تفسیر موضوعی

جلد سوم

قرآن کا دائمی منشور

آیۃ اللہ استاد جعفر سبحانی

مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

نام کتاب ------------------ تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور

جلد -------------------- سوم، چہارم

مؤلف ------------------ آیۃ اللہ اُستاد جعفر سبحانی

مترجم ------------------ مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و تنظیم نو --------------- قلب علی سیال

کمپوزنگ ---------------- فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)

طبع ثانی ------------------ مکتبہ جدید پریس لاہور

سال اشاعت --------------- فروری 2012ء

ناشر ------------------- مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ مکمل سیٹ -------------- 3000 روپے

اس کتاب کی اشاعت کیلئے الحاج شیخ وحید احمد نے تعاون فرمایا ہے
ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اور ان
کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ادارہ۔

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیات قرآنی کو ایک مقام پر لا کر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کر دی گئی ہے، لہٰذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔

تفسیر قرآن کا یہ طریقہ علماء و محققین اور عام طالبانِ قرآنیات کے لیے بڑی اہمیت اور افادیت رکھتا ہے۔ وہ اس کے ذریعے قرآن کی ہمہ گیر تعلیمات اور اسلام کے آفاقی ضوابط کو بہتر اور جامع طور پر سمجھنے سمجھانے کے علاوہ بالوقت استنباط احکام بھی کر سکتے ہیں۔ آیت اللہ جعفر سبحانی نے فارسی زبان میں یہ اولین تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور کے نام سے ترتیب دی اور علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ نے اسے فارسی سے اردو میں منتقل فرمایا ہے۔

تفسیر موضوعی کی طباعت واشاعت میں حسب ذیل دو مقاصد ہمارے پیش نظر رہے ہیں:

۱: اردو خوان طالبان قرآنیات کو تفسیر قرآن کی ایک نئی روش سے روشناس کرانا۔

۲: علماء و محققین کی خدمت میں اسلامی و قرآنی تعلیمات کا ایک ایسا مرقع پیش کرنا کہ جس میں ہر موضوع اپنی جگہ مکمل ہو۔

اس وقت تفسیر موضوعی کی جلد نمبر 3، 4 کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے پیش نظر دو جلدوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ تا کہ کتاب کی قیمت میں کمی کی جا سکے۔ کتاب تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور کی طباعت ثانی دس سال بعد پیش کی جا رہی ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم و تحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرِ نایاب سے بھرپور علمی و عملی استفادہ فرمائیں گے۔ اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز و آراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست

تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور جلد نمبر 3، 4

تفسیر موضوعی:

قرآن کا دائمی منشور جلد چہارم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن ایک بحر ناپیدا کنار اور کِتاب نامہ قرآن

پیش گُفتار:

قرآن آسمانی کتاب اور آسمانی وحی ہے جو تیئیس سال کے عرصہ میں پیغمبر اکرمؐ کے قلب مبارک پر [۱] اتری، اور آپ نے تلاوت اور قرات [۲] کے ذریعہ لوگوں کو اس سے آشنا کیا پھر آپ ہی کے حکم سے بڑی اور چھوٹی سورتوں کی شکل میں جمع اور اکٹھا ہوا[۳]

جس دن سے قرآن نقوش وخطوط کی صورت میں صفحہ کاغذ پر آیا ہے اسی دن سے علماء اور دانشمندوں میں اس کی اس قدر پذیرائی ہوئی ہے کہ تاریخ تمدن وعلم میں اس کی کوئی نظیر اور مثال نہیں مل سکتی۔

قرآن کی تلاوت اور اس کے معانی کو سمجھنے کی طرف علماء اسلام کی توجہ کے سبب سے اس سلسلہ میں دو قسم کے علوم مدون ہوئے اور دونوں قسموں کا مقصد قرآن کے عالی مضامین کو سمجھنا اور اس کی صحیح تلاوت ہے وہ دو علوم یہ ہیں۔

ا۔علوم عربیہ

مثلاً صرف ونحو، لغت واشتیاق ومعانی وبیان وبدیع وغیرہ جنہیں قرآن کے ابتدائی معانی کے سمجھنے کی کلید سمجھنا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ اس کلید سے فائدہ اٹھانا صرف قرآن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ان علوم کے ذریعہ انسان عربی زبان سے آشنا ہوجا تا ہے۔ اور جتنی کتابیں بھی عربی زبان میں لکھی گئی ہیں وہ ان سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن عربی زبان کے قواعد کے کشف کرنے اور ان علوم کی تدوین کا اصلی اور بنیادی سبب کتاب اللہ'' کو سمجھنا تھا۔

---

[۱] ''نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ (سورہ شعراء)

[۲] سورہ آلِ عمران۔164

[۳] کتاب ''البرھان'' زرکشی ج1 ص256 و''اتقان'' سیوطی ج1 ص172۔173

۲۔علوم قرآن

اس سے مراد وہ علوم ہیں جو خود قرآن سے ہی مربوط ہیں اور جن کا سرچشمہ خود قرآن ہے، مثلاً پیغمبروں کے قصے' آیات کا شان نزول' اور ''قرات'' و'' تجوید' اور ان ہی کے مانند دوسرے علوم اس قسم کے علوم کے لیے قرآن کے متن سے ہی مدد لی جاتی ہے اور وہ خود اسی کتاب کے ذریعہ مدون ہوتے ہیں۔

وہ علوم جو خود قرآن کے متن سے مدد لیتے ہیں وہ ان ہی علوم میں منحصر نہیں ہیں بلکہ تمدن اسلامی کی پیش رفت اور افکار کے تکامل وارتقاء اور دانش وبینش کی وسعت کے ساتھ ساتھ بڑھتے چلے گئے ہیں۔

قطب الدین شیرازی (متوفی ا ۷) نے کتاب ''درۃ التاج'' میں قرآن کے علوم کو بارہ علموں میں تقسیم کرتا ہے۔ جبکہ جلا ل الدین سیوطی'' (متوفی ۹۱۱) نے کتاب ''اتقان'' میں قرآن کے علوم کو اسی ۸۰ قسموں تک پہنچا دیا ہے میں بدر الدین زرکشتی (متوفی ۷۹۴) نے کتاب برہان فی علوم القرآن کے علوم کی اقسام کو سینتالیس ۴۷ تک پہنچا دیا ہے اور بہت سے علوم کی اقسام کو جنہیں سیوطی نے مستقل ''علم'' کی صورت میں شمار کیا ہے دوسری اقسام کے ساتھ ملا دیا ہے۔

امیر المومنین (ع) نے قرآن کی آیات اور علوم کو ایک حدیث میں خاص طریقے سے تقسیم کیا ہے [1]

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ ان علوم ومعارف میں سے ہر ایک کی تالیف وتحریر کا سلسلہ جو سب کے سب اس کے مفاہیم کے سمجھنے کے لیے مدون ہوئے ہیں کسی زمانہ میں بھی تکامل وارتقا سے نہیں رکا اور ہر زمانہ میں تالیف وتحریر کا سلسلہ جاری وساری رہا ہے اور اگر اس سلسلہ میں لکھی گئی علماء اسلام کی تمام کتابوں کو کسی ایک مقام پر جمع کر دیا جائے تو ان سے ایک عظیم ترین کتب خانہ وجود میں آ جائے گا۔ اور اگر ان کتابوں کو بھی جو براہ راست قرآن کے بارے میں لکھی گئی ہیں ان کے ساتھ ملا دیا جائے تو اس کتاب آسمانی کی عظمت اتنی زیادہ تجلی پیدا کرے کہ ہر مفکر تعجب اور حیرت سے انگشت بدنداں رہ جائے اور دل ہی دل میں کہے۔

''قرآن کیسا ناپیدا کنارہ سمندر ہے کہ کوئی بھی تیراک اس کے ساحل تک پہنچ نہیں پاتا اور نہ ہی اس کی انتہا اور سرحد کا تعین کر سکتا ہے۔''

صرف شعیہ علماء کی طرف سے قرآن کی سینکڑوں تفاسیر [2] لکھی گئی ہیں جن کا ایک حصہ تو زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ضائع ہو گیا ہے اور ایک حصہ مطبوع یا محفوظ صورت میں عالمی کتب خانوں میں محفوظ رہ گیا ہے اور اگر ان تفاسیر کو جو علماء اہل سنت کی طرف سے لکھی گئی ہیں ملا لیا جائے تو عقل وخرد قرآن کے بارے میں مبہوت اور مدہوش ہو جاتے ہیں اور خود سے کہتے ہیں کہ یہ کتنی انوکھی اور تعجب خیز کتاب ہے جس میں اتنی کشش پائی جاتی ہے؟ کتنی وسیع اور بے کراں فضا ہے جس کے اوپر کسی افق کا تعین نہیں ہو سکتا اور کیسا ستاروں بھرا آسمان ہے جس کے

---

[1] بحار الانور ا ج ۱۹ چاپ کمپانی باب ۱۲۸ ص ۹۴۔۱۱۹۔

[2] الذریعہ ج ۴ ص ۲۳۱۔۳۴۵۔

ستاروں کا کوئی شمار نہیں؟

کتاب نامہ قرآن

ایسے بے نظیر استقبال کو جو اس کتاب کا ہوا۔ اور گوناں گوں جہات سے اس کی طرف توجہ کی گئی ہے مدنظر رکھتے ہوئے مناسب ہے کہ اسلامی ممالک میں ایک ''دارالقرآن'' کی بنیاد ڈالی جائے اور صدر اسلام کے آغاز سے لے کر اب تک قرآن کے سلسلے میں جو کام ہوئے ہیں وہ اس میں منعکس کئے جائیں اور قرآن سے مربوط کتابیں چاہے وہ مطبوعہ ہوں یا غیر مطبوعہ، آفسٹ زیراکس یا فوٹو کاپی کے طریق سے اس (دارالقرآن) میں جمع کی جائیں اور اس طرح سے اس کتاب کی عظمت اور اس کا وہ پایہ جذبہ جس نے چودہ صدیوں کے دوران علماء اور دانشمندوں کے دماغوں کو اپنی طرف متوجہ کئے رکھا ہے، روشن ہو جائے۔

قرآن کی عظمت و وسعت اور پایان ناپذیری کے لیے یہی کافی ہے کہ یہ جان لیں کہ اسلامی محققین ومفسرین نے ذیل میں بیان کردہ کے موضوعات کے سلسلہ میں ___ جن میں ہر ایک قرآن سے مدد و کمک لیتا ہے۔ ___ متعدد کتابیں لکھی ہیں یہاں تک کہ ان موضوعات میں سے بعض میں تو تالیف شدہ کتابوں کی تعداد ایک سو سے بھی زیادہ ہے۔

اگر قرآء سبعہ یا ان کی قراتوں کے بارے میں سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ تو ان موضوعات میں سے ہر ایک کے متعلق ___ جن کی طرف ہم ابھی اشارہ کرتے ہیں ___ بہت ہی زیادہ کتابیں ___ جو احتمالاً سو جلدوں سے بھی زیادہ ہوں گی ___ لکھی گئی ہیں وہ مذکورہ موضوعات یہ ہیں۔

۱۔ اعراب قرآن
۲۔ اسالیب النفی فی القرآن
۳۔ اسالیب استفہام فی القرآن
۴۔ غریب قرآن
۵۔ مجازات قرآن
۶۔ وجوہ قرآن
۷۔ معانی قرآن
۸۔ اعجاز قرآن وفنون بلاغی
۹۔ ناسخ ومنسوخ قرآن
۱۰۔ محکم ومتشابہ قرآن
۱۱۔ قصص قرآن
۱۲۔ کشف الآیات
۱۳۔ اخلاق
۱۴۔ تعلیم وتربیت
۱۵۔ مباحث کلامی
۱۶۔ علوم امروزہ
۱۷۔ اہل بیت
۱۸۔ سوگندھائے قرآن
۱۹۔ شانِ نزول ہائے قرآن
۲۰۔ مختلف عالمی زبانوں میں قرآن کے ترجمے

یہ ان موضوعات کا ایک اجمالی بیان ہے جن کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور انسان اس وقت تعجب اور حیرت میں غرق ہو جاتا ہے

جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ صرف لغات قرآن میں سو سے زیادہ جلدیں اور ناسخ ومنسوخ کے بارے میں ۷۵ سے زیادہ جلدیں اور محکم ومتشابہ کے بارے میں ۶۰ سے زیادہ جلدیں لکھی گئی ہیں، اور اس وقت تک قرآن کا (فارسی زبان کے علاوہ) ستر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور تراجم کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے۔

اور اگر اس کام کے ساتھ خطی اور چاپی قرآنوں کی فہرست اور ادبی اور عرفانی تفاسیر کی فہرست کا بھی اضافہ کیا جائے تو یہ وہ منزل ہے کہ انسان بے اختیار ہو کر کہتا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ (شعراء۔ ۱۹۲تا۱۹۵)

بے شک یہ عالمین کے پروردگار کی نازل کی ہوئی کتاب ہے جسے روح الامین نے تیرے قلب پر نازل کیا ہے تاکہ تو واضح عربی زبان میں عذاب سے ڈرانے والا ہو۔"

مگر اس کتاب کو پڑھنے والے کو کیا ملتا ہے۔؟ اور وہ کیا سنتا ہے؟ اس ناپیدا کنار سمندر پر ایک اجمالی نگاہ ہر قسم کے اندرونی شک وتنزلزل کو یقین واطمینان میں بدل دیتی ہے۔

قرآن در قرآن

منطقی صورت اور جامع ومانع شکل میں قرآن کی تعریف عام انسان کی قدرت وتوانائی سے باہر ہے کیونکہ اس قسم کی معرفت پر قدرت حاصل کرنا اس پر احاطہ کرنے کی فرع ہے، اور وہ عظمت جو قرآن لفظ ومعنی کے لحاظ سے رکھتا ہے طائر فکر انسانی اس کی چوٹی تک نہیں پہنچتا اور اسی پر احاطہ نہیں کرتا۔

جس طرح سمندر کا پانی کسی کوزے میں نہیں سما سکتا۔ اسی طرح قرآن کے معارف کا سمندر بھی ہمارے چھوٹے سے دماغ میں نہیں سما سکتا اور الفاظ کے قالب میں نہیں آ سکتا۔ اور قرآن کی ہر قسم کی تعریف اس کی عظمت کے ایک حصہ کی طرف ایک اشارہ ہی ہو سکتی ہے۔

قرآن کا بہترین تعارف کرانے والا وہ خود، اور اس کے حامل پیغمبر گرامیؐ کا کلام ہی ہے اگر ان تمام آیات کو جو خود قرآن کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں ایک جگہ جمع کیا جائے تو ہم اس کتاب کی عظمت سے خود اسی کے ذریعہ بہتر طور سے آگاہ ہوں گے اور حق یہ ہے کہ خدا کے کلام کا معرف خود اس کو ہی ہونا چاہیے۔ اور اگر ہم ان تمام باتوں کا جو پیغمبر یا آئمہ معصومین نے قرآن کے بارے میں کہی ہیں مطالعہ کریں تو قرآن ہماری نظر میں ایک اور ہی عظمت اور جلوہ پیش کرے گا۔ اب ہم قرآن کے تعارف کے بارے میں کچھ نمونے خود اس آسمانی کتاب سے نقل کرتے ہیں صرف چند ایک نمونے اس میں سے اکثر اور سب نہیں:

① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾ (بقرہ۔ ۲)

''یہ وہ کتاب ہے جس کی استواری میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور یہ پرہیز گاروں کی رہنما ہے۔''

② قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ۝١٥

(مائدہ۔۱۵)

''خدا کی طرف سے تمہارے لیے تو اور تاریکیوں میں روشنی بخشنے والی واضح کتاب آئی ہے۔''

③ قَدۡ جَآءَكُمۡ بُرۡهَانٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ نُوۡرًا مُّبِيۡنًا ۝١٧٤

(نساء۔۱۷۴)

''تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان اور گواہ آیا ہے اور تمہاری طرف ہم نے روشنی بخشنے والا نور نازل کیا''

④ لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا

(حشر۔۲۱)

اگر ہم اس قرآن کو پہاڑوں پر نازل کر دیتے تو وہ اس کے سامنے خاضع ہو جاتے، اور اپنے پروردگار کے خوف سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔

5 كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ

(ابراھیم۔۱)

''ہم نے یہ کتاب تیرے اوپر اس لیے نازل کی ہے تاکہ تو لوگوں کو (شرک اور اندھے پن کی) تاریکیوں سے (ایمان کی) روشنی کی طرف نکال لے جائے۔''

یہ خود قرآن کے ذریعہ قرآن کے تعارف کے چند نمونے ہیں ہم اس پیش لفظ میں اسی مقدار پر اکتفا کرتے ہوئے اس موضوع کی تفصیل کسی دوسرے وقت کے سپرد کرتے ہیں۔

قم۔موسسہ امام صادق

۳۰ دیماہ ۱۳۶۲

مطابق

۱۶ ربیع الثانی ۱۴۰۴

جعفر سبحانی

ا۔اسلام میں جہاد

انسان چونکہ انسان دوستی سے الفت ومحبت رکھتا ہے، لہٰذا وہ جنگ کو ایک وحشیانہ اور غیر انسانی اقدام سمجھتا ہے اس طرح سے کہ جنگ کے نقصان رسان اور بُرے نتائج کی یاد سے ہی انسان کے دل میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔اس لیے عام حالات میں جنگ کو مذموم اور بُری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اور یہ ایک بشری احساس ہے اسلام جو کہ ایک فطری اور طبعی دین ہے اس حقیقت اور واقعیت کا معترف ہے اور جنگ کو بشری طبیعت کے لحاظ سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔''کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم ''تم پر جہاد واجب کیا گیا ہے حالانکہ وہ تمہارے لیے موجب دشواری وکراہت ہے۔

لیکن اس مسئلہ کی تہہ تک پہنچنا چاہیے کہ کیا جنگ عقلی لحاظ سے ہمیشہ اور تمام حالات میں مذموم اور ناروا ہے؟ اور کسی بھی قوم کو کسی بھی حالت میں اسلحہ کے ساتھ جنگ نہیں کرنا چاہیے؟ یا کبھی کسی قوم کو ایسے حالات بھی پیش آ جاتے ہیں کہ جب عقل کے قطعی فیصلہ کے مطابق انسان کے لیے جنگ کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا،اس صورت میں نہ صرف یہ کہ جنگ غیر انسانی فعل نہیں ہوگی ، بلکہ اس کا ترک کرنا ذلت وخواری کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

اگر کسی معاشرے پر ظلم وستم ڈھایا جارہا ہو تو انسان کے لیے لازم وضروری ہے کہ وہ عقل وفطرت کے فیصلہ کے مطابق معاشرے اور خود اپنے حقوق کا دفاع کرے اور اس قسم کی جنگ عقل کی نظر میں واجب ہے بلکہ حق کے لیے دفاع کرنا ہر زندہ موجود کا طبعی اور فطری حق ہے۔

طولِ تاریخ میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو ایسے دشمن کے ساتھ، جو اس کی زندگی ختم کرنے پر تلی ہوئی ہو، جنگ کرنے کو امکانی صورت میں ضروری نہ سمجھتی ہو۔اور جب کہ ایسے دشمن کو بچھاڑنا قتل کرنے یا قتل ہونے کے سوا اور کسی طرح بھی ممکن نہ ہو تو خونریزی کو روا اور جائز نہ سمجھتی ہو۔

اسی بنا پر موجودہ دنیا جنگ کو اتنا مذموم اور برا سمجھنے کے باوجود انجام کار اسے کئی موارد میں جائز اور قانونی سمجھتی ہے۔

اسلام بھی چونکہ ایک فطری دین ہے اور اس نے اپنے دستور وقوانین کو آفرینش وخلقت کی بنیاد اور فطری مشخصات پر استوار کیا ہے لہٰذا وہ جہاد کو بعض حالات میں لازم وواجب سمجھتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام میں جہاد کے مشروع ہونے کے کیا اسباب تھے؟

جہاد کے مشروع ہونے کا سبب

جہاد کے بارے میں جو سب سے پہلی آیات نازل ہوئیں وہ سورۂ حج کی چار آیات ہیں۔ان آیات کے مطلب میں غور وغوض کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جہاد کے مشروع ہونے کا اصل سبب وہی جان ومال کا دفاع تھا۔

چونکہ مسلمان مکہ میں ہمیشہ دشمن کی لوٹ مار کا شکار رہتے تھے۔اوران کی جان ومال پر تجاوز ہوتا رہتا تھا، یہاں تک کہ دشمنوں نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر دیارِ غربت میں آوارہ ہوں جب وہ مدینہ اکٹھے ہوگئے اور اپنے سے چھینے ہوئے حق کا دفاع کرنے کے لیے ان میں کافی حد تک قدرت وتوانائی پیدا ہوگئی تو اس موقع پر انہیں خدا کی طرف سے یہ حکم ملا کہ وہ اپنے چھینے ہوے حق کا دفاع کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور دشمن کی سرکوبی کر کے اپنے طبعی وفطری حقوق حاصل کریں آیات کا متن یہ ہے۔

ان اللہ یدافع عن الذین اٰمنوا ان اللہ لایحب کل خوّان کفور۔"

خدا ان لوگوں کا جو ایمان لائے ہیں دفاع کرتا ہے خدا ناشکرے خیانت کاروں کو دوست نہیں رکھتا۔"

اُذِنَ لِلّذین یقاتلون بانّھم ظلموا وانّ اللہ علیٰ نصرھم لقدیر۔"

جن لوگوں کے ساتھ جنگ کی جارہی ہے، انہیں بھی اجازت دی ہے کہ وہ (بھی ان جنگ کرنے والوں کے ساتھ) جنگ کریں کیونکہ ان پر ظلم وستم کیا جارہا ہے۔اور یقینا خدا ان کی مدد کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔"

"الّذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق اِلا ان لو اربنا اللہ ولو لادفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرًا ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز۔

"وہ لوگ کہ جنہیں محض اس وجہ سے اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار خدا ہے، اگر خدا بعض لوگوں کا دوسرے بعض کے ذریعہ دفاع نہ کرتا، تو سارے دیر اور گرجے، عبادت گاہیں اور وہ مسجدیں جن میں خدا کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے۔ویران ہوجاتے جو بھی خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی مدد کرتا ہے۔

ایک اور آیت میں آیا ہے:

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ ﴿۴۱﴾ (سورہ حج)

وہ لوگ اگر ہم انہیں زمین میں قدرت دے دیں تو نماز کو قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے نیکی کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے، اور کاموں کا انجام خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔"

یہ چار آیات وہ سب سے پہلی آیات میں جو جہاد کی اصل تشریح کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں اور ان میں جہاد کے علل واسباب کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے ان آیات میں غور وفکر ہمیں جہاد کے اسباب سے آشنا کرتا ہے۔

اَوَّلاً:

راہ حق میں جنگ کرنے والوں نے ہرگز جنگ کا آغاز نہیں کیا۔ بلکہ یہ اس جنگ کا جواب تھا جو تجاوز کرنے والوں کی طرف سے شروع ہوئی تھی یعنی یہ لوگ جنگ زدہ ہیں نہ کہ جنگجو، اس صورت میں اس شخص کا جس پر تجاوز کیا جارہا ہے۔
اپنا دفاع کرنا، قہراً لازم وواجب ہوگا اس کے علاوہ ہر صورت میں خوار ذلیل ہونا پڑے گا۔

ثانیاً

دشمن کے تجاوز کرنے کی دوسری نشانی یہ ہے کہ انہوں نے انہیں خدائے یگانہ کے اعتقاد کے جرم میں اپنے گھر اور اپنے شہر سے باہر نکال دیا ہے، گویا ان کی نظر میں خدائے یگانہ کا اعتقاد ایسا جرم ہے کہ اس کا اعتقاد رکھنے والے کو اپنی زندگی کا ماحول ترک کردینا چاہیے۔

ثالثاً

وہ مشرک جو خدا کی الوہیت اور حق تعالی کی پرستش کے مخالف ہیں، انہیں مردانِ خدا پرست کے ہاتھوں نابود ہوجانا چاہیے اور زمین ان کے وجود کی گندگی سے پاک ہوجانی چاہیے، اس کے سوا تمام معابد الٰہی ویران ہوجائیں گے۔

رابعاً

اگر خدا ان آیات میں اس طرح سے قیام کرنے والوں کو کامیابی کا وعدہ دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انہیں روئے زمین پر قدرت واقتدار حاصل ہوگیا تو وہ ظالموں اور ستم گروں کا طریقہ اختیار نہیں کریں گے، بلکہ وہ اپنے خدا کے ساتھ تعلق ''اقاموا الصلاۃ'' کو اور اپنے لوگوں کے ساتھ تعلق ''اتوا الزکاۃ'' کو زیادہ سے زیادہ محکم اور مضبوط بنائیں گے اور نیکی کو عام کرنے اور برائی کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے اور کسی شخص سے بھی نہیں ڈریں گے۔

یہ آیات جہاد کے چہرے کا ایک رخ اور صدر اسلام میں اس کے مشروع ہونے کے اسباب ہم پر واضح کررہی ہیں اور اس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اسلام کے اس حیات بخش حکم پر عیسائیوں کے بہت سے اعتراضات اور حملے بہت ہی بے بنیاد اور بے پایہ ہیں جب کہ اپنے حقوق کو واپس لینے اور متجاوز کو پیچھے ہٹانے کیلئے اس قسم کا جہاد اور کوشش تمام ملل واقوام کی لغت میں مشروع اور ان کا ایک وجدانی اور ملی فریضہ ہے۔

ابتدائی جہاد

فقہانے ''جہاد'' کو دو اقسام میں تقسیم کیا ہے، ایک کو جہاد دفاعی اور دوسرے کو جہاد ابتدائی کا نام دیا ہے لیکن اگر ہم جہاد کے علل واسباب میں غور وفکر کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ تمام اسلامی جہاد، یہاں تک کہ اس کا ابتدائی اور تعرضی حصہ بھی دفاعی ہی ہے اور اس کی وضاحت اسی طرح سے ہوسکتی ہے کہ تمام ابتدائی جہادوں کے اسباب اختصار کے ساتھ پیش کر دیئے جائیں۔

ستم زدہ اور مظلوم لوگوں کو ظلم سے نجات دلانا

ممکن ہے کہ خود امت اسلامی پر تو تجاوز نہ ہو رہا ہو لیکن اسے یہ اطلاع ملے کہ کسی گروہ پر ظلم وستم ہو رہا ہے اور وہ ظالموں کی گرفت میں مظلومانہ اپنی جانوں کو پھنسائے ہوئے ہیں اور امت اسلامی بھی اپنے آپ کو اس گروہ سے ظلم وستم کے دور کرنے پر قادر سمجھے خصوصاً جبکہ ستم زدہ اور مظلوم لوگ مسلمان ہوں اور دنیا کے کسی علاقہ میں ایک اقلیت کی صورت میں رہ رہے ہوں تو اس صورت میں ضروری ہے کہ امت اسلامی اس ستم زدہ اور مظلوم گروہ کی مدد کیلئے جائے اور انہیں ظلم وستم سے نجات دلائے۔

اس قسم کا جہاد اگرچہ ظاہراً ابتدائی اور تعرضی ہے، لیکن حقیقتاً اور واقعی طور پر یہ بھی ایک دفاعی جہاد ہی ہے البتہ یہاں امتِ اسلامی کے کسی آدمی ،اس کے مال یا وطن کا دفاع نہیں ہے، بلکہ یہاں مظلوم اور ستم زدہ انسانوں کا دفاع ہے۔ یہاں اُمت اسلامی پر تجاوز نہیں ہوا ہے بلکہ نوع انسانی پر تجاوز درپیش ہے، ایسا تجاوز جو خود ایک قسم کا ظلم ہے، اور اس سے مبارزہ کرنا عدل وانصاف کا دفاع ہے اور ظلم کے ساتھ مقابلہ ہے۔ تو کیا اس قسم کے مبارزہ کو صد در صد تعرضی یا ابتدائی جہاد کا نام دیا جاسکتا ہے؟ اس قسم کا جہاد اس ستم گر اور ظالم سے مقابلہ ہے جو ایک آزاد انسان پر ظلم وستم ڈھا رہا ہے اور اس کو زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔

ایک مرتبہ یہ بیان آیا تھا کہ جب الجزائر کے لوگ فرانسیسیوں کے ساتھ جنگ کر رہے تھے تو فرانسیسیوں کا ایک گروہ بھی الجزائر والوں کے دوش بدوش فرانسیسیوں سے لڑ رہا تھا جبکہ فرانس والوں پر معمولی سا بھی تجاوز نہیں ہوا تھا، لیکن چونکہ دنیا کے ایک مقام پر انسان پر ظلم ہو رہا تھا اور دوسرا انسان اس کا دفاع کر سکتا تھا اور اُسے نجات دلا سکتا تھا اس بنا پر یہ گروہ اپنا حق سمجھتا تھا کہ الجزائر کے لوگوں کے دفاع کیلئے اپنے ہم وطن تجاوز کرنے والوں سے مبارزہ کریں۔

قرآن مجید جہاد کے اس حصہ کی طرف، جو ظاہراً ابتدائی اور تعرضی ہے، لیکن حقیقت میں دفاعی اور آزادی بخش ہے، ایک آیت میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۚ

وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾ (نساء)

''تم راہ خدا میں اور ان مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے جو کمزور و ناتواں اور بے کسی کے عالم میں ہیں جہاد کیوں نہیں کرتے؟ وہ لوگ جو یہ کہ رہے ہیں پروردگار! ہمیں اس شہر سے جس کے لوگ ظالم وستم گر ہیں باہر نکال اور اپنی طرف سے ہمارے لیے کوئی سرپرست مقرر کر دے اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا یار و مددگار بنا دے۔''

لیکن یہ بات کہ کیا مظلوم کی مدد کرنا ہر حال میں واجب و لازم ہے یا اس صورت میں واجب ہے کہ جب وہ مسلمان سے مدد چاہے نیز اس صورت میں واجب ہے کہ وہ مسلمان ہو یا مسلمانوں سے ملنے کی راہ پر چل رہا ہو، یا کم از کم حکومت اسلامی کے برخلاف راستہ پر نہ ہو، یا مطلقاً واجب ہے ہم یہاں اس موقع پر کوئی بحث نہیں کرتے، کیونکہ یہ فقہ اسلامی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان قیود و حدود کا تعین کرے۔

ہاں! اس قسم کا جہاد وہ مقدس ترین جہاد ہے جو اب تک انسان اپنے دل میں رکھتا ہے یہاں پر ایک معنوی اور صد در صد انسانی سبب مجاہد کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنا خون بہا کر مظلوموں اور ستم رسیدہ لوگوں کی نجات فراہم کرے اور ہرگز مسلمان کو اس بہانہ سے کہ خود اس کے شخصی یا نوعی حقوق سے تو تجاویز نہیں ہو رہا ہے مظلوموں اور بیچاروں کے قتل کے منظر کا تماشہ دیکھتے نہیں رہنا چاہیے بلکہ یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ جہاد کریں، یہاں تک کہ انہیں قید سے رہائی دلائیں۔

ہاں! اسلام اس لیے جنگ کرتا ہے۔ تاکہ عوام الناس زندگی کی صحیح راہ اپنے ارادہ کے ساتھ منتخب کر سکیں۔ اسلام ہرگز اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ ساری دنیا میں کہیں بھی کسی بھی انسان پر تجاوز اور ظلم وستم ہو، اور ایک قوم و ملت کے حقوق دوسری قوم و ملت کے ہاتھوں پامال ہوں۔ اسلام قانون جہاد کے ذریعے مظلوموں اور بیچاروں کے حقوق کا دفاع کرتا ہے اور در حقیقت وہ مظلوموں کی پناہ گاہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ اسلامی مجاہدین کی جنگ کا سبب ظالموں کے زیر تسلط لوگوں کو آزاد کرانا اور ستم دیدہ افراد سے ظلم وستم کو مٹانا ہے لہٰذا اس کا نام بھی ''دفاعی جہاد'' یا ''جہادِ آزادی بخش'' رکھا جانا چاہیے۔ نہ کہ ابتدائی و تعرضی۔

یہ تصور کہ ایک حکومت یا قوم و ملت کو دوسری حکومتوں یا قوموں کے داخلی امور میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔ ایک سفسط (اور بے ہودہ بات) سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ اصل اس مقام کے ساتھ ربط رکھتی ہے جب کوئی حکومت اپنی قوم کی حمایت کے ساتھ کسی کام کو انجام دیتی ہو۔ نہ کہ وہ حکومت جو بزورِ شمشیر کسی جماعت پر چڑھ دوڑے اور ایک گروہ کو حاکم اور دوسرے گروہ کو محکوم و تباہ و برباد کر دے۔

۲۔ دعوت اسلامی کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے جہاد

اب اگر کسی مسلمان شخص یا اس کی شخصیت پر ظلم و زیادتی نہ ہو رہی ہو لیکن حاکم جابر ایسی گھٹن پیدا کر دے کہ وہ پیغمبروں کی دعوت کو جو خدا کی جانب سے عقلمند انسانوں کے لیے بھیجی گئی ہے، ان تک نہ پہنچنے دے، اور وہ لوگوں کے گرد ایسا حصار بنا دے جو کلام خدا کو ان تک نہ پہنچنے دے، تو کیا ایسے فرد یا نظام کے خلاف جہاد کرنا ایک تعرضی اور ابتدائی جہاد ہے یا وہ دفاعی جہاد ہے اگر ہم غور کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ بھی ایک

دفاعی جہاد ہی ہے کیونکہ مبلغ کی تبلیغ سے جلوگیری انسانوں سے ایک قسم کی سلب آزادی ہے جس نے کہنے اور سننے والے کو اس قسم کے طبیعی اور فطری حق سے روک دیا ہے۔ اس قسم کا جہاد مستضعفین کو آزاد کرانے کی کوشش کے مانند ہے اور یہ ظلم واستبداد کے خلاف ایک قسم کا قیام ہے ، کیونکہ وہ نظام جو ہمیشہ عقائدِ فاسد کے لوگوں میں ٹیکے لگاتا ہے اور پیغمبر کی دعوت اور انبیاء کے حیات بخش پروگراموں کی نشرواشاعت سے مانع ہے ایک ایسا ظالم ہے جس نے لوگوں کے طبعی اور فطری حقوق چھین لیے ہیں، اگرچہ بعض اوقات مظلوم قوم کی اپنی مظلومیتکی طرف توجہ نہیں ہوتی اور جوستم اس پر ہورہا ہوتا ہے اس سے بے خبر ہوتی ہے ایسی ظالم طرزحکومت سے ٹکرانا اور مبارزہ کرنا، انسانوں کے حقوق کے لیے ایک ایسا دفاعی قیام ہے، جو اس طرزحکومت نے ان سے چھین لیے ہیں اور یہ ظلم وستم کے خلاف مبارزہ ہے۔

زیادہ واضح الفاظ میں جہاد کے مقدس ہونے کی میزان یہ نہیں ہے کہ اپنی ذات سے دفاع ہو بلکہ جہاد تمام مراحل میں اس لحاظ سے انسانی ہے کہ وہ حق اور حقیقت کے دفاع کی صورت میں صورت پذیر ہو، اور اگر اپنے آپ یا اپنی قوم کا دفاع زیبا اور انسانی ہے تو وہ بھی اس وجہ سے ہے کہ اس قسم کا عمل حق اور حقیقت کا دفاع ہے تو اس صورت میں کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم جہاد کے فریضہ کو شخص یا ملت کے دفاع میں منحصر کریں بلکہ جہاں کہیں بھی حق اور حقیقت کا دفاع ہوگا چاہے خود انسان یا اسکی ملت پر ظلم وستم اور تجاوز ہورہا ہو۔ یہ جہاد مقدس ہی ہوگا۔

خسروانی وقیصری ارباب اقتدار کی طرف سے گھٹن کا پیدا کرنا۔ اور نور الٰہی کو دلوں میں نفوذ کرنے سے روکنا، اور لوگوں کو خراب اور بیہودہ عقائد میں مشغول کرنا حق وحقیقت کے حریم میں تجاوز کرنا ہے یا انسانوں کے حقوق پر تجاوز کرنا ہے اور اس قسم کی گھٹن سے مبارزہ کرنا چاہیے اور آزاد ماحول حاصل کرنا چاہیے اور خدا کی بات لوگوں کے کانوں تک پہنچانی چاہیے اس کے بعد لوگوں کو اختیار ہے، **فمن شاء فلیئومن و من شاء فلیکفر** ۔ ''موجودہ زمانہ میں کچھ حقوق ''حقوق بشر'' کے نام سے اور ایک جمعیت حامیان حقوق انسانی کے نام سے قائم ہے۔ وہ لوگ جو لوگوں کے درمیان انسانوں کے حقوق کے دفاع کے عنوان سے گفتگو کرتے ہیں اور ان کے حقوق کا دفاع کرتے ہیں (اگرچہ بعض اوقات اس حمایت کے پردہ میں سیاسی اغراض کا ایک سلسلہ بھی ہوتا ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس طریقہ سے ان تک پہنچ جائیں)

یہاں پر کوئی شخص ان پر یہ اعتراض نہیں کرتا کہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو تمہارے ملی یا شخصی حقوق کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے تو تم کیوں شور وغل مچا رہے ہو؟ یہ اس لیے ہے کہ حق دفاع کے عنوان سے قیام کرنا چاہیے اور حق کو واپس لانے کے لیے خون دینا اور خون بہانا چاہیے اسی لیے موجودہ زمانہ میں دنیا اس گروہ کے قیام کو جو صرف آزادی کے لیے قیام کرتا ہے اور اس حاکم کے ساتھ کہ جس نے گھٹن پیدا کررکھی ہے جنگ کرتا ہے مقدس قیام شمار کرتی ہے۔

پس اگر کافر حکومتیں نفوذ اسلام، لوگوں کو تبلیغ کرنے اور مصارف واحکام کی نشرواشاعت میں رکاوٹ نہ ڈالیں، اور پیغمبروں اور اولیاء اللہ اور ان کے نمائندوں کی دعوت میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالیں تو اس صورت میں حکومت اسلامی اس قسم کی حکومتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتی، اور راہ ورسم کے انتخاب کرنے میں لوگوں کے نظریہ کی منتظر رہتی ہے کہ وہ کس طریقہ کا انتخاب کرتے ہیں اور کس مکتب کی پیروی کرتے ہیں۔

مسلّمہ طور پر انسانوں کی پاک اور صاف فطرتیں آہستہ آہستہ اسلامی تبلیغات کی فریفتہ ہو جائیں گی (اور تبلیغ کے آزاد ہونے کی صورت میں) اس حیات بخش مکتب کی طرف جذب ہو جائیں گی اور زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ لوگ گروہ در گروہ اسلام کی طرف کھنچتے چلے جائیں گے اور ایمان

لے آئیں گے اور ''ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجاً۔ (اور تو لوگوں کو دیکھے گا کہ وہ فوج درفوج خدا کے دین میں داخل ہورہے ہیں) کی آیت کا مفہوم ہر زمانہ اور ہر عصر میں پورا ہو رہا ہے۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اسلام کے تمام جہاد دفاعی تھے اور عام طور پر قوموں اور ملتوں کو تسلط اور غلامی سے آزاد کرانے، اور تبلیغ کے لیے آزادی کے حصول، اور مختلف اقوام وملل کو بیدار کرنے کے لیے وقوع پذیر ہوئی تھیں۔

اگر صدر اسلام میں مسلمان ایک ہاتھ میں ہتھیار اور دوسرے میں قرآن اٹھائے ہوئے زیر تسلط ممالک کی طرف بڑھتے تھے تو وہ اس لیے تھا تاکہ کمزوروں اور مستضعفین کو ظالموں کے تسلط سے نکالیں اور اس گھٹن کو جسے وقت کے حکمرانوں نے اپنے اپنے علاقوں میں ایجاد کیا ہوتا ختم کردیں تاکہ توحید کی منطق کے بارے میں لوگوں کے لیے غور وفکر کی راہ کھول دیں اور احکامِ الٰہی لوگوں تک پہنچ جائیں اور لوگوں پر حجت تمام ہوجائے۔

ایک عمل منکر سے روکنا

ابتدائی جہاد کا ایک اور عامل ایک عمل منکر سے روکنا ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک انسانی قدر و قیمت کو پھیلانے کے لیے ہوتا ہے اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ:

اسلامی معاشرے میں آسمانی شرائع میں سے ہر ایک کے پیروکار مثلاً یہودی، عیسائی اور زرتشتی اپنے مذہب کے سنن وتعلیمات کے انجام دینے میں آزاد ہیں اور کسی فرد مسلمان کو ان سے معترض نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں صرف کچھ مالیات ''جزیہ'' کے عنوان سے، جو ان مالیات سے کئی درجہ کم ہیں جو مسلمان ادا کرتے ہیں ادا کرنا چاہیے اور یہ مالیات ان مختلف اور گوناں گوں خدمات کے لیے ہیں جو حکمت اسلامی ان کے اور دوسرے لوگوں کے لیے انجام دیتی ہیں۔

ان کی آزادی کا سبب یہ ہے کہ وہ جادہ توحید سے جو نوع بشر کے لیے سرنوشت ساز اور سعادت آفرین ہے منحرف نہیں ہوئے اور باوجود ان تمام بیہودگیوں کے جو بعد میں ان کی شریعت میں وارد ہوئی ہیں وہ اپنے آپ کو مواحد اور خدا پرست شمار کرتے ہیں۔

لیکن اسلامی معاشرے میں بت پرست قانونی طور پر نہیں رہ سکتا۔ اور حکومت اسلامی بت اور بت پرستی کو برداشت نہیں کرتی، اور اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنے ماحول اور معاشرے کو اس قسم کے منکر اور برے عمل کی گندگی سے جو انسان کو پتھر اور مٹی کے سامنے ذلیل وخوار بنادیتی ہے ___ پاک کردیتی ہے اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حریت وآزادی کے ساتھ جس کی اسلام منادی کرتا ہے جہاد کس طرح سے سازگار ہے۔

جواب

حقیقت یہ ہے کہ عقیدہ اور عمل میں انسان کی آزادی کے حدود کو واضح کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ انسان کس حد تک آزاد ہے تو اس بارے میں

اس بات پر توجہ کرنا چاہیے کہ انسان کے کام دو قسم کے ہیں:

ا۔ وہ کام جو اس کے شخصی سلیقہ اور مادی زندگی کے ساتھ مربوط ہیں تو مسلمہ طور پر ہر انسان اپنے لیے ایک ذوق اور سلیقہ رکھتا ہے اور ہر گز دو انسان ایسے نہیں مل سکتے جو سلیقہ کے لحاظ سے یکساں ہوں۔ انسانوں میں سے ہر ایک ایک خاص قسم کی آرائش کو پسند کرتا ہے اور ہر ایک اپنے لباس کے لیے کسی معین سلائی کو پسند کرتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان لباس کی طرز، نوع آرائش حصول علم اور کاموں کا سلسلہ، زوجہ اور شوہر کی خصوصیت اور انتخاب کرنے میں ایک سلیقہ رکھتا ہے جو اس کی مادی شخصی زندگی کے ساتھ مربوط ہے اور اس کے ساتھ مزاحم نہیں ہونا چاہیے اور یہ چیز عام طور پر اس کی سعادت وشقاوت، خوش بختی اور بدبختی اور اس کی معنوی وروحانی زندگی میں موثر نہیں ہے۔

۲۔ وہ کام جو اس کی سعادت داور خوش بختی کے ساتھ پورے طور پر مربوط ہیں اور ایک معین راستے کے انتخاب کے علاوہ باقی اس کی بدبختی کا سبب بن جاتے ہیں اس حصہ میں آزادی ممنوع ہے اور اس حصہ میں جاہل و نادان افراد کا ہاتھ کھلا نہیں رکھا جا سکتا۔ مثلاً نشہ آور مواد، ہیروئن، ایل ایس، ڈی، اور شراب۔ ان موارد میں سعادت بشر کی حفاظت اس کی آزادی کی حفاظت پر مقدم ہے مثلاً وہ معاشرہ جس میں ''وبا'' (کسی متعدی بیماری) کے جراثیم پیدا ہو جائیں تو نادان لوگوں کو ویکسین کے ٹیکہ لگوانے پر مجبور کرنا نہ صرف یہ کہ بری چیز نہیں ہے بلکہ ایک اچھا اور سو فیصد انسانی عمل ہے اور پوری دنیا میں صحت عامہ کے کسی بھی مامور کو اس قسم کے کسی بھی عمل کی وجہ سے افراد کی آزادی کے حریم میں متجاوز شمار نہیں کرتے۔

بت پرستی ان منکرات میں سے ہے جو انسان کی بدبختی کا سبب بنتی ہے۔ اور انسان کی سعادت کو خطرے میں ڈالتی ہے اس قسم کے منکر سے روکنا، اس کی سعادت کی طرف ایک قدم ہے اور اس قسم کا عاقلانہ اقدام اس کی آزادی کی حفاظت پر مقدم ہے کہ جس سے سوء استفادہ کرتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو بدبختی کے گرداب میں پھنسا ڈالا ہے۔

یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ غیر خدا کی پرستش، حقوق الٰہی پر ایک قسم کا تجاوز اور انہیں ضائع کرنا ہے اس قسم کے کسی منکر عمل سے مبارزہ کرنا ظلم اور خدائی حقوق پر تجاوز کرنے سے مبارزہ ہے۔

ہاں! اس مبارزہ کی حد اور اختتام بت اور بت پرستی کی بساط کا لپیٹا جانا ہے۔ لیکن عقیدہ توحید ایجاد کرنے کے لیے مبارزہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ مبارزہ اسی چیز کے لیے کیا جاتا ہے جس کا کرنا اور نہ کرنا انسان کے ہاتھ میں ہو، جب کہ کسی مذہب کا عقیدہ رکھنا کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے کہ اس کا جبر اور طاقت کے ذریعہ کسی کے ٹیکہ لگا دیا جائے ایسے موقع پر ہمیں عقل کی منطق اور حکیمانہ دعوتوں کے ذریعہ ـــــ جس کی قرآن نے ہمیں ہدایت کی ہے ـــــ پیروی کرنی چاہیے جیسا کہ فرماتا ہے:

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ؕ

''اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف دلیل وبرھان ار دلنشین پند ونصائح کے ذریعہ دعوت کرو اور ان کے ساتھ بہترین طریقہ سے بحث ومناظرہ کرو۔'' (نحل۔ ۱۲۵)

مُفسد کے ساتھ مبازرہ

اسلام اس لیے آیا ہے تا کہ روئے زمین میں عدالت و آزادی حقیقی وواقعی معنی کے ساتھ حقیقت بن جائے اور معاشروں میں صلح امنیت کی حکمرانی ہو۔

مسلمہ طور پر اس آسمانی پیغام کے عملی صورت اختیار کرنے کے لیے ایک طاقت وقدرت کے منبع کی ضرورت ہے کیونکہ خواہ نخواہ کچھ اشخاص ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جو شخصی نفع کی خاطر عدالت کو قبول نہیں کرتے اور وہ عمومی راحت و آرام اور امن وامان کو تباہ کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں اور اس طرح سے معاشرے میں فتنہ وفساد بپا کر دیتے ہیں۔ اسی بنا پر اجتماعی عدالت کے قیام کے لیے قدرت وطاقت کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ ان لوگوں کو جو حق کے راستے سے ہٹ گئے ہیں انہیں راہ راست پر واپس لائے۔ اور ظالموں کے ظلم اور سرکشوں کی دشمنی سے روکے اور عوام الناس کے لیے امن وامان اور صلح و آشتی کی حفاظت کرے۔

اسی لیے اسلام نے (مظہر قدرت) ''لوہے'' کا ترازوئے عدل کے ساتھ اور ترازوئے عدل کا کتاب اور وحی کے ساتھ نام لیا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾ (حدید)

''بے شک ہم نے اپنے رسول کھلی دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ عدالت پر قائم ہو جائیں۔ اور ہم نے لوہا نازل کیا جس میں سخت خوف بھی ہے اور لوگوں کے لیے نفع بھی تا کہ اللہ یہ جان لے کہ اس کی اور اس کے رسولوں کی بغیر دیکھے کون کون مدد کرتا ہے بے شک اللہ صاحب قوت اور غلبہ ہے۔''

انبیاء کرام حجت قاطع اور واضح دلیل کے ساتھ خدا کی طرف سے آئے ہیں تا کہ لوگوں کی راہنمائی کریں۔ جو لوگ صحیح عقل وادراک رکھتے ہیں وہ اسی برہان کی بنا پر پیغمبروں کی اطاعت کرتے ہیں اور نجات پاتے ہیں لیکن ہٹ دھرم اور عناد رکھنے والے اشخاص کے لیے یہ بات تو سہل ہے کہ وہ خود ایمان نہ لائیں۔ لیکن وہ تو اس عمومی خیر وصلاح کے لوگوں تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں۔ اور اپنی قوت وطاقت سے اس کے اور لوگوں کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں۔ یقیناً اس قسم کے لوگ نوع بشر کے سخت دشمن اور تمام افراد انسانی کے حقوق پر تجاوز کرنے والے ہوتے ہیں اور وہ خدا کے نام اور اس کے عمومی ارادہ کے مخالف ہیں۔

پس اس پتھر کو انسانی معاشرے کی سعادت کی راہ سے ہٹا دینا چاہیے تا کہ یہ عمومی خیر و برکت سب تک پہنچ سکے اور معاشرے میں عدالت مطلق اور امن و امان برقرار ہو چنانچہ ایک آیت مبارکہ میں خدا صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے۔

وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور عمومی نظم وضبط اور آرام وسکون کو تباہ کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل ہو جائیں یا سولی پر لٹکا دیئے جائیں یا ان کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں ایک دوسرے سے الٹی سمت میں کاٹ دیا جائے یا انہیں اس سرزمین سے جلاوطن کر دیا جائے یہ رسوائی تو ان کی دنیا کے لیے ہے اور آخرت میں ان کے لیے عظیم عذاب ہے۔[۱]

وہ لوگ جو واقعاً روئے زمین میں فتنہ و فساد کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ اسلام نے عوام الناس کو ان کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے سخت اور دردناک سزائیں مقرر کی ہیں۔

پس جب کوئی شخص سرکشی اور خودسری کی راہ اختیار کر لے اور عمومی امن وسکون کو تباہ و برباد کر دے اور معاشرے کے مصالح کے خلاف قدم اٹھائے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس کے ساتھ جنگ کریں اور اس کو حق کی طرف واپس لائیں اور اس حکم کے سامنے مسلمان اور غیر مسلمان یکساں ہیں۔

ہاں! اگر کوئی مسلمان بھی سرکشی وطغیانی اور بیدادگری کی راہ اختیار کرے اور عدل وانصاف سے دور ہو جائے تو وہ بھی حکم خدا کا مخالف ہے اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ اعلائے کلمہ توحید اور عدل وانصاف کو وسعت دینے کے لیے ایسے شخص کے ساتھ حسب ذیل صورت میں جنگ کریں۔

''اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں جنگ کریں تو ان کے درمیان صلح کرا دو، اور اگر ان میں سے ایک دوسرے پر تجاوز کرے تو تجاوز کرنے والے کے ساتھ جنگ کرو تا کہ وہ حکم خدا کی طرف پلٹ آئے، اگر وہ حق کی طرف آئے تو ان کے درمیان عدالت کے ساتھ اصلاح کرو اور انصاف کرو۔ خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔[۲]

جب اسلام مسلمانوں کو یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ اس مسلمان کے ساتھ جو ظلم وستم کی راہ اختیار کرتا ہے (ظلم کو ختم کرنے اور عدالت کو برقرار رکھنے کے لیے) مبارزہ کریں تو بلاشک وہ انہیں یہ حکم دے گا کہ وہ ہر قسم کے ظلم کو دفع کرنے کے لیے مبارزہ کریں اس شرط کے ساتھ کہ وہ خود کسی طرح بھی کسی قسم کے ظلم کے مرتکب نہ ہوں۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ﴿۱۹۰﴾

راہ خدا میں ان لوگوں کے ساتھ جو تم سے مبارزہ کرتے ہیں جنگ کرو۔ لیکن ظلم و جور کی راہ اختیار نہ کرنا کیونکہ خدا

---

[۱] مائدہ۔۳۳

[۲] سورہ حجرات آیت ۹۔

ستم گروں کو پسند نہیں کرتا۔"[۱]

اسلام صرف اس قسم کے عظیم انسانی اہداف کے لیے جنگ کو جائز سمجھتا ہے اور جہاد کے حکم کو عظیم شمار کرتا ہے۔ اور جہاد کرنے والے سربازوں کو اعلیٰ ترین درجاتِ شہادت اور جزا کی خوشخبری دیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ [۲]

"خدا نے مومنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے اس کے بدلے میں ان کے لیے جنت ہے وہ راہ خدا میں مبارزہ کرتے ہیں، پس وہ دشمن کو قتل کرتے ہیں یا قتل ہو جاتے ہیں، اور یہ خدا کا حق وعدہ ہے جو تورات، انجیل اور قرآن میں آیا ہے۔

اسلام صرف انہیں اعلیٰ اور انسانی اہداف کے لیے مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ دشمن سے جنگ کرنے کے لیے جنگی ساز و سامان سے آراستہ ایک طاقتور لشکر تیار کریں۔

یہاں تک ہم اسلام میں جہاد کے علل و اسباب سے ___ جو چار اسباب میں خلاصہ ہوتے ہیں ___ آشنا ہو چکے ہیں اور ان اسباب میں سے کوئی سبب بھی انسانوں کے طبعی حقوق کے برخلاف نہیں ہے اور مجاہدین کسی پر کوئی عقیدہ ٹھونسنے، اور کسی فرد کی آزادی سلب کرنے کے درپے نہیں ہوتے۔ بلکہ مقصد ان چاروں موارد میں ایسے موانع کو توڑنا اور ایسی رکاوٹوں کو دور کرنا ہے جو انسان کے ارتقاء و تکامل، اس کی حریت و آزادی اور طبیعی و فطری حقوق کی راہ میں حائل ہو گئی ہیں یا ایسے مفسدین اور اشرار کے شر کو دفع کرنے کے لیے ہوتا ہے جنہوں نے نظامِ اسلام کو نابود اور تباہ و برباد کرنے کے لیے قیام کیا ہو یا نظم و نسق اور آرام و سکون کو تباہ کیا ہو۔

---

[۱] سورہ بقرہ آیت ۱۹۰

[۲] سورہ توبہ آیت ۱۱۱

آیات جہاد کا اجتماعی صورت میں مطالعہ

اگر چہ ہم نے گذشتہ اوراق میں جہاد سے مربوط آیات پر جداگانہ طور سے غور تحقیق کی ہے لیکن چونکہ مجموع آیات سے اجتماعی طور پر اور ایک ہی جگہ بحث کرنا موضوع کو ایک خاص روشنی بخشتا ہے لہذا ہم موضوعِ جہاد میں وارد تمام آیات کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے، غور وفکر اور تحقیق کرتے ہیں۔

ا۔ وہ آیات جو بغیر قید وشرط جہاد کا حکم دیتی ہیں

کچھ آیات ایسی ہیں جو لوگوں کو کسی قید وشرط کے بغیر راہِ خدا میں جہاد کرنے کی دعوت دیتی ہیں ہم اس سلسلہ میں دونمونے پیش کرتے ہیں ایک مشرکین اور منافقین کے بارے میں جو حقیقتاً مشرک بھی تھے اور دوسرا (اہل کتاب) کلیم ومسیح کے پیروکاروں کے بارے میں۔

مشرکین کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۝٧٣ (توبہ)

''اے پیغمبر کافروں اور منافقین کے ساتھ جہاد کر، اور ان پر سختی کر، ان کی جگہ دوزخ ہے۔ اور وہ کتنا برا انجام ہے۔''

اور اہل کتاب کے بارے میں فرماتا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

(توبہ۔۲۹)

''اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے ساتھ، جو خدا اور روز جزا پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ ہی اس چیز کو حرام سمجھتے ہیں جسے خدا اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور نہ ہی دین حق کو قبول کرتے ہیں، جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے خضوع وتسلیم کے ساتھ جزیہ دینے لگ جائیں۔

پہلی آیت میں مشرکین سے جنگ کو اس حد تک تجویز کرتا ہے کہ وہ ختم ہو جائیں جبکہ دوسری آیت اہل کتاب کے ساتھ جنگ کو اس حد تک لازم

قرار دیتی ہے کہ وہ جزیہ دینے لگ جائیں دوسرے لفظوں میں پہلی آیت میں مشرک کے وجود کو قانونی طور پر تسلیم نہیں کرتا۔ جب کہ دوسری آیت میں اس بناء پر کہ اہل کتاب ایک آسمانی دین کی پیروی کرنے کے لحاظ سے مسلمانوں کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں اگر چہ ایک جہت سے وہ مشرکین سے بھی مشابہت رکھتے ہیں، ان سے جنگ کو اس حد تک کہ وہ جزیہ دینے لگ جائیں تجویز کرتا ہے اور ان کے لیے احکام کے ایک سلسلہ کا جو مسلمان اور مشرک کے درمیان حد وسط ہے قائل ہوتا ہے اور جزیہ ادا کرنے کی صورت انہیں قانونی طور پر تسلیم کرتا ہے۔

اس کے علاوہ دوسری آیت میں اہل کتاب سے جنگ کی علت جزیہ دینے کی حد تک تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ اور ذیل کی جہات کو ان سے جنگ کرنے کے علل واسباب سمجھتا ہے:۔

١۔ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے یہاں ایک سوال درپیش ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل کتاب ان دو بنیادی ارکان پر ایمانکس طرح نہیں رکھتے جبکہ وہ خود کو خدا پرست اور پیغمبروں کے پیروکار سمجھتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے ان کا ایمان صحیح اور خالص نہیں رہے بلکہ شرک سے آلودہ ہے یہودی ''عزیز'' کو خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں، اور عیسائی تین خداؤں کا اعتقاد رکھتے ہیں، قیامت پر ان کا ایمان بہت ہی تحریف شدہ ہے ان کے عقیدہ کے مطابق معاد صرف خالص روحانی ہے اس لحاظ سے وہ خدا اور قیامت پر ایمان نہ رکھنے والے گروہ میں شمار ہوئے ہیں۔

٢۔ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

وہ خدا اور اس کے پیغمبر کے حرام کردہ امور کو حرام شمار نہیں کرتے اگر ''رسولہ'' سے مراد ان کے پیغمبر حضرت کلیم وحضرت مسیح ہیں تو اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنی کتابوں کے محرمات، شراب ور با وغیرہ کو حرام نہیں سمجھتے۔ اور اگر اس سے مراد پیغمبر اسلام ہوں، تو پھر مقصد یہ ہے کہ وہ قرآن کے محرمات کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ چونکہ آیت میں لفظ ''رسول'' مفرد کی صورت میں آیا ہے لہٰذا مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کہ اس سے مراد پیغمبر اسلام ہیں اور اگر خود ان کے اپنے پیغمبر مراد ہوتے تو پھر ''ورسلھم'' کہنا مناسب تھا جیسا کہ ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے:۔

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ

(المائدہ:٣٢)

''ہمارے پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ ان کی طرف آئے۔''

٣۔ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ

وہ دین حق کو قبول نہیں کرتے ''دین الحق'' سے مراد وہی دین اسلام ہے، کیونکہ اسی سورہ کی آیت تینتیس ٣٣ میں فرماتا ہے۔

هُوَ الَّذِيٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ

(توبہ۔۳۳)

''وہی تو ہے کہ جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا۔''

قرآن ان تین دلائل کے ساتھ ان سے جہاد کو لازم شمار کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ:

اب جب کہ دینِ حق کے راستہ سے منحرف ہو گئے ہو اور خرافات کے ایک انبوہ نے سچے عقائد کی جگہ لے لی ہے اور تم اپنی فکر و ذہن کو ان خرافات سے پاک کرنے پر آمادہ و تیار نہیں ہو اور ایک طرف سے شراب و سود خوری، سور کا گوشت کھانے اور بہت سی بے قید و بند جنسی آلودگی نے تمہاری زندگی کے ماحول کو گھیرا ہوا ہے تو کم از کم مسلمانوں کے ساتھ ایک اقلیت کی صورت میں صلح و صفائی کے ساتھ رہو اور وہ یہ ہے کہ جزیہ ادا کر کے، جو تمہارے ہی مصالح میں صرف ہو گا، مسلمانوں کے ساتھ صلح و آشتی کی زندگی کا آغاز کرو۔

اور اگر تم خدا اور پیغمبرؑ کے بارے میں اپنے بیہودہ عقائد کو ترک کر دو اور گذشتہ ادیان سے متکامل اور ترقی یافتہ دین کے سامنے سر جھکا لو اور خود کو آلودگیوں سے پاک کر لو تو پھر تم دینی بھائی بن جاؤ گے اور ہر لحاظ سے دوسروں کے ساتھ یکساں اور برابر شمار ہو گے۔''

ا۔ جو تمہارے ساتھ جنگ کرے تم اس کے ساتھ جنگ کرو

آیات جہاد میں سے دوسری آیات وہ ہیں جو جہاد کو اس صورت میں واجب قرار دیتی ہیں جبکہ کوئی مسلمانوں کے ساتھ جنگ کا ارادہ رکھتا ہو، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَقَاتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡمُعۡتَدِيۡنَ ﴿۱۹۰﴾

(سورہ بقرہ)

''راہ خدا میں ان لوگوں کے ساتھ، جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں، جہاد کرو لیکن عدالت سے تجاوز نہ کرنا، خدا تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔''

اس آیت میں ایسے افراد سے جنگ کو لازمی بتایا گیا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں اور یہ خود ایک ''قید'' اور ''شرط'' ہے جو اس آیت میں وارد ہوئی ہے۔

۳۔ وہ گروہ جو اپنے عہد و پیمان کے پابند نہیں ہیں

آیات جہاد کا ایک حصہ ایسے گروہ کے ساتھ مربوط ہے جو اپنے عہد و پیمان کی کچھ بھی پابندی نہیں کرتے اور اس سلسلے میں جو آیات وارد ہوئی ہیں، ان میں سے واضح ترین آیات سورہ توبہ کی آیت ۸، ۱۰، ۱۳ ہیں۔ ہم نمونہ کے طور پر ان میں سے ایک کو نقل کرتے ہیں۔

كَيْفَ وَإِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ

(سورہ توبہ۔ ۸)

''تم ان کے ساتھ مبارزہ کیوں نہ کرو، اگر وہ تم پر مسلط ہو جائیں، تو وہ تمہارے حق میں اس عہد و پیمان کی جو انہوں نے باندھا ہے، رعایت نہ کریں۔''

اور اسی لیے، اسی سورہ میں، اس گروہ کا جو عہد و پیمان کے پابند ہیں ___ استثناء کر دیا ہے اور اجازت نہیں دیتا کہ ان سے جنگ کی جائے جیسا کہ فرماتا ہے:

الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (توبہ)

''مگر وہ لوگ جن کے ساتھ تم نے ''مسجد الحرام'' کے پاس عہد و پیمان باندھا ہے جب تک وہ اپنے عہد و پیمان پر ثابت قدم رہیں، تم بھی اپنے عہد و پیمان کو پورا کرتے رہو۔ خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔''

آیات کے اس حصہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے روشن ہو جاتا ہے کہ وہ آیات جو پہلے گروہ میں بطور مطلق مشرکین کے ساتھ جنگ کا حکم دیتی تھیں حقیقت میں ان سے مراد وہ مشرک تھے جنہوں نے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے عہد و پیمان باندھا تھا اور ان کا کوئی معنوی اور اخلاقی ہدف اور مقصد نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ قدرت و طاقت کا موقع ہاتھ آنے پر حملہ کریں اور اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

۴۔ مستضعفین کا دفاع

آیات کے اس حصہ میں ہمیں ایسے جہاد کی دعوت دی گئی ہے کہ جس میں خود ہماری یا ہماری قوم و ملت کی جان و مال خطرے خطرے میں نہیں ہوتے بلکہ ہم سے دور کا کوئی گروہ، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان، ظالموں کے زیرِ تسلّط ہے، اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان ستمگروں کے تسلط

سے باہر نکلیں اور ہم میں بھی جنگ کرنے اور اُن کا دفاع کرنے کی قدرت ہو۔ایسے موقع پر ہم پر لازم ہے کہ ہم حریم عدالت اور دباؤ میں آئے ہوئے انسانوں کے حقوق کا دفاع کریں۔جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيرًا ۝ (نساء)

تم خدا کی راہ میں اوران مردوں،عورتوں اور بچوں کے لیے جو (ستمگروں کے ہاتھوں) کمزور ضعیف بنا دیئے گئے ہیں جنگ کیوں نہیں کرتے وہی کہ جو یوں کہتے ہیں کہ خدایا ہمیں اس شہر (مکہ) سے جس کے رہنے والے ستم گر ہیں، باہر لے جا اور ہمارے لیے اپنی طرف سے سرپرست قرار دے اور ہمارے لیے اپنی طرف سے یاور ومددگار معین فرما۔''

اس آیت میں ''مستضعف'' کے بارے میں گفتگو ہے، نہ کہ ضعیف'' کے بارے میں۔دوسرا تو وہ شخص ہے جو کمزور وناتواں ہو لیکن مستضعف وہ ہے، جو ستم گروں کے مظالم کے زیر اثر،فکری وفرہنگی لحاظ سے، یا اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی لحاظ سے، یا اقتصادی طور پر،ضعیف وناتواں بنا دیا گیا ہو۔

اس قسم کا ایثار گرانہ جہاد بہترین قسم کا جہاد ہے کیونکہ اس میں انسان اپنے آپ کو اس لیے قربان کرتا ہے کہ دوسرا زندہ رہے، جان اور خون دیتا ہے تاکہ دوسرا زندہ ہو جائے۔اس سے بالاتر اور بہتر اور کونسا ایثار ہوگا۔

۵۔عقیدہ کے لیے مجبور کرنا منع ہے

اس حصہ میں ایسی آیات پیش ہوں گی جو ہر قسم کے عقیدہ کو دوسرے پر ٹھونسنے کے ممنوع ہونے کا اعلان کرتی ہیں۔کیونکہ کسی اصل پر اعتقاد رکھنے کے لیے کچھ مقدمات کی ضرورت ہے کہ جب تک وہ مقدمات حاصل نہ ہوں اس شئی کا اعتقاد وقوع پذیر نہیں ہو سکتا چاہے خود انسان اس کو چاہے یا باہر سے اس پر دباؤ ڈالیں۔

قرآن اس سلسلہ میں فرماتا ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔ (بقرہ۔۲۵۶)

''دین اور عقیدہ میں جبر اور زبردستی نہیں ہے۔''

یعنی جبر واکراہ بے فائدہ ہے مفسرین نے اس آیت کے شانِ نزول میں کچھ مطالب نقل کئے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ''ابوالحصین'' نامی ایک انصاری کے دو بیٹے ایک عیسائی تاجر کی تبلیغ سے متاثر ہوکر عیسائیت کی طرف مائل ہوگئے اور یہ کام ''ابوالحصین'' کے لیے بہت سخت تھا اور اپنے دل میں، پیغمبر کی خاموشی سے، کہ آپ انہیں گرفتار نہیں کرتے، ناخوش تھا کہ اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

چونکہ کسی اصل کے بارے میں اعتقاد رکھنے کے لیے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور بہت سے مقدمات کے بعد اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے اس لیے قرآن اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ:

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ ؕ

(نحل:۱۲۵)

''اپنے پروردگار کی راہ میں دلیل وبرہان اور نصیحت اور اچھے مواعظ کے ذریعہ دعوت کر، اور ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث ومناظرہ کر۔''

اور دوسری آیت میں فرماتا ہے۔

وَقُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ۟ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ ۙ

(کہف:۲۹)

''کہہ دے کہ حق خدا کی طرف سے (تمہارے لیے) آیا ہے پس جو شخص چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے۔''

اس سلسلہ میں اور آیات بھی ہیں جن میں افراد بشر کو دین حق کی طرف مائل ہونے کے لیے ایک طرح سے آزاد رکھا ہے اور وہ کسی ایک طرف پر اصرار نہیں کرتیں۔

آپ ان آیات کا سورہ یونس آیت ۹۹، اور شعراء آیت ۴ میں مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

۶۔ متقابل حقوق کی بنیاد پر صلح

کچھ اور آیات مسلمانوں کو حقوقِ متقابل اور حفظِ اصول کی بنیاد پر صلح وآشتی (نہ کہ ظلم کے سامنے سرتسلیم خم کرنے) کی دعوت دیتی ہیں، اور اس طرح کی نرمی کے اظہار سے، جو طرفین کے جان ومال کی محافظ ہو، اپنی انسانی خوبیوں کو ظاہر کرتی ہیں اور اس سلسلہ میں قانون کلی کے طور پر فرماتا

[1] مجمع البیان جلد ۱ ص ۳۶۳

ہے"والصلح خیر "(نساء۔۱۲۸) صلح اچھی اور عمدہ چیز ہے یہ آیت اگرچہ زوجہ وشوہر کے اختلاف کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے لیکن یہ ایک اصل کلی ہے جس سے دوسرے موارد میں بھی باحفظ شرائط کام لیا جاسکتا ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا

(انفال:۶۱)

"اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اپنی طرف سے تمائل دکھاؤ۔"

اوراس کے علاوہ فرماتا ہے

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۞ (نساء)

"اگر وہ ایک طرف ہٹ جائیں اور تم سے جنگ نہ کریں، اور تمہاری طرف صلح وآتشی کا ہاتھ بڑھائیں تو پھر خدا نے تمہارے لیے ان کے بارے میں حقِ تعرض قرار نہیں دیا ہے۔"

ان آیات میں انسانی صورت اور اسلامی شفقت اچھی طرح نظر آتی ہے۔ جہاد کی تمام آیات کا ملاحظہ کرنے کے بعد، خصوصاً ان چھ قسم کی آیات کو جو قیود وشروط کے ساتھ جہاد کی اجازت دیتی ہیں، مدنظر رکھتے ہوئے مقصود الٰہی کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔

فقہی قواعد کے مطابق آیاتِ مطلق، ان دوسری آیات کے ذریعہ، جو جہاد کا مشروط ذکر کرتی ہیں، مقید ہو جائیں گی۔

یہاں ایک نکتہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان چھ قسم کی آیات کے مطابق اسلامی جہادوں کی نوعیت دفاعی تھی اور ایک معنی کے لحاظ سے وہ ایک آزادی بخش پہلو رکھتے تھے کیونکہ پہلے گروہ کی آیات سے قطع نظر، دوسری آیات جہاد کو حریم جان ومال یا مستضعف انسانوں کے دفاع کے طور پر تجویز کرتی ہیں اور جہاد کو ایک قسم کی اجتماعی ضرورت قرار دیتی ہیں جو لوگوں کے جان ومال یا انسان سے متعلق قوم وملت یا زیرِ تسلط قوموں کے دفاع کی خاطر، یا تبلیغ دین کے نام سے مشروع اور جائز آزادیوں کا دفاع کرنے کے لئے انجام پاتا ہے۔ اگرچہ اقسام کے لحاظ سے وہ دفاعی اور ابتدائی اقسام میں تقسیم ہوتا ہے لیکن ان سب کی روح حق وحقیقت کا دفاع ہے۔

۲۔ قرآن میں ہجرت

قرآن اور احادیث اسلامی میں مہاجرت کا ایک خاص اہمیت کے ساتھ بیان ہوا ہے اور اس سے مقصود جیسا کہ بیان کیا جائے گا۔

ایمان کے بچانے دین کی حفاظت، اور وظائف الٰہی کی انجام دہی کے لیے ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف چلے جانا ہے، نہ کہ مال ودولت

کمانے اور مقام ومنصب حاصل کرنے کے لیے۔''

''ہجرت'' لغت میں کسی چیز سے کٹ جانے کے معنی میں ہے اب اگر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوجانے کو''مہاجرت'' کہتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مہاجر آدمی اپنے منتقل ہونے کے ساتھ راشتہ تعلق سابقہ جگہ سے کاٹ لیتا ہے۔

زندگی کے امور کی تکمیل یا دوسرے مادی مقاصد کے لیے ہجرت کرنا، جسمانی مہاجرت ہے اور اگر انسان اس طریقہ سے کوئی مادی مقصد حاصل کرے تو اس نے مادی کمال حاصل کیا ہے جب کہ قرآن کی رو سے مہاجرت جسم وروح کا ایک ساتھ منتقل ہونا ہے۔ اس معنی میں کہ جسم تو اپنا مکان اور جگہ بدلتا ہے اور روح شرک سے توحید، کفر سے ایمان، گناہ سے اطاعت اور انجام فرائض پر قدرت نہ ہونے سے انجام فرائض کی قدرت کی طرف پرواز کرتی ہے۔

پہلی مہاجرت میں جسم اپنا رشتہ اور تعلق ایک خاص جگہ سے منقطع کرلیتا ہے جبکہ دوسرے معنی والی مہاجرت میں نہ صرف یہ کہ جسم اپنا رشتہ وتعلق ایک خاص جگہ سے منقطع کرلیتا ہے بلکہ روح بھی ایک تنگ وتاریک اور وحشت ناک جگہ سے جس میں وہ اپنے دین وایمان کی حفاظت پر قادر نہیں ہے یا فرائض کے انجام دینے کی قدرت نہیں رکھتی، ایک وسیع فضا جس میں معنویت کے لحاظ سے کوئی کمی نہیں ہے منتقل ہوجاتی ہے اور وہاں اپنا آشیانہ بناتی ہے۔

جیسا کہ پیغمبر گرامی اسلام نے فرمایا ہے:

''المهاجر من هجر ما حرّم الله عليه۔''۔ [1]

''مہاجر وہ ہوتا ہے جو حرام وگناہ سے ہجرت اور دوری اختیار کرے۔''

اور اس قسم کی ہجرت کے بارے میں اس بحث کے آخر میں ہم ایک مختصر سی گفتگو کریں گے:

اس بناء پر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں مسئلہ''مہاجرت'' کو ایک خاص اہمیت دی گئی ہے یہاں تک کہ''ہجرت'' اپنے تمام مشتقات کے ساتھ چوبیس ۲۴۔ مرتبہ قرآن میں وارد ہوا ہے۔ [2]

عام طور پر جب بھی''ہجرت'' کی بات ہوتی ہے تو اذہان پیغمبر کی مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ کی طرف مہاجرت کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں اور پیغمبر کے اس تاریخی سفر کو جو بہت ہی فائدہ منداور قابلِ قدر تھا نظر میں لے آتے ہیں، اور وہ تاریخ اسلام کے سینکڑوں واقعات میں سے اس عظیم اثر کی وجہ سے جو اس میں پایا جاتا ہے مسلمانوں کی تاریخ کا مبدءو آغاز بن گیا ہے۔

---

[1] جامع الاصول ج ا ص ۱۵۴

[2] اس کا اجمال یہ ہے کہ لفظ''هاجروا''۹ مرتبہ، لفظ''المهاجرين''۵ مرتبہ، لفظ''يهاجروا''۳ مرتبہ لفظ''مهاجراً''۲ مرتبہ لفظ''يهاجر'' ایک مرتبہ لفظ''هاجر'' ایک مرتبہ لفظ هاجرن۔'' ایک مرتبہ لفظ''مهاجرات'' ایک بار اور لفظ''تهاجروا'' ایک بار، وارد ہوئے ہیں اور المعجم میں ان الفاظ کے مواقع معلوم ہوجائیں گے۔ اس بحث میں ان آیات کے ایک حصہ پر غور ہوگا۔

لیکن اس بات کو ذہن میں لانے کی طرف سبقت کرنا ہمارے ذہن کے اُنس کی وجہ سے ہے اور ''ہجرت'' سے مقصود ہرگز یہ خاص مصداق نہیں ہے، بلکہ ہجرت ایک اصل آسمانی سنت ہے جس کے نمونے ہم گذشتہ پیغمبروں میں مشاہدہ کرتے ہیں اب ہم اپنی بحث کا یہاں سے آغاز کرتے ہیں۔

ا۔ قرآن میں مہاجرین

مقصد کے حصول کی راہ میں ہجرت اور جہاد، اسلام کے اجتماعی اصولوں میں سے دو محکم اصول ہیں، جو قرآنی آیات میں کئی مواقع پر ساتھ ساتھ وارد ہوئے ہیں۔

مہاجرت، مقصد کی طرف بڑھنا ہے ''جبکہ جہاد'' اس ہدف ومقصد کے حصول کی ہر رکاوٹ کو دور کرنا ہے۔

ایک خدائی فرد کا ہدف ومقصد ''اللہ'' کی حکومت کو تمام شئونِ زندگی میں وسعت دینا۔ اور ہر قسم کی غیر الٰہی حکومت کو ختم کرنا ہے۔ چونکہ اس ہدف اور مقصد کے حصول کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہوتی ہیں جن کو دور کرنا، طاقت کے استعمال کے بغیر ممکن نہیں ہے، (رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے ہر قسم کی کوشش کو ہی جہاد کہتے ہیں) اسی لیے زندگی بھر ایک باایمان فرد کا نعرہ ''ہجرت'' اور ''جہاد'' ہے۔

جیسا کہ فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓٮِٕكَ يَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ ؕ (بقرہ:۲۱۸)

''وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے ہجرت کی اور راہِ خدا میں جہاد کیا، وہ خدا کی رحمت کے اُمیدوار ہیں۔''

چونکہ یہ دونوں ارکان ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہونے کی صورت میں اہداف الٰہی کی تکمیل کے سلسلہ میں اہم اثر رکھتے ہیں، اس لیے قرآن پانچ مواقع پر[1] ہجرت کے بارے میں گفتگو کرنے کے بعد بلافاصلہ راہ خدا میں جہاد کے مسئلہ کو پیش کرتا ہے۔ ہم اس حقیقت کو پیغمبر گرامی، امیر المومنین، تمام آئمہ کی زندگی میں واضح طور پر بخوبی مشاہدہ کرتے ہیں پیغمبر اور امیر المومنین کا جہاد مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد، یا حسنؑ بن علیؑ اور حسینؑ ابن علی (علیہم السلام) کا جہاد، مدینہ سے کوفہ کی طرف ہجرت کے بعد ان دونوں اصولوں کی ہم آہنگی کی اہمیت کو بیان کرتا ہے اس طرح سے کہ ان میں سے ایک دوسرے کے ساتھ ملے بغیر چنداں مؤثر نہیں ہے۔

[1] سورہ بقرہ آیت ۲۱۸۔ سورہ انفال آیت ۷۲، ۷۴، ۷۵۔ سورہ توبہ آیت ۲۰

آسمانی پیغمبرؐ اور ہجرت

آسمانی رہبروں کی زندگی کی تاریخ اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جب بھی وہ ماحول کو تبلیغ کے مناسب نہیں دیکھتے تھے یا وہ اپنی جان اور مقصد کے لیے خطرہ محسوس کرتے تھے، تو وہ اپنے ماحول کو کسی مناسب جگہ کے حصول کے لیے ترک کر دیتے تھے۔
یہ صرف پیغمبر اسلام ہی نہیں ہیں۔ جنہیں مکہ کی گھٹن نے اپنی جائے ولادت کو ترک کرنے اور مدینہ چلے جانے پر آمادہ کیا، بلکہ مہاجرت عقل و خرد کی رو سے ایک سنت الٰہی ہے جس سے پیغمبروں کے ایک گروہ نے فائدہ اٹھایا ہے اور قرآن نے ان کی سرگذشت کو بیان کیا ہے۔ ہم بھی اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہیں۔

الف حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید کے ہیرو

ابراہیم خلیل الرحمن شاید پہلے پیغمبر ہیں جنہوں نے مناسب ماحول میں اپنی رسالت کو پھیلانے کے لیے اپنی جائے ولادت کو ترک کیا۔ انہیں بتوں کو توڑ کر شرک و بت پرستی کے ساتھ مبارزہ کرنے کی وجہ سے سخت سزا دی گئی تھی۔ لطف الٰہی نے دشمن کے چنگل سے نجات دی، اور چونکہ آپ نے ''بابل'' کے ماحول کو توحید کا بیج بونے کے لیے مناسب نہ سمجھا، لہٰذا مہاجرت کا ارادہ کیا اور اپنی قوم کو اپنے ارادہ سے آگاہ کیا۔
جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

وَاَعۡتَزِلُكُمۡ وَمَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَاَدۡعُوۡا رَبِّىۡ ۖ عَسٰٓى اَلَّاۤ اَكُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّىۡ شَقِيًّا ﴿۴۸﴾ فَلَمَّا اعۡتَزَلَهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلۡنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾ (مریم)

''میں تم سے بھی اور ان بتوں سے بھی جنکی تم پرستش کرتے ہو، دوری اختیار کرتا ہوں۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں اور یہ اُمید رکھتا ہوں کہ وہ مجھے محروم نہیں کرے گا۔ جس وقت اس نے اپنی قوم سے اور ان بتوں سے کہ جن کی وہ خدا کے بجائے عبادت کیا کرتے تھے دوری اختیار کر لی، تو ہم نے بھی اپنے لطف و رحمت سے اسے اسحٰق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عطا کیا، اور انہیں شرف نبوت سے سرفراز کیا۔''

قرآن ایک آیت میں ابراہیم کی مہاجرت کی طرف پھر اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

قَالُوا ابۡنُوۡا لَهٗ بُنۡيَانًا فَاَلۡقُوۡهُ فِى الۡجَحِيۡمِ ﴿۹۷﴾ فَاَرَادُوۡا بِهٖ كَيۡدًا فَجَعَلۡنٰهُمُ

الْاَسْفَلِيْنَ ۝۹۸

وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝۹۹ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰۰ (صافّات)

''اس کی قوم نے کہا اس کے لیے ایک آتش خانہ بناؤ اور اُسے آگ میں ڈال کر جلا دو۔ انہوں نے تو اُسے جان سے مار ڈالنے کا ارادہ کیا۔ اور ہم نے انہیں ذلیل و پست کر کے رکھ دیا (اور ان کی سازشوں کو نقش بر آب کر دیا)

اور ابراہیمؑ نے ان سے کہا، میں تو اپنے رب کی طرف چلا جاؤں گا وہی میری ہدایت کرے گا بارالٰہا! مجھے فرزند صالح عطا فرما۔''

مفسرین کہتے ہیں کہ دونوں سورتوں کی آیات میں ابراہیم کی بابل سے ''ارضِ مقدس'' کی طرف ہجرت کو بیان کیا گیا ہے آپ نے اپنی بیوی اور ''لوط'' کے ساتھ شام کی طرف ہجرت کی۔ وہ دوسروں کو (جوان کے پیرو ہو گئے تھے) ہجرت کا شوق دلانے اور اپنے دشمنوں کی آنکھوں کے اندھا ہی رہنے کے لیے کہتے ہیں ''سیھدین'' میرا خدا اس مقصد میں میری مدد اور رہنمائی کرے گا۔

اور اس بناء پر کہ پردیس میں اکیلے نہ رہیں خدا نے انہیں دو فرزند (بیٹا اور پوتا) عطا کئے اور ان دونوں کو نبی بنایا، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝۴۹ (مریم)

''ہم نے اُسے اسحاقؑ و یعقوبؑ عطا کئے اور دونوں کو شرف نبوت عطا کیا[1]

(ب) حضرت لوط علیہ السلام

یہ خدائی پیغمبر ابراہیم کے بھانجے تھے وہ پہلے شخص ہیں جو ابراہیمؑ پر ایمان لائے۔ لوط نے بھی چونکہ بابل کے ماحول کو جو موجودہ ملکِ عراق میں واقع تھا ___ مناسب نہ سمجھا تو اپنا معاملہ اپنی قوم سے جدا کر لیا۔

قرآن ان کے بارے میں اس طرح کہتا ہے۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲۶

(عنکبوت)

''لوط ابراہیم پر ایمان لائے اور کہا میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرتا ہوں، وہ عزیز و حکیم ہے۔''

---

[1] مجمع البیان، ج ۳ ص ۵۱۷ و ج ۴ ص ۴۵۱

(ج) ## حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السّلام

وہ فرعون کی حکومت کے مظالم کو دیکھتے تھے، ہمیشہ ان پر تنقید کرتے تھے اور مستضعفین کو متکبرین کے خلاف ابھارتے تھے آخر کار موسیٰ کی نمایاں کارگذاریوں نے، ''فلن اکون ظیرأللمجرمین'' (قصص ۱۷) (میں ہرگز گنہگار لوگوں کی مدد نہیں کروں گا) کے نعرے کے ساتھ فرعون کی حکومت کو وحشت میں ڈال دیا۔ اور مصر کی جابر حکومت نے ان کے قتل کا منصوبہ بنالیا۔ لیکن ایک نیک جوان نے جو خود فرعون کی حکومت کا ایک رکن تھا، اور باطنی طور پر موسیٰ پر ایمان رکھتا تھا اور تقیہ کے پردے میں زندگی بسر کرتا تھا، موسیٰ کو فرعونیوں کے منصوبہ سے آگاہ کردیا اور ان سے کہا:

اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۲۰﴾

(قصص)

''فرعون کے درباری تیرے بارے میں یہ مشورہ کررہے ہیں کہ تجھے قتل کردیں جتنا جلدی ہو سکے مصر سے نکل جاؤ میں تیرا خیرخواہ ہوں۔''

موسیٰؑ نے اس خطرناک منصوبہ سے آگاہ ہونے کے بعد مصر کو چھوڑ دینے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ قرآن ان کی مہاجرت کی سرگذشت کا اس آیت سے آغاز کرتا ہے۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۱﴾

(قصص)

''موسیٰ خوف و وحشت کی حالت میں مصر سے مدین کی طرف روانہ ہوئے اور کہا خدایا! مجھے ستم گر قوم کے شہر سے نجات دے۔''

اس کے بعد قرآن سورہ قصص میں مدین کی طرف مہاجرت کے بعد کے واقعات کو بیان کرتا ہے، جن کے بیان کرنے کی یہاں پر ضرورت نہیں ہے۔

کچھ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالحؑ اور شعیبؑ نے بھی اپنی قوم کی نابودی کے بعد اپنی زندگی کے ماحول کو چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے کی طرف ہجرت کی تھی، اگرچہ وہ آیات جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں مہاجرت کی اصطلاح کے مفہوم میں کچھ زیادہ صراحت نہیں رکھتیں، اور ہم آئندہ اصحابِ کہف کی مہاجرت کے سلسلہ میں کچھ بیان کریں گے۔

اس مہاجرت کا مبدء اور مقصد کیا ہے؟

اس میں شک نہیں کہ ہجرت کا مبدء انسان کا گھر اور جائے ولادت ہوتا ہے جو ایک امر عادی کی صورت میں جلوہ نما ہوتا ہے لیکن تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ اس سفر کا مقصد ایک معنوی اور الٰہی امر ہوتا ہے مثلاً وہ شخص جس نے پیغمبر اکرم کے زمانہ میں شرک کی زمین کو مسلمانوں کی صفوں میں داخل ہونے کے لیے ترک کیا ہے تو ظاہر میں تو اس نے ایک سرزمین کو دوسری سرزمین میں داخل ہونے کے لیے چھوڑا ہے لیکن معنوی لحاظ سے ایسا شخص جتنا بھی مدینہ سے نزدیک ہوتا جاتا تھا اس کا خدا اور رسول کے ساتھ قرب بڑھتا جاتا تھا، اور اس کا مدینہ میں پہنچ جانا رحمتِ حق اور اس کے وسیع لطف میں داخل ہونا تھا اسی وجہ سے قرآن کی تمام آیات میں ہجرت کا مقصد، خدا اور اس کے رسول کو بتایا گیا ہے جن میں سے کچھ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

ابراہیمؑ کہتے ہیں۔

"ذھب اِلیٰ ربّی"۔ "میں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوں۔"

لوط کہتے ہیں

"انّی مھاجر الیٰ رَبِّی۔" "میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کر رہا ہوں۔"

قرآن ایک مقام پر ہدف کو "الی اللہ" دوسرے مقام پر "فی اللہ" تیسرے مقام پر "فی سبیل اللہ" اور چوتھے مقام پر "فی سبیلی" بتاتا ہے اور ان سب سے یہی پتہ چلتا ہے کہ اس سفر میں مقصد ایک امر معنوی ہے نہ کہ مادی۔ اور ہم ان موارد کو ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

① وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ (نساء۔۱۰۰)

جو شخص اپنے گھر سے خدا کی طرف ہجرت کرے اور اس راہ میں اُسے موت آ جائے تو اس کا اجر اور جزا خدا کے ذمہ ہے۔

② وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ (نحل۔۴۱)

"جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد راہ خدا میں ہجرت کی ہم انہیں دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے۔"

③ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا

حَسَنًا ط

(حج۔۵۸)

''جنہوں نے خدا کی رضا حاصل کرنے کیلئے وطن چھوڑا، پھر وہ اسی راہ میں قتل کر دیئے گئے یا مر گئے، تو خدا جنت میں ان کو اچھی روزی نصیب کرے گا۔''

④فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ

(آلِ عمران۔۱۹۵)

جنہوں نے اپنے وطن کو چھوڑا، یا انہیں وطن سے نکال دیا گیا اور انہیں میری راہ میں اذیت دی گئی ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی ہجرت خدا کی عبادت اور خدا کے قرب کا سبب ہے اور انسان اس کو خدا کے حساب میں شمار کر سکتا ہے۔

دو قسم کے مقصد

پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں اسلام کے پھیل جانے کے بعد کچھ لوگ اپنا گھر بار اس لیے چھوڑ دیتے تھے تا کہ جہاد میں شرکت کے ذریعہ مال وثروت حاصل کریں اور ضمناً اپنے آپ کو مہاجر بھی شمار کریں۔ پیغمبرؐ گرامی نے اپنی ایک تاریخی حدیث میں اس قسم کے لوگوں کو آشکار کر دیا۔ اور مہاجر کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ تو وہ ہے کہ جن کا مقصد خدا اور اس کا رسول ہیں اور ایک گروہ وہ ہے کہ جن کا مقصد مال دنیا اور جنسی لذت کا حصول ہے اور ان میں سے ہر ایک آخر کار اس مقصد تک کہ جس کے لیے اس نے ہجرت کی تھی پہنچ گیا۔ پیغمبرؐ نے ان دونوں گروہوں کے بارے میں اس طرح فرمایا ہے:

الاعمال بالنيات وكل امرئ مانوى فمن كانت هجرته الى الله ورسوله فهجرته الى الله ورسوله ومن كانت هجرته لدنيا يصيبها اوامرأة يتزوجها فهجرته الى ماهاجر اليه۔" [1]

''ہر عمل کا حساب اس کی نیت کے ساتھ وابستہ ہے اور ہر انسان نے جس بات کی نیت کی ہے، وہ اسے حاص کرے گا جس شخص نے خدا اور اس کے رسول کیلئے وطن چھوڑا تو اس کی ہجرت تو خدا ورسول کیلئے ہے (اور اسے اس کی جزا ملے گی) اور وہ شخص کہ جس کی ہجرت دنیا کے حصول کیلئے ہو، یا کسی عورت کیلئے ہو کہ اس سے شادی کرے

---

[1] صحیح بخاری ج۱ ص۱۶

'تو اس کی ہجرت کا نتیجہ وہی ہے کہ جس کیلئے اس نے ہجرت کی اور وہ خدا سے کسی چیز کا طلب گار نہیں ہے۔

(د) غار والے جواں مرد

یہ صرف آسمانی پیغمبر مثلاً ابراہیمؑ، لوط اور موسیٰ ہی نہیں تھے کہ جنہوں نے ایک خاص وقت پر جلاوطنی اختیار کی اور اپنی جائے ولادت کو ایمان کی نجات اور سنن الٰہی کی ادائیگی کیلئے چھوڑ دیا۔

بلکہ قرآن کچھ اور پاک دل اور پاکباز افراد کا ذکر بھی کرتا ہے جو حفظ دین کیلئے گھر بار وزندگی، بیوی بچوں اور ہر چیز سے دست بردار ہو گئے اور ایک غار میں جا کر پناہ گزین ہو گئے اور آخر کار ایک حیرت انگیز سرنوشت سے روبرو ہوئے۔ یہ گروہ اگرچہ سن وسال کے لحاظ سے جوان نہیں تھا لیکن قرآن انہیں ''الفتیۃ'' کے نام سے یاد کرتا ہے گویا وہ ضمیر کے لحاظ سے پاک وروشن ضمیر جوان تھے اور طرز کار کے لحاظ سے جوانمرد تھے جنہوں نے دلوں میں نہال توحید کی حفاظت کیلئے اور وظائف وفرائض کو نانجام دینے کی خاطر مہاجرت کی تکالیف برداشت کیں۔[1]

قرآن ان کے تعارف میں اس طرح کہتا ہے:

اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ﴿١٠﴾ (کہف)

''جب اس گروہ نے غار میں پناہ لی اور وہ وہاں پر چھپ گئے تو انہوں نے کہا: پروردگارا!
ہم پر اپنی رحمت نازل فرما اور ہماری رشد وہدایت کا وسیلہ فراہم کر دے۔''

خدا نے ان کی دعا کو قبول کر لیا، اور اس سلسلہ میں اس طرح فرمایا:

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿١٣﴾ (کہف)

''وہ ایسے جوانمرد تھے جو اپنے خدا پر ایمان لائے تھے اور ہم نے بھی ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا تھا۔''

ان لوگوں کے تکامل وارتقاء کے وسیلہ کی تکمیل اور ان کی ہدایت میں اضافہ کرنا کہ جو تکامل وارتقاء کی راہ میں قدم بڑھاتے ہیں اور ہدایت ورہنمائی کے طلب گار ہوتے ہیں خدا کی ایک یقینی سنت ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ (عنکبوت:٦٩)

---

[1] تفسیر برھان ج ۲ ص ۴۵٦ میں اس سلسلہ میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ امام باقرؑ نے ایک شخص سے پوچھا کہ ''فتی'' کسے کہتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک ''فتی'' جوان کو کہتے ہیں۔ امام نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اصحاب کہف تو سب کے سب بوڑھے تھے خدا نے انہیں ''فتیۃ'' کہا ہے جوانمرد وہ ہے جو ایمان لائے اور پرہیزگار ہو۔

''جو لوگ اپنی ہدایت کے سلسلہ میں کوشش کرتے ہیں، ہم انہیں اپنی راہوں کی ہدایت کردیتے ہیں۔

اب انسان خود سے سوال کرتا ہے کہ ان جوانمردوں کی مہاجرت کا سبب کیا تھا، انہوں نے بیابان کا رخ کیوں کیا، اور آخر میں ایک غار میں جا کر پناہ کیوں لی، قرآن اس راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے فرماتا ہے:

وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مِرْفَقًا ﴿١٦﴾ (کہف)

''انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: اب جبکہ تم نے ان مشرکین اور ان کے باطل خداؤں سے دوری اختیار کر لی ہے تو آؤ پہاڑ کی غار میں پناہ گزین ہو جائیں۔ اگر تم نے ایسا کیا تو خدا تم پر اپنی رحمت کو وسیع کر دے گا۔ اور تمہارے کام کے اسباب حلال روزی کے ساتھ مہیا کر دے گا''

آیت کے مضمون اور اس کے شان نزول پر غور کرنے سے پورے طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ برسر اقتدار مشرک اس قدر مسلط تھے کہ وہ لوگوں کو باطل خداؤں کی عبادت پر مجبور کرتے تھے اور توحید کی طرف مائل ہونے سے روکتے تھے۔ لہٰذا اس گروہ نے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ دیکھا کہ بیابان کی طرف نکل کھڑے ہوں اور کسی غار میں جا کر پناہ لے لیں، یہاں تک کہ ان کی سرنوشت کا تعین ہو۔

وہ الطاف الٰہی سے اتنے مطمئن تھے کہ ایک دوسرے سے یہ وعدہ کر رہے تھے کہ اگر ہم اس مشرک گروہ کو چھوڑ دیں گے تو ہم خدا کی رحمت کے سائے میں آ جائیں گے اور خدا زندگی کے اسباب فراہم کر دے گا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہم وحی کی زبان سے دوسری آیات میں بھی سنتے ہیں اور ہم اس بارے میں ''مہاجرین'' کے بارے میں غیبی امدادوں کے عنوان کے ماتحت بحث کریں گے۔''

۳۔ ہجرت بعض حالات میں فرض ہے

پیغمبر اکرم کی ہجرت کا سبب اپنی جان کی حفاظت اور اسلام کے پیغام کی تبلیغ کے لیے آزاد ماحول کا حصول تھا، کیونکہ مکہ کا گھٹن سے پر ماحول پیغمبر کو اس امر کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اپنی خدائی رسالت کی تبلیغ کریں، توحید و خدا پرستی کو پھیلائیں اور انسانوں کو شرک کی دلدل سے باہر نکالیں۔ اور جب انہیں عالمِ غیب سے یہ خبر ملی کہ توحید کے دشمنوں نے آپ کی جان کا قصد کیا ہے تو آپ خدا کے حکم سے اپنی جائے ولادت کو چھوڑ کر ''یثرب'' کی طرف چل پڑے۔ ذیل کی آیت میں اسی واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴿٣٠﴾ (انفال)

اس وقت کو یاد کرو جب کافر گروہ یہ سازش کر رہا تھا کہ تجھے قید کرلیں، یا قتل کر ڈالیں، یا تجھے تیری جائے ولادت سے باہر نکال کھڑا کریں۔ وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے۔ اور خدا نے بھی تدبیر کی اور خدا بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔''

قرآن ایک دوسری آیت میں بھی پیغمبر کی مہاجرت کی طرف اشارہ کرتا ہے، جہاں فرماتا ہے:

اِلَّا تَنۡصُرُوۡهُ فَقَدۡ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذۡ اَخۡرَجَهُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ثَانِىَ اثۡنَيۡنِ اِذۡ هُمَا فِى الۡغَارِ اِذۡ يَقُوۡلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلَيۡهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوۡدٍ لَّمۡ تَرَوۡهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا السُّفۡلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الۡعُلۡيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۝ (توبہ)

''اگر تم اس کی مدد نہیں کرتے تو خدا اس کی مدد کرے گا۔ جیسا کہ اُس نے اس کی اُس وقت مدد کی جب کافروں نے اسے مکہ سے اس حال میں نکالا تھا۔ کہ وہ دو میں سے دوسرا شخص تھا (اور ایک آدمی کے سوا اور کوئی ان کے ساتھ نہیں تھا) جب وہ دونوں غار میں تھے جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا، غم نہ کھا خدا ہمارے ساتھ ہے۔ اس موقع پر خدا نے اپنا سکون اس پر نازل کیا اور اس کے ایسے لشکروں کے ساتھ مدد کی جنہیں تم دیکھتے نہیں تھے۔ کافروں کی بات نیچے کر دکھائی اور خدا کے دین وآئین کو اوپر اور کامیاب کیا۔ اور خدا عزیز و حکیم ہے۔''

قرآن ایک تیسرے مقام پر پیغمبر کی ہجرت کو ایک دوسرے طریقے سے بیان کرتا ہے۔

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ هِىَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنۡ قَرۡيَتِكَ الَّتِىۡۤ اَخۡرَجَتۡكَ ۚ اَهۡلَكۡنٰهُمۡ فَلَا نَاصِرَ لَهُمۡ ۝ (محمد)

''کتنے ہی علاقے ایسے تھے جن کے لوگ اس شہر کے لوگوں سے جنہوں نے تجھے اس سے باہر نکالا ہے۔ زیادہ طاقتور تھے ہم نے انہیں نابود کر ڈالا اور ان کا کوئی بھی مدد کرنے والا نہیں تھا۔

ان تینوں آیات پر غور و فکر، جو پیغمبر کی مدینہ کی طرف ہجرت کو بیان کر رہی ہیں، ہمیں ذیل میں بیان کردہ نکات سے آگاہ کرتا ہے۔

اولا

جو شخص خدا کے لیے اور معنوی اور الٰہی اہداف کی حفاظت کے لیے وطن کو چھوڑتا ہے توحید و دین کے دشمنوں کی طرف سے اس کے خلاف جو سازش

اور منصوبہ بنایا جاتا ہے۔ وہ خدا کی عنایات کے ذریعے ناکارہ ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین

''ان کی سازش اور حیلہ بازی مہاجر کونابود کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

لیکن ان کے مقابلہ میں الطافِ الٰہی ان کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ اگر قرآن ان کے باطل منصوبوں کو نابود کرنے کو ''مکر'' کہتا ہے تو یہ ان سے مقابلہ کی بنا پر ہے چونکہ کافروں کا کام مکروحیلہ ہے۔ اسی لیے خدا نے اپنی تدبیر کو ''مکر'' کہا ہے جب کہ اس کی حقیقت مکر نہیں ہے بلکہ ان کی شیطانی سازشوں کو نابود کرنا ہے اور اس قسم کی گفتگو کرنے کو علماء بلاغت کی اصطلاح میں ''مشاکلہ'' کہتے ہیں جو تمام زبانوں میں رائج ہے۔

دوسری آیت یہ بتاتی ہے کہ خدا صرف مہاجرین کے دشمنوں کے منصوبہ کو نابود ہی نہیں کرتا۔ بلکہ مہاجر کو (سکونِ قلب عطا کرکے اور غیبی لشکروں کے ساتھ اس کی مدد کرکے) اپنے لطف وکرم کے سایے میں لے لیتا ہے، اور اس قسم کے لطف ورحمت کی طرف دوسری آیت میں ''فانزل اللہ سکینۃ علیہ وایدہ بجنود لم تروھا۔ کے جملہ سے اشارہ ہوا ہے۔

آخرکار تیسری آیت یہ بیان کرتی ہے کہ شیطانی قوتیں اور طاقتیں چاہے جتنی بھی قوی اور طاقتور کیوں نہ ہوں حق وعدالت کی منادی کرنے والوں اور خدائی سفیروں کے مقابلہ میں ان کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں جیسا کہ مکہ کی ابوجہلی اور ابوسفیانی قدرتوں کی تو کچھ حیثیت ہی نہیں ہے بلکہ ان سے کہیں زیادہ طاقتور گروہ ہلاک ونابود ہوگئے اور کوئی بھی ان کی مدد کو نہ آیا اور خدا اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ⑬ (محمد)

مفسرین بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر نے مدینہ کی طرف اپنی ہجرت کے موقع پر اثناء راہ میں (جحفہ کے مقام پر) دل ہی دل میں اپنی جائے ولادت کو یاد کیا تو اچانک وحی نے انہیں قطعی طور پر خوشخبری دی کہ خدا تجھے اس سرزمین کی طرف دوبارہ لوٹائے گا۔ اور یہ غیبی خوشخبری ہجرت کے ساتویں سال پوری ہوئی اور پیغمبر ایمان لانے والے لوگوں کے ایک گروہ کے ساتھ خدا کے گھر کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے، درانجالیکہ مکہ پر مشرکوں کی حکومت تھی......اور مکہ میں تین دن ٹھہرنے اور مراسم عمرہ انجام دینے کے بعد مدینہ کی طرف لوٹ گئے پھر آٹھویں سال بھاری لشکر کے ساتھ شرک کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا اور سپاہ توحید کے ساتھ شہر توحید میں وارد ہوئے ذیل میں بیان کردہ آیت اسی خوشخبری کو بیان کر رہی ہے:

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَاۗدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ۭ

(قصص۔۸۵)

''وہ ذات کہ جس نے قرآن کی تبلیغ کو تجھ پر واجب کیا ہے تجھے تیرے وطن کی طرف ضرور واپس پلٹائے گی۔''

اثناء راہ میں جب کہ ابھی اسلامی قدرت متشکل نہیں ہوئی تھی اس قسم کی ایک قطعی خوشخبری، قرآن لانے والے کی مقامِ الوہیت سے ارتباط کی ایک نشانی ہے۔[1]

ہجرت ایک سنت الٰہی ہے

اگر چہ پیغمبر کی ہجرت ایک عظیم اور پر بار حادثہ تھی اس طور پر کہ اس سادہ سی چیز نے صفحہ تاریخ کو الٹ کر رکھ دیا اور اس کی وجہ سے تاریخ کی راہ تبدیل ہوگئی۔ لیکن اس بات پر توجہ کرنا چاہیے کہ قرآن و احادیث اسلامی میں مہاجرت صرف ایک تاریخی حادثہ نہیں ہے کہ جب بھی ہجرت و مہاجرت کی بات ہو تو ذہن اور رسول اکرمؐ کی ہجرت کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اس کے دوسرے پہلوؤں سے غفلت برتی جائے بلکہ اس بناء پر کہ پیغمبر گرامی ایک ''اسوہ'' اور ''نمونہ'' ہیں جیسا کہ فرماتا ہے۔

لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِي رَسُولِ ٱللَّهِ أُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب۔۲۱)

''پیغمبر گرامی تم لوگوں کے لیے ایک اچھا اُسوہ اور نمونہ ہیں۔''

لہٰذا ان کے نقش قدم کی پیروی کرنی چاہیے اور اسی مقصد کے لیے جس کی خاطر آنحضرت نے ہجرت فرمائی تھی، یا اس کے مشابہ مقصد کے لیے ہمیں بھی ایسے علاقوں سے جہاں ہم اپنے ایمان کی نجات اور مذہبی فرائض پر قدرت نہ رکھتے ہوں ہجرت کرنی چاہیے اور ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ بلادِ کفر سے بلادِ اسلام کی طرف اور ایسے علاقے سے، جہاں ہم تبلیغ وارشاد اور وظائف اسلامی پر عمل وقیام کی قدرت نہیں رکھتے۔ کسی دوسرے علاقہ کی طرف جہاں پر ہر قسم کے دینی امکانات موجود ہوں ہجرت کرنا احکام الٰہیہ میں سے ایک ہے جو تمام آسمانی شریعتوں میں موجود تھا اور اسلام میں بھی موجودہ زمانہ تک اپنی پوری قدرت کے ساتھ موجود ہے۔

رسول اکرم کا ارشاد ہے:

"لن تنقطع الهجرة ما قوتل الكفار۔"[2]

جب تک مسلمانوں اور کافروں کے درمیان جنگ جاری ہے۔ لوگوں پر ہجرت کرنا واجب ہے۔'' امیر المومنین اس بارے میں فرماتے ہیں۔

"والهجرة قائمة على حدها الاوّل ما كان الله فى الارض حاجة من مستسر الامة ومعلنها۔"

(نہج البلاغہ عبدہ خطبہ ۱۸۴)

---

[1] مجمع البیان ج۳ص ۲۶۹

[2] جامع الاصول ج۱۲ص ۲۶۱

''بلاد اسلام کی طرف ہجرت کا وجوب اپنے پہلے حکم پر باقی ہے اور یہ فریضہ خود ہجرت کرنے والے کے نفع میں ہے کیونکہ جو شخص ماحول کی گھٹن کی وجہ سے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتا ہے اس شخص کے ساتھ جو اس کو آشکار کردے خدا کے ہاں یکساں ہے۔

اور اگر پیغمبر نے یہ فرمایا ہے کہ ''لا هجرة بعد الفتح[1]'' تو اس سے مقصود مکہ سے ہجرت کرنا ہے۔ یعنی مکہ کے اسلامی سلطنت میں شامل ہوجانے کے بعد، جب کہ ایمان کی نجات اور وظائف الٰہیہ کے قیام کے سلسلہ میں خدا کے بندوں کی راہ سے ہر قسم کی رکاوٹیں دور ہوگئی ہیں لہٰذا اب سابق زمانہ کی طرح مکہ سے ہجرت کرنا مسلمانوں کے لیے ضروری نہ رہا۔ اور اگر اب وہ ہجرت کریں گے تو وہ ہرگز ''**مهاجرون**'' کے اس عنوان کے تحت، جو قرآن میں وارد ہوا ہے قرار نہیں پائیں گے نہ یہ کہ فتح مکہ کے بعد مستضعف لوگوں کے لیے اس علاقہ سے، جہاں وہ اپنے ایمان کی حفاظت اور فرائض کی انجام دہی پر قادر نہیں ہیں مہاجرت کا حکم اٹھالیا گیا ہے ہم اس بحث میں مہاجرت کے بارے میں قرآن کے نظریہ کو کلی طور پر پیش کریں گے۔

۵۔ فکری مستضعفین کی ہجرت

قرآن میں وارد شدہ مستضعف کے موضوع کی تشریح کے لیے ایک وسیع بحث کی ضرورت ہے جس کے بارے میں ہم اس کے مقام پر بحث کریں گے۔

مستضعفین'' کا ایک گروہ تو وہ ہے جو اس کے باوجود کہ وہ دوسروں کے زیر تسلط ہوتے ہیں، اور طاقتور لوگ ان کے رشد و تکامل میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں لیکن وہ ان کے تسلط اور نفوذ سے باہر نکلنے کی طاقت بھی رکھتے ہیں تا کہ کھلے ماحول میں ان کی معنوی اور مادی توانائیاں ظاہر ہوں، لیکن وہ کئی علل واسباب کی بناء پر اپنے وطن کو ترک کرنے اور پردیس میں زندگی بسر کرنے پر زیر تسلط رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور انجام کار استضعاف فکری (فکری کمزوری) میں باقی رہ جاتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں وہ ایمان کی حفاظت نہیں کرسکتے۔ قرآن اس گروہ کی، جو اپنے آپ کو تسلط سے نکال سکتا ہے۔ مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰىهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِیۡمَ كُنۡتُمۡ ؕ قَالُوۡا

[1] صحیح بخاری کتاب صید حدیث ۱۰ اس توجیہ کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے جو ابن کثیر نے اپنی جامع ج ۱۲ ص ۲۶۱ میں عائشہؓ سے نقل کی ہے۔ اس نے ''**لا هجرة اليوم**'' کے جملہ کی توضیح میں کہا ہے کہ اہل ایمان اپنے دین کی حفاظت کیلئے گزشتہ زمانہ میں اپنے وطن سے بھاگ کھڑے ہوتے تھے، لیکن اب جبکہ اسلام ہر جگہ کامیاب ہوگیا ہے تو مومن جہاں چاہے اپنے خدا کی عبادت کرسکتا ہے، اس بناء پر ہجرت کی نفی ایک نسبتی نفی تھی نہ کہ مطلق نفی، اور یہ خاص شرائط کے تابع ہے اور جب کبھی بھی ہجرت کا عامل پیدا جائے ہجرت ضروری ہوجائے گی۔

كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾ (نساء)

''جب فرشتے ان لوگوں کی جان قبض کرتے ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے تو وہ ان سے پوچھتے ہیں کہ تم دنیا میں کیا کیا کرتے تھے وہ کہیں گے ہم تو حکام کے زیر تسلط تھے اس پر فرشتے کہیں گے کیا خدا کی زمین وسیع وفراخ اور کشادہ نہیں تھی کہ تم وہاں پر ہجرت کر جاتے (اور جہالت وکفر کے ماحول سے علم ایمان کی سرزمین میں چلے جاتے) اور نتیجہ یہ ہے کہ اس گروہ کا عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔

ان کے رہنے کی جگہ جہنم ہے۔ وہ کتنی بری جگہ ہے۔

اس آیت نے مستضعفین کے اس گروہ کے لیے جو اپنے آپ کو کافر حکام کے تسلط سے آزاد کرا سکتے تھے۔ حجت کو تمام کر دیا ہے اور دوسرے الفاظ میں یہ آیت ہجرت کو ایسے افراد کے لیے جو قدرت وتوانائی رکھتے ہیں ایک خدائی فریضہ سمجھتی ہے تاکہ وہ اس طریقہ سے سرزمینِ شرک کو سرزمین توحید کے قصد وارادہ سے ترک کر دیں اور یہ ان سے کسی قسم کے عذر ومعذرت کو قبول نہیں کرتی اور بعد والی آیت میں صرف بے چارہ لوگوں کو جو ہجرت پر جسمانی وفکری توانائی نہیں رکھتے، مستثنیٰ کرتی ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾ (نساء)

''سوائے ان کمزور مردوں عورتوں، اور بچوں کے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی راستے سے آشنا ہیں۔'' ایک اور دوسری آیت میں اس زیر تسلط گروہ کے بارے میں جو یہ سوچتا ہے کہ دین الٰہی کی پیروی متکبرین کے قہر وغضب میں آنے کا سبب بن جائے گی اور انجام کار ہمیں اپنی سرزمین سے دھتکار کر نکال دیا جائے گا اس طرح فرماتا ہے۔

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ (قصص)

وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم اسلام کی پیروی کریں گے تو اپنی سرزمین سے نکال دیئے جائیں گے کیا ہم نے مکہ کو ان کے

لیے امن وامان والا حرم قرار نہیں دیا کہ انواع واقسام کی نعمتیں اطراف سے وہاں لائی جاتی ہیں، لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے'' یعنی اب جبکہ تم حالت کفر میں لطفِ خداوندی کے سایہ میں ہو اور حرم امن کو تمہارے لیے رہنے کی جگہ قرار دیا ہے۔ جہاں پر ہر طرف سے انواع واقسام کی نعمتیں پہنچ رہی ہیں تو یقینی طور پر ایمان لانے اور خدا کے احکام کی پیروی کرنے کی صورت میں اور بھی زیادہ لطف الٰہی تم پر ہوگا۔''

یہی وہ موقع ہے کہ جہاں امیر المومنینؑ نے اپنے ارشادات میں اصل مہاجرت کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

والهجرة قائمة على حدها الاول

(نہج البلاغۃ خطبہ:۱۸۸)

''حکم ہجرت اپنی پہلی صورت پر باقی ہے اور ہر فرد مسلمان پر لازم ہے کہ خاص حالات میں کفر کی سرزمین کو چھوڑ کر ایمان کی سرزمین سے اپنا رشتہ جوڑ لے۔''

اسلام کے عالی قدر محقق فقیہ، ساتویں صدی ہجری میں اپنی گرانقدر کتاب ''الشرائع'' میں لکھتے ہیں۔

ويجب المهاجرة عن بلد الشرك علىٰ من يضعف عن اظهار شعائر الاسلام مع المكنة، والهجرة باقية مادام الكفر باقيًا[۱]

''یعنی وہ شخص جو سرزمین کفر میں انجام وظائف اور شعائر اسلامی کے بجالانے پر قادر نہیں ہے، اسے قدرت کی صورت میں ہجرت کرنی چاہیے اور جب تک روئے زمین پر کفر باقی ہے ہجرت کا حکم اپنی پوری قوت کے ساتھ باقی ہے۔''

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی سے نقل ہوا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا: جو شخص کسی سرزمین سے شرک سے فرار کرنے کے ارادے سے چاہے اس کا فاصلہ دو یا ایک بالشت ہی ہو ہجرت کرے تو اس کا اجر اور صلہ جنت ہے ایسا شخص ابراہیم اور پیغمبر اسلام جیسے مہاجروں کے ساتھ ہم نشین ہوگا۔[۲]

''المنار'' کا مولف جلد ۹ ص ۴ پر لکھتا ہے جب اندلس پر عیسائیوں نے حملہ کیا تو کچھ مسلمانوں نے یہ خیال کیا کہ وہ اس ماحول میں رہ کر اپنے ایمان کی حفاظت اور آداب وسنن اسلامی پر عمل کر سکتے ہیں۔ کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ ماحول کا ان کی اولاد پر غلبہ ہوگیا اور ان کی اولاد اسلام سے

---

[۱] شرائع جلد ۱ ص ۳۰۸ کتاب جہاد

[۲] مجمع البیان ج ۲ ص ۱۰۰، جواہر الکلام ج ۲۱ ص ۳۵

پھر گئی اور مسیحیوں کے دین میں داخل ہوگئی۔

۶۔ہجرت کے بعد تعرب (واپسی)

اسلامی احادیث میں ایک مسئلہ ''تعرب بعد الھجرۃ'' کے نام سے وارد ہوا ہے اور مسلمانوں کی صفوں سے پیوستہ ہونے کے بعد اسلامی سرزمین کو چھوڑ کر سرزمین شرک کی طرف جس میں ایمان کے محو و نابود ہونے کا خطرہ ہے واپس نہیں جانا چاہیے اور اس بارے میں دوسروں کو تعلیم دینے کے عنوان سے پیغمبر اسلامؐ سے فرماتے ہیں: ولا تعرب بعد الھجرۃ[۱]۔ سرزمین اسلام کی طرف ہجرت کرنے کے بعد صحرا نشینی جو اس زمانہ وظائف اسلامی کے ترک کرنے کا سبب تھی ___ ممنوع ہے۔

ایک شخص امام ششم امام صادق علیہ السلام سے سوال کرتا ہے کہ ایک آدمی کسی ایسے علاقے میں زندگی بسر کرتا ہے جہاں پر سال کے بڑے حصہ میں برف کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی، اور اس کے لیے غسل اور وضو کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ امام نے فرمایا ضرورت کی حالت میں تیمم کرے، لیکن وہاں سے کوچ کر جائے اور دوبارہ وہاں پلٹ کر نہ جائے کہ اپنے دین کو ہی نابود کر بیٹھے[۲]

آئمہ معصومین علیہم السلام کے زمانہ میں ایک اسلامی وظیفہ یہ تھا کہ جب کسی امام کی وفات ہوجاتی تھی تو اس کے جانشین کی پہچان کے لیے لازم وضروری تھا کہ بصیرو آگاہ لوگ دنیا جہان کے مختلف علاقوں سے چل کر مدینہ میں آئیں اور امام کے جانشین کے بارے میں آگاہی حاصل کریں۔

امام صادقؑ اس قسم کی مہاجرت کے لازم وضروری ہونے کے سلسلہ میں ایک آیت اور ایک حدیث سے استدلال فرماتے ہیں ایک طرف تو پیغمبر نے یہ فرمایا ہے:

"من مات ولم یعرف امام زمانه فقد مات میتة جاھلیة۔"

جو شخص مرجائے اور اپنے وقت اور زمانہ کے امام کو نہ پہچانے تو اس کی موت زمانہ جاہلیت کی موت ہوگی۔''

اور دوسری طرف سے قرآن یہ حکم دیتا ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ (توبہ)

''ہر قوم سے کچھ لوگ اپنے گھروں سے کیوں نکل کھڑے نہیں ہوتے کہ وہ مسائل دینی میں زیادہ بصیرت حاصل کریں اور واپس آنے کے بعد انہیں حلال وحرام خدا سے آشنا کریں، اور خدا کی مخالفت سے ڈرائیں، شاید کہ وہ

---

[۱] وسائل الشیعہ ج ۱۱ ص ۷۵۔ امیر المومنین ایک گروہ کی مذمت میں فرماتے ہیں۔

[۲] تم ہجرت کرنے کے بعد صحرا نشین بدو ہو گئے ہو (نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۷)

ڈر جائیں۔"

کے بعد امام صادقؑ نے فرمایا: اگر کوئی شخص امورِ دین میں تحقیق کرنے کے لیے مسافرت کرے اور اس کو اثناء راہ میں موت آ جائے تو اس کا اجر خدا کے ذمہ ہوگا اور گواہ کے طور پر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی[1]

وَمَنۡ يَّخۡرُجۡ مِنۡۢ بَيۡتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ يُدۡرِكۡهُ الۡمَوۡتُ فَقَدۡ وَقَعَ اَجۡرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ (نساء۔۱۰۰)

اس تفصیلی بحث سے واضح ہوگیا ہے کہ ذیل میں بیان کردہ موارد میں شرک سے ہجرت کرنا لازم و ضروری ہے۔

(۱) ایسی گھٹن سے پُر ماحول جو انسان سے دینی آزادی کو سلب کرلے اور اس کے نتیجہ میں وہ ایمان کی حفاظت اور مذہبی وظائف کی انجام دہی پر قادر نہ ہو۔

(۲) ایسا ماحول جہاں انسان احکام کو سیکھنے اور اپنے دین کے معارف کے اصول کی شناخت پر قادر نہ ہو، ان حالات میں، عام طور پر تحصیل علم کے بعد دوسروں کو ہدایت و رہنمائی کے لئے پہلی جگہ پر پلٹ جانا چاہیے۔

(۳) اسلامی حکومت کی تشکیل کے لیے ہجرت کرنا اس میں شک نہیں ہے کہ اسلام کے خصوصی نورانی احکام کا نفاذ و اجرا ایک قوت و طاقت و اقتدار کے بغیر ممکن نہیں ہے، بلکہ سارے کا سارا اسلام حکومت کے نام سے ایک دفاعی زنجیر کے بغیر ممکن نہیں ہے اس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو دنیا کے مختلف علاقوں سے ایک ہی جگہ پر جمع ہونا چاہیے تاکہ وہ اس دفاعی زنجیر کو وجود میں لائیں۔

ہجرت ایمان کی نشانی ہے

ایمان کا دعویٰ کرنے والے جو عمل کے لحاظ سے ان لوگوں کے ساتھ یکساں اور برابر ہیں کہ جو ایمان نہیں رکھتے، یقیناً فاقد ایمان ہی ہیں قرآن مہاجرت اور خوشحال مادی زندگی کے ترک کرنے کو سچے ایمان کے وجود کی نشانی سمجھتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَالَّذِيۡنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوۡۤا اُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا (انفال۔۷۴)

"وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور اس کی حفاظت کے لیے انہوں نے ہجرت کی اور وہ لوگ کہ جنہوں نے ان مہاجرین کو جگہ دی، وہ واقعی طور پر سچے مؤمن ہیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۲ ص ۲۸۲۔۲۸۴

اور دوسری آیت میں اس حقیقت کی ایک اور طریقہ سے تصریح کی گئی ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

لِلۡفُقَرَآءِ الۡمُهٰجِرِيۡنَ الَّذِيۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَاَمۡوَالِهِمۡ يَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا وَّيَنۡصُرُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ۚ﴿۸﴾ (حشر)

فقیر و تہی دست مہاجر جو اپنے گھروں اور اموال سے نکالے گئے ہیں وہ خدا کے فضل و کرم کے طلبگار ہیں اور خدا اور اس کے پیغمبر کی مدد کرتے ہیں (وہ اپنے ایمان کے دعوے میں) سچے ہیں۔

قرآن ایک دوسری آیت میں ایک اور طرح سے اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَدُّوۡا لَوۡ تَكۡفُرُوۡنَ كَمَا كَفَرُوۡا فَتَكُوۡنُوۡنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوۡا مِنۡهُمۡ اَوۡلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ (نساء۔۸۹)

''کافر (تمہارے ایمان پر رشک کرتے ہیں) اور یہ آرزو کرتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر ہو جاؤ تا کہ سب کے سب یکساں ہو جائیں جب تک وہ راہ خدا میں مہاجرت نہ کریں تم انہیں دوست نہ بناؤ۔

آپ مزید آگاہی کے لیے ذیل میں ذکر شدہ آیات میں خدا کے ہاں مہاجر کے مقام و حیثیت کو معلوم کر سکتے ہیں۔ مہربانی فرما کر سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۶، آل عمران ۱۹۵، نساء ۱۰۰، انفال ۷۴، ۷۵ اور توبہ کی آیت ۱۰۲، ۱۱۹ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۸۔ غیبی امدادیں

ایک جگہ سے ہجرت کرنا، ایک نظام کو ختم کرنے اور ایک نئے نظام کو ایجاد کرنے کی قیمت پر مکمل ہوتا ہے اور ایسا کام کرنے کے لیے اقدام کرنا دل گردے اور جرأت کا محتاج ہے اور سب سے بڑھ کر اس راستہ میں کامیابی پر ایمان کا نیاز مند ہے قرآن اس سلسلہ میں مہاجرین کی مدد کے لیے آگے بڑھتا ہے اور انہیں غیبی امدادوں کا وعدہ دیتا ہے کہ ہجرت کرنے سے ان کی زندگی کی حالت میں ہر گز خلل واقع نہیں ہوگا۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا فِى اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا لَـنُبَوِّئَنَّهُمۡ فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً ؕ وَلَاَجۡرُ الۡاٰخِرَةِ اَكۡبَرُ‌ۘ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَۙ﴿۴۱﴾ (نحل)

''جن لوگوں نے اپنی سرزمین میں ظلم و ستم سہنے کے بعد راہ خدا میں ہجرت کی انہیں ہم اس دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے (اور انہیں معلوم ہونا چاہیے) کہ آخرت کا اجر تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔

دوسری آیت میں قطعی طور پر اُمید دلاتا ہے کہ آخر کار یہ گروہ زندگی گزارنے اور راحت و آرام کے لیے ایک وسیع جگہ حاصل کرلے گا چنانچہ فرماتا ہے:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ط

(نساء۔۱۰۰)

''جو شخص راہ خدا میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں زندگی گذارنے کے لیے وسیع جگہ حاصل کرے گا۔اور دوسری آیت میں اپنے فرمانبردار بندوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ۝۵۶

(عنکبوت)

''اے میرے ایمان لانے والے بندو! میری زمین وسیع ہے پس تم میری ہی عبادت کیا کرو۔''

اور یہ خیال نہ کرو کہ اس گھٹن کے ماحول کے علاوہ، جو خدا کی پرستش سے مانع ہے دوسری زمین نہیں ہے اور اگر اس جگہ کو ترک کردیا تو تمہاری زندگی کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

۹۔ہجرت میں سبقت

باوجوداس کے قرآن تمام حالات میں ہجرت کی ترغیب دیتا ہے لیکن قرآن اس گروہ کے لیے جس نے اسلام کے ضعف وناتوائی کے موقع پر اپنی موجودہ زندگی کو چھوڑ کر نہال اسلام کی پرورش کے لیے مسافر اور پردیس کی زندگی اختیار کی ایک اور مقام اور مرتبہ کا قائل ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (توبہ:۱۰۰)

''مہاجرین وانصار میں سے ایمان کی طرف سبقت کرنے والے اور جنہوں نے نیکی میں ان کی پیروی کی خدا ان سے راضی ہے اور وہ خدا سے راضی ہیں۔

اسی بنا پر جن لوگوں نے فتح مکہ کے بعد انفاق وجہاد کیا ہے ان لوگوں کے ساتھ کہ جنہوں نے فتح مکہ کے ذریعہ اسلام کی کامیابی کے بعد جہاد وانفاق کیا ہے یکساں نہیں ہیں۔کیونکہ پہلے گروہ کا خلوص دوسرے گروہ کی نسبت زیادہ تھا جیسا کہ فرماتا ہے۔

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ط اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً

مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ (حدید۔۱۰)

''جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے انفاق و جہاد کیا ہے ان لوگوں کے ساتھ کہ جنھوں نے فتح کے بعد یہ کام انجام دیا ہے یکساں نہیں ہیں اور خدا نے دونوں ہی گروہوں کو اچھا وعدہ دیا ہے۔''

۱۰۔مہاجر عورتیں

دین کی حفاظت اور ایمان کی نجات کے لیے مہاجرت کا مسئلہ خدائی فرائض میں سے ہے جس میں دوسرے احکام کی طرح، مرد اور عورت یکساں ہیں اور قرآن دو موقعوں پر مہاجر عورتوں کا کلی طور پر نام لیتا ہے اور ان کے ایمان کی قدر کرتا ہے اور یہ حکم دیتا ہے کہ ان کے ایمان کے ثبوت کے بعد وہ اپنے کافر شوہروں پر حرام ہو جاتی ہیں کیونکہ کافر مرد مسلمان عورت کا ہم شان نہیں ہے۔ اور مسلمان عورتوں کو ان کی طرف واپس نہیں لوٹانا چاہیے جیسا کہ فرماتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ (ممتحنہ۔۱۰)

''اے ایمان والو! جس وقت ایمان لانے والی مومنہ مہاجر عورتیں تمہاری طرف آئیں تو تم ان کا امتحان کر لیا کرو۔ خدا تو ان کے ایمان سے آگاہ ہے جب ان کا ایمان ثابت ہو جائے تو ان کو کافر شوہروں کی طرف واپس نہ پلٹاؤ۔''

سورہ احزاب کی آیت ۵۰ میں ایک خاص طرح سے مہاجر عورتوں کا نام لیا گیا ہے۔

اور کچھ روایات میں یہ وارد ہوا ہے کہ پیغمبر مہاجر عورتوں کو قسم دیتے تھے کہ وہ کہیں کہ:

خدا کی قسم میں نے شوہر کے غضب کی وجہ سے یا اس سرزمین کے پانی اور خاک سے لگاؤ کی بناء پر یا دنیا کے حصول کے لیے وطن نہیں چھوڑا ہے میں تو صرف خدا اور اس کے پیغمبر کی خاطر باہر نکلی ہوں [1]

امیر المومنین نے اپنے متعدد خطبوں اور خطوں میں ہجرت کے بارے میں کچھ مطالب بیان کئے ہیں اور اپنی اس طرح سے توصیف بیان فرمائی ہے:

---

[1] مجمع البحرین مادہ ہجر

فانی ولدت علی الفطرة وسبقت الی الایمان والهجرة [۱]

''میں دین توحید پر پیدا ہوا ہوں اور میں نے ایمان اور ہجرت کی طرف سبقت کی ہے:''

۱۱۔ گناہ سے ہجرت

اسلام میں اصطلاحی ہجرت کے علاوہ ایک اور ہجرت ہے جس کا تعلق قلب و دل کے ساتھ ہے اور وہ گناہ سے اطاعت کی طرف ہجرت ہے یعنی انسان یہ مصمم ارادہ کرلے کہ دوبارہ گناہ کے قریب نہیں جائے اور خدا کے حکم سے روگردانی نہیں کرلے گا قرآن و حدیث میں اس قسم کی ہجرت کی طرف اشارہ ہوا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ (ال عمران۔ ۱۹۵)

''جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور انہیں میری راہ میں اذیت دی گئی ہے ہم ان کی برائیوں کی پردہ پوشی کریں گے (اور انہیں بخش دیں گے)''

چونکہ اس آیت میں ہجرت گھر سے خروج کے مقابلہ میں قرار پائی ہے لہٰذا ممکن ہے کہ اس سے مقصود وسیع معنی والی ہجرت ہو جو گناہ کے ترک کرنے اور آلودگی سے پاک ہونے کو شامل ہو۔

اگرچہ فخر رازی نے ان دونوں جملوں کا ایک دوسرے طریقے سے معنی کیا ہے وہ کہتا ہے کہ: ھاجروا'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے اختیار سے اپنے وطن کو چھوڑیں، اور ''اخرجوا'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو مجبوری کی بناء پر ترک وطن کریں۔

لیکن پہلے مطلب کی تائید ان روایات سے ہوتی ہے جو اس قسم کی مہاجرت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں جہاں پر ایک شخص پیغمبر سے سوال کرتا ہے کہ دونوں قسم کی مہاجرت میں سے کونسی افضل ہے تو پیغمبر فرماتے ہیں۔

ان تهجر ما کره ربك۔'' [۲]

جس بات کو تیرا پروردگار پسند نہیں کرتا اس کو ترک کردے۔''

ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام سے اس طرح وارد ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۵۶

[۲] جامع الاصول ابن اثیر ج ۱۲ ص ۲۶۲

يقول الرجل هاجرت ولم يهاجر انما المهاجرون الذين يهجرون السيئات ولم يأتوا بها۔"[1]

"ایک شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے سرزمین شرک سے سرزمین اسلام کی طرف ہجرت کی ہے۔ حالانکہ اس شخص نے ہجرت نہیں کی ہے (کیونکہ مہاجرت کا مقصد، جو گناہ سے پاک ہونا ہے حاصل نہیں ہوا ہے) مہاجر تو وہ لوگ ہیں جو گناہ کو ترک کریں اور انہیں انجام نہ دیں۔"

کچھ روایات میں پیغمبر گرامی سے نقل ہوا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا:

لاتنقطع الهجرة حتیٰ تنقطع التوبة۔"[2]

"جب تک توبہ کا دروازہ کھلا ہے ہجرت منقطع نہیں ہوتی۔

اس قسم کی ہجرت سے مراد وہی روح و نفس کا آلودگی سے تصفیہ ہے جو توبہ اور شرعی عبادات کے ذریعہ انجام پاتا ہے البتہ یہ بات مدّنظر رہنی چاہیے کہ اس قسم کی ہجرت کو قبول کرنا اس مشہور ہجرت کی نفی کے معنی میں نہیں ہے جس میں ایمان لانے والے لوگ خدا کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ اکثر اوقات کچھ لوگ یہ خیال کر لیتے ہیں کہ اگر ہجرت جسمانی کا ھدف ومقصد خدا ہے تو ہم اس کام کو سیر وسلوک (عبادت) اور تدبر وتفکر کے ذریعہ انجام دے لیتے ہیں، کیونکہ فرض یہ ہے کہ ایمان کی حفاظت مکمل طور پر اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کفر کی سرزمین کو ایمان کی سرزمین کے ارادہ سے چھوڑ دے اور اس فرض میں صرف فکری سیر وسلوک اصلی ھدف اور مقصد کے پورا ہونے میں کافی نہیں ہوگا۔

طریحی مجمع البحرین میں مادہ "ہجر" کے لیے ذیل میں ذکر شدہ جملوں کو نقل کرتا ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ تینوں جملے حدیث کے ہیں۔

"والمهاجر من هاجر ما حرم الله عليه، و المهاجر من ترك الباطل الى الحق وفی الحديث من دخل الاسلام طوعاً فهو مهاجر۔"

"مہاجر وہ ہے جو خدا کے محرمات کو ترک کرے اور باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف پلٹ آئے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ جس کسی نے بھی صمیم قلب کے ساتھ اسلام کو قبول کیا وہ مہاجر ہے۔"

---

[1] سفینۃ البحار ج ۲ ص ۶۹۷

[2] جامع الاصول ج ۱۲ ص ۲۶۱۔

۳۔قرآن میں حق و باطل

قرآن حق و باطل کے مسئلہ کو انتہائی اہمیت کے ساتھ پیش کرتا ہے، لفظ ''حق'' اپنے تمام مشتقات کے ساتھ ۲۸۷ مرتبہ اور لفظ باطل ۳۵ مرتبہ قرآن میں آیا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ لفظ حق و باطل عربی کے الفاظ ہیں۔لیکن یہ دونوں الفاظ چودہ سو سال سے اس طرح ہماری لغت اور زبان میں وارد ہوئے ہیں کہ ان کے معادل وہم معنی الفاظ ترک ہو گئے ہیں (اسی بناء پر) دونوں الفاظ کی تصویر کشی میں ہمیں زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں ہے اور جو معانی ہم ان دونوں الفاظ کے سمجھتے ہیں وہ عربی زبان بولنے والوں سے چنداں مختلف نہیں ہیں۔

لیکن ہم مزید وضاحت کے لیے دونوں الفاظ کی لغوی توضیح وتشریح، اور یہ کہ نزولِ قرآن کے وقت عربی زبان والے لوگ ان دونوں الفاظ سے کیا معنی سمجھتے تھے، پیش کرتے ہیں۔

لیکن ہم پہلے ایک نکتہ بیان کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ''حق'' اور ''باطل'' کے معنی کی پہچان کے کئی طریقے ہیں۔

الف

اصل عربی زبان کی لغت کی کتابوں کی طرف رجوع جو ہمیں ان دونوں الفاظ کے واقعی مفہوم سے آشنا کرتی ہیں۔اور اب ہم اسی کو بیان کریں گے، اور اس سے واضح ہو جائے گا کہ ''حق'' وہ پائیدار چیز ہے کہ جو واقعیت وحقیقت رکھنے کی بناء پر اتقان واستواری اور ایک خاص قسم کی بقا اور پائیداری رکھتی ہے، اور باطل وہ ڈگمگانے والی اور ناپائیدار چیز ہے جو کچھ واقعیت نہ ہونے کی بنا پر گزر جانے والی چیز ہے۔اور اس کی بقاء مختصر اور بہت ہی محدود ہے اور اسی بنا پر حق و باطل کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ: **اللحق دولة ولباطل جولة۔**''

حق ''تداول'' اور دست بدست ہونے کے طریق سے پائیدار ہے، اور باطل صرف جلدی گزر جانے والی نمائش ہے۔

ب

دونوں کے واضح نمونوں کا اظہار جن میں سے بعض کو انسان محسوس کر سکتا ہے۔قرآن نے حق و باطل کا تعارف کرانے کے لیے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے۔اور ''خدا'' اور ''قرآن'' کو حق کے منتخب نمونوں کے طور پر پیش کیا ہے۔

ج

حق و باطل کی خصوصیات کی تشریح جو دونوں کی واقعیت کے تعارف کا سبب بن سکتی ہے قرآن نے اس راستے کو بھی طے کیا ہے اور ہم بھی اس کے بارے میں بحث کریں گے۔اب ہم ان تینوں پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔

۱۔ عربی کتب لغت میں حق و باطل کا مفہوم

عربی لغت کی اصل کو پہچاننے والے لفظ ''حق'' کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ:

"له اصل واحد يدل على احكام لشيء وصحته وهو نقيض الباطل ثم يرجع اليه كل فرع بجودة الاستخراج۔"[۱]

''لفظ حق، باطل کی ضد ہے اور اس کی صرف ایک ہی اصل ہے جو کسی چیز کی استواری اور پائیداری پر دلالت کرتی ہے اور اس کے تمام معانی جو ظاہر میں مختلف ہیں غور کرنے پر اسی ایک معنی کی طرف لوٹتے ہیں۔''

اس کے بعد ''باطل'' کے معنی کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

''باطل'' کا ایک سے زیادہ معنی نہیں ہے اور وہ اس کا بے حقیقت ہونا ہے جس کے لیے ناپائیدار اور قیام و بقاء کی کمی لازمی ہے[۲]

اگر ایک حقیقت والی چیز کو ''حق اور بے حقیقت چیز کو ''باطل'' کہتے ہیں تو یہ حق کے واقیعت و حقیقت ہونے کی بنا پر ہے جو اس کی استواری واستحکام اور پائیداری کا موجب بنتا ہے اور باطل کی بے حقیقتی کی بنا پر ہے کہ جو طبعاً ناپائیدار تھا اور اس کے لیے قیام و بقا نہیں ہوگی۔ مقاییس'' کے مولف اور دوسری لغت کی کتابیں لکھنے والوں کی باتوں کے مجموعہ سے ذیل میں بیان کردہ مطلب واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے۔

ہر وہ چیز جو ایسی حقیقت واقعیت رکھتی ہو کہ جس کا نتیجہ استحکام واتقان ودوام واستمرار ہو وہ ''حق'' ہوگی اور اس کے مقابلہ میں باطل ہے جو کوئی حقیقت وواقعیت نہ ہونے کی وجہ سے تھوڑی سی نمائش کے بعد ختم ہوجاتا ہے۔

قرآن میں حق کے نمونے

اب جب کہ ہم دونوں الفاظ کے معانی سے کسی حد تک آشنا ہو گئے ہیں لہٰذا اب ضروری ہے کہ ہم ''حق'' کے ان مصادیق سے جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں کسی حد تک آشنائی حاصل کریں البتہ اس سے مقصد یہ نہیں ہے کہ حق کا مصداق انہیں میں منحصر ہے جنہیں قرآن نے اس صفت کے ساتھ موصوف کیا ہے بلکہ چونکہ یہ موارد حق واضح ترین موارد میں سے ہیں لہٰذا قرآن نے کچھ مناسبتوں کی بنا پر انہیں بیان کیا ہے۔

۱۔ خدا حقِ مطلق ہے

---

[۱] مقاییس ج ۲ ص ۱۵۔

[۲] له اصل واحد وهو ذهاب الشئى وقلة مكثه ولبثه وسمي الشيطان الباطل لانه لاحقيقة لافعال له مقاييس اللغة ج ۱ ص ۵۸۔

قرآن نے خدا کو حقِ مطلق کے ساتھ ___ جس کی ذات میں چھوٹے سے چھوٹے بطلان کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ توصیف کیا ہے اور ایک طرح سے صفحہ ہستی میں حق کو اسی میں منحصر کر دیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَالْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ هُوَ الْبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَالْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٣٠﴾

(حج ۶۲۔ لقمان، ۳۰)

''یہ اس بنا پر ہے کہ وہ خدا ہی حق ہے اور اس کے سوا جس جس کی پرستش کرتے ہیں، باطل ہے، اور خدا ہی بزرگ و برتر ہے۔''

یہ آیت ایک ہی مضمون کی اور ایک ہی عبارت میں مذکورہ دونوں سورتوں میں آئی ہے مگر سورہ لقمان میں هو الباطل، کی جگہ لفظ ''الباطل'' وارد ہوا ہے اور حق بات یہ ہے کہ یہ آیت دونوں سورتوں کی آیات کے اندر ایک خاص جذبہ اور درخشندگی رکھتی ہے جبکہ دونوں سورتوں کی دوسری آیات میں ایسی خصوصیت نہیں ہے آیات قرآنی اگرچہ سب ہی معجزانہ شان رکھتی ہیں اور انسانوں میں اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے اس کے باوجود ان سے بعض دوسری بعض پر ایک خاص قسم کا امتیاز اور برتری رکھتی ہیں اور یہ آیت مضمون و تعبیر کے لحاظ سے ان میں سے ایک ہے گویا عرب کے زمانہ جاہلیت کا سخن ساز شاعرہ لبید فطرت الٰہی کے ذریعہ ایک طرح سے نچلے درجے میں آیت کے مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

الا کلّ شیء ما خلا اللہ باطل
وکلّ نعیم لامحالۃ زایل::
خدا کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے
اور ہر نعمت یقینی اور قطعی طور پر ناپائیدار ہے

حق مطلق اور حق نسبی

(هوالحق وان مایدعون من دونه هو الباطل) کے جملوں میں، لفظ ''ھو'' کے لانے کا مقصد خدا کے حق اور جھوٹے معبودوں کے باطل ہونے کی ایک قسم کی تصویر کشی ہے اور جو لوگ عربی ادب سے آگاہی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان موارد میں لفظ ''ھو'' حق کے ذاتِ خدا میں منحصر ہونے کو بیان کرتا ہے، اور یہ کہ صرف وہی حق ہے اور بس اور اس کے علاوہ تمام جھوٹے معبود باطل محض ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خدا حقِ مطلق اور جھوٹے معبود باطلِ محض کس طرح ہیں۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ مشرکین بتوں کے بارے میں ایک قسم کی ربوبیت کے معتقد تھے اور وہ یہ خیال کرتے تھے کہ جہاں ہستی میں

خدا کے کاموں میں سے کچھ کام مثلاً بارش کا برسانا اور تمام خیرات و برکات، یا مغفرت و شفاعت کے مانند کام ان کے بتوں کو سپرد کر دیے گئے ہیں اور وہ مقامِ ربوبیت کے ایک حصہ کے مالک ہیں [1]

قرآن اس نظریہ و خیال کو باطل کرنے کے مقام میں خدا کو حق مطلق اور لکڑی اور دھات کے بتوں کا باطل محض ہونے کے ساتھ تعارف کراتا ہے کیونکہ اگر کسی چیز کی حق و باطل ہونے کے سلسلہ میں توصیف کا معیار مقام ربوبیت رکھنا یا نہ رکھنا ہو تو یہ حقیقت خدا میں منحصر ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی بھی مقامِ الوہیت و ربوبیت کا مالک نہیں ہے کیونکہ بحث کا محور یہ ہے کہ کیا الوہیت و ربوبیت خدا کی ذات پر منحصر ہے یا ان کے جھوٹے معبود بھی اس قسمت میں کوئی حصہ رکھتے ہیں اس بنا پر حق اور باطل ہونا اس واقعیت کے رکھنے یا نہ رکھنے کے محور کے گرد گھومتا ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ یہ واقعیت خدا ہی میں منحصر ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی بھی الوہیت و ربوبیت میں کوئی حصہ نہیں رکھتا۔

جو چیز اس مطلب کی تائید کرتی ہے وہ یہ ہے کہ:

(حج ولقمان) کی دونوں سورتوں میں اس آیت سے پہلے تدبیر جہاں اور اُسے گردش میں لانے سے مربوط آیات وارد ہوئی ہیں جو خدا کی ربوبیت کے ساتھ مربوط ہیں سورہ حج میں اس طرح وارد ہوا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿٦١﴾

(حج)

''یہ اس لیے ہے کہ خدا رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور یقیناً خدا سننے اور دیکھنے والا ہے۔''

اور سورہ لقمان میں اس طرح آیا ہے

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۡ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٩﴾ (لقمان)

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ خدا رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اسی نے سورج و چاند کو مسخر کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک ایک معین زمانہ تک حرکت میں ہے اور خدا تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔''

جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں زیر بحث آیت سے قبل کی آیات مقامِ ربوبیت سے مربوط افعال کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں وہ ایسے افعال ہیں جو خدا ہی کے ساتھ مربوط ہیں اور ان میں سے کوئی بھی کام کسی کو سپرد نہیں کیا گیا ہے اس موقع پر فرماتا ہے: (ذٰلِك بان الله هو الحق الخ)

---

[1] کتاب ''مبانی توحید از نظر قرآن'' میں (جو اس تفسیر موضوعی کی دوسری جلد ہے) توحید در ربوبیت کی وضاحت کی گئی۔

اس صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی حق کے ساتھ توصیف کا سبب وہی مقامِ الوہیت و ربوبیت کی واقعیت کا رکھنا ہے اور ایسی حقیقت صرف خدا ہی میں موجود ہے اور غیر خدا اس حقیقت سے پورے طور پر خالی ہے اس جہت سے وہ حق مطلق ہے اور اس کا غیر باطلِ مطلق ہے۔

البتہ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف خدا ہی اکیلا ''ربّ'' اور عالم کے تمام کاموں کا ادارہ کرنے والا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ کسی شخص و مقام سے مدد نہ لے کر اس کارخانہ کا مستقل طور پر ادارہ کرنے والا صرف وہی ہے لیکن یہ عقیدہ اس سے مانع نہیں ہے کہ کچھ عوامل مثلاً فرشتے، پروردگار کے اذن سے اور اس کی لا یزال قدرت سے مدد لیتے ہوئے اور اس کے حکیمانہ ارادہ کے مطابق مقام ربوبیت کے خدمت گذار بن کر عالم کے کاموں کو سبب کے طور پر اپنے ذمہ لے لیں، اور اس مطلب کی وضاحت کتاب ''مبانی توحید'' میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔

لیکن اگر حق و باطل ہونے کا سبب اور معیار کسی چیز کی الوہیت و ربوبیت نہ ہو بلکہ اس کا سبب کسی معدوم چیز کے مقابلہ میں جس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ وجود رکھنا اور موجودات کو وجود میں لانا ہو تو اس صورت میں خدا ہی حق مطلق ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اگر وہ وجود میں آ گیا ہے تو وہ حقِ نسبی ہوگا۔

کیونکہ خدا کا وجود ہستی ایک ازلی و ابدی ہستی ہے اور اس کا وجود خود اس کی ذات سے متعلق ہے اور وہ خود بخود موجود ہے جبکہ دوسرے موجودات کا وجود خدا سے وابستہ ہے اور اس میں ازلی و ابدی ہونے کی خصوصیت نہیں ہوتی۔ اس جہت سے عدم و نسیتی جس کا لازم بطلان ہے خدا کی ذات میں اس کی گنجائش نہیں ہے وہ تو حق محض ہے جو کبھی بھی بطلان پذیر نہیں ہے اور اس کی ذات میں ''عدم'' کا راہ پانا ممکن ہی نہیں ہے۔

جب کہ دوسرے موجودات اس لحاظ سے کہ وہ ایک وجود رکھتے ہیں اور معدوم اشیاء کے مقابلہ میں جو عدم کی ظلمت و تاریکی میں باقی ہیں صفحۂ ہستی میں ایک طرح سے موجود پائے جاتے ہیں حق ہوں گے۔ لیکن حق کے ساتھ ان کی توصیف ایک نسبی وصف ہے یعنی وہ معدوم چیزوں کی نسبت حق اور حقیقت رکھنے والے ہیں لیکن اس نظر سے کہ ان کا وجود ایک دوسری ذات سے وابستہ ہے اور وہ ایک دوسری جگہ سے فیض حاصل کرتے ہیں اور ہرگز ابدی اور پائیدار نہیں ہیں ''قہراً باطل ہیں اور حق محض کے احاطہ سے خارج ہیں[1]

وہ آیات جو خدا کی ''حق'' کے ساتھ توصیف کرتی ہیں وہ ہیں تھیں جو ہم نے سورہ حج اور لقمان سے ۶۲ اور ۳۰ نمبر سے نقل کی ہیں اور دوسری آیات میں بھی خدا کی حقِ مطلق کے ساتھ توصیف ہوئی ہے۔ مثلاً۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

(یونس)

''یہی اللہ تمہارا پروردگار حق ہے اور حق کے بعد گمراہی کے علاوہ اور کچھ نہیں، تم کہاں (بہکے چلے) جا رہے ہو۔''

---

[1] حق و باطل کی مطلق و نسبی کے ساتھ تقسیم، علم منطق میں قضیوں کے صدق و کذب کے نسبی ہونے کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتی اور جو لوگ ان علوم سے واقف ہیں ان سے یہ مطلب پوشیدہ نہیں ہے۔

وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾ (نور)

''وہ جانتے ہیں کہ خدا واضح و آشکار حق ہے۔''

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ (کہف۔۴۴)

''وہاں حکمرانی خدائے حق کی ہے۔''

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ (مومنون۔۱۱۶)

فرمانروائے حق اللہ بالاتر و برتر ہے اس کے علاوہ اور کوئی خدا نہیں ہے۔

جہانِ ہستی عارف کی نظر میں

اگرچہ ہستی و واقعیت کو واجب و ممکن، یا مستقل و غیر مستقل موجود میں تقسیم کرنے سے یہ ممکن نہیں ہے کہ موجودات کے وجود کا ہی انکار کر دیں، یا انہیں مجازی موجودات جان لیں اور ان کے لیے کسی واقعیت کے ہی قائل نہ ہوں، بلکہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ ہستی اور وجود اس مرحلہ میں مطلق اور نسبی حقیقت میں تقسیم ہوتے ہیں۔لیکن عارف کی نگاہ میں یہ جہان ایک وہم وخیال سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔یعنی موجودِ مستقل کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے وہ ہستی حقیقی کے نام کے لائق نہیں ہے اگرچہ اس موازنہ سے قطع نظر اس کی ایک واقعیت وحقیقت ہے اور ان دونوں کی مثال آفتاب جہاں تاب کی پرفروغ روشنی اور نور کے مقابلہ میں پانچ شمعوں والے چراغ جیسی ہے اور اس مطلب کے لیے قرآن میں بہت سے نظائر موجود ہیں۔

قرآن مجید اخروی زندگی کو ہی حقیقی زندگی سمجھتا ہے اور اس جہان کی زندگی کو سوائے لہو ولعب اور کھیل کود کے کوئی حیثیت نہیں دیتا، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾ (عنکبوت)

''اس جہاں کی زندگی سوائے لہو ولعب اور کھیل کود کے اور کوئی چیز نہیں ہے، اور آخرت کا گھر ہی حقیقی زندگی ہے اگر وہ سمجھیں۔

بچے اور نوجوان کھیلتے وقت اپنے لیے کسی ایک کو رئیس وسردار اور باقی کو رعایا قرار دے لیتے ہیں اور اپنے لیے کئی منصب دار بنا لیتے ہیں۔لیکن وہ سب دائمی اور ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتے چند لحات کے بعد ان منصب داروں میں سے کسی کا پتہ نہیں ہوتا اس جہان کی زندگی اور اس کے تمام مقام

ومنصب جلدی گذر جانے کے لحاظ سے دو بچوں یا چار جوانوں کے کھیل کے دورانیہ کی مانند ہے جو غروب آفتاب تک کے لیے اپنے لیے ایک پروگرام طے کرتے ہیں اور اندھیرا چھاتے ہی سب کچھ درہم وبرہم کر دیتے ہیں۔

اسی بناء پر جس طرح اخروی زندگی کے مقابلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیاوی زندگی کوئی نہیں ہے اور وہ کھیل کود اور بازیچہ اطفال کے سوا اور کچھ نہیں ہے اسی طرح واجب الوجود کے پرتواں و پرفروغ وجود کے مقابلہ میں ممکنات کے وجود کو حقیر اور بے واقعیت شمار کیا جا سکتا ہے۔

سعدی ان لوگوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اس حقیقت کو اپنے عمدہ اشعار میں ڈھالا ہے وہ اس بارے میں اس طرح فرماتے ہیں۔

ره عقل جز پیچ درپیچ نیست
برعاشقاں جز خدا ہیچ نیست

تواں گفتن ایں با حقیقت شناس
ولی خرده گیر ندا اہل قیاس

که پس آسمان وزمین چیتند؟
بنی آدم ودام ودرکیتند؟

پسندیده پر سیدی اے ہوش مند
بگویم جو ابت گراید پسند!!

که هامون ودریاو کوه و فلک
پری، آدمیزادو دیو وملک

ہمه ہر چه ہستند ازاں کمترند
که باهتیش نام ، ہستی برند

عظیم است پیش تو دریاوموج
بلند است خورشیدِ تاباں براوج

ولی اہل صورت کجاپے برند؟
که اربابِ معنی به ملکی درند

که گر آفتابست یک ذره نیست
وگرهفت دریاست یک قطره نیست

چوسلطاں عزّت علم برکشید

جہان سربه حبیبِ عدم برکشید[1]

ترجمہ:

عقل کی راہ پیچ در پیچ کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور عاشقوں کے لیے خدا کے سوا کچھ نہیں ہے یہ بات حقیقت شناس لوگوں سے تو کہی جاسکتی ہے لیکن قیاس کرنے والے اس پر اعتراض ہی کریں گے (وہ کہیں گے کہ) پھر آسمان وزمین کیا ہیں! اور اولاد آدم، اور جانور اور درندے کیا ہیں اے عقل مند آدمی تو نے یہ اچھی بات پوچھی ہے میں تیرے سوال کا جواب دیتا ہوں اگر تجھے پسند آجائے کہ بیابان، دریا، پہاڑ اور آسمان جن و پری آدم زاد اور دیو اور فرشتے یہ سب کے سب جو کچھ ہیں اس سے کمتر ہیں کہ اس کے وجود وہستی کے ساتھ ان کو وجود کا نام دیا جائے تیرے نزدیک تو سمندر اور اس کی موج بڑی چیز ہے اور خورشید تاباں اوج پر بلند ہے لیکن ظاہر بین لوگ اس حقیقت کو نہیں پاسکتے کہ جس ملک میں اربابِ معنی داخل ہوسکتے ہیں (ان کے نزدیک) آفتاب ایک ذرہ کے برابر بھی نہیں ہے اور ساتوں سمندر (مل کر بھی) ایک قطرہ نہیں ہے جب وہ عزیز و غالب بادشاہ علم لہرائے گا تو سارا عالم معدوم ہوجائے گا:

جہاں ہستی کے بارے میں اس حقیقت پر نظر کرتے ہوئے واقعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدا کے سوا ہر چیز باطل اور بے حقیقت ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ (حج۔٦٢)

٢۔قرآن مجید

قرآن نے متعدد آیات میں اپنی ''حق'' کے ساتھ توصیف کی ہے۔قرآن سے بڑھ کر اور کونسا حق ہوگا، جس کے عقلی معارف اور حیات بخش احکام ودساتیر میں ذرہ بھر غلطی اور خطا نہیں ہے اور اس کے اس دعوے میں کہ وہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے معمولی سے معمولی شک وشبہ نہیں ہے اور اس حقیقت کا حامل ہونے کی وجہ سے ثابت و پائیدار اور پیغمبر گرامی کا جادانی معجزہ ہے۔

گویا خدا کا کلام خود خدا کی طرح حقِ مطلق ہے جس کی طرف باطل کی کوئی راہ نہیں ہے اور وہ ہر قسم کے باطل سے مبرا منزہ ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝٤١ لَّا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ

---

[1] بوستان سعدی، ص ١١٨، چاپ ١٣٣٨۔

مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ ﴿۴۲﴾ (حٰم السجدہ)

''یہ عزت والی کتاب ہے جس میں باطل کے لیے کوئی راہ نہیں ہے لائق حمد خداوند حکیم کی طرف سے بھیجی گئی ہے۔''

اس بناء پر خدا کی ذات حق مطلق ہے اور اس کی کتاب حق مطلق ہے۔ خدا حق مطلق ہونے کی وجہ سے ازلی وابدی ہے اور اس کی آسمانی کتاب ایسی حقیقت کی وجہ سے ابدی وجاودانی ہے۔

وہ آیات جو قرآن کی حق مطلق کے ساتھ توصیف کرتی ہیں یہ ہیں:

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَيَكۡفُرُوۡنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمۡ ؕ (بقرہ۔۹۱)

''جب یہودیوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے جو کچھ نازل کیا ہے اس پر ایمان لے آؤ، تو وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم اس چیز پر جو ہم پر نازل ہوئی ہے (تورات) ایمان لاتے ہیں۔ اور اس کے غیر سے کفر کرتے ہیں حالانکہ قرآن حق ہے اور اس تورات کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس ہے۔''

قرآن کی حقانیت کی شناخت کا ایک طریقہ اہل کتاب کے ان بے غرض علماء کی طرف رجوع کرنا ہے جو آسمانی کتابوں کی شناخت اور پیغمبروں کی زندگی کی سیرت سے مکمل طور پر آگاہ ہیں اسی بناء پر قرآن ذیل میں بیان کردہ آیت میں خود کو ''حق'' کہنے کے باوجود دوسروں کو سمجھانے کے لیے پیغمبر کو خطاب کرتا ہے۔ کہ اگر وہ قرآن کی حقانیت اور خدا کی طرف اس کی نسبت کے بارے میں شک وشبہ رکھتے ہیں تو یہود ونصاریٰ کے علماء سے پوچھ سکتے ہیں، جیسا کہ فرماتا ہے۔

فَاِنۡ كُنۡتَ فِىۡ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ فَسۡــَٔلِ الَّذِيۡنَ يَقۡرَءُوۡنَ الۡـكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكَ ۚ لَقَدۡ جَآءَكَ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ۙ﴿۹۴﴾ (یونس)

''جو چیز ہم نے تم پر نازل کی ہے اگر تمہیں اس میں کچھ شک ہے تو ان لوگوں سے جو تجھ سے پہلے کتاب (عہدین) پڑھتے ہیں پوچھ لو تیرے پروردگار کی طرف سے حق (کتاب) تیری طرف آئی ہے۔''

لہٰذا شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔''

پھر اس سورہ (یونس آیت ۱۰۸) میں قرآن کی حق کے ساتھ توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ ۚ فَمَنِ اهۡتَدٰى فَاِنَّمَا يَهۡتَدِىۡ لِنَفۡسِهٖ ۚ

اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس حق آیا ہے۔ جو شخص ہدایت کو قبول کرے گا وہ خود اپنے ہی لیے ہدایت کو قبول کرے گا۔

اور آیت میں ''حق'' سے مراد ہی قرآن ہے، اس کا گواہ یہ ہے کہ بعد والی آیت میں کہتا ہے:

وَاتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡکَ (یونس۔۱۰۹)

جو کچھ ہم نے تجھ پر وحی کی ہے اس کی پیروی کر۔

قرآن نے دوسری آیات میں بھی اپنی ''حق'' کے ساتھ توصیف کی ہے، برائے مہربانی سورہ سجدہ آیت ۳، وسبا آیت ۶، ۴۸، وفاطر آیت ۳۱ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۳۔ توحید اور یکتا پرستی

جس دن پیغمبر گرامی نے شرک کے قلعہ کو تباہ و برباد کر دیا اور شرک کے مرکز کو فتح کر لیا تو ''ھبل'' ''و'' ساف'' اور ''نائلہ'' بت خانہ کعبہ کے دروازے پر نصب تھے پیغمبر اس عظیم کامیابی کے شکرانے کے طور پر، جو لشکر اسلام کو نصیب ہوئی تھی مسجد میں وارد ہوئے اور اشارے سے تمام لوگوں کو خاموش رہنے کی دعوت دی اور خود طواف میں مصروف ہو گئے اور طواف کے پہلے ہی چکر میں ان تینوں بتوں کی طرف متوجہ ہوئے جو کعبہ کے دروازے پر نصب تھے اس موقع پر اسی نیزے سے جو آپ کے ہاتھ میں تھا ان پر ایک محکم ضرب لگائی اور سب کو زمین پر گرا دیا اور اس آیت کی تلاوت کی۔

وَقُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا ﴿۸۱﴾ (اسراء)

''اور کہہ دے حق پرشکوہ فتح مندی کے ساتھ جلوہ افروز ہوا، اور باطل محو و نابود ہو گیا، اور یقینا باطل نابود ہونے والا ہے[1]

اگر چہ یہ آیت ایک وسیع معنی رکھتی ہے لیکن حق و باطل کا واضح ترین مصداق وہی حق کی پرستش اور فضول و باطل معبود نماؤں کی پرستش کی نابودی ہے اس صورت میں اس کی پرستش اسی وجہ سے حق ہوگی اور اس کے مقابلہ میں چونکہ جھوٹے معبودوں میں کسی بھی قسم کا کوئی بھی کمال نہیں ہے لہذا ان کی پرستش سبب وعلت کے فقدان کی وجہ سے قہراً باطل، فضول اور بیہودہ ہوگی۔ اور اسی آیت کی نظیر ذیل کی دو آیتیں ہیں:

لِیُحِقَّ الۡحَقَّ وَیُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۚ﴿۸﴾ (انفال)

''تا کہ حق کو پائیدار اور باطل کو ناپائیدار کر دے چاہے گناہگاروں کو یہ بات اچھی نہ لگے۔''

---

[1] مجمع البیان ج ۴ ص ۴۳۷ و تفسیر فخر رازی ج ۵ ص ۵۴۴ طبع شبت جلدی

اس آیت میں حق سے مراد یکتا پرستی، یا مجموعی طور پر تمام تعلیماتِ اسلامی ہیں۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴿۴۹﴾ (سبا)

''کہہ دے حق آ گیا ہے اور باطل کے لیے نہ ابتداء رہی نہ انتہا۔''

۴ معجزہ

اعجاز، سحر اور جادو کے مقابلہ میں ہے قرآن پہلے کو ''حق'' اور دوسرے کو ''باطل'' کہتا ہے کیونکہ معجزہ خدا کے ارادہ قاہرہ کے ماتحت ہوتا ہے جو ہر طرح کے بطلان اور کمزوری سے پاک ہے جبکہ جادو اور سحر، ساحر کے ضعیف و ناتوان ارادہ سے مدد حاصل کرتا ہے قرآن اس بارے میں فرماتا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾ (یونس)

''جب حق ہماری طرف سے آیا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو وہی کھلا ہوا جادو ہے تو موسیٰ نے ان سے کہا کیا تم حق (معجزے) کو جو تمہاری طرف آیا ہے جادو کہتے ہو، اور جادوگر تو کبھی بھی فلاح نہیں پائیں گے۔''

قرآن کئی آیات کے ضمن میں معجزہ کی حقیقت کو جو حق تعالیٰ کے ناپذیر ارادہ کے ماتحت ہوتا ہے۔ اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (رعد آیت ۳۸)

''کسی بھی پیغمبر کے لیے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ خدا کے اذن کے بغیر کوئی معجزہ لے آئے۔''

قرآن ایک دوسری آیت میں سحر کی واقعیت کو خود ساحر کی طرف نسبت دیتا ہے اور اس کے بعد یہ بتلاتا ہے کہ سحر حق تعالیٰ کے ارادہ قاہرہ کے ذریعہ نابود ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ (یونس۔۸۱)

''جو کچھ تم لائے ہو وہ تو جادو ہے اور خدا اُسے نابود کر دے گا۔''

اور دوسری جگہ فرماتا ہے:

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ (اعراف)

''حق ظاہر ہو گیا اور ان کے کام باطل ہو گئے۔''

۵۔ پیغمبر کی نبوت

قرآن پیغمبر کو حق کا واضح و روشن مصداق سمجھتا ہے اور اس بارے میں فرماتا ہے۔

رَبَّنَا لَوۡلَاۤ اَرۡسَلۡتَ اِلَيۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الۡحَقُّ مِنۡ عِنۡدِنَا قَالُوۡا لَوۡلَاۤ اُوۡتِیَ مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی ؕ اَوَلَمۡ يَكۡفُرُوۡا بِمَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی مِنۡ قَبۡلُ ۚ (قصص۔۴۷۔۴۸)

''(وہ کہتے ہیں) پروردگارا! تو نے ہماری طرف کوئی پیغمبر کیوں نہیں بھیجا تا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اس پر ایمان لے آتے۔لیکن جب ہماری طرف سے ان کے پاس حق آ گیا (تو انہوں نے اس پر اعتراض شروع کر دیئے) اور انہوں نے کہا کہ وہ موسیٰ جیسا معجزہ لے کر کیوں نہیں آیا۔کیا انہوں نے موسیٰ کے معجزہ کا بھی انکار نہیں کیا تھا؟''

کیونکہ پیغمبروں کی نبوت واقعیت و حقیقت رکھتی ہے،لہٰذا خود پیغمبر کا حق کے مصداق کے طور پر تعارف ہوا ہے۔

٦۔ قیامت

قبروں سے اٹھانا اور انسان کا نئے سرے سے زندہ ہونا جو ایک زیادہ مکمل زندگی کا آغاز ہے، ایسے حقائق میں سے ہے جس کی تمام آسمانی پیغمبروں نے خوشخبری دی ہے اور اس قسم کی اصل کے اعتقاد کے بغیر دین اپنے واقعی معنی کے لحاظ سے امکان پذیر نہیں ہے قرآن اس بارے میں فرماتا ہے:

يَسۡتَعۡجِلُ بِهَا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مُشۡفِقُوۡنَ مِنۡهَا ۙ وَيَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهَا الۡحَقُّ ؕ (شوریٰ۔۱۸)

''کافر لوگ قیامت کے برپا ہونے کا انکار کرتے ہیں،اور ایمان لانے والے اس سے ڈرتے ہیں،اور یہ جانتے ہیں کہ وہ حق ہے۔''

قرآن اس کے بعد پھر اس سلسلے میں فرماتا ہے۔

وَيَسۡتَنۡۢبِـُٔوۡنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؔ قُلۡ اِیۡ وَرَبِّیۡۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔ وَمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ﴿۵۳﴾

(یونس)

''وہ تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا قیامت حق ہے کہہ دے مجھے اپنے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ حق ہے اور تمہارے لیے اس سے گریز کرنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔''

اور ناصر خسرو علوی کے قول کے مطابق:

روزگار وچراخ وانجم سر به سر باز یستی
گر نه این روز درازدهر رافردا ستی

اگر زمانہ کے اس طویل دن کے لیے کوئی کل (قیامت) نہ ہوتو پھر زمانہ اور آسمان اور ستارے سراسر ایک کھیل ہی کھیل ہیں۔

اور ایک اور دوسرے شاعر کے قول کے مطابق:

من به خود نامدم اینجا، که به خود باز روم
آں که آور ده مرا باز برد در وطنم

میں یہاں پر اپنے آپ نہیں آیا ہوں، کہ خود پلٹ کر جاؤں، جو مجھے یہاں لایا ہے وہی مجھے میرے وطن کی طرف دوبارہ لے جائے گا۔

۷۔ مالِ مشروع

قرآن اس حلال مال کو جو قرض دار کے ذمہ ہے حق کا نام دیتا ہے، اور یہ حکم دیتا ہے کہ قرضہ اور تمام مطالبات کسی عادل لکھنے والے کے ذریعہ لکھے جانے چاہئیں، جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَلۡيُمۡلِلِ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَـقُّ وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبۡخَسۡ مِنۡهُ شَيۡـــًٔا ‌ؕ فَاِنۡ كَانَ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَـقُّ سَفِيۡهًا اَوۡ ضَعِيۡفًا اَوۡ لَا يَسۡتَطِيۡعُ اَنۡ يُّمِلَّ هُوَ فَلۡيُمۡلِلۡ وَلِيُّهٗ بِالۡعَدۡلِ (بقرہ۔ ۲۸۲)

''وہ شخص کہ جس کے ذمہ کوئی قرضہ ہو، وہ ایک تحریر پر تصدیق و دستخط کرے، اور تقویٰ اختیار کرے (اور قرض کے ادا کرنے کی کوشش کرے) اور اس میں سے کوئی چیز کم نہ کرے اور اگر قرض دار کم عقل، نادان و ناتوان ہو، اور وہ

خود تحریر نہ کرا سکتا ہو تو پڑھ اس کا ولی، انتہائی عدالت کے ساتھ تحریر پر تصدیقی دستخط کرے۔"

اگر قرآن دنیا کے مال کو حق کہتا ہے تو وہ اس کام اور کوشش کی وجہ سے ہے جو اس کے مالک نے اس کے حاصل کرنے میں کی ہے، اور اس نے اس کا مالک اور حقدار بنانے کی لیاقت پیدا کی ہے۔

۸۔ واقعیت کا اظہار کرنے والی ضرب المثل

عقل مند لوگ اپنے محاورات اور روزمرہ باتوں میں مثالوں سے مدد لیتے ہیں اور نظری امور کی مثال کو حسیّ امور کے قالب میں ڈھال کر مطالب کو مخاطب کی نظر میں مجسم کر دیتے ہیں۔ قرآن جھوٹے معبودوں کی قدرت کی بنیاد کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس طرح مثال دیتا ہے اور فرماتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ (حج)

"اے لوگو! ایک مثال بیان کی گئی ہے، اسے کان دھر کر سنو۔ تمہارے جھوٹے بت سارے کے سارے مل کر بھی ایک مکھی کے پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ اور اگر ناتواں مکھّی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اُسے واپس لینے کی قدرت نہیں رکھتے، طالب و مطلوب دونوں ہی ناچیز و ناتوان ہیں۔"

جھوٹے معبودوں کی تحقیر و تذلیل کے لیے کوئی دلیل و برہان بھی اس مثال جیسی بلیغ نہیں ہو سکتی، اور نہ ہی اس قسم کے میلان و رجحان کی بیہودگی کو اس طرح سے واضح کر سکتی ہے بت پرست اس مثال سے اور مکڑی کی مثال سے جو سورہ عنکبوت (کی آیت ۴۱) میں وارد ہوئی ہے سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے یہ مغالطہ دینا شروع کر دیا کہ خدا نے حقائق کو بیان کرنے میں ان بے قدر و قیمت حیوانات کا ذکر کیوں کیا ہے، خدا نے ان کے جواب میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ (بقرہ۔۲۶)

"خدا اس بات سے کہ مچھر اور مکھی، بلکہ (حقارت کے لحاظ سے) ان سے زیادہ بظاہر چھوٹی موجودات کی مثل بیان کرے، شرم نہیں کرتا۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ مثالیں حق ہیں (اور جھوٹے معبود مکھی سے

بھی پست ہیں) لیکن جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے (وہ ان مثالوں کو بہانہ بناتے ہوئے) کہتے ہیں کہ ان مثالوں کے دینے سے خدا کا کیا مقصد ہے۔''

قرآن اس آیت میں زیر نظر مثل کو ''حق'' کہتا ہے کیونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت و واقعیت کو جو بتوں کی وہی ناتوانی اور حقیر ہونا ہے بیان کرتی ہے۔

۹۔ رزاق و مواعید

قرآن آسمان کو انسان کے ارزاق و مواعید کا سرچشمہ قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ﴿٢٢﴾ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ ﴿٢٣﴾ (ذاریات)

''تمہارے رزق اور جس چیز کا ہم نے تم سے وعدہ کیا ہے، آسمان میں ہے آسمان و زمین کے پروردگار کی قسم یہ مطلب حق ہے، جس طرح کہ تم بات کرتے ہو۔''

اب اس آیت میں آسمان سے مراد کیا ہے؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، ایک گروہ اسے (اوپر کی سمت) کے معنی میں لیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اس سے مراد برف اور بارش ہے، جو زمین پر پڑتی ہے اور گھاس اور درختوں کے اگنے اور جانوروں کی پرورش کا سبب بنتی ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد عالمِ غیب ہو، جو قرآن کے نظریہ کے مطابق [۱]

ہر چیز وہیں پر پیدا ہوتی ہے اور وہیں سے اترتی ہے، خاص طور پر اگر ہم یہ کہیں کہ ''وما توعدون'' سے مراد بہشت موعود ہے۔ [۲]

۱۰۔ خلل ناپذیر واقعیتیں

گذشتہ موارد میں تو واضح مصادیق پیش کیے ہیں لیکن دوسری آیات میں اس لفظ کو اپنے بہت ہی وسیع معنی میں استعمال کیا ہے، اور یوں فرماتا ہے:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ (انبیاء آیت ۱۸)

''ہم ہمیشہ حق کو باطل پر فتحیاب کرتے ہیں تاکہ وہ باطل کو محو و نابود کر دے۔''

یہ آیت حق کی پائیداری اور باطل کی ناپائیداری کو بیان کر رہی ہے جو دونوں کی خصوصیات میں شمار ہوتے ہیں اور ہم آئندہ قرآن کے لحاظ سے

---

[۱] سورہ حجرات ۲۱۔

[۲] تفسیر المیزان ج ۱۸ ص ۴۰۷۔

دونوں کی خصوصیات کے بارے میں بحث کریں گے۔

وہ کام جو حق ہیں

قرآن بہت سے موارد میں افعال خداوندی کی لفظ ''بالحق'' کے ساتھ توصیف کرتا ہے، مثلاً جہاں وہ آسمان وزمین کی خلقت کے بارے میں بات کرتا ہے تو بلا فاصلہ لفظ ''بالحق'' اس کے بعد لاتا ہے اور اس طرح فرماتا ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ (انعام۔۷۳)

''اور وہی تو ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔''

یہ مضمون اور یہ تعبیر متعدد سورتوں مثلاً سورہ عنکبوت آیت ۴۴ سورہ زمر آیت ۵ اور سورۃ جاثیہ آیت ۲۲ میں بھی وارد ہوئی ہے۔

اور ایک دوسری جگہ فرماتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ (ابراہیم۔۱۹)

اور یہ بھی فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ (حجر۔۸۵)

اس قسم کی آیات کے سمجھنے کی کلید یہ ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ ان موارد میں لفظ ''باء'' ''مصاحبت'' اور ہمراہ ہونے کے معنی میں ہے یعنی آسمانوں اور زمین کی خلقت حق کے ہمراہ ہے اور ان کی خلقت وآفرنیش عبث، لغو اور کھیل تماشہ کے طور پر نہیں ہے، جیسا کہ دوسری آیات میں اس حقیقت کو زیادہ واضح صورت میں بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ﴿۱۶﴾ (انبیاء)

اور پھر فرماتا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ﴿۳۸﴾ (دخان)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚ

(ص۔۲۷)

تینوں آیات کا مضمون یہ ہے کہ ہم نے آسمان وزمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اُسے عبث، فضول اور بے مقصد پیدا نہیں کیا۔

اس بیان سے بہت سی آیات کا معنی جن میں خدائی فعل کی لفظ ''بالحق'' کے ساتھ توصیف کی گئی ہے سمجھ میں آسکتا ہے نمونہ کے طور پر خدا نے چند آیات میں قرآن کے نزول اور پیغمبر اسلام کی بعثت کی بھی لفظ ''بالحق'' کے ساتھ توصیف کی ہے اور اس بارے میں فرماتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ (بقرہ۔۱۷۶)

''خدا نے قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔''

اور دوسری جگہ فرماتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ (نساء۔۱۷۰)

''اے لوگو پیغمبر تمہارے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔''

اس قسم کی قید کا مقصد یہ ہے کہ کتاب کا نزول خدا کی طرف سے ہے یا پیغمبر اسلام کی بعثت حق کے ساتھ اور بطلان وخطا اور اشتباہ کی ان میں ہرگز بھی گنجائش نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کے تمام موارد میں لفظ ''بالحق''، فعل خدا کے حق کے ساتھ اور اس کے ہمراہ ہونے کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ کام حقیقت کے ہمراہ ہے جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہر مورد میں لفظ ''حق'' کے لیے کوئی مناسب مصداق (مثلاً آسمان وزمین کی خلقت میں مقصد کا ہونا اور نزول کتاب اور پیغمبر کی بعثت میں جھوٹ خطا اور اشتباہ کا نہ ہونا) تلاش کیا جائے اور آیت کی توضیح کی جائے۔

حق و باطل کی خصوصیات

قرآن اور لغت عرب میں ''حق وباطل'' کے وسیع مفاہیم سے، اور اسی طرح ان دونوں الفاظ کے مصادیق سے جو قرآن میں آئے ہیں، ہم واقف ہو چکے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم دونوں الفاظ کے آثار وخصوصیات سے بھی۔ جن کی طرف قرآن میں اشارہ یا تصریح ہوئی ہے__ آشنا ہوں، کیونکہ خصوصیات کی پہچان کسی چیز کی واقعیت کی شناخت کے طریقوں میں سے ایک شمار ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات تو کسی چیز کی شناخت اس کے آثار وخواص کی شناخت پر ہی منحصر ہوتی ہے اور اس چیز کی ماہیت ابہام میں ہی رہتی ہے اتفاقاً علوم طبعی میں اکثر یہی واقعہ پیش آتا ہے۔ مثلاً ہم الیکٹریسٹی (برق وبجلی) کے بارے میں سوائے خواص کے اور ایٹم کے بارے میں سوائے خصوصیات کے اور کچھ نہیں جانتے اور ان دونوں چیزوں کی واقعیت ابہام میں پوشیدہ ہے، اور صرف خواص کے ذریعہ ہی ان سے آشنائی ہو سکتی ہے اب ہم حق وباطل کے بارے میں بھی اس راہ کو طے کرتے ہیں۔

حق پائیدار اور باطل ناپائیدار

حق وباطل کا نمایاں ترین اثر حق کی پائیداری اور باطل کی ناپائیداری ہے۔ حق واقعیت رکھنے کی بناء پر جاودانی اور ابدی ہے اور باطل حقیقت سے خالی ہونے کی بناء پر وقتی خودنمائی سے زیادہ نہیں ہوتا۔

حق خالص سونے کی طرح ہے جس کی چمک میں زمانہ کے گزرنے سے کوئی کمی نہیں ہوتی، جبکہ باطل ایک ایسا ظاہری طور پر حق دکھائی دینے والا ہے کہ جس نے چند روز کے لیے حقیقت کا نقاب اپنے چہرہ پر ڈال لیا ہے۔ اور اس سیاہ تانبے کی طرح ہے کہ جس پر سونے کا پانی چڑھایا گیا ہو، جس کا پانی کچھ ہی دن کے بعد پرانا ہو جاتا ہے اور اپنی ماہیت کو نمایاں کر دیتا ہے۔

قرآن مجید اس خصوصیت پر تکیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَى الۡبَاطِلِ فَيَدۡمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ (انبیاء۔۱۸)

ہم حق کے ذریعہ باطل کو مٹا دیں گے، اور نتیجہ میں حق اسے نابود کر دے گا، اور باطل اچانک زائل ہو جائے گا۔

پائیدار علمی، فلسفی اور اخلاقی مکاتب

ہر فکر و نظر اور علمی و فلسفی و اخلاقی نقشہ جو سوچ سے باہر کے ساتھ موافق ہو، اور محیط فکر سے باہر ایک واقعیت کو بیان کرے طبیعی طور پر اس قسم کی فکر حق اور استوار ہوگی اور واقعیت کی پائیداری کے ساتھ خود وہ فکر بھی ثابت و پائیدار ہوگی لیکن ہر قسم کی ایسی فکر و اندیشہ جو ایسی واقعیت کے ساتھ، جس کا فکر کے محیط سے باہر تکیہ نہ ہو، ایک ثابت و استوار تکیہ گاہ کے نہ ہونے کی وجہ سے خود بخود باطل، فضول اور ناپائیدار ہوگی۔

اگر قواعد ریاضی اور اصل ہندسہ اور بہت سے طبیعی علوم حق اور پائیدار ہیں تو وہ اسی سبب سے ہیں جو بیان ہوا، کیونکہ وہ سب فکر و نظر کے محیط سے باہر واقعیت کے ساتھ موافق ہیں اور ایک ثابت و پائیدار واقعیت کے حامل ہیں۔ اور اس کی پائیداری کی وجہ سے ہی خود وہ اصول بھی ابدیت کا رنگ اور ہمیشگی کی صورت اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس نظریات کا وہ سلسلہ جو چند ایک تخیّلات واوہام پر استوار ہے پلک جھپکنے میں لغو و نابود ہو جاتا ہے۔

یہ صرف علمی و فلسفی افکار ہی نہیں ہیں جو دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں بلکہ اجتماعی دعوتیں اور سیاسی و اخلاقی مکاتبِ فکر بھی اس تقسیم سے الگ نہیں ہیں۔ ہر قسم کی اصلاح دعوت اور اجتماعی و اخلاقی قوانین جو فطرت انسانی، اصول عدل و انصاف اور رعایتِ حقوقِ بشری کی بنیاد پر استوار ہوں وہ طبیعی طور پر پائیدار ہوں گے اور ابدی صورت اختیار کر لیں گے۔ اور اس کے خلاف جنگ پانی کی روانی کے برخلاف تیرنے کے مانند ہے جس کے ساتھ مبارزہ کرنے والا شخص تھوڑی سی دیر میں خستہ و ناتواں ہو جاتا ہے جس طرح سے مذکورہ تیرنے والا شخص کچھ مدت کے بعد خستہ و ناتواں ہو جاتا ہے اور اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ پانی کی طبیعی روانی کی طرف تیرے یہ شخص بھی آخر کار مجبور ہو جاتا ہے کہ جنگ سے ہاتھ کھینچ لے، اور اصولِ فطرتِ انسانی اور عدل و انصاف کے قوانین کی پیروی کرے۔

چند گروہ اور سیاسی جماعتیں جن کی نیتیں صحیح اور سالم نہیں ہوتیں، عمومی افکار کو جلب کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ تا کہ اپنے مقاصد اور نیتوں کو اصول انسانی کے قالب اور فطری خواہشات میں پیش کریں۔ وہ اس راہ میں پردوں اور نقابوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن کچھ مدت کے بعد وہ نقاب اتر جاتا ہے اور ماہیت و اصلیت کے واضح ہو جانے کے بعد خود وہ جماعت اپنی تمام نیتوں اور مقاصد کے ساتھ فراموشی کے سپرد ہو جاتی ہے۔

یہ خصوصیت ایک مثال میں، جو قرآن نے حق و باطل کی تصویر کشی کی بنیاد پر پیش کی ہے۔ واضح صورت میں وارد ہوئی ہے اور اس بحث میں ہم اس کی تشریح و تفصیل پیش کریں گے۔

یہی وہ اصل ہے کہ جس کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے۔

"للحق دولة وللباطل جولة۔"

حق ثابت و پائیدار ہے اور باطل کے لیے وقتی خودنمائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

احادیث اسلامی میں آیا ہے۔

"الحق القديم لايبطله شيئ۔"

قدیم حق کو کوئی چیز باطل نہیں کرتی۔"

باطل کی پائیداری وقتی کیوں ہے؟

اگر حق کا تکیہ واقعیت پر ہے اور باطل ہر قسم کی واقعیت سے عاری ہے تو پھر ہم باطل کی وقتی پائیداری کی کیسے توجیہ کریں اور یہ کیوں کہتے ہیں کہ "للباطل جولة" جب کہ ہر قسم کی حقیقت سے خالی ہونے کی بناء پر اسے ایک لمحہ کے لیے بھی دوام نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن اس سوال کا جواب واضح ہے کیونکہ باطل ہمیشہ حق کے لباس میں اور حقیقت کا نقاب ڈال کر میدان میں قدم رکھتا ہے اور اس طریقہ سے سادہ لوح افراد کو دھوکہ دیتا ہے اور ایک مدت تک افکار کو اپنی طرف متوجہ کئے رہتا ہے اور اگر وہ پہلے دن سے ہی اپنے واقعی چہرہ کے ساتھ خودنمائی کرے تو ہرگز بازار حقیقت میں وقتی طور سے بھی خودنمائی نہ کر سکے۔

امیر المومنین (ع) نے اس بارے میں بہت ہی عمدہ بات کہی ہے جو غور اور توجہ کے لائق ہے، فرماتے ہیں۔

"فلوان الباطل خلص من مزاج الحق، لم يخف على المرتادين والوان الحق خلص من لبس الباطل انقطعت عنه السن المعاندين، ولكن يؤخذ من هٰذا ضغث ومن هٰذا ضغث فيمزجان۔"[1]

اگر باطل کو حق کے ساتھ ملا کر پیش نہ کیا جاتا تو (حق چاہنے والوں کے لیے) حق پوشیدہ نہ رہتا اور اگر حق باطل کے درمیان پنہاں نہ ہوتا تو دشمن کبھی بھی اس کی بدگوئی نہ کر سکتے لیکن (ہوتا یہ ہے کہ) کچھ حصہ حق میں سے اور کچھ

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۵۰۔

باطل میں سے لے کر انہیں ملا دیا جاتا ہے تو اس وقت شیطان اپنے دوستوں پر مسلّط ہو جاتا ہے۔''

حق و باطل کی دوسری خصوصیات

قرآن مجید حق و باطل کی خصوصیات کی تصویر کشی کے لیے ایک مثال پیش کرتا ہے جو اس سلسلے میں بہت ہی عمدہ اور بے نظیر ہے اور اس مثال کے مضمون میں غور و فکر ہمیں حق و باطل کی بہت سی خصوصیات سے آشنا کر دیتا ہے۔ اب ہم آیت کا متن اس کے ترجمہ کے ساتھ یہاں پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم ان اسرار و رموز کی طرف جن کا اس مثال سے علم ہوتا ہے ریاضی کی رقوم کے ماتحت اشارہ کریں گے۔

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَـقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ

(رعد۔۱۷)

''خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا اور وہ پانی دریاؤں اور نہروں میں ان کی گنجائش کے مطابق جاری ہو گیا (اور چھوٹے چھوٹے ندی نالے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر سیلاب بن گئے) سیلاب نے اوپر آنے والی جھاگ کو اپنے اوپر اٹھالیا۔ (یہ نہ صرف سیلاب ہے جو جھاگ کو اپنے اوپر اٹھاتا ہے) بلکہ ان دھاتوں کے اوپر بھی جو زینت کے لیے یا زندگی کے آلات کے طور پر آگ کے دباؤ سے پگل جاتی ہیں۔ جھاگ آ جاتے ہیں، خدا اس طرح سے حق و باطل کی تصویر کشی کرتا ہے (اور حق و باطل کے ثبات و پائیداری کے اندازہ کو مجسم کرتا ہے) لیکن جھاگ تو ختم ہو جاتی ہے، مگر وہ چیز جو لوگوں کے لیے سودمند ہے (مثلاً خود پانی اور دھاتیں) وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے، خدا اس طرح سے مثالیں بیان کرتا ہے۔ (اور حق و باطل کی حقیقت کو واضح کرتا ہے)''۔

قرآنی مثالوں میں سے یہ مثال ایک پر مغز اور پر معنی مثال ہے۔ اس آیت میں حق و باطل کے مبارزہ، اور ان دونوں کی حیثیت اور نتائج کی ایک دقیق اور پر نکتہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس مثال میں حق کو پانی اور دھات سے تشبیہ دی گی ہے اور باطل کو پانی کی جھاگ اور پگھلی ہوئی دھاتوں کی جھاگ کے مانند قرار دیا گیا ہے۔ اس مثال میں بھی ان ہی آیات کی مانند جنہیں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ثبات و پائیداری کو حق کے آثار میں سے اور بے ثباتی اور زائل ہونے کو باطل کی علامت بتایا گیا ہے حق کو پانی اور دھات کی طرح صاف وشفاف سمجھتا ہے جو اپنی راہ میں روئے

زمین پر باقی رہ جاتا ہے اور کچھ ہی عرصہ کے بعد چشمہ اور کنویں کی صورت میں ظاہر ہوجاتا ہے، یا آلات اور زندگی کے اوزار کی صورت میں لوگوں کے کام آتا ہےلیکن باطل پانی کے اوپر کی جھاگ، یا پگھلی ہوئی دھاتوں کے اوپر کی جھاگ کے مانند ہے جو بالکل بے ثبات ہے اور جو چند لمحات کے بعد اتار کر پھینک دی جاتی ہے۔ اور یہ وہی خصوصیت ہے جو گذشتہ آیات میں بھی بیان ہوئی ہے اب ضروری ہے کہ ہم اس مثال کے دوسرے اسرار و رموز، جو میدان مبارزہ میں حق و باطل کی حقیقت و ماہیت کو بیان کرتے ہیں پیش کریں، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ''پائیداری'' اور ناپائیداری'' حق و باطل کا پہلا اثر ہے، اس کی خصوصیت کے دوسرے آثار کو شمارہ نمبر دو سے آغاز کرتے ہیں۔

۲۔ باطل کا ظاہر فریب دینے والا اور اس کا اندر خالی ہوتا ہے اس کے باوجود وہ پانی کی جھاگ اور پگھلی ہوئی دھاتوں کی جھاگ کی طرح خودخواہ اور بلند پرواز ہوتا ہے۔لیکن حق ہر قسم کے فریب، دھوکہ دہی اور کھوکھلے تظاہرات سے دور ہوتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ متواضع اور تکبر و بلند پروازی سے پاک و منزہ ہوتا ہے۔

قرآن نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے لفظ ''زبد'' کو جو جھاگ کے معنی میں ہے ''رابیاً'' کے لفظ کے ساتھ جو اوپر آجانے والی کے معنی میں ہے، بیان کیا ہے۔

۳۔کبھی حق و باطل کا مبارزہ ایمان و کفر کے مبارزہ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس صورت میں حق (ایمان) کو پانی سے تشبیہ دینا، ایک خاص تجلی دکھاتا ہے کیونکہ جس طرح سے پانی مایہ حیات، بلکہ حیوانات و نباتات کی زندگی کی جڑ بنیاد ہے۔ اور قرآن مجید اس کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۚ (انبیاء۔۳۰)

''ہم نے ہر زندہ موجود کو پانی سے پیدا کیا ہے۔''

اسی طرح خدا اور روز جزا پر ایمان حیاتِ اجتماعی کا سبب ہے۔ اور خدا پر ایمان کے سایہ میں عدل اجتماعی جو حقیقت میں اجتماعی زندگی کا سبب ہے زندہ ہوجاتا ہے، عواطف انسانی اور بشری، پاکیزہ احساسات، ایک خاص تجلی پیدا کر لیتے ہیں، جبکہ ایمان نہ رکھنے والی قوم، پس ماندہ لوگوں کے حقوق کی مرعات اور اجتماعی عدالت کے اجزاء کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہوتی، اور ہمیشہ طبقاتی فاصلوں کے گڑھوں کے کنارے پر کھڑے ہو کر چھوٹی بڑی جنگوں میں اُلجھی رہتی ہے۔

ایک وہ دن تھا جب کہ مشہور سائیکولوجسٹ ''فرائڈ'' یہ خیال کیا کرتا تھا کہ دین کا زمانہ ختم ہوگیا ہے اور تمدنی نظاموں، اور اجتماعی تربیتوں نے دین کی جگہ لے لی ہے۔لیکن پہلی جنگ عظیم کے وحشت انگیز نقصانات نے جس میں تلف ہونے والے افراد کی تعداد ایک کروڑ سے بھی زیادہ تھی اسے مجبور کردیا کہ وہ اپنا مفروضہ واپس لے اور دسری عالمی جنگ نے واضح کردیا کہ مشینی یورپ میں اجتماعی انسانی زندگی کا وجود ہی نہیں ہے اور وہ ابھی تک ایک درندہ کی صورت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

اگر ایمان کو دھاتوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو وہ بھی اسی بناء پر ہے کہ ان میں سے کچھ انسان کے لیے مایہ حیات ہیں اور ان میں سے ایک کے

بارے میں قرآن یہ کہتا ہے کہ:

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (حدید:۲۵)

''ہم نے لوہے کو پیدا کیا، اس میں عظیم قدرت اور لوگوں کے لیے بہت فائدے ہیں۔''

اگر یہ دھات ختم ہوجائے تو انسانی زندگی میں خلل پڑ جائے گا۔

۴۔سیلاب کے اوپر کی جھاگ یا پگھلی ہوئی دھات کی جھاگ ایک حجاب کے مانند ہے جو ایک مدّت تک پانی اور دھات کے چہرے کو ڈھانپے رہتی ہے، لیکن زیادہ دیر نہیں لگتی کہ تمام جھاگ نابود ہوجاتی ہے اور پانی کا صاف وشفاف چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔اسی طرح حقیقت کا چہرہ بعض اوقات باطل کے نقاب کی وجہ سے پوشیدہ ہوجاتا ہے۔لیکن آخرکار باطل کا نقاب ہٹ جاتا ہے۔اور حق کا چہرہ اپنی خاص چمک دمک کے ساتھ دکھائی دینے لگتا ہے۔

بعض اوقات شیطانی افکار اور باطل آراء کچھ دیر کے لیے، حق کے آفتاب کو موسم بہار کے سیاہ بادلوں کی طرح ڈھانپ لیتے ہیں لیکن یہ پردہ پوشی ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتی، اور قرآن نے اس حقیقت کو ایک اور زبان میں بیان کیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾ (اسراء)

''کہہ دیجئے، حق آ گیا اور باطل نابود ہوگیا، اور باطل ناپید ہونے والا ہی ہے۔''

اور دوسری جگہ فرماتا ہے:

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ (شوریٰ۔۲۴)

''خدا باطل کو نابود کردیتا ہے اور حق کو اپنے کلمات کے ذریعہ پائیدار اور ثابت بنا دیتا ہے۔''

۵۔باطل بے خاصیت اور بے فائدہ ہوا کرتا ہے، لیکن حق انواع واقسام کے برکات کا منبع ہوتا ہے، پانی کے اُوپر کی جھاگ سے نہ تو کوئی پھول اُگتا ہے اور نہ ہی کوئی سرسبز درخت پیدا ہوتا ہے اور نہ کوئی پیاسا سیراب ہوتا ہے لیکن پانی حیوانات ونباتات میں حیات وزندگی کے ہزاروں جلووں کا سرچشمہ ہے۔

۶۔جس طرح سے کہ آسمان سے بارش برستی ہے اور ہر خطہ اپنی لیاقت اور شائستگی کے مطابق اس سے بہرہ مند ہوتا ہے، اور اصطلاح کے مطابق:

درباغ لاله روید و درشوره زار خس''

(باغ میں تو گُلِ لالہ اُگتا ہے، اور کلر زمین میں خس وخاشاک)

اس کے علاوہ دروں، نہروں اور سیلابوں کی ظرفیت بھی یکساں نہیں ہوتی اور ان میں سے ہر ایک اپنی گنجائش کے مطابق پانی سماتے ہیں۔اسی طرح افراد بشر کی روح ورواں بھی گنجائش کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوتیں۔لہٰذا ہر ایک اپنی لیاقت کے مطابق معارف اور آسمانی تعلیمات سے

فائدہ اٹھاتا ہے۔ دل اور روح بھی گنجائش کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں کچھ تو ایک پیالہ کے اندازہ میں ہوتے ہیں اور بعض ایک دریا کی مقدار میں اور ہر ایک اپنی گنجائش کے مطابق آسمانی تعلیمات سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

قرآن نے اس نکتہ کو سمجھانے کے لیے لفظ ''بقدرھا'' استعمال کیا ہے۔

آفرینشن کے مسئلہ میں اختلاف اس قدر اہم ہے کہ قرآن اس پر تکیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾ (نوح)

''تمہیں مختلف اور الگ الگ حالت میں پیدا کیا ہے۔''

پیغمبر اکرمؐ نے افراد کی استعداد اور شائستگی کو زیر زمین معدنیات کے ساتھ تشبیہ دی ہے جن میں سے کچھ سونا ہیں اور کچھ چاندی ہیں جیسا کہ فرمایا:

''الناس معادن کمعادن الذھب والفضة۔''[۱]

لوگ سونا چاندی کی کانوں کے مانند کانیں ہیں۔

امیرالمومنینؑ کمیل کے ساتھ اپنی مشہور گفتگو میں اس طرح فرماتے ہیں:

ان هٰذه القلوب اوعية فخيرها اوعاها۔''[۲]

''لوگوں کے دل اور روحیں برتن ہیں۔

ان میں سے زیادہ بہتر وہ روح ہے جو زیادہ وسیع ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی لیاقت اور شائستگی کے مطابق مادی اور معنوی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

۷۔ جنگ کے میدانوں میں بقاء و کامیابی کا رمز یہ ہے کہ انسان کا وجود لوگوں کے لیے مفید اور سودمند ہو، خدا نے اس مطلب کو سمجھانے کے لیے اس طرح فرمایا ہے:

واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض

''جو چیز لوگوں کے لیے مفید ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔

۸۔ باطل گوناں گوں شکلوں اور مختلف صورتوں میں متعدد میدانوں میں رونما ہوتا ہے، جس طرح سے جھاگ پانی کے اوپر بھی، اور پگھلی ہوئی دھاتوں کے اوپر بھی، آشکار ہو جاتی ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

---

[۱] بحارالانوار جلد ۶۴ ص ۵۰۴۔

[۲] نہج البلاغہ کلمات قصار شمارہ ۱۴۷۔

ومما یوقدون علیہ فی النار

''جھاگ نہ صرف پانی پر بلکہ پگھلی ہوئی دھاتوں پر بھی ظاہر ہوجاتی ہے۔''

۹۔ باطل کا ناپائیدار سایہ حق کے دائمی فروغ کی وجہ سے ہوتا ہے اور باطل اپنی وقتی خودنمائی کے لیے بھی حق کا قرضدار ہے اور جب تک وہ حق کی حیثیت سے فائدہ نہ اٹھائے خود کو حق کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتا۔ باطل کی جھاگ پانی کی حیثیت سے فائدہ اٹھاتی ہے اور اپنی نشاندہی کرتی ہے اور اگر پانی درمیان میں نہ ہوتو جھاگ میں اپنے اظہار کی طاقت ہی نہیں تھی۔ قرآن اسی نکتہ کو سمجھانے کے لیے''فاحتمل السیل زبدًا رابیاً'' کا جملہ لایا ہے دوسرے لفظوں میں باطل حق کے سایہ میں قدم اٹھاتا ہے اور اس کے چلنے کے ساتھ چلتا ہے اور وہ باطل جو حق سے خالی ہو چلنے کے قابل نہیں ہوتا۔

۱۰۔ باطل ہمیشہ پریشان بازار اور ہرج ومرج کے ماحول سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنی نشان دہی کرتا ہے، وہ سکون وآرام اور بے صدا ماحول میں اپنی خودنمائی نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ جھاگ اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب سیلاب پہاڑوں کے اوپر سے نیچے کی طرف تیزی سے شور وہیجان کے ساتھ نیچے گرتا ہے۔ لیکن جب پانی چٹیل میدان اور صاف وہموار علاقوں میں پہنچتا ہے اور اس کا شور وہیجان ختم ہوجاتا ہے۔ تو وہ آہستہ آہستہ خاموش ہوتا چلا جاتا ہے۔

حق و باطل کی بنیاد

فلاسفہِ اسلام کا فلسفی دلائل کی پیروی میں یہ نظریہ ہے کہ ہر فکری وذہنی واقعہ جو اپنے سے باہر کی حقیقت واقعیت کے مطابق ہو، وہ فکر اور سوچ صحیح اور سچ ہے اور اس کے برخلاف باطل اور جھوٹ ہوگی مثلاً اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ ہال مستطیل ہے یا ہم اسے ذہن میں مستطیل صورت میں خیال کرلیتے ہیں اب اگر وہ حال خارج میں بھی اسی شکل وصورت میں ہو، تو پھر یہ بات اور یہ سوچ ایک حق بات اور حق سوچ ہے اور اس صورت کے علاوہ باطل اور بے اساس ہوگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جہاں ایک فکر اور سوچ کے لیے یا خبر وگزارش کے لیے ذہن اور گفتگو کے دائرے سے باہر کوئی حقیقت وواقعیت موجود ہو (جیسا کہ ان افکار وگذارشات میں معاملہ ہے، جن کے مضمون کا وجود، فکر وسخن سے باہر موجود ہو، اسی طرح ہے) حقیقت کی بنیاد، جو ذہن کا عین کے ساتھ مطابق ہونا یا صورت ذہن کا خارجی واقعیت کے ساتھ اور مضمون کا ''نفس الامر'' کے ساتھ ہونا ہے اور اس صورت کے علاوہ ہر سوچ، فکر، کلام اور سخن باطل اور خطا ہوگا۔

فلاسفہِ اسلام ہر قسم کی سوچ اور گفتگو کے لیے جس میں حکایتی اور گذارشی مفاد پایا جائے، ایک قسم کی واقعیت اور نفس الامر کے قائل ہیں اور ان دونوں کی مطابقت کو سوچ اور گفتگو کے حق وحقیقت ہونے کی بنیاد سمجھتے ہیں۔

البتہ ہر جگہ یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی چیز کی واقعیت، ہال کے مستطیل ہونے کے مانند ایک مرئی یا ملموس، اور اصطلاح کے مطابق مٹھی کو پُر کرنے

والی واقعیت ہو، بلکہ واقعیت اور نفس الامر اس سے عام اور زیادہ وسیع ہے کہ جو ہال کے بارے میں نظر آتی ہے۔ اب ہم ذیل میں واقعیت کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ فزکس اور کیمسٹری کے قوانین کلی اپنے لیے ایک واقعیت رکھتے ہیں، جو ہرگز کلی صورت میں تجربہ کے مقام میں حواس میں سے کسی سے بھی درک نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح ریاضی کے اصولوں کی اپنے لیے ذہن سے باہر ایک واقعیت ہے، اگرچہ یہ واقعیت پانچوں حواس میں سے کسی کے ذریعہ محسوس نہیں ہوتی لیکن محسوس نہ ہونا ایک اور چیز ہے اور واقعیت نہ رکھنا ایک الگ چیز ہے۔

ہم سب کہتے ہیں کہ ہر دائرہ کا محیط اس کے قطر کی لمبائی کو (۳/۱۴) سے ضرب دینے کے مساوی ہے اور اس ادراک کو ہم ایک حق اور سچا ادراک سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ایک مسلمہ واقیعت کو بیان کرتا ہے جو ذہن سے خارج میں موجود ہے۔ اسی طرح نفسیات سے مربوط مسائل میں قواعد و قوانین کلی کا ایک سلسلہ موجود ہے اور یہ قوانین ایک واقعیت رکھتے ہیں، اگرچہ یہ واقیعت ''عینیت خارجی'' اور ''حقیقت ملموس'' کے معنی میں نہیں ہے لیکن یہ واقعیت اور نفس الامر ہونے سے بھی عاری نہیں ہیں خلاصہ یہ ہے کہ واقعیت رکھنے کا معنی یہ نہیں ہے کہ وہ واقعیت ایک ''مٹھی پر کرنے والی) اور آنکھ سے دکھائی دینے اور ہاتھ سے چھونے والی چیز ہو، بلکہ جو بھی فکری بات اپنے سے باہر کی طرف رجوع کرنے سے اس پر منطبق ہو جائے، تو وہ یقیناً حق ہوگی اور ریاضی اور ہندسہ کے تمام قضیے اور کلیے یہی خصوصیت رکھتے ہیں جبکہ ان کلمات کے برخلاف جو کچھ ہے ان میں ایسی خصوصیت نہیں ہوتی۔

اگر کوئی ماہر نفسیات مثلاً ''عقیدہ حقارت'' کے وجود کی بات کرتا ہے اور اس کی خصوصیات کو شمار کرتا ہے تو اس نے حق بات کی ہے، اور اس کی سوچ سچی ہے اگرچہ مذکورہ بالا عقیدہ نفسِ انسانی میں اپنا ٹھکانا بنالیتا ہے۔ لیکن وہ ہرگز عینیت خارجی نہیں رکھتا، کیونکہ حق ہونے کا یہ معنی ہرگز نہیں ہے کہ فکر اور سوچ کا موضوع ایک واقعیت ملموس یا ''مٹھی پر کرنے والی'' عینیت رکھتا ہو۔

علم منطق تصورّ و تصدیق کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور ان دونوں کی خصوصیات کے احکام کو بیان کرتا ہے ان احکام میں سے جو واقعیت کے ساتھ مطابق ہوتے ہیں، وہ حق، ورنہ باطل ہوں گے لیکن واقعیت کا معنی عینیت ملموس نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے یہاں تک کہ خود تصور اور تصدیق جو علم منطق کا موضوع ہیں عینیت خارجی نہیں رکھتے، لیکن ان میں واقعیت اور نفس الامر ہونا مفقود نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق و باطل کی بنیاد ذیل میں بیان کردہ دو چیزوں میں سے ایک ہوتی ہے۔

۱۔ وہ قضیہ یا بات سچ اور حق ہے جو عینیت خارجی کے ساتھ مطابق ہو، مثلاً ہم یہ کہتے ہیں کہ دشمن کے سب سپاہی مورچے میں مارے گئے یا ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر جسم ابعاد ثلاثہ (طول، عرض، عمق) رکھتا ہے۔ ان میں پہلے کو قضیہ خارجیہ دور دوسرے کو قضیہ حقیقیہ کہتے ہیں اب ان دونوں میں فرق ہے سردست ہمیں اس سے بحث نہیں ہے۔

۲۔ سوچ اور گفتگو نفس الامر'' اور واقعیت کے ساتھ، فکر و کلام کے تناسب سے مطابق اور مساوی ہو۔ علم منطق، نفسیات علوم ریاضی اور ہندسہ سے مربوط قضیے، جن کے موضوعات ملموس اور عینی صورت میں خارج میں نہیں ہوتے لیکن وہ ایک خاص نفس الامر اور واقعیت کے حامل ہوتے ہیں اور اگر کوئی یہ کہے کہ دو کو دو میں ضرب دیں تو حاصل ضرب چار ہوگا، تو اس نے یہ ایک واقعیت رکھنے والی بات کہی ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ ان

دونوں کا حاصل ضرب پانچ ہے، تو اس نے واقعیت سے دور بات کہی ہے۔

البتہ محققین اسلام نے اس قسم کے قضایا کی حقانیت کو بیان کرنے کے لیے دوسرے بیانات اور توجیہات بھی پیش کئے ہیں جنہیں سر دست بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اور جو چیز عام لوگوں کے لیے مفید اور سودمند ہو سکتی ہے، وہ وہی ہے جو بیان کر دی گئی ہے۔

قرآن اور بنیادِ حقیقت

قرآن ہر حقیقت پسند فلسفی کی طرح حق ہونے کی بنیاد حقیقت رکھنے کو اور حقیقت رکھنے کا معنی فکر وسوچ، کلام سخن اور فعل وکام کا واقع اور نفس الامر کے ساتھ مطابق ہونے کو سمجھتا ہے۔ اور اس حقیقت کو ان آیات کے مطالعہ سے جو ''حق'' صدق'' ''باطل'' اور ''کذب'' کے بارے میں وارد ہوئی ہیں واضح طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے اس بحث میں اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ ان سب آیات کو بیان کیا جا سکے۔ لیکن ہم اجمالی طور پر چند آیات کا ذکر تے ہیں۔

قرآن ان اہل کتاب کے بارے میں جو عیسیٰ مسیح کو خدا سمجھتے ہیں، اور ان کی اس طرح سے تعریف وتوصیف کرتے ہیں، جو واقع کے ساتھ موافقت نہیں رکھتی اس طرح کہتا ہے۔

يَاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ وَلَا تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَقَّ ؕ (نساء:۱۷۱)

''اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور خدا کی طرف حق اور واقعیت کے علاوہ کوئی اور نسبت نہ دو۔

قرآن قیامت، جنت اور دوزخ کا انکار کرنے والوں کے بارے میں جو یہ کہتے تھے کہ:

اِنۡ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنۡيَا وَمَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِيۡنَ ۝۲۹ (انعام)

''زندگی تو بس یہی دنیاوی زندگی ہے اور ہم قبروں سے اٹھائے نہیں جائیں گے۔''

اس طرح کہتا ہے:

وَلَوۡ تَرٰٓى اِذۡ وُقِفُوۡا عَلٰى رَبِّهِمۡ ؕ قَالَ اَلَيۡسَ هٰذَا بِالۡحَـقِّ ؕ قَالُوۡا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ

(انعام:۳۰)

''اگر تو انہیں دیکھے جب کہ وہ اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہوئے ہوں گے اور خدا ان سے خطاب کر رہا ہوگا، بتاؤ! کیا یہ دوزخ جس کی حقیقت واقعیت کا تم انکار کیا کرتے تھے حق نہیں ہے (اور ذہن سے باہر ایک حقیقت واقعیت نہیں ہے)؟ تو وہ سب کے سب کہیں گے کیوں نہیں؟''

اس بارے میں اس سے کہیں زیادہ آیات ہیں کہ انہیں یہاں نقل کیا جائے۔ ہم صرف ایک اور آیت کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا (لقمان۔ ۳۳)

''خدا کے وعدے سچے ہیں (اور واقعیت رکھتے ہیں) دنیاوی زندگی تمہیں دھوکہ نہ دے۔

قوانین میں حق وباطل کی بنیاد

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ خبری واقعات اور انسانی گذارشات میں خارج سے حق و باطل کی بنیاد سے مربوط تھا لیکن یہاں کچھ اور فکری واقعات بھی موجود ہیں جس میں حق و باطل کی بنیاد مذکورہ بالا صورت میں نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے کوئی اور ہی بنیاد سوچنی پڑے گی اور وہ ''وہ قوانین ہیں جو خدا کی جانب سے، یا مجالسِ قانون ساز کی طرف سے، نوع بشر کے لیے بنائے جاتے ہیں اس سلسلہ میں حق و باطل کی بنیاد ایک دوسری چیز ہوتی ہے نہ کہ ذہن سے خارج کے ساتھ مطابقت، کیونکہ اس بارے میں ہم خارج سے کوئی گذارش نہیں کرتے کہ جس سے مطابقت اور عدم مطابقت کا مسئلہ پیش آئے، بلکہ قانون گذار امر و نہی کی صورت میں کہتا ہے یہ کرو، یا یہ نہ کرو، لہٰذا اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ایک قانون کے حق ہونے یا باطل ہونے کی بنیاد کیا ہے؟ اس بارے میں مفکرین کے دو گروہ ہیں۔

ایک گروہ تو وہ ہے کہ جو افکارِ عمومی کو قانون کا سرچشمہ سمجھتا ہے وہ قانون کے حق و باطل ہونے کی بنیاد اس بات کو سمجھتا ہے کہ قانون گذار اور قانون بنانے والا ملت کی رضا و خوشی سے قانون گذاری کی کرسی پر بیٹھتا ہے لہٰذا ہر وہ قانون جسے ملت کی تائید حاصل ہو وہ حق ہے اور اس کے علاوہ جو ہوگا وہ باطل ہے۔

جب کہ قرآن کی نظر میں حق و باطل کی بنیاد ایک دوسری چیز ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ قانون سعادتِ انسانی کا امین ہو یا اس کی فطرت و آفرینش کے خلاف نہ ہو۔

اس بنا پر نشہ آور مشروبات کے مصرف کے مسئلہ کی تصویب چاہے عوام کی رضا مندی سے کی گئی ہو۔ حق نہیں ہوگی بلکہ وہ ایک باطل قانون ہوگا۔ لیکن توحید و یکتا پرستی چونکہ انسان کی فطرت اور آفرینش کے مطابق ہے۔ لہٰذا وہ قانون حق ہے چاہے سارا مشرک معاشرہ اور ساری قوم کے عوام اس کی مخالفت پر کھڑے ہو جائیں۔

قرآن جس مقام پر خدائے یکتا کی پرستش کے لازم ہونے کے بارے میں بات کرتا ہے۔ اور انسانی معاشرے کو یہ حکم دیتا ہے کہ ہم صرف اسی کی پرستش کریں تو بلا فاصلہ بشر کی آفرینش کے مسئلہ کو جو خدا پرستی اور یکتا پرستی کے ساتھ ملا ہوا ہے پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۰

(روم)

''خدا کے سچے دین کی طرف رخ کرو، وہ سچا دین جو خدا کی آفرینش وخلقت ہے، اور اس نے انسانوں کو اسی بنیاد پر خلق کیا ہے خدا کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے، یہی محکم واستوار دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یہ وہ منزل ہے جہاں قرآن دوسرے ادارہ ہائے حقوق سے الگ ہو جاتا ہے کیونکہ مغرب کے حقوقی اداروں میں قانون کے حق ہونے میں طرف مقابل کی خوشبختی کو مدنظر نہیں رکھا جاتا۔ ان کا معیار لوگوں کی خواہش ہے، چاہے ان کی خواہشیں ان کی سعادت پر ضرب ہی لگاتی ہوں۔ اور (ان کے نزدیک) اس قسم کے عمومی افکار نظریات کی سند رکھنے والا قانون ہی حق قانون ہوتا ہے، لہٰذا اخلاقی عریانی، شراب خوری جوئے بازی قانونی اعمال شمار ہوتے ہیں۔ اور ان کا کرنے والا خود کو منکرات اور برائیوں کا ارتکاب کرنے میں حق پر سمجھتا ہے، جب کہ قرآن کی نظر میں وہی قانون حق اور پائیدار ہے، جو خدا تک منتہی ہوتا ہے اور انسان کی فطرت پر منطبق، اور فرد و جامعہ کی سعادت وخوش بختی کا ضامن ہو، اور اس مطلب کی وضاحت بعد میں آئے گی۔

اعتراضات کا جواب

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، فلاسفہ کی نظر میں حق و باطل کی بنیاد، جس کی قرآن بھی تائید کرتا ہے یہ ہے کہ فکری سوچ، ذہن سے باہر کے ساتھ اور اپنی واقعیت کے ساتھ منطبق ہو۔ اس سلسلہ میں گذشتہ اور موجودہ علماء کی طرف سے تین اعتراض ہوئے ہیں۔ ہم ان تینوں کی تشریح پیش کرتے ہیں۔

۱۔ مسائل ہندسہ میں انطباق کس طرح ہے؟

یہ نظریہ ریاضی ہندسہ اور نفسیات کے قوانین کے بارے میں صادق نہیں ہے، کیونکہ ان قوانین کے لیے ذہن سے خارج واقعیت کا وجود نہیں ہے جس کے ساتھ فکری سوچ منطبق ہو۔

اس اعتراض کا جواب اس بیان سے جو گذر چکا ہے واضح ہو گیا ہے کیونکہ یہ بیان ہو چکا ہے کہ واقعیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ محسوس وملموس امور میں سے ہو، بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ اگر ہم اس قسم کی فکری سوچ سے آگاہ ہونے کے بعد ذہن کی دنیا سے باہر کی طرف پلٹیں اور اس خارج کو اس کے ساتھ کسی طرح موافق پائیں تو یہ چیز فکری سوچ کی واقعیت سے مطابقت کی نشانی ہے اور کسی فکر کے صادق ہونے کے لیے مطابقت کی اتنی مقدار ہی کافی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہم براہین فلسفی کی نظر سے خارج میں نقطہ، خط، دائرہ وغیرہ نہیں رکھتے کیونکہ اس قسم کے اعراض کا واقعی وجود جو اصطلاح کے مطابق ''کم'' کی اقسام کے ساتھ متصل ہوتے ہیں خارج میں ''جزاء لا یتجزا'' کے وجود کا سبب بن جاتا ہے جو عقلی لحاظ سے محال ہے، لیکن

یہ بات ماننی پڑے گی کہ ذہن سے خارج میں واقعیتوں کا ایک ایسا سلسلہ موجود ہے جو اس بات کا سبب بن جاتے ہیں کہ یہ مفاہیم خود وان سے ہمارے ذہن میں وارد ہوں اور یہ واقعتیں ہی ہیں جو خط، دائرہ اور مثلث کے احکام کی متحمل ہوتی ہیں اور انہیں واقعیت دار بناتی ہیں دوسرے لفظوں میں خط اور دائرہ کا اپنے تمام خصوصیات کے ساتھ نہ ہونا ایک چیز ہے اور واقعیتوں کے ایک سلسلہ کا نہ ہونا کہ جن سے اس قسم کے مفاھیم کا ادراک ہوتا ہے، دوسری چیز ہے، اور مفاہیم کے اس حصہ کے صدق وحقانیت کے لیے اس قسم کی منشاؤں کا وجود کافی ہے۔ اور یہ ضروری نہیں ہے کہ نقطہ اور خط خارج میں اپنے تمام خصوصیات کے ساتھ موجود ہو[1]

۲ گذشتہ واقعات کے ساتھ انطباق کس طرح ہوتا ہے؟

بعض اوقات یہ کہتے ہیں کہ اگر حق و باطل کی بنیاد وہی ہے جو بیان کی گئی ہے تو یہ تعریف ان تاریخی واقعات پر جو ختم ہو چکے ہیں اور ان کی واقعیت باقی نہیں رہی ہے صادق نہیں آتی کیونکہ سوچ اور گفتگو کے وقت سوچ اور فکر سے باہر کوئی واقعیت موجود نہیں ہے کہ جس کے ساتھ سوچ اور گفتگو منطبق ہو۔

لیکن اس بات کا جواب بھی واضح ہے کیونکہ اس مغالطہ ڈالنے والے نے سوچ اور بات کرنے کے وقت میں، واقعیت کے موجود ہونے میں اور واقعیت کے ظہور میں آنے کے وقت میں، واقعیت رکھنے میں کوئی فرق نہیں کیا ہے لہٰذا وہ اس قسم کے خیال سے دوچار ہو گیا ہے کیونکہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ:

خیبر کا ''مرحب'' نامی پہلوان علیؑ کے ہاتھ سے مارا گیا تو یہ بات ٹھیک ہے کہ جب ہم یہ بات کہہ رہے ہوتے ہیں تو نہ علیؑ موجود ہیں اور نہ مرحب اور نہ ہی اس کا قتل ہونا۔ لیکن اس وقت میں کہ جس وقت کی یہ بات یاد تازہ کر رہی ہے اس قسم کی واقعیت موجود تھی اور واقعی چودہ صدی پہلے یہ یہودی پہلوان امیر المومنینؑ کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ اس طرح سے کہ اگر ہم زمانہ کی گردش کو پیچھے کی طرف پھیر دیں تو ہم اس واقعہ کو اس وقت میں عینیت یافتہ پائیں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دیرینہ تاریخی واقعات ظرف گفتگو میں وجود خارجی نہیں رکھتے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک اپنے وقوع پذیر ہونے کے وقت میں واقعیت رکھتا تھا۔ اور اب بھی اُسی ظرف میں تحقق رکھتے ہیں۔

۳ یہ نظریہ جمود کے میلان سے سرچشمہ حاصل کرتا ہے

حقیقت کی یہ تعریف کرنا کہ ذہن عین کے ساتھ مطابق ہو طبعیت میں ایک قسم کے جمود کی طرف میلان سے سرچشمہ حاصل کرتا ہے کیونکہ فلاسفہ کا خیال یہ ہے کہ عین اور طبیعت کی دنیا میں تغیر نہیں ہے، اور وہ ایک ہی حالت و کیفیت میں رہتی ہے اسی بنا پر وہ حقیقت کی بنیاد، ذہن کے حکم کو، عین کے ساتھ مطابق ہونے کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ گروہ جو خارج کی دنیا کو ہمیشہ تغیر اور دگرگونی میں سمجھتا ہے۔ اور عالم کو ان دونوں میں ایک حالت میں تصوّر نہیں کرتا وہ ذہن کے حکم کی خارج کے ساتھ مطابقت کو حق کی بنیاد کیسے سمجھ سکتا ہے کیونکہ جب تک کوئی ان دونوں کے درمیان تطبیق

---

[1] ان مباحث کی تفصیل ہم نے شناخت کی بحث میں پیش کی ہے۔

کرنا چاہے گا اس وقت تک عالم دگرگوں اور واقعیت بدل چکی ہوگی۔

اس اعتراض کا جواب بھی واضح ہے، اور ایک لحاظ سے اس کی بازگشت دوسرے اعتراض کی طرف ہے اور اس مطلب کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو وہاں بیان ہوا ہے ہمیں یاد آ جائے گا کہ اگر عالم طبیعت حالتِ تغیر و دگرگونی میں ہے اور ہمیشہ حرکت کے سایہ میں اپنی صورت کو بدلتا رہتا ہے تو یہ چیز اس بات سے مانع نہیں ہے کہ ایک ذہنی صورت اور ایک علمی فکر تو واقعیت کے ایک چہرہ پر منطبق ہو اور طبیعت کے دوسرے چہرے کے لیے ہمیں ایک نئی ذہنی صورت اور نئی فکر کی ضرورت ہو۔ اور فیلسوف الٰہی ہرگز اس بات کا مدعی نہیں ہوتا کہ ایک قضیہ موضوع کے تمام مختلف حالات پر منطبق ہوتا ہے۔

مثلاً افراد کے لیے مختلف ادوار ہوتے ہیں، جیسے نومولود، بچپن، نوجوانی، جوانی ادھیڑ عمر، بڑھاپا اور بوڑھا پھونس اور ہر ایک حالت کے لیے ذہن میں ایک تصور موجود ہوتا ہے۔ جو ان مختلف ادوار میں سے کسی ایک دور پر منطبق ہوتا ہے نہ کہ تمام ادوار پر اور ادراک کے کارخانہ نے خارج سے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اس کے وجود کی صرف ایک حالت پر منطبق ہوتا ہے، اگرچہ بعد کے ادوار میں وہ حالت موجود نہ رہے لیکن تصور کا انطباق اس حالت کے اپنے ظرف میں تحقق کی بناء پر انجام پاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک طبعی موجود کے بارے میں ___ جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بتدریج تبدیلی اور تکامل پیدا کرتا ہے ___ ہماری ذہنی تصویر اس کی ایک حالت کے لیے صحیح اور اس پر صادق آتی ہے اور ہماری متعدد ذہنی تصویروں میں سے ہر ایک صرف اس موجود کے بدلتے ہوئے حالات میں سے ایک ہی حالت کی نشاندہی کرتی ہے نہ کہ تمام حالت کی اور تشبیہ کے طور پر یوں کہنا چاہیے کہ ہمارے ادراک کا کارخانہ فوٹوگرافی کے کیمرہ کی طرح ہے جو ایک ایسے موجود کی، جو بتدریج حالتِ تکامل میں ہے بہت سے فوٹو کھینچتا ہے، اور ان تصویروں میں سے ہر ایک تصویر اس موجود کے تکامل کے ایک خاص مرحلہ کی نشاندہی کرتی ہے اور وہ صرف اسی کے لیے صادق اور منطبق ہوگی لیکن دوسرے حالاتِ کے لیے ہمیں دوسری تصویروں کی ضرورت ہوگی۔

دوسرے الفاظ میں طبعیت میں تغیر و تبدیلی کا عقیدہ اس سے مانع نہیں ہے، کہ ہماری ذہنی صورتیں ایک موجود کے ایک مرحلہ کے لیے صادق ہوں، نہ کہ گذشتہ تمام مراحل کے بارے میں۔

طبعیت متغیر ہے نہ کہ اس پر حاکم قوانین

اس سے قطع نظر، وہ چیز جو متغیر اور دگرگوں ہوتی ہے وہ وہی طبیعت و مادہ ہے نہ کہ اس پر حاکم قوانین۔ اگر ہمارے ادارک کا تعلق موجود کے صفات اور تبدیل ہونے والے حالات سے ہو تو اس بات کی گنجائش تھی کہ یہ کہا جائے کہ صورت ذہنی کے لیے خارج میں کوئی موضوع نہیں ہے کہ تم صورت ذہنی کی اس کے ساتھ تطبیق کرو، کیونکہ جب تک تم آ کر صورت ذہنی کی اس کے ساتھ تطبیق کرو گے، خارج بدل چکا ہوگا اور اس کا موضوع ختم ہو چکا ہوگا لیکن اگر ہمارے علم کا تعلق طبیعت پر حاکم قوانین ہوں تو قوانین میں کسی قسم کی حرکت اور تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے اور موضوع کی تبدیلی سے طبیعت پر حاکم قوانین نہیں بدلیں گے مثلاً حرکت اور سات کو سات میں ضرب کا حاصل مطلقاً ۴۹ ہے، اور مثلث کے تینوں زاویوں کا مجموعہ ہمیشہ ۱۸۰ درجہ تھا اور ہے اور رہے گا۔ اور ہم علوم میں زیادہ تر قوانین کے ساتھ سروکار رکھتے ہیں نہ کہ مصادیق اور متغیر جزئیات کے ساتھ۔

اب جب ک ہم حق و باطل کے بارے میں قرآن اور فلسفہ اسلامی کے واقع کے متعلق نظریہ سے آشنا ہو گئے ہیں تو اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مغربی دانشوروں کے درمیان کچھ مشہور نظریات سے بھی آشنائی حاصل کریں۔

۱۔ اگوسٹ کینٹ کا نظریہ

اگوسٹ کینٹ ایک فرد کے لیے حقیقت کی اس طرح سے تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جس وقت کوئی فکر اور سوچ دوسرے افکار کے ساتھ سازگار اور موافق ہو تو اس قسم کی فکر اور سوچ حقیقت ہے اور اس صورت کے علاوہ، یعنی جب کوئی فکر اور سوچ دوسرے افکار کے ساتھ ناسازگار ہو تو وہ خطا اور غلط ہوگی۔

وہ ایک معاشرے کے لیے حقیقت کی اس طرح تعریف کرتا ہے کہ جب ایک زمانہ کے لوگ ایک نظریہ کو اپنا لیں اور اس پر متفق ہو جائیں تو وہ فکر اور سوچ حقیقت ہوگی اور اگر کچھ عرصہ کے بعد افکار و نظریات بدل جائیں اور اس زمانہ کے لوگ پہلے نظریہ کے مخالف نظریہ کو قبول کر لیں، اس صورت میں حقیقت وہ دوسرا نظریہ ہوگا۔

مثلاً کئی صدیوں تک ''بطلیموس'' کا مفروضہ ایک حقیقت تھا کیونکہ مشرق و مغرب کے علماء اور دانش مندوں نے اُسے قبول کر لیا تھا۔

اور پندرہ صدیوں تک بطلیموس کے نظریہ نے لوگوں کے افکار پر غلبہ کئے رکھا، چند ایک افراد مثلاً ابوریحان بیرونی یا شیخ بھائی اس کی مخالفت کرتے تھے، لیکن چونکہ یہ مخالفت جزئی تھی لہٰذا اس کے مفروضہ کے حقیقت ہونے کو کوئی ضرر نہیں پہنچاتی تھی۔ جب گلیلیو آیا اور اس نے اس نظریہ کو بدل دیا اور علماء اور دانش مندوں نے اس کی موافقت کی، تو پہلا نظریہ غلط سمجھا جانے لگا اور دوسرا نظریہ حقیقت بن گیا۔

اس نظریہ پر تنقید

اس نظریہ میں کسی معاشرے کے اذہان کے کسی چیز کو قبول کر لینے میں یہ طاقت ہے کہ ایک انسان کی سوچ کو جب تک کہ وہ انسانوں کے قابل قبول ہے، ایک حقیقت بنا دے اور جس دن معاشرے کے اذہان اس کو رد کر دیں اور کسی دوسری چیز کو قبول کر لیں تو پہلی چیز سے حقیقت کا لباس اتر والے اور دوسری چیز کے بدن پر پہنا دے، گو یا قبول کرنے میں خلقت و آفرینش کا اثر ہے یہ نظریہ اہل سنت علماء کے اس نظریہ سے مشابہ ہے جو کسی ایک زمانہ کے علماء کا کسی حکم پر اتفاق کے بارے میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک صدی کے علماء مثلاً کسی چیز کی حرمت یا جواز پر اتفاق کر لیتے ہیں تو ان کا وہی نظریہ حکم الٰہی ہوگا۔ لیکن جب دوسری صدی میں علماء کا نظریہ اس کے خلاف ہو جائے تو پھر حکم الٰہی وہ دوسرا نظریہ ہوگا گو یا حکم الٰہی کی کوئی واقعی اور حقیقی بنیاد نہیں ہے بلکہ حکمِ خدا علمائے اسلام کے ارادے اور نظریہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی لیے اس گروہ کو ''مصوبہ'' کہتے ہیں۔

جب کہ شیعہ حکمِ خدا کو صرف ایک سمجھتے ہیں اور ایک سے زیادہ نہیں سمجھتے، اور علماء کے اتفاق و اجماع کی ان کی نظر میں کوئی قیمت اور وقعت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ کسی طرح سے حکم خدا کو کشف کر سکیں اور نظریہ کی تبدیلی کی صورت میں وہ ان دونوں اجماعوں میں سے ایک کو (اگر اس قسم کے دو اجماع کا وقوع فرض کریں) باطل اور بے بنیاد جانتے ہیں، لہٰذا وہ انہیں ''مخطئہ'' کہتے ہیں۔

حقیقت، اصلاح کے بدلنے سے نہیں بدلتی

اگوسٹ کینٹ اور فیلیسین شالہ نے یہ خیال نہیں کیا کہ انسان کا علم اور سوچ کی صفتِ ذاتی ہے اور وہ واقع کی ترجمانی اور اس کے کشف کی حالت ہے، اور یہ کہ ہر علم اپنے ماوراء کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور فلاسفہ اسلامی کی اصطلاح کے مطابق ''علم'' وہ آ گاہی'' اور ''فکر'' و ''اندیشہ انسانی'' ایک آئینہ اور واقع نما ہوتے ہیں اور دوسری طرف واقعیت بھی صرف ایک ہوتی ہے اور ایک سے زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ یا تو زمین مرکز ہے اور سورج اس کے گرد گردش کر رہا ہے اور یا سورج مرکز ہے منظومہ شمسی کا اور زمین اس کے گرد حرکت کر رہی ہے اس صورت میں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بطلیموس اور کپر نیکی کے افکار و نظریات جو ایک دوسرے کی ضد اور ایک دوسرے کے بالکل خلاف ہیں، حقیقت ہوں، یعنی دونوں ایک طرح سے حقیقت و عینیت کا رجی کی ترجمانی کر رہے ہوں اور دونوں ہی درست اور استوار محکم ہوں۔ ہر انسان آزاد ہے جس طرح چاہیے حقیقت کی تعریف کرے اور یہ کہنے لگ جائے کہ جس چیز کو عام لوگوں کے اذہان قبول کر لیں وہ حقیقت ہے اور جب تک یہ قبولیت موجود ہے اس کا نام حقیقت ہے لیکن آخرکار یہ سوال باقی رہتا ہے کہ ان دونوں نظریوں میں سے جن میں سے ہر ایک کسی خاص زمانہ میں قابل قبول رہا ہے کون سا واقع نما ہے۔ اور عینیت کے ساتھ مطابقت کرتا ہے اگر وہ یہ کہیں کہ یہ دونوں ہی مطابق ہیں تو یہ بالکل جھوٹ بات ہے کیونکہ واقعیت اور حقیقت ایک سے زیادہ نہیں ہوتی، کیونکہ یا تو زمین پہلے سے ہی مرکز تھی اور ہے اور رہے گی، یا سورج مرکز تھا، ہے اور رہے گا جس کو بھی آپ حساب کریں وہ دوسرا نہ تھا

نہ ہے، نہ ہوگا۔ اس صورت میں وہ کیسے کہتے ہیں کہ دونوں واقع کے ترجمان ہیں اور دونوں ہی واقع کے مطابق ہیں اور اگر وہ یہ کہیں کہ اُن میں سے ایک مطابقت کرتا ہے اور دوسرا نہیں کرتا تو جو مطابقت کرتا ہے وہی حقیقت ہے اور دوسرا خطا اور غلط ہے اور اگر یہ کہیں کہ ان میں سے کوئی بھی مطابقت نہیں کرتا تو معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت کوئی تیسری چیز ہے جہاں تک ابھی فکر بشری پہنچ نہیں پائی ہے۔

ہاں! حقوقی مسائل کے بارے میں ان دونوں دانش مندوں کا نظریہ جس میں ایک احساسی اور ایک خواہش کا پہلو موجود ہے اور ان کی خارج میں کوئی حقیقت نہیں ہے اور ان کا باہر کوئی مصداق نہیں ہے وہ پورے طور پر صحیح اور استوار ہے۔

کسی قسم کے حقوق ان کی خواہشات کے مطابق ہوتے ہیں اور جس طرح وہ چاہیں وہی حق اور حقیقت ہوگی اگر ایک مدت کے بعد ان کی خواہشات دگرگوں ہو جائیں تو صرف دوسری خواہشات حق و حقیقت ہوں گی۔

ہم احساسی اور حقوقی مسائل میں ہرگز خارج میں کوئی نظریہ نہیں رکھتے کہ جس سے خارج کے ساتھ مطابق ہونے کا مسئلہ پیش آئے بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہر معاشرے کی سرنوشت خود اسی کے ہاتھ میں ہے مثلاً کسی زمانہ میں ہمارے بزرگ نظام مشروط کو چاہتے تھے۔ اب اس وقت جمہوری اسلامی کے نظام کو چاہتے ہیں دونوں چاہتیں اگر صحیح اور سچی ہوں تو حق ہیں حکومت کی صورت اور حاکم کے نظام کا سرچشمہ لوگوں کی خواہش کو ہونا چاہیے۔ اس صورت میں دونوں نظاموں کو حق سمجھا جاسکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان نظریات وافکار کے درمیان ___ جو محیط ذہن سے خارج کی ترجمانی کرتے ہیں کہ عینیت اس طرح ہے اور اس طرح ہے یا اس طرح اور اس طرح ہوگی تو اس صورت میں چونکہ حقیقت و عینیت ایک سے زیادہ نہیں ہوتی لہٰذا یقیناً دونوں علموں میں سے ایک حقیقی اور واقع نما ہوگا نہ کہ دونوں علوم ___ اور ان احساسات وخواہشات کے درمیان فرق ہے جن کے متعلق ہم یہ کہتے ہیں کہ اس طرح ہو اور اس طرح نہ ہو۔ جب خواہشوں کی لگام لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی تو جو کچھ وہ چاہیں گے (جب تک کہ اس کے خلاف نہ چاہیں) وہی حقیقت ہوگی [1]

حقیقت کی دوسری تعریفیں

حق اور حقیقت وہ ہے جو انسان کے لیے مفید اور سودمند ہو۔ پس ہر وہ چیز جو مفید ہے وہ حق ہے اس نظریہ کے طرفدار حق ہونے اور مفید ہونے کو یا حق ہونے اور مصلحت ہونے کو ایک دوسرے کا لازم وملزوم سمجھتے ہیں اتفاقاً خصوصیت کے ساتھ اجتماعی مسائل میں (نہ کہ ہر اس فکری سوچ میں جو عالمِ افرینش کے ساتھ مربوط ہو) حقیقت و مصلحت ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں اس طرح سے کہ اگر جھوٹ اور تہمت حقیقت کے برخلاف ہے تو مصلحت کے بھی برخلاف ہے جیسا کہ راستگوئی اور سچائی اگر عین حقیقت ہے تو مفید اور سودمند بھی ہے لیکن یہ لازم وملزوم ہونا کلی مسائل کے ساتھ مربوط ہے اور جزائی موارد میں یعنی خاص معوقوں پر ان کلیات کی تطبیق کے مقام میں اکثر ایسا ہوسکتا ہے کہ حقیقت کوئی ضرر اور

---

[1] یہ مطلب حقوق انسانی کے بارے میں اہل مغرب کے نظریہ کی بنیاد پر ہے لیکن اسلام میں یہ مطلب ایک اور طرح پر ہے جس کی طرف ہم پہلے اجمالی اشارہ کر چکے ہیں اور یہ بیان کر چکے ہیں کہ تشریع کی وہ قسم حق ہے جو سعادتِ بشر کی ضامن ہو اور تنہا خواہش کافی نہیں ہے۔

نقصان کا سبب بن جائے فرض کیجئے ایک بوڑھا باپ ہے جو بستر بیماری پر پڑا ہوا ہے اور ڈاکٹری اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے دو تین سال تک زندگی بسر کر سکتا ہے اس کا جوان بیٹا جو ملک سے باہر تعلیم میں مشغول ہے کسی حادثہ سے دوچار ہو گیا ہے بیٹے کے واقعہ کو بیان کرنا اگر چہ وہ حقیقت ہے لیکن مصلحت نہیں ہے کیونکہ یہ بات اس کے لیے شدید تکلیف کا سبب بن جائے گی اور ہوسکتا ہے کہ اسے سکتہ (ھارٹ فیل) ہو جائے اس صورت میں حقیقت گوئی سود مند ہونے کے ساتھ لازم نہیں ہے۔اور رائج مثالوں میں سے سعدی کا وہ مشہور قول ہے کہ حاکم وقت نے ایک قیدی کے قتل کا حکم دے دیا۔جب قیدی اپنی زندگی سے ناامید ہو گیا تو اس حاکم کو گالیاں دینی شروع کردیں۔حاکم نے اپنے ایک وزیر سے قید کی باتوں کا ترجمہ کرنے کیلئے کہا اس نے دوسرے وزیر نے کہا کہ ہمارے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ حاکم کے سامنے جھوٹ بولیں وہ تو حاکم کو گالیاں دے رہا ہے۔تو اس طرح سے ترجمہ کیا: **الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس**۔وہ غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں باانصاف حاکم نے کہا: اس کی جھوٹی بات میرے لیے تیری سچی بات سے زیادہ لذت بخش ہے کیونکہ اس جھوٹ میں ایک شخص کی نجات پوشیدہ ہے جب کہ اس سچی بات میں ایک انسان کی موت ہے اور مصلحت آمیز جھوٹ فتنہ انگیز سچ سے بہتر ہے۔اب چاہے اس قصہ میں کوئی حقیقت ہو یا نہ ہو؟ یا دنیا میں اس قسم کے حاکم پیدا ہوتے ہیں جو انسان کی نجات کو اپنے غرور و تکبر پر ترجیح دیں یا نہیں، سر دست ہمیں اس سے سروکار نہیں ہے۔اصل بات یہ ہے کہ ایسے موقع پر سچ بولنا قیدی کے لیے مفید نہیں ہوگا۔

قرآن مجید سورہ رعد کی آیت ۱۷ میں حق و حقیقت اور مفید و سودمند ہونے کے درمیان لزوم کلی کے سلسلہ میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿١٧﴾

''خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا اور پانی دروں اور وادیوں میں ان کی گنجائش کے مطابق جاری ہوا، (چھوٹے چھوٹے ندی نالے ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے) اور سیلاب بن گئے، سیلاب اپنی جھاگ کو ساتھ لیے ہوئے بڑھنے لگا صرف سیلاب ہی اپنے اوپر جھاگ کو اٹھائے ہوئے نہیں ہوتا بلکہ دھاتوں کے اوپر بھی .... جو زینت، یا آلات زندگی کے لیے، آگ میں تپانے سے پگھل جاتی ہیں...... جھاگ آجاتا ہے (جیسے خود پانی اور دھاتیں) وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے خدا اس طرح سے مثالیں بیان کرتا ہے۔''

''**اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض**۔'' (جو چیز مفید ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے) کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو چیز لوگوں کے لیے سودمند ہے وہ حق ہے اور جو چیز معاشرے کے لیے نقصان دینے والی ہے وہ باطل ہے یہ جملہ اس بات کی طرف توجہ کرتے

ہوئے کہ اس سے پہلے کے جملہ میں: کذلك یضرب الله الحق و الباطل' وارد ہوا ہے، اس بات کو بیان کرتا ہے کہ حق ہونا اور مفید ہونا ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔

کیا حقیقت ایسی نسبی امر ہے

جو لوگ حقیقت کو نسبی جانتے ہیں، اور حقیقت کا مطلق طور سے انکار کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ قوائے ذہنی کے عالم خارج کے ساتھ مطابق کرنے سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہی حقیقت ہے مثلا جب انسان کے حواس خارج سے ملتے ہیں تو خارج حواس کے اوپر اثر ڈالتا ہے اور ہمارے حواس بھی خارج سے اثر لے کر عکس العمل ظاہر کرتے ہیں خارج کی تاثیر اور حواس کے ردعمل سے جو نتیجہ نکلتا ہے اسی کو حقیقت کہتے ہیں عمل اور ردعمل کی صورت میں مثلا جسم سے ایک روشنی نکلتی ہے اور آنکھ میں داخل ہوجاتی ہے تو ہماری آنکھ صرف اثر قبول کرنے والی ہی نہیں ہوتی بلکہ اثر بخشنے والی بھی ہوتی ہے آنکھ ان تمام حالات وشرائط میں جو وہ خارج کے ساتھ رکھتی ہے موجود کے اوپر اثر انداز ہوتی ہے۔ ان دونوں تصادفات اور ملاقاتوں کے مجموعہ کا محصول جو عالمِ عین کے عالم ذہن کے ساتھ تصادف کا معلول ہے اسی کو حقیقت کہتے ہیں۔

جس وقت ان سے یہ کہا جاتا ہے۔ کہ ممکن ہے کہ دو آدمی ایک ہی چیز کو دو حالتوں میں دیکھیں مثلاً وہ آدمی جو یرقان کی بیماری میں مبتلا ہے۔ بیماری کی وجہ سے چیزوں کو زرد، اور صحیح سالم آدمی چیزوں کو ان کے اپنے رنگ میں دیکھے تو وہ اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ دونوں حقیقت ہیں۔ پہلے شخص کے لیے وہی زردی حقیقت ہے اور دوسرے شخص کے لیی اس چیز کا خود اپنا رنگ حقیقت ہے۔

جس وقت ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے ہم کسی ایک چیز کو دو صورتوں میں محسوس کریں، مثلاً اگر ہم اپنے ایک ہاتھ کو گرم پانی میں رکھیں اور دوسرے کو سرد پانی میں، اور اس کے بعد دونوں کو ملائم پانی کے درمیان رکھیں تو ہم ایک ہاتھ سے سردی اور دوسرے سے گرمی کا حساس کریں گے تو وہ اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ: دونوں حقیقت ہیں، تو اس بناء پر حقیقت کی کوئی بنیاد نہ ہوئی اور خاص بنیاد کا عقیدہ وہی مطلق سوچ ہے بلکہ مختلف اشخاص کے حالت کی بنا پر حقیقت ہے وہ دوست جسے ہم نے خاص حالات میں اچھا سمجھا ہے اور دوسرے حالات میں برا سمجھا ہے ہے دونوں حقیقت ہیں ان حالات میں حقیقت اس کے اچھے ہونے میں تھی اور دوسرے حالات میں حقیقت اس کے نقطہ مقابل میں ہے۔

اشیاء کوئی مسلم اور محدود واقعیت نہیں رکھتیں، جس کے ساتھ ہم اپنی ذہنی دریافت کو پرکھ سکیں، بلکہ حقیقت حالات کے اختلاف کے ساتھ، جو ادراکات واحساسات کے اختلاف کا سبب بن جاتی ہے خود بھی مختلف ہوتی ہے۔

لہٰذا آج یہ کہا جاتا ہے کہ چیزوں کے مطلق ہونے کی سوچ کو دور پھینک دینا چاہیے اور تمام چیزوں کو نسبی صورت میں سوچنا چاہیے۔ بطلیموس کے لیے حقیقت وہی تھی جو وہ سوچتا تھا اور خلقتِ جہان کو جس طرح سے وہ تصور کرتا تھا، اور گلیو اور دوسروں کے لیے حقیقت وہی ہے جو وہ خیال کرتے اور سوچتے ہیں۔ اور ہر تصور اپنے حالات کی نسبت حقیقت ہے۔

اگر کسی زمانہ میں یہ کہا جاتا تھا کہ عناصر چار ہیں اور آج یہ کہتے ہیں کہ ایک سو کچھ ہیں تو دونوں حقیقت ہیں۔ کیونکہ پہلے حالات کا نتیجہ پہلی دریافت

اور دوسرے حالات کا نتیجہ دوسری دریافت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اگر ایک گروہ کہتا ہے۔ کہ خدا ہے اور کچھ لوگ اس کا انکار کرتے ہیں، تو دونوں نظریے حقیقت ہیں، کیونکہ ہر شخص کی دریافت اس کے اپنے ادراک کے حالات کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے اور ہر قسم کے حالات اسی ادراک کے سوا اور کسی چیز کو قبول نہیں کرتے۔ مثلاً پہلے گروہ کے حالات میں اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ وہ خدا کے وجود کے معتقد ہوں اور دوسرے لوگوں کے حالات اس کی نفی کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہیں کرتے۔ یہ موجودہ زمانہ کے میٹریالسٹول (ماوٰبٹین) کا نظریہ ہے جو اس طریقہ سے تمام چیزوں کی توجیہ کرتے ہیں۔

حقیقت کے نسبی ہونے کے نظریہ پر تنقید

حقیقت اور خطاء کے نسبی ہونے کا نظریہ، علم کی واقع نمائی اور انسان کی واقع گرائی اور واقع جوئی سے قطع نظر، پورے طور پر قابل توجیہ ہے لیکن علم کی واقع نمائی اور انسانوں کے حقیقت پسند ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے۔ اور یہ کہ حقیقت ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتی، حقیقت و خطاء کا نسبی ہونا، ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

وہ انسان جو ورزشی میدانوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، ان کی نظر میں پانچ سومیٹر کے مدرسہ کے صحن کی فضا بہت ہی چھوٹی ہوتی ہے جبکہ یہی فضاء ان لوگوں کے لیے جو پچاس یا ساٹھ میٹر مربع کے گھروں میں رہتے ہیں ایک بہت وسیع فضاء ہے ان میں سے ہر ایک اپنی ذہنی خصوصیت اور پہلے کی انسیت کے مطابق گفتگو کرتا ہے اور ہر ایک سچ بات کہتا اور حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ لیکن چونکہ چھوٹا ہونا اور بڑا ہونا ایک نسبی چیز ہے اور نسبت کے علاوہ اور کوئی واقعیت اور عینیت نہیں رکھتے لہٰذا ہوسکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مقام پر سچا اور استوار ہو، لیکن اگر وہ دونوں افراد یہ بات کریں کہ گھر کا صحن کتنے میٹر ہے۔ تو پھر دونوں کی نظر میں صحن کے میٹر پانچ سومیٹر سے زیادہ نہ ہوں گے۔ اور چونکہ وہ ایک واقعیت سے زیادہ نہیں ہے لہٰذا وہ ایک حقیقت سے بھی زیادہ نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب یہ دونوں آدمی اپنے ذہنی خصوصیات کے ساتھ کسی گھر کے صحن کے بارے میں فیصلہ کریں تو ہوسکتا ہے کہ دونوں کے فیصلے دو اعتبار سے صحیح ہوں۔ لیکن جب اپنے فیصلہ میں اس قسم کی خصوصیات سے صرفِ نظر کرلیں اور خود واقع کے ساتھ سروکار رکھیں اور اپنے علم و آگاہی کے ساتھ واقع نمائی کی نظر سے دیکھیں، مثلاً وہ زمین کی واقعی پیمائش کو معین کرنا چاہیں، تو پھر قطعی طور پر ایک سے زیادہ حقیقت نہیں ہوگی۔

دومختلف احساسات کے بارے میں، جو انسان میں پیدا ہوتے ہیں معاملہ اسی طرح سے ہے۔ وہ ہاتھ جو گرم پانی میں ڈالا گیا ہے وہ اس کی حرارت سے متاثر ہوگا اور پانی کی حرارت ہاتھ کے اعصاب پر اثر انداز ہوگی۔ اسی طرح وہ ہاتھ جو سرد پانی میں ڈالا گیا ہے پانی کی سردی اس ہاتھ کے اعصاب پر اثر ڈالے گی اور اس کو متاثر کرے گی۔ اب اگر ہم دونوں ہاتھوں کو معتدل و ملائم پانی کے درمیان داخل کریں تو ہمیں دومختلف احساسات عارض ہوں گے یہ مختلف احساسات تیسرے پانی کے ساتھ مربوط نہیں ہیں یعنی تیسرا پانی گرم بھی ہو اور ٹھنڈا بھی، ایسا نہیں ہے بلکہ اس

تاثر کے ساتھ مربوط ہے جو دونوں ہاتھوں میں خارج سے پیدا ہوا ہے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ پانی ٹھنڈا بھی ہے اور گرم بھی تو ایک معنی کے لحاظ سے دونوں باتیں صحیح ہیں۔ اور ایک معنی کے لحاظ سے دونوں غلط، یا کم از کم ایک غلط ہے۔

اگر مقصد یہ ہے کہ ایک ہاتھ کے اعصاب اس پانی سے ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں اور دوسرے ہاتھ کے اعصاب اس پانی سے گرمی محسوس کرتے ہیں تو یہ بات صحیح و استوار ہے یعنی ایک کہتا ہے کہ میں اس پانی سے ٹھنڈک محسوس کرتا ہوں، اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ میں اس پانی سے گرمی محسوس کرتا ہوں تو متفقہ طور پر دونوں صحیح کہتے ہیں لیکن اگر مراد یہ ہے کہ یہ پانی ٹھنڈا بھی ہے اور گرم بھی ہے تو یہ غلط اور جھوٹ ہے کیونکہ پانی میں ایک معینہ حرارت پائی جاتی ہے کہ وہ ہرگز اس سے تجاوز نہیں کرتی۔ اس لیے یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ گرم بھی ہو اور سرد بھی ہو۔ کہنے والے کی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے دو مختلف احساسات (گرمی و سردی) کو اپنے اعصاب کی طرف نسبت دینے کی بجائے پانی کی طرف نسبت دیتا ہے اور یہی نسبت اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ انسان حقیقت کو ایک امر نسبی سمجھنے لگے۔ ساری گفتگو اس بات میں ہے، کہ کیا ہاتھ سردی اور گرمی محسوس کرتے ہیں، یا پانی سرد و گرم ہے یعنی مثلاً صفر سے ۳۰ درجہ اوپر بھی ہے اور اس سے ۱۰ درجہ اور بھی اوپر ہے؟ مسلمہ طور پر معاملہ پہلے قبیل سے ہے نہ کہ دوسرے قبیل سے۔

قرآن میں حق و باطل کا پہلا مبازرہ

قرآن حق و باطل کا پہلا مبازرہ آدم کی اولاد کے درمیان آدم کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل کی سرگذشت میں جانتا ہے، جو دونوں ہی آدم کے صلبی بیٹے تھے۔ یہ مبازرہ اس وقت شروع ہوا جب دونوں نے بارگاہ الٰہی میں تقرب کے لیے ایک عمل انجام دیا۔ ان میں سے ایک کا عمل تو قبول ہو گیا اور دوسرے کا قبول نہ ہوا اور دوسرے نے اپنے بھائی کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا اور اُسے قتل کر دیا۔

قرآن اس بارے میں اس طرح کہتا ہے:

وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ ابۡنَىۡ اٰدَمَ بِالۡحَـقِّ ‌ۘ اِذۡ قَرَّبَا قُرۡبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنۡ اَحَدِهِمَا وَلَمۡ يُتَقَبَّلۡ مِنَ الۡاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقۡتُلَـنَّكَ‌ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الۡمُتَّقِيۡنَ‏ ﴿۲۷﴾

(مائدہ)

''آدم کے دونوں بیٹوں کی داستان صحیح طور پر ان کے لیے تلاوت کردو جب کہ ان دونوں نے بارگاہ الٰہی میں تقرب کے لیے ایک عمل انجام دیا، لیکن ان میں سے ایک کا عمل تو قبول ہو گیا اور دوسرے کا عمل قبول نہ ہوا (تو جس بھائی کا عمل قبول نہیں ہوا تھا اس نے دوسرے سے کہا) میں تجھے قتل کر دوں گا۔ دوسرے نے اس کے جواب میں کہا (میں نے کیا گناہ کیا ہے) خدا پرہیزگاروں کے عمل کو قبول کرتا ہے

(اگر تیرا عمل قبول نہیں ہوا ہے تو وہ تیری پرہیزگاری نہ کرنے کی وجہ سے ہے) اور اس نے مزید کہا:

لَئِنۡۢ بَسَطۡتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقۡتُلَنِیۡ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیۡکَ لِاَقۡتُلَکَ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۸﴾ (مائدہ)

''اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ بڑھائے گا تو میں ہرگز تیرے قتل کے لیے ہاتھ نہیں کھولوں گا میں تو عالمین کے پروردگار، خدا سے ڈرتا ہوں۔

اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِکَ فَتَکُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیۡنَ ﴿ۚ۲۹﴾

(مائدہ)

''میں چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا گناہ کندے پر لے لے۔ (اب جب کہ تو میرے قتل کا ارادہ کر چکا ہے، میں تجھے قتل نہیں کروں گا، تاکہ تو میرے اور اپنے گناہ کو اپنے کندھے پر لے لے) اور انجام کار دوزخیوں میں سے ہو جائے اور ظالم لوگوں کو یہی سزا ہے۔''

تینوں آیات کے تینوں میں غور کرنے سے ہمیں نکات ذیل کا سبق ملتا ہے۔

ا۔ آدم کے بیٹوں کی داستان کوئی فرضی اور موجودہ زمانہ کی اصطلاح کے مطابق ''سمبولک'' نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی واقعیت ہے جس کی صحیح اور سچی تصویر قرآن نے پیش کی ہے جیسا کہ پہلی آیت میں لفظ ''بالحق'' اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ ان دونوں کے جھگڑے کی بنیاد یہ نہیں تھی کہ کوئی جنبہ طبقاتی تھا، یا ان میں سے ایک دوسرے کا استحصال یا استثمار کر رہا تھا، بلکہ ''خود ہی خود کو چاہنا'' اور ''اپنے سے غیر کو نہ چاہنا'' کی سرشت اور ''حسد'' اس بات کا سبب بن گیا کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کے خون سے اپنا ہاتھ رنگے۔ دوسرے لفظوں میں اس جھگڑے کی بنیاد خواہش اور عقیدت تھی۔ اس جھگڑے کا ایک فریق معتقد اور ہوا و ہوس سے خالی انسان تھا، اور دوسرا فریق خودخواہ اور حاسد تھا۔

دونوں فریقوں میں سے ایک اپنے عمل کے قبول ہوجانے کی وجہ سے خوش ہے اور کیفر کردار کے خوف سے دوسرے فریق کو قتل کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جب کہ دوسرا فریق اپنی خواہشات نفسانی کا محکوم ہے ایسی خواہشات جنہوں نے بھائی کی محبت و الفت کے شعلوں کو خاموش کر دیا ہے اور کیفر کردار کے خوف کو بے اثر بنا دیا ہے۔

اس واقعہ کو دو گروہوں کے درمیان بھی حاکم سمجھا جا سکتا ہے یعنی دو عظیم گروہوں کی نزاع بھی ــ جو عقیدہ و آرزو اور ہوا و ہوس کی حکومت سے متاثر ہوں1؎ جانا جا سکتا ہے نہ کہ اختلاف طبقاتی سے۔

مارکس ازم یہ چاہتا ہے کہ تاریخی دور کے آغاز سے ہی انسانوں کے تمام جھگڑوں اور مبارزات کی طبقاتی اختلاف کے طریق سے توجیہ کرے اور تمام مقدس جنگوں کی، جو حق طلب اور عظیم مقاصد کے خواہاں انسانوں اور پست اور حیوان صفت انسانوں کے درمیان ہوئی ہے اسی طریق سے تفسیر کرے، لیکن اس نے انسانوں کے مبارزات کے صرف ایک حصہ پر ہی آنکھیں جمارکھی ہیں اور انسانوں کے بہت سے مقدس مبارزات کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

۳۔ یہ سرگذشت یہ بتاتی ہے کہ ایمان اور عظیم مقاصد کی آرزو انسان کو کس طرح سے سکون و آرام بخشتے ہیں کہ وہ دشمن سے یہ کہتا ہے۔

ما انا بباسط یدی الیك لاَ قتلك انیّ اخاف الله رب العالمین۔"

''میں تیرے قتل کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، کیونکہ میں عالمین کے پروردگار سے ڈرتا ہوں''[1]

اسی طرح اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس انسان میں ایمان، عظیم مقصد اور خدا کا خوف نہ ہو۔ وہ ایسا وحشی جانور بن جاتا ہے کہ اس میں برادرانہ الفت و محبت اور روکنے والے عوامل ہی نہیں رہتے، اور وہ بھائی کے قتل کے لیے ہاتھ بڑھا دیتا ہے، جیسا کہ بعد والی آیت میں فرماتا ہے۔

فَطَوَّعَتۡ لَهٗ نَفۡسُهٗ قَتۡلَ اَخِيۡهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ۞ (مائدہ)

''سرکش نفس نے اُسے اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کردیا اور اس نے اسے قتل کر دیا، اور زیاں کاروں میں سے ہوگیا۔''

حق کی کامیابی یا باطل امور سے وابستگی کس طرح ہے؟

آخری بات جو حق و باطل کے بارے میں کہی جاتی ہے یہ ہے کہ:

اگر حق پائیدار اور باطل ناپائیدار ہے، اور قرآن کی تعبیر کے مطابق باطل زائل ہونے والا ہے۔ تو پھر نوعِ بشر کی زندگی کی تاریخ کو باطل حکومتوں نے کیوں تشکیل دیا اور ظلم وستم نے ___ جو باطل کا واضح مصداق ہے ___ دنیا کو کیوں گھیر رکھا ہے؟''

جواب

آیات کا ہدف یہ نہیں ہے کہ باطل ہرگز ظاہر ہی نہیں ہوگا اور باطل کی جڑ صفحہ ہستی سے ہی منقطع ہو جائے گی۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو باطل حق کے

---

[1] البتہ اس بھائی کے قتل کا قیاس، جو اس کے قتل کا خواہاں ہے، اپنا دفاع کرنے کے علاوہ چیز ہے۔ جس چیز کی وہ نفی کر رہا ہے وہ بھائی کے قتل کا قیام ہے نہ کہ اپنے آپ سے دفاع۔

ساتھ ابھر کر بڑھتا ہے وہ کچھ مدت کے بعد ختم اور نابود ہو جائے گا اور اس کی ہستی باقی نہیں رہے گی۔ اور یہ چیز اس بات سے مانع نہیں ہے کہ ایک اور باطل ایک اور دوسری شکل وصورت میں حق کے پہلو بہ پہلو پھر نمودار ہو جائے اور جڑ پکڑ لے۔

خلاصہ یہ ہے کہ افرادِ باطل محو و نابود ہو جائیں گے، چاہے اس کی نوع حق کے دائمی ہونے کے ساتھ اس کے سائے میں محفوظ ہی رہ جائے۔ یہاں دو اور جواب بھی ہیں جو سر دست بیان نہیں ہوں گے۔ اُمید ہے کہ ہم کسی اور موقع پر یہ دونوں جواب بیان کریں گے۔

۴۔ عمل میں اخلاص یا صِرف خُدا کے لیے عمل

عمل میں اخلاص، یا خدا کے لیے کام کرنا اسلام کے مسلم اصولوں میں سے ہے جس نے اس آسمانی مکتب کو اپنے خاص قسم کی روشنی اور درخشندگی بخشی ہے۔ اور اسے اعتقادی، اخلاقی اور اجتماعی میدانوں میں دوسرے انسانی مکاتب سے جدا کر دیا ہے اور لوگوں کے لیے فیصلہ اور انصاف کرنے کے سلسلہ میں اقدار میں انقلاب لانے کا سبب بن گیا ہے، درحقیقت یہ ان پر بارترین اصولوں میں سے ایک ہے جس کی اسلام دعوت دیتا ہے اور اس کا شرائع الٰہی کے علاوہ اور کہیں بھی اور کسی بھی مکتب میں نام ونشان نہیں ہے اور حقیقت میں اس کے سوا کسی اور میں ہو بھی نہیں سکتا۔

مادی مکاتب اور اسلام میں نیکوکار

مادی مکاتب ا؎ میں نیکوکار وہ شخص ہے جو اچھا کام انجام دے چاہے اس کے کام کرنے کا سبب انسانوں سے ہمدردی کی روح ہو، یا نام ونمود، رضائے الٰہی کا حاصل کرنا مقصود ہو، یا معاشرے میں امتیازی حیثیت کا حصول، خلاصہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہر قسم کی دکھائی دینے والی، یا دکھائی نہ دینے والی دنیاوی نفع رسانی سے پاک رکھے یا اُسے دنیاوی مناصب میں کامیابی کے لیے پل قرار دے مادی مکاتب کے نزدیک ایسا آدمی ہر حال میں قابلِ تعریف ہے۔

فرض کریں ایک شخص اپنی جائز آمدنی سے علاج معالجہ کے تمام وسائل سے آراستہ ایک ہسپتال بناتا ہے اور اس ادارہ کے لوازمات اور ضروریات کو پورا کرنے اور ہسپتال کے لیے ضروری انسانی قوت حاصل کرنے کے لیے حد سے زیادہ کوشش کرتا ہے اور ایک دن اس کا جرائد اور روزناموں اور خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندوں کے سامنے افتتاح کرتا ہے۔ اس موقع پر روزنامے ہسپتال کے بانی کی تصویر چھاپ کر اور ہسپتال کے دروازے اور دوسرے حساس اور تعجب انگیز مقامات پر اس کے فوٹو لگا کر اس کی تعریف وتحسین کرتے ہیں اور ریڈیو ٹیلی ویژن اس کے بانی کے انٹرویو کا ایک حصہّ اور ہسپتال کے مختلف سین پیش کر کے اس کا ایک نیک مرد کے عنوان سے معاشرے کو تعارف کراتے ہیں۔

حالانکہ اسلام کے اخلاقی مکتب کے لحاظ سے اکیلا نیک کام قدر وقیمت پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ نیک مقصد ایک امر معنوی ہو، جو عیبوں سے پاک ہو، مثلاً اُسے خدا کے لیے بنائے نہ کہ فائدہ اٹھانے کے لیے، ھدف انسانوں کی خدمت ہو، نہ کہ شہرت ونام ونمود ۔خلاصہ یہ ہے کہ کام کی بنیاد پاک الٰہی اور انسانی اہداف ومقاصد ہوں نہ کہ مادی نفسانی اغراض۔

یہی وہ موقع ہے کہ عمل میں اخلاص لوگوں کی تعریف و تحسین میں اقدار کے انقلاب کا سبب بن جاتا ہے اور مادی مکاتب کے لحاظ سے نیک کام کرنے والا آدمی نیت کی پلیدی کی وجہ سے غیر نیکوکار رہو جاتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ اسلام لوگوں کے حق میں فیصلہ دینے کے لیے دو قسم کی فائلیں دیکھتا ہے ایک عمل کی فائل اور دوسری نیت کی فائل۔ اگر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوں تو اس کو نیکوکار سمجھتا ہے اور اس کی تعریف کرتے ہوئے اُسے نیک جزا دیتا ہے اور اس کے علاوہ دوسری صورت میں اس کو بے قدر و قیمت سمجھتا ہے۔

پیغمبر گرامیؐ نے فرمایا ہے

"ان اللہ لا ینظر الیٰ صورکم ولٰکن ینظر الیٰ قلوبکم واعمالکم۔"[1]

''خدا تمہارے ظاہر کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمہاری نیتوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔''

پیغمبر گرامیؐ کے زمانہ میں مکہ کے بت پرست مسجد الحرام کو تعمیر کر رہے تھے اور ظاہر بین لوگ ان کے کام کی تعریف میں لگے ہوئے تھے۔ جبکہ قرآن ان کے اس ظاہری عمل کو بالکل بے قدر و قیمت قرار دے رہا ہے کیونکہ اگرچہ ان کا وہ عمل ظاہری اعتبار سے ایک عمدہ عمل تھا لیکن نیت کے لحاظ سے وہ کئی قسم کی ناپاک اغراض سے آلودہ تھا، لہٰذا قرآن اس کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ⑰ (توبہ)

''مشرکین کو خدا کی مساجد کے تعمیر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے جبکہ وہ خود اپنے لیے اپنے کفر پر گواہ ہیں، ان کے اعمال نابود اور ضائع ہو گئے، ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اور وہ ہمیشہ کی آگ میں رہیں گے۔''

قرآن ہر عمل صالح کو ایمان کے درخت کا پھل سمجھتا ہے کیونکہ عمل انسان کی نیت کا پرتو ہوتا ہے اور اس کا رنگ اور صورت کسی نہ کسی طرح اس کے اندر آ جاتی ہے۔ اور آلودہ نیت کے ساتھ پاک عکس العمل ہرگز ممکن نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی دن وہ اپنی آلودگی کو ظاہر کر دیتی ہے، اور اسی لحاظ سے اس عمل کو بلند کر دیتی ہے جس کی تراوش ایمان کے درخت سے ہوئی ہو اور وہ کام حقیقتاً خدا کے لیے انجام پایا ہو جیسا کہ فرماتا ہے:

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (توبہ۔۱۸)

''خدا کی مسجدوں کو تو وہ شخص آباد کرتا ہے جو خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو۔''

---

[1] المحجۃ البیضاء ج۶ ص۱۰۸۔

ریاء ایک خاص گروہ کے لیے ایک جال ہے

ریاء اس گروہ کے لیے جو سرکش نفس کو ظاہری طور پر گناہ کرنے سے باز رکھتے ہیں ایک وسیع جال ہے۔ کیونکہ شیطان انہیں ظاہری طور پر گناہ کرنے کی طرف مائل کرنے سے مایوس ہوجاتا ہے۔

اس صورت میں گناہ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا اور نفسانی لذتوں کو ظاہری قویٰ کے طریق سے ترک کردینا، ایسے لوگوں کے اندر جن کی روح خدا کے عشق اور معنویت سے پر نہیں ہے، ایک عظیم خلا پیدا کردیتا ہے اور ہوس باز نفس کسی ایسے سوراخ کی تلاش میں رہتا ہے کہ جس کے ذریعہ اس خلا کو پر کرے۔ اسی لیے نفس ظاہر سے منقطع ہونے کی بناء پر باطن اور دل کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس جگہ کو اپنی فعالیت کا مرکز بنالیتا ہے کیونکہ اس نے عبودیت کی لذت اور کمالِ مطلق سے پیوستگی کا مزہ نہیں چکھا، لہٰذا اسے لوگوں کی طرف سے اپنی تعریف سن کر مزا آتا ہے اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ لوگوں کے سامنے اپنے گذشتہ کئے ہوئے اچھے اور نیک کاموں کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے لگ جاتا ہے اور صرف انہی نیک کاموں کو انجام دیتا ہے جو لوگوں میں اس کی واہ واہ کرائے اور ان کی حیرت اور تعریف کرنے کو بڑھائے اور اس روح کے بلندی پر پہنچنے سے وہ آہستہ آہستہ معنویت کی سرحد سے دور ہوکر حریم گناہ سے نزدیک ہوجاتا ہے اور نیک کاموں کے انجام دینے سے اس کا ہدف اور مقصد ''مرضات اللہ'' اور اخروی اجزاؤں کی بجائے وہی شہرت اور لوگوں کی تعریف ہوجاتا ہے اور اس کی نظر میں عمل صالح، جاہ و منصب اور شہرت وحیثیت کے حصول کے لیے کامیابی کے ایک پل کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس کے بعد یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ وہ خدائی فرائض کو بھی اسی نظر سے انجام دینے لگ جاتا ہے کہ لوگ اُسے عابد وزاہد اور متقی و پرہیزگار خیال کریں اور اس کے تقویٰ، پرہیزگاری اور نیکوکاری کے محفلوں میں چرچے ہوں اور اس کا معاشرے میں حد سے زیادہ احترام ہو۔

اس قسم کا ظاہری طور پر خدا پرست انسان، خود پرست اور خودخواہ ہوجاتا ہے اس کا خدا اس کا نفس بن جاتا ہے اور اس کا دین اس کی نفسانی لذتیں ہوتی ہیں اور مولوی (روم) کے قول کے مطابق:

چوں سزای ایں بت نفس اونداد
ازبت نفسی ، بت دیگر بذاد
مادربت ھابت نفس شما است
زانکہ آں بت مار وایں بت اژدھااست

چونکہ اس نے اس نفس کے بت کو سزا نہیں دی لہٰذا اس بت کے نفس سے ایک اور بت پیدا ہوگیا تمہارے نفس کا بت بتوں کی ماں ہے کیونکہ وہ بت تو سانپ ہے اور یہ بت اژدھا ہے

کچھ لوگ آخر عمر تک اسی حالت میں باقی رہتے ہیں اور دکھاوے اور ریاکاری میں اپنی عمر بسر کردیتے ہیں اور فرائض وواجبات اور اعمال صالح کو

ریا کاری کی صورت میں ادا کرنے سے دست بردار نہیں ہوتے اور بعض لوگ کچھ زمانہ گذر جانے کے بعد نفاق کی نقاب بھی اپنے چہرہ سے ہٹا دیتے ہیں اور ریا اور فریب سے حکومتی عہدے اور اجتماعی و معاشرتی مناصب کے لیے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس چھوٹے زاہد اور عبادت کو بھی الوداع کہہ دیتے ہیں اور ظاہری دکھاوے سے ترقی کر کے افعال قبیح اور کفر و الحاد سے بھی انکار نہیں کرتے۔

جاہ طلبی کے مفاسد

اس میں شک نہیں کہ ہر نیک عمل اور سودمند کام شہرت اور لوگوں کی توجہ کا سبب بنتا ہے اور عمل صالح سے لوگ نیکو کار آدمی سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں، یہاں تک کہ قرآن فرماتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ (مریم)

''جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور عمل صالح بجالاتے ہیں تو خدا ان با ایمان اور نیکو کار لوگوں کی محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔

لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ اس قسم کے قہری ردعمل کی ریاء کے بارے میں کوئی بات نہیں ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے عکس العمل کو کام پر ابھارنے اور انسان کو نیک عمل کرنے پر آمادہ کرنے کا سبب نہیں بننا چاہیے۔''

لوگ انبیاء اور اولیائے خدا سے محبت کرتے ہیں اور سارے جہان میں ان کی شہرت ہے اور تمام انسانوں میں دو اللہ کے بندے، یعنی حضرت عیسیٰ مسیحؑ اور حضرت محمدؐ سب سے زیادہ مشہور ہیں اور انسانی معاشرہ ان سے محبت کرتا ہے لیکن وہ ہرگز کوئی کام شہرت اور جاہ و منصب کے حصول کے لیے نہیں کرتے تھے بلکہ وہ خدا اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ہر قسم کی تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلتے تھے اور ہمیشہ لوگوں سے یہ کہتے تھے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۣ

(سبا۔۴۶)

''کہہ دیجئے میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم خدا کے لیے قیام کرو، خواہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر خواہ انفرادی صورت میں اور پھر غور کرو۔''

اس بناء پر قہری عکس العمل کو ان علل و اسباب کے ساتھ جن کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں مخلوط نہیں کرنا چاہیے۔

حب جاہ وہ حد سے زیادہ سرکوبی کرنے والی علت ہے جو انسان کو ریاء کے قریب لے جاتی اور انسان کے اعمال کو تباہ کر دیتی ہے۔ اور یہ وہ منزل ہے کہ جس کے لیے اہل معرفت یہ کہتے ہیں کہ:

اٰخر ما یخرج من رؤوس الصدیقین حب الرّئاسۃ۔"[۱]

"صدیقین کے دماغوں سے جو آخری نفسانی تعلق باہر نکلتا ہے وہ منصب اور ریاست کی طلب ہے۔"

حب جاہ کی سرشت کے مصیبت اور آفت ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ قرآن کی نظر سے جاہ طلبی اور آخرت کے گھر کی فلاح اور رستگاری اکٹھے نہیں ہو سکتے جیسا کہ فرماتا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ

(قصص۔ ۸۳)

"ہم آخرت کا گھر ان ہی لوگوں کے لیے قرار دیں گے جو برتری کے طلب گار اور فساد کرنے والے نہ ہوں۔

امام ہشتمؑ نے معمر بن خلاّد سے فرمایا:

"دو درندہ بھیڑیوں کا ضرر اس گلہ کے لیے جس کے چرواہے غافل ہوں مسلمان کے دین میں حب ریاست کے ضرر سے زیادہ نہیں ہے"[۲]

قرآن ریاء کے انفرادی اور اجتماعی مضرات کو ایک مثال کے ضمن میں بیان کرتا ہے، اب ہم اس مثل کو پیش کر کے اس کے مفاسد کے تمام پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔

عمل میں ریاء

قرآن جب کہ امت اسلامی کو عمل میں اخلاص اور خدا کے لیے کام کرنے کی دعوت دیتا ہے ریا کاری اور ظاہر سازی سے جو ریاء کا براہ راست اثر ہے، شدت کے ساتھ روکتا ہے اور ریا کاری کے ساتھ انجام دیئے گئے اعمال کے لیے بڑی خوبصورت مثالیں بیان کرتا ہے۔ ریاء کے کئی پہلو ہوتے ہیں، عقیدہ کا پہلو، معاشرے کا پہلو اور اخلاق کا پہلو یعنی یہ ایک ایسا عامل ہے جو ان تینوں مرحلوں میں اپنا اظہار کرتا ہے۔

لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور نام اور شہرت کے حصول کے لیے عبادت اور پرستش کرنا، شرک درعبادت کی ایک قسم ہے جسے اسلامی روایات میں شرکِ خفی کا نام دیا گیا ہے اور اس شرک کا مظہر اگرچہ عمل اور خود عبادت ہے، لیکن اس کی جڑ بنیاد کو انسان کی روح ورواں اور عقیدہ میں تلاش کرنا چاہئے۔

کیونکہ شرک درعبادت کبھی تو واضح صورت میں انجام پاتی ہے، مثلاً بت پرستوں کی عبادت، جو خدا کی بجائے بت کی پرستش کرتے تھے اور کبھی مخفی اور پوشیدہ صورت میں، اور ریا کار کا کام مخفی اور پنہاں شرک ہے کیونکہ وہ ظاہر میں تو خدا کی پرستش کرتا ہے لیکن چونکہ اس کے عمل کا سبب یہ

---

[۱] المحجۃ البیضاء ج ۶ ص ۱۰۷۔

[۲] ماذئبان ضاربان فی غنم قد تفرق رعاءوھا ءباضر فی دین المسلم من الرئاسۃ" (رجال کشی ص ۳۱۳)

ہے کہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے لہٰذا وہ حقیقت میں اس کے غیر کی پرستش کر رہا ہوتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر اس قسم کا سبب درمیان میں نہ ہوتا تو وہ ہرگز بھی عبادت نہ کرتا۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

"الرّجل یعمل شیئا من الثواب لایطلب به وجه الله انما یطلب تزکیة الناس یشتهی ان یسمع الناس فهذا الّذی اشرك بعبادة ربّه ثم قال مامن عبداسر خیراً فذهبت الایام ابدًا حتّٰی یظهر الله له خیرًا۔"

"جو آدمی ثواب کا کام انجام دیتا ہے، لیکن وہ خدا کے لیے نہیں بلکہ اس کے لیے انجام دیتا ہے کہ لوگ اُسے پاکیزہ آدمی سمجھیں اور وہ اس سے یہ چاہتا ہے کہ اس کی پاکیزگی کا حال لوگوں کے کانوں تک پہنچ جائے، یہ شخص اپنی پرستش کے ساتھ خدا کے لیے شریک قرار دیتا ہے، اور جو کوئی شخص کسی نیک کام کو چھپ کر انجام دے تو آخر کار وہ نیک کام خود کو ظاہر کر کے رہتا ہے۔"

عارف کے دل میں سوائے خدا اور سوائے اس کی ولاء کے اور کوئی ولاء نہیں ہوتی، اور ایک سالک کی تعبیر کے مطابق:

درضمیر مانمی گنجد به غیراز دوست کس
ہر دوعالم رابه دشمن ده که مارا دوست بس

ہمارے دل میں دوست کے علاوہ کسی کی گنجائش نہیں ہے۔ دونوں جہان ہمارے دشمن کے حوالے کر دو کیونکہ ہمارے لیے تو دوست ہی کافی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پیغمبر گرامیؐ نے فرمایا:

"من عمل عملاً اشرك فیه غیری فهوله کله وانا اغنی الاغنیاء من الشرك۔ [1]

"جو شخص کسی کام کو انجام دے اور اس میں میرے علاوہ کسی اور کو شریک قرار دے، تو وہ سارا عمل اسی کے لیے ہے

[1] صحیح ابن ماجہ حدیث نمبر ۲۰۳۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

یار مفروش به دنیا که بسی سود نکرو
آنکه یوسف به زرنا سره بفروخته بود

اور میں کسی شریک سے، سب بے نیازوں میں سے، سب سے بڑھ کر بے نیاز ہوں۔"
دلوں میں ریاء کا نفوذ اس طرح لاشعوری طور پر عجیب وغریب نفوذ کو بیان کرتی ہے، آپ نے فرمایا۔

الریاء اخفی من دبیب النملة السوداء علی الصخرة الصماء فی اللیلة الظلماء۔"[1]

"آدم کی اولاد کے دلوں میں ریاء کا نفوذ اندھیری رات میں صاف پتھر پر سیاہ چیونٹی کے چلنے سے بھی زیادہ مخفی ہے۔"

کوئی بھی انسان چاہے سننے اور دیکھنے میں کتنا ہی تیز ہو، وہ چیونٹی کے چلنے کی آواز کو نہیں سن سکتا اور نہ ہی اُسے دیکھ سکتا ہے اور ریاء دل میں نفوذ اور عمل میں حرکت کے لحاظ سے اندھیری رات میں چیونٹی کے چلنے سے بھی زیادہ نہ سنائی دینے اور نہ دکھائی دینے والی چیز ہے اس بناء پر اہل ایمان کے لیے لازم وضروری ہے کہ وہ ہوش میں رہیں کہ ریاء لاشعوری طور پر ان کے دلوں اور اعمال میں نفوذ نہ کر جائے۔

یہ ریاء کے اعتقادی پہلو کی قسم ہے اب ہم اس کے اجتماعی اور اخلاقی پہلو کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

معاشرے اور فرد کے اخلاق پر جو سب سے بڑا ضرر اور آسیب "ریاء" سے پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ کام کی جڑ بنیاد کو ختم کردیتا ہے۔ اور عمل کی گہرائی میں کمی کردیتا ہے۔ اور لوگوں کو ظاہر سازی پر (اگرچہ درد کی دوا نہیں کرتا) آمادہ کردیتا ہے۔

فرض کریں کہ ایک شخص معاشرے کے پس ماندہ اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتا ہے لیکن اس کے یہ کام الٰہی اور انسانی اسباب کی وجہ سے نہیں ہوتے بلکہ وہ یہ کام شہرت حاصل کرنے اور نام ونمود اور آخر کار مال ومنصب کے حصول کے لیے کرتا ہے تو مسلمہ طور پر اس کے اس کام کی کوئی گہرائی اور جڑ بنیاد نہیں ہوگی۔ اور یہ سلسلہ وقتی طور پر نتیجہ کے حاصل ہونے تک برقرار رہے گا اور نتیجہ کے حاصل کر لینے کے بعد نہ ہم اس کی گرد کو دیکھیں گے اور نہ ہی اس کے کام کو، نہ انگور کی بیل ہوگی نہ اس کو لگانے والا۔ یہاں تک کہ اس کا وہ وقتی کام بھی ظاہری ہوگا باطنی نہیں ہوگا۔ اور اس کے نمائشی پہلوؤں کی طرف زیادہ توجہ دے گا، لیکن وہ اس کے باطنی اور سودمند پہلوؤں سے منہ موڑ لے گا۔

لیکن اگر یہ کام خدائی مقاصد اور صحیح انسانی افکار سے سرچشمہ حاصل کرے تو وہ کام جڑ پکڑے اور گہرائی پیدا کرے اور اُسے دوام اور ہمیشگی حاصل ہو۔ یہاں تک کہ ایک نیکوکار آدمی بعض اوقات اپنے اوپر زندگی کو اس لیے سخت کر لیتا ہے تاکہ پس ماندہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے۔

طاغوت (شاہ ایران) کے زمانہ میں ایران کے جنوبی شہروں میں سے ایک شہر میں ایک ریاکار شہردار (کارپوریشن کا میئر) تھا اسنے شہر کے بڑے چوک کے باغیچوں میں پھولوں کے پودے نہیں لگوائے تھے اتفاق سے اُسے اطلاع ملی کہ طاغوت وقت (شاہ ایران) جنوب کی طرف

---

[1] مسند احمد ج ۴ ص ۴۰۳۔ مستدرک الوسائل ج ۱ ص ۱۲۔ المحجة البیضاء ج ۶ ص ۱۰۷۔

آ رہا ہے اور اس جگہ سے عبور کرے گا ریا کار شہردار (کارپوریشن کے میئر) نے طاغوت (شاہ ایران) کے آنے سے دو دن پہلے پھول بیچنے والوں سے پہلے بہت سے پھول خرید ے اور اس باغیچہ کی زمین پر چنوا دیئے تا کہ اپنے آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرے۔ اس کے دو دنوں کے بعد وہ پھول مرجھا گئے اور اس باغیچہ کی وہ جھوٹی آرائش ختم ہوگئی مجھے یہ واقعہ سننے کے بعد وہ آیت یاد آ گئی جو ریا کار کے عمل کی اس ریا کار میئر کے عمل کی طرف توصیف کرتی ہے اور یہ بیان کرتی ہے کہ ریا کاروں کا عمل کامل طور سے بے بنیاد اور بغیر گہرائی کے ہوتا ہے جب کہ خدا کے لیے کیئے گئے کام عمیق اور جڑ بنیاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اور قرآن اس حقیقت کو ایک مثال کے ضمن میں بیان کرتا ہے جس میں بہت سے نکات پوشیدہ ہیں جیسا کہ فرماتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَا لَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۶۴ (بقرہ)

''اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل نہ کرو، اس شخص کی طرح جو اپنے مال کو دکھانے کے لیے صرف کرتا ہے اور خدا اور روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتا، ایسے لوگوں کا عمل پتھر کے اس صاف ٹکڑے کی طرح ہے جس پر مٹی کی ایک نازک تہہ جمی ہوئی ہو اور اس میں بیج ڈال دیں تو اس کے اوپر ایک زوردار بارش برس جائے اور ساری مٹی کو دھو کر ختم کر دے اور اس کو مٹی اور بیج سے خالی اور صاف کر دے۔ انہوں نے جو کام انجام دیا ہے اس سے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا، اور خدا کافروں کی رہنمائی نہیں کرتا۔''

قرآن اس آیت میں ان لوگوں کے عمل کو، جو اپنا کام کسی پر منت جتلانے اور زبانی اذیت پہنچانے کی وجہ سے خراب کر لیتے ہیں ریا کار کے کام سے تشبیہ دیتا ہے اور ان دونوں کی قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنا کام خدا کے لیے نہیں کرتا کیونکہ اگر وہ خدا کے لیے وہ کام انجام دیتے تو ہرگز احسان نہ جتلاتے اور تصریح کے ساتھ یا اشارہ کنایہ میں بھی منہ پر نہ لاتے، یہ ایک تشبیہ ہے۔

اس کے بعد قرآن دوسری طرف رخ کرتا ہے اور ریا کار کے عمل کو اس کسان کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے جس نے ایک ایسے مضبوط اور سخت پتھر پر جس پر مٹی کی ایک تہہ جمی ہوئی ہو، بیج بکھیر دیا ہو اور ایسی زمین جو سورج کے سامنے اور ایک آزاد فضا میں ہو اور سیلاب کی طرح سے ایک زبردست بارش اس پر برس پڑے تو وہ مٹی کی ساری تہہ اور بیج کو بہا لے جائے گی اور صاف پتھر کے سوا جس پر کوئی چیز نہ اُگ سکے۔ اس کے لیے کچھ باقی نہ رہنے دے گی کسان نے اپنے اس عمل سے کوئی فائدہ کیوں نہ اٹھایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے کام کی کوئی جڑ بنیاد نہیں تھی اور دانہ چاہیے جتنا بھی طاقتور ہو پتھر کو نہیں چیر سکتا۔

ہر آں افگند تخم بروئے سنگ

جوی وقت دخلش نیا بدبہ چنگ

جوشخص پتھر پر بیج ڈالے گا،

تو درآمد کے وقت کوئی چیز اس کے ہاتھ نہیں آئے گی۔لیکن اگر اس کے عمل کو کوئی جڑ بنیاد ہوتی اور وہ اپنا بیج تیار وآمادہ زمین اور قابل نفوذ مٹی میں ڈالتا تو یہ بارش نہ صرف اس کو کوئی نقصان نہ پہنچاتی بلکہ اس کی نشوونما اور پرورش میں مددگار رہوتی۔

قرآن کی نظر میں ریاکار لوگوں کے کام اس کسان کے کام کے مانند ہیں۔جب کہ اہل ایمان کے اعمال جو خدا کے لیے کام کرتے ہیں،اس کے بالکل برعکس ہیں،جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ [1] اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٦٥﴾ (بقرہ)

جولوگ اپنے مالوں کو خدا کی رضا کے حصول اور دل وجان میں سکون وآرام کے لیے خرچ کرتے ہیں،ان کی مثال اس باغ جیسی ہے کہ جو بلندی پر واقع ہو اور اس پر زور کی بارش برسے اور اس کی وجہ سے وہ دوگنا پھل دے اور اگر اس پر زوردار بارش نہ برسے تو ہلکی بارش اور شبنم اس پر پڑتی ہے (اور باگ کی طراوت کو محفوظ رکھتی ہے)اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اُسے دیکھتا ہے۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بارش وہاں نقصان کیوں پہنچاتی ہے،لیکن یہاں پھلوں کے کئی گنا ہونے کا سبب کیوں بن جاتی ہے۔اس کا نکتہ یہ

---

[1] مفسرین نے''ربوہ'' کو بلند جگہ کے معنی میں لیا ہے اس خیال سے کہ اگر باغ بلندی پر ہو تو وہ زیادہ ثمر دار ہوتا ہے جبکہ گزشتہ زمانہ میں باغ کی زمین کا اونچا ہونا،پانی کے وہاں نہ پہنچنے کا سبب بنتا تھا۔علاوہ ازیں اس قسم کی زمین گرم علاقوں میں ہمشیہ گرم اور جلانے والی ہواؤں کی زد میں ہوتی ہے اور باغ لگانے کی بہترین جگہ ہموار زمین ہوتی ہے،نہ زیادہ بلند اور نہ زیادہ پست اس بناء پر آیت میں''ربوہ'' سے مراد وہ گرم مٹی ہے جو بارش کے برسنے کے بعد ظاہر ہوتی ہے اور زراعت اور باغ لگانے کیلئے بہترین زمین ہوتی اور قرآن مجید میں لفظ''ربوہ'' اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (حج ۵) تم زمین کو آرام کی حالت میں دیکھتے ہو۔جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ حرکت میں آجاتی ہے اور اوپر آجاتی ہے اور برآمدگی کی حالت پیدا کر لیتی ہے(کسان کہتے ہیں کہ زمین سان لے رہی ہے اور''ربوہ'' اس معنی میں مثال کے طور پر زیادہ مناسب ہے

ہے کہ ایسے کام کی کوئی جڑ بنیاد نہیں ہوتی اور دوسرا کام مکمل طور سے گہرا اور ریشہ دار ہوتا ہے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ریا کاروں کے کام تھوڑے سے ہی عرصہ کے بعد کیوں ختم ہوجاتے ہیں لیکن مردان خدا کے کام جو ریاء سے دور ہوتے ہیں سینکڑوں سال تک پھلتے پھولتے رہتے ہیں۔

ریاء کے ساتھ کئے ہوئے کام کے بے بنیاد ہونے کی وحی الٰہی سے بھی تائید ہوتی ہے اور اجتماعی مشاہدات بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

''وتثبیتاً من انفسہم'' کا جملہ اس معنی میں ہے کہ وہ انفاق کرنے میں نہ صرف خدا کی رضا کے حصول کے خواہاں ہیں بلکہ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے آمادہ رہتے ہیں کہ آیندہ زمانہ میں احسان جتلا کر اُسے باطل نہ کریں۔

یہ جملہ ایک اور مطلب کی طرف اشارہ بھی ہوسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل ایمان راہ خدا میں انفاق کر کے اپنے نفس اور دل کو ثبات وسکون بخشتے ہیں اور انفاق کرنا ان کی روح کے سکون وآرام کا سبب بنتا ہے کیونکہ: ''الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔'' دلوں کو یاد خدا سے اطمینان وسکون حاصل ہوتا ہے۔

قرآن کئی آیات میں اہلِ ایمان کو عمل میں اخلاص اور پاکیزگی کی دعوت دیتا ہے اور اس نے اس حقیقت کو:

''مرضات اللہ'' و''وجہ اللہ'' و''رضوان اللہ''، ''مخلصین لہ الدّین۔ اور قُوموا اللہ'' کے عنوان کے تحت بیان کیا ہے اور ان آیات کی طرف رجوع کرنے سے کہ جن میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں مطلب واضح ہوجائے گا۔

اوران بیانات کے اصول کو ذیل میں بیان کردہ صورت میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مرضات اللہ

قرآن ان لوگوں کی تعریف کرتا ہے جو کام کو خدا کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لیے انجام دیتے ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌ ۢ بِالۡعِبَادِ‏﴿۲۰۷﴾

(بقرہ)

''لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی جان کے بدلے میں خدا کی رضا کو خرید تے ہیں اور خدا بندوں پر مہربان ہے[1]

[1] ''مرضات اللہ'' بقرہ۔ ۲۶۵ اور نساء۔ ۱۱۴ میں بھی وارد ہوا ہے

۲۔ وجہ اللہ

لغت عرب میں لفظ وجہ کے معنی تو وہی چہرہ وصورت ہے لیکن چونکہ انسان کا چہرہ ہی انسان کے رضاء وغضب، اور خوشنودی اور غصہ کا مظہر ہوتا ہے اگر انسان کسی چیز سے خوش ہوتا ہے تو اس کے آثار اس کے چہرہ میں نمایاں ہوجاتے ہیں اور وہ اس کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے اور اگر وہ اس سے غمگین اور غصہ ہوجائے تو اس سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اسی بناء پر لغت عرب میں یہ لفظ بعض اوقات رضا وخوشنودی کے کنایہ کے عنوان سے استعمال ہوتا ہے۔

قرآن مجید اس اصل کے لیے دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ کاموں کو خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے انجام دینا چاہیے اور اس سلسلہ میں وہ اسی لفظ سے مدد لیتے ہوئے فرماتا ہے۔

"ابتغاء وجه الله"، "لوجه الله" "وجه ربه الاعلیٰ"، "وجه الله" [۱]

نمونہ کے طور پر:

وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ (بقرہ۔ ۲۷۲)

''اور وہ صرف خدا کی رضا کے حصول کے لیے خرچ کرتے ہیں۔''

اہل بیت رسالت جب اپنا رات کا کھانا محتاجوں کو دیتے تھے تو وہ ان سے یہ کہتے تھے۔

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ (دھر)

''ہم تو تمہیں خدا کی رضا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں، ہم تم سے کسی جزاء یا تعریف کے طلب گار نہیں ہیں۔''

۳۔ رضوان اللہ

اس اصل کی طرف دعوت دینے کے لیے قرآن نے جو تیسرا لفظ استعمال کیا ہے وہ لفظ ''رضوان'' ہے، جو اہل دل اور اہل معرفت کے نزدیک ایک خاص قسم کا جذبہ اور کشش رکھتا ہے اور اہل کمال کے لیے اس کے حصول سے بڑھ کر اور کوئی لذت نہیں ہے اور ہر عارف کی آخری آرزو یہی ہوتی ہے۔ کہ اس کے بدنی اور قلبی اعمال رضائے خدا کے مظہر ہوں، اور قرآن نے اس لفظ کو:

"رضوان الله"۔ "رضوان من الله"۔ رضوانه" "رضوان"۔ "رضواناً۔"

---

[۱] اس سلسلہ میں بقرہ۔ ۲۷۶۔ دہر۔ ۹، لیل۔ ۲۰، روم۔ ۳۸، ۳۹، کی طرف رجوع کریں۔

کی صورتوں میں استعمال کیا ہے۔[1]

نمونہ کے طور پر:

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ (فتح۔۲۹)

''تم پیغمبر اور ان کے اصحاب کو دیکھو گے کہ وہ رکوع وسجود کی حالت میں ''اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے خواہاں ہیں۔''

۴۔عمل میں اخلاص

''خلوص'' لغت عرب میں اس چیز کو کہتے ہیں جس میں اس کے غیر کی آمیزش نہ ہو۔اور قرآنی آیات کے ایک سلسلہ میں ''دین میں اخلاص'' کے بارے میں تاکید ہوئی ہے اور ''ونحن له مخلصون''،واخلصوا دينهم الله''،مخلصين له الدين''،مخلصاً له الدين''، مخلصاً له ديني۔'' کے مانند جملے وارد ہوئے ہیں[2]

اب دیکھنا یہ ہے کہ ''اخلاص در دین'' سے کیا مراد ہے۔ان آیات میں دو احتمال پائے جاتے ہیں جن میں سے پہلا احتمال دوسرے احتمال سے زیادہ واضح اور روشن ہے اب ہم ان دونوں احتمالوں کو بیان کرتے ہیں۔

۱۔''دین'' سے مراد وہی اطاعت ہے اور لغت میں ''دین کے قطعی معنی میں سے ایک وہی اطاعت ہے[3] اور ان آیات کا مقصد اطاعت میں اخلاص ہی ہے یعنی خدا کے علاوہ اور کسی کی اطاعت نہیں ہونا چاہیے، یہاں تک کہ پیغمبر اور امام کی بھی اس لحاظ سے اطاعت کرنا چاہیے کہ خدا نے ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔

اس احتمال کی تائید آیات کے اس سلسلہ سے ہوتی ہے جو وضاحت کے ساتھ ''توحید در اطاعت'' کی دعوت دیتی ہیں۔مثلاً۔

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ؕ [4] (نحل۔۵۲)

''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کے لیے ہے اور دائمی اور ہمیشہ کی اطاعت بھی اسی کے

---

[1] اس سلسلہ میں آل عمران، ۱۵، ۱۶۲، ۱۷۴، مائدہ۔۲، ۱۶۔توبہ۔۲۱، ۷۲، ۱۰۹ محمد۔۲۸ اور حشر ۸ کی طرف رجوع کریں۔

[2] بقرہ۔۱۳۹، نسائی، ۱۴۶، اعراف۔۲۹، زمر۔۲، ۱۱، ۱۴ کی طرف رجوع کریں۔

[3] مفردات راغب اور مجمع البحرین کی طرف رجوع کریں۔

[4] واصب۔دائم اور ہمیشہ کے معنی میں اور آیت میں دین کا مناسب معنی وہی اطاعت ہے اور یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ ''دین'' ''اصول وفروع'' کے معنی میں ہے کیونکہ اس صورت میں ''واصباً'' کی قید بے فائدہ ہوگی۔

لیے ہے۔"

اور مثلاً۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَاَصۡلَحُوۡا وَاعۡتَصَمُوۡا بِاللّٰہِ (نساء۔۱۴۶)

"سوائے ان لوگوں کے جو اللہ کی طرف لوٹ آئے اور انہوں نے اپنی اصلاح کر لی اور خدا کے (دین) سے تمسک کیا اور اپنی اطاعت کو خدا کے لیے خالص کر لیا"

ان دونوں آیات میں بھی اور دوسری آیات میں بھی "دین" کا مناسب معنی اطاعت ہی ہے اس بناء پر وہ آیات جو دین میں اخلاص کی دعوت دیتی ہیں، وہ توحید در اطاعت کو ہی بیان کرتی ہیں اور یہ کہ عالم ہستی میں خدا کے علاوہ اور کوئی "مطاع بالذات" نہیں ہے۔

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ "دین" سے مراد شریعت ہو اور دوسرے لفظوں میں اصول و فروع دین ہو [1]

اور دین میں اخلاص سے مراد یہ ہے کہ خدا کے بارے میں وہ عبادت سے مربوط مسئلہ میں ہم اس کے غیر کی عبادت نہ کریں، اور صرف اسی کی پرستش کریں، اور حقیقت میں اس قسم کی آیات توحید در عبادت سے مربوط ہوں گی اور یہ کہ صرف اسی کی پرستش کی جائے نہ کہ اس کے غیر کی اور نہ ہی اس کی غیر کے ضمیمہ کے ساتھ لیکن یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ یہ معنی پہلے معنی کی نسبت چنداں واضح نہیں ہے کیونکہ اس قسم کا معنی اس چیز سے وابستگی رکھتا ہے کہ ہم "دین" کو "ملت" اور شریعت یعنی اصول و فروع کے معنی میں لیں اور پھر اس کے مجموعہ سے صرف اصول کو مراد لیں اور اصول سے مقصود صرف توحید در عبادت ہو۔ اس قسم کا معنی وسط کا محتاج ہونے کی بنا پر فہم عرفی سے دور ہے۔

اس لحاظ سے اس قسم کی آیات توحید در "اطاعت" کو ہی بیان کرتی ہیں جس کے مشرکین قائل نہیں تھے، اور اِن کا توحید در عبادت یا ریاء و نفاق سے پاک ہونے کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے اگر چہ بہت سے فقہاء نے ان آیات سے عبادت کے ریاء سے پاک ہونے پر استدلال کیا ہے۔

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ بہت سی آیات میں "دین" کا مناسب معنی اطاعت ہی ہے اور دین کے اصول کے معنی میں تفسیر اس خصوصیت کے ساتھ جو اس کی ذات یا صفات یا عبادت سے مربوط ہے، ابہام سے خالی نہیں ہے، مثلاً:

یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡـنِكُمۡ وَلَا تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ‌ؕ اِنَّمَا الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ (نساء۔۱۷۱)

"اے اہل کتاب "دین" کی اطاعت میں حد اعتدال سے باہر نہ نکلو، اور خدا کے بارے میں حق بات کے علاوہ اور کچھ نہ کہو، مریم کا بیٹا عیسیٰ مسیح تو خدا کا رسول ہے۔"

یہ حقیقت اس صورت میں واضح ہو جاتی ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ عیسائی مسیح کو چونکہ خدا سمجھتے تھے لہٰذا وہ اُسے مطاع بالذات بھی سمجھتے تھے، مثلاً۔

---

[1] راغب کہتا ہے کہ اس قسم کا استعمال ایک مجازی استعمال ہے۔

وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

(توبہ ۰۔۲۹)

''خدا اور اس کے رسول نے جس چیز کو حرام قرار دیا ہے اہل کتاب اسے حرام شمار نہیں کرتے اور حقیقی صورت میں اطاعت بھی نہیں کرتے۔''

اور مثلا

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (بقرہ۔۲۵۶)

''اطاعت میں جبر و اکراہ نہیں ہے، یعنی واقعی اور حقیقی اطاعت جبر کو قبول نہیں کرتی۔''

ہم یہاں ان چار قسم کی آیات سے، جو مسئلہ ریاء سے مربوط تھیں، یا جن میں ارتباط کا امکان تھا، آشنا ہوئے ہیں۔ اب ہم پانچویں قسم کی آیات کی وضاحت کرتے ہیں۔

۵۔ خدا کے لیے قیام

کچھ آیات یہ حکم دیتی ہیں کہ اُمت اسلامی کو خدا کے لیے قیام کرنا چاہیے اور ان کا اُٹھنا بیٹھنا، حرکات وسکنات سب کچھ خدا کے لیے ہونا چاہیے۔

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ (بقرہ)

''خدا کی اطاعت کے لیے نماز کو قائم کرو۔''

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾ (طٰہٰ)

''میری یاد کے لیے نماز کو قائم کرو۔''

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾ (فرقان)

''وہ لوگ جو راتوں کو خدا کے لیے سجدہ کرتے اور قیام کی حالت میں صبح کر دیتے ہیں۔''

آیات کا یہ گروہ دوسرے گروہ کی آیات کی مانند ہی اہلِ ایمان کے ہر کام اور ہر کوشش اور عبادت و پرستش کو خدا کے لیے کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

۵۔قرآن میں نور و ظلمت

وہ موضوعات جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں ان میں سے ایک ''نور'' و ''ظلمت'' کا مسئلہ ہے۔اس آسمانی کتاب میں ان دونوں موضوعات کو مختلف پہلوؤں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً لفظ ''نور'' ''النور'' ''نورا'' ''نورکم''۔ ''نورنا'' ''نورہ''۔ ''نورھم'' ''المنیر'' و ''منیراً'' کی صورت میں ۴۹ بار وارد ہوا ہے اور اسی طرح سے لفظ ''ظلمت'' اپنے تمام مشتقات کے ساتھ ''اظلم'' ''مظلما'' ''مضلمون''۔و ''ظلمات'' کی صورت میں ۲۶ بار وارد ہوا ہے۔

نور و ظلمت بدیہی اور واضح مفاہیم میں سے ہے جس کے لیے تعریف کوئی ضرورت نہیں ہے۔ فارسی (اور اردو) زبان میں ان دونوں کے ہم معنی الفاظ ''روشنی'' اور ''تاریکی'' میں قرآن میں یہ دونوں الفاظ معنوی نور و ظلمت کے لیے مجاز اور استعارہ کی صورت میں استعمال ہوئے ہیں اور قرآن نے ان کے مصادیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ امور کو ''نور'' اور کچھ چیزوں کی ''ظلمت'' قرار دیا ہے۔

نور ایک وجود ہے اور ظلمت عدم

علمی تحلیل کے لحاظ سے ''نور'' ایک ایسی چیز ہے جو وجود رکھتی ہے ، جو ''منور بالذات'' اجسام مثلاً سورج'' وغیرہ سے نکلتا ہے جبکہ ''ظلمت'' کی فقدانِ نور کے علاوہ اور کوئی حقیقت نہیں ہے۔مثلاً وہ کمرہ جس کے تمام دروازے بند ہوں ''وہ نور کے فقدان کی بناء پر تاریک ہوتا ہے اور نور کے اس میں داخل ہوجانے سے وہ روشن ہوجاتا ہے، یا وہ شاخ جسے زمین پر نصب کیا جاتا ہے تو اس کے سائے کا حصہ کم رنگ ظلمت کا حامل ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ شاخ نور کی چمک میں رکاوٹ بن جاتی ہے اس بناء پر درحقیقت سایہ نور کے نہ ہونے کے سوا اور کوئی واقعیت نہیں رکھتا۔

یہاں ایک سوال پیش آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ظلمت ''فقدانِ نور'' کے علاوہ اور کوئی واقعیت نہیں رکھتی تو پھر اُسے جعلِ الٰہی کیوں قرار دیا گیا ہے؟ جیسا کہ ذیل میں بیان کردہ آیات اس کی ترجمانی کرتی ہے۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوۡرَ ۬ؕ ثُمَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ یَعۡدِلُوۡنَ ① (انعام)

''حمد کا سزاوار وہی خدا ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔اور تاریکی اور روشنی قرار دی،لیکن کافر لوگ خدا کا شریک قرار دیتے ہیں۔''

اس سوال کا جواب ''ظلمت'' کی حقیقت کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کیونکہ رات کی تاریکی زمین کے سائے کے سوا اور کوئی چیز نہیں

ہے۔اور چونکہ خدا نے سورج کو پیدا کیا ہے۔اور زمین کو ایک ایسے محور پر قرار دیا ہے کہ ہمیشہ اس کا آدھا حصہ روشن اور دوسرا آدھا حصہ تاریک رہتا ہے تو اس صورت میں اس قسم کی تدبیر کرنے والا۔واقعی طور پر تاریکی وظلمت کو بھی وجود میں لانے والا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ ٹھیک ہے کہ ظلمت ایک امر عدمی ہے لیکن اس امر عدمی کا سرچشمہ ایک امر وجودی ہے جس کا تعلق قدرت وخلقت سے ہے اور وہ زمین کو اس طرح سے خلق کرتا ہے کہ اس کا آدھا حصہ ہمیشہ تاریک رہتا ہے تو اس صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ظلمت بھی خدا ہی کی مخلوق ہے، لیکن وہ بالعرض اور بالتبع مخلوق ہے۔

فرض کریں کہ کوئی شخص ایک فوٹو کھینچنے کے لیے کمرہ تاریک میں نور اور روشنی کے تمام سوراخوں کو بند کر دیتا ہے۔تو اس صورت میں کہا جا سکتا ہے اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فلاں شخص نے کمرہ کو تاریک کر دیا اور ظلمت کو پیدا کیا، اگرچہ وہ براہِ راست تاریکی کو وجود میں نہیں لایا، بلکہ اس نے ایک ایسا کام انجام دیا ہے کہ جس کا نتیجہ تاریکی کا وجود میں آنا ہے۔

ظلمتوں کی نسبت

اس سے قطع نظر ظلمتیں عام طور پر ظلمتِ مطلق نہیں ہوتیں، بلکہ ستاروں یا دوسرے منابع نور کے کم رنگ اور ضعیف نور کی آمیزش رکھتی ہے۔اور آیت یہ کہنا چاہتی ہے کہ خدا نے ہمارے لیے دن کی روشنی اور رات کی تاریکی کو، جن میں سے پہلی طاقت نور ہے اور دوسری کمزوری روشنی ہے قرار دیا ہے اور اس قسم کی ظلمت خدا کی مخلوق ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ظلمتیں عام طور پر نسبتی ہوتی ہیں، لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا، کیونکہ بعض اوقات ظلمت مطلق ظلمت کی صورت میں بھی ہوتی ہے جیسا کہ ''رحم'' مادر (جسے قرآن ظلماتِ ''ثلاث'' سے تعبیر کرتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے۔

يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ (زمر-٦)

''وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں میں کئی طرح کی تبدیلیوں کے ساتھ تین تاریکیوں ''مشیمہ''، ''رحم''، و''بطن'' میں خلق کرتا ہے۔''

نورِ مفرد اور ظلمات جمع کیوں ہے؟

اس بیان سے ایک دوسرے سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ قرآن میں ''نور'' مفرد کی صورت میں اور ''ظلمات'' جمع کی صورت میں کیوں وارد ہوا ہے اور تعبیر میں اس اختلاف کا کیا سبب ہے؟

اس اختلاف کی علت اور سبب کو نور کی جڑ بنیاد میں تلاش کرنا چاہیے۔نور کی جڑ بنیاد تو اسی منظومہ شمسی میں ہے اور درختوں اور معاون میں مجتمع انرجی جو خاص حالت میں روشنی دیتی ہے، یہ سب سورج ہی سے حاصل کردہ ہوتی ہے۔اجسام مثلاً نباتات بتدریج سورج سے انرجی حاصل کرتے ہیں

اور اپنے اندر ذخیرہ کر لیتے ہیں اور خاص حالات میں اُسے آزاد کر دیتے ہیں۔اس بناء پر نور کا مرکز ایک سے زیادہ نہیں ہے، اور وہ آفتاب جہاں تاب ہے لیکن ہر جسم کا اپنا ایک سایہ ہوتا ہے اور ہر جسم خاص حالات میں ظلمت آفرین ہوتا ہے۔اسی وجہ سے ''نور'' ہمیشہ مفرد اور ''ظلمت'' جمع کی صورت میں آیا ہے۔

یہ توجیہ تو حسی ''نور و ظلمت'' سے مربوط ہے لیکن معنوی نور و ظلمت کے بارے میں مطلب دوسری طرز پر ہے۔ یہاں نور حق کی نشانی اور ظلمت باطل کی رمز ہے حق تو ہمیشہ ایک ہوتا ہے لیکن باطل طرح طرح کی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے نور وہی ''صراط مستقیم'' ہے جو ایک سے زیادہ نہیں ہے جو ہمیں حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، جب کہ ظلمت وہی کجیاں اور متعدد انحرافی ندی نالے ہیں جن کو عبور کرنے کا نتیجہ تاریک اور ہولناک دروں میں گرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

اس وجہ سے ''نور'' معنوی میں بھی ''ظلمت کے برعکس'' جمع کے بجائے مفرد کو ترجیح دی گئی ہے۔

اسی آیت کی تفسیر میں جو سورہ انعام کے آغاز میں وارد ہوئی ہے۔ایک بہت ہی عمدہ روایت امیر المومنینؑ سے نقل ہوئی ہے ہم یہاں پر اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ امیر المومنینؑ یہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ آیت تین منحرف گروہوں: مادئین، ثنوئین اور مشرکین کے جواب میں وارد ہوئی ہے۔

مادئین کے جواب میں جو عالم کو ازلی و ابدی جانتے ہیں کہتا ہے: **خلق السماوات والارض۔** ''خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے۔ ثنوئین (دو خداؤں کے قائل) کے جواب میں جو ظلمت کو مدبر عالم خیال کرتے ہیں۔فرماتا ہے۔'' **وجعل الظلمات والنور** ''اسی نے تاریکیاں اور روشنی قرار دی ہے۔اور مشرکین کے جواب میں جو اپنے بتوں کو خدا سمجھتے تھے۔فرماتا ہے۔'' **ثم الذین کفروا بربهم یعدلون۔**''[1]

وہ مخلوق خدا کو خدا کا شریک خیال کرتے تھے۔یعنی آسمانوں اور زمین کی خلقت ان کے حدوث کی نشانی ہے اور نور ظلمت کی خلقت ان کے لیے تدبیر کی احتیاج کی گواہ ہے۔اور غیر خدا کو خدا کی جگہ قرار دینا خدا کے بارے میں ان کے کفر کی دلیل ہے۔

نورِ حسّیِ کے طبیعی آثار

اس بارے میں بحث کہ حسّی ''نور'' کی حقیقت کیا ہے؟ ایک فزیکی بحث ہے جو ہماری بحث کی حدود سے خارج ہے لیکن وہ بات جو قابل توجہ ہے یہ ہے کہ ہم نور حسّی کے تکوینی آثار سے آگاہ ہوں تا کہ ہم نور معنوی کے سلسلہ میں بھی کہ قرآن نے زیادہ تر اسی پر تکیہ کیا ہے ایک دوسرے طریقہ سے جستجو کریں۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۱ ص ۵۸۱۔

نورحسّی کے طبعی آثار حسب ذیل ہیں۔

۱۔اس کی رفتار بہت ہی زیادہ تیز ہوتی ہے۔اس طرح سے کہ ایک سکینڈ میں تیس لاکھ کلومیٹر کی مسافت کو طے کر لیتا ہے۔

۲۔حیوانات اور نباتات کی پرورش کا عامل ہے، اس طرح سے کہ نور کا فقدان چاہے وقتی طور پر ہی ہو، روئے زمین پر حیات کی نابودی کا سبب ہے۔

۳۔زندگی کے ماحول کو روشن کرنے والا اور راہ سے چاہ کی نشاندہی کرنے والا ہے۔

۴۔چوروں اور خیانت کرنے والوں کو رسوا اور ذلیل کرنے والا ہے، یہاں تک کہ وہ صرف رات کو تاریکی میں ہی باہر نکل سکتے ہیں اور اپنے برے ارادوں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔

ہم قرآن میں ''معنوی نور'' کے بیان کے بعد انہیں آثار کے وجود کی طرف اشارہ کریں گے۔

انوارِ عقلی و معنوی

اگر چہ لوگوں کی زبان میں ''نور'' اسی حسّی نور کو' جو سورج اور دوسرے نورانی اجسام سے نکلتا ہے، کہا جاتا ہے۔لیکن قرآن نے اُن چیزوں کو نور کہا ہے جو ایک طرح سے ''حسّی'' نور کے ساتھ مشابہت رکھتی تھیں اور جن میں ایک یا اکثر نورِ حسّی'' کے خواص پائے جاتے تھے۔قرآنی آیات کا مطالعہ ہمیں ان انوار کی طرف رہبری کرتا ہے۔اور غور و جستجو کرنے سے ''نور حسّی'' سے ان کی وجہ تشبیہ معلوم کی جا سکتی ہے اب یہ قارئین کا کام ہے کہ وہ ہر اس موقع پر جہاں قرآن نے ''نور'' کا لفظ استعمال کیا ہے توقف کریں اور شباہت کی قسم اور اصطلاح کے مطابق ان کی ''وجہ تشبیہ'' نور حسّی کے ساتھ معلوم کریں اور ہم نے ابھی ابھی نور حسّی کے آثار و خواص کو بیان کیا ہے لہٰذا یقینی طور پر ان موادمیں کم از کم ایک خاصیت تو ضرور پائی جانی چاہیے۔

ان موارد کا مختصر بیان

۱۔قرآن نور ہے

کئی آیات میں قرآن اپنے آپ کو ''نور'' کہتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴿۱۷۴﴾

(نساء)

''اے لوگو! خدا کی طرف سے دلیل اور رہنمائی تمہاری طرف آ گئی ہے اور ہم نے تمہارے لیے روشنی دینے والا

نور نازل کیا ہے۔

''برھان'' سے مقصود اس آیت میں پیغمبر خدا ہیں ''نور'' سے مراد ''انزلنا'' کی گواہی سے وہی قرآن ہے۔اس کے علاوہ فرماتا ہے۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ؁ (اعراف)

''جو لوگ پیغمبر خدا پر ایمان لائے ہیں، اور ان کی مدد کرتے ہیں، اور اس نور کی جو ان کے ساتھ نازل کیا گیا ہے پیروی کرتے ہیں وہی نجات پانے والے ہیں۔''

پھر فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؀ (شوریٰ)

''اور ہم نے اسی طرح اپنے حکم سے قرآن کی تیری طرف وحی کی، حالانکہ تم تفصیلی طور پر اس کے مضامین سے آگاہ نہیں تھے (اور اس صورت میں اس پر) ایمان واقرار بھی نہیں تھا، اور ہم نے اُسے نور قرار دیا ہے ہم اس کے ذریعہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتے ہیں رہنمائی کرتے ہیں اور بیشک تم بھی راہ راست کی طرف رہنمائی کرتے ہو۔''

''اوحينا اليك روحاً۔'' کے جملہ میں ''روحاً'' سے مراد ''اوحينا'' کے لفظ کے قرینہ سے بہت سے مفسرین کے نزدیک قرآن ہے۔ اور ''ولكن جعلناه نوراً'' کے جملہ میں ضمیر روح کی طرف لوٹتی ہے اور آیت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم نے قرآن کو تیری طرف وحی کیا ہے اور اس کو نور قرار دیا ہے جس کے ذریعہ ہم ہدایت کے لائق بندوں کی ہدایت کرتے ہیں۔

اس مقام پر ہم دو نکات پیش کرتے ہیں۔

ا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ''اوحينا اليك روحاً من امرنا'' کے جملہ میں ''روحاً'' سے مراد ہی روح ہے جو فرشتوں کے ساتھ نازل ہوتی ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ ۔'' (قدر ۴) فرشتے اور روح نازل ہوتے ہیں۔

لیکن یہ نظریہ آیت کے ظاہر کے ساتھ مطابق نہیں ہے کیونکہ اگر روح سے مراد فرشتہ ہوتا تو ضروری تھا کہ ''اوحينا'' کی جگہ پر ''ارسلنا'' کا لفظ استعمال ہوتا کیونکہ روح اس معنی کے لحاظ سے ایک عالی مقام اور مادہ سے مجرد مخلوق ہے دوسرے فرشتوں کی مانند یا ان سے بھی بالاتر اور

اس قسم کا موجود قابل وحی نہیں ہے بلکہ بھیجنے اور ارسال کے لائق ہے، مثلاً یہ ہرگز صحیح نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ ہم نے جبرئیل کو وحی کی، بلکہ کہا یہ جائے گا کہ ہم نے جبرئیل کو بھیجا، جبکہ قرآن اس آیت میں فرماتا ہے۔ ''اوحینا الیک روحا من امرنا''

خلاصہ یہ ہے کہ ''وحی'' کلام اور گفتگو کے ساتھ مناسب ہے نہ کہ روح جبرائیل وغیرہ موجود مجرد کے ساتھ۔ اسی بناء پر یہ نظریہ رکھنے والا اس بات پر مجبور ہو گیا ہے کہ وہ ''اوحینا'' کے لفظ کو ''ارسلنا'' کے معنی میں لے، اور یہ خود ظاہر کے بہت ہی خلاف ہے۔

۲۔ کچھ لوگ ''ما کنت تدری ما الکتاب ولا والایمان'' کے جملہ کا غیر صحیح صورت میں معنی کرتے ہیں اور اس کو اس بات کے لیے گواہ بنایا ہے کہ رسول خدا بعثت سے پہلے فاقد ایمان تھے حالانکہ اگر سیاق آیت میں غور کیا جائے، اور خود ہر قسم کے پہلے سے کئے ہوئے فیصلہ سے پاک رکھیں تو وہ ہرگز بھی قرآن کی اس قسم کی ناروا تفسیر تجویز نہیں کریں گے، کیونکہ پیغمبر سے خطاب میں آیت کا ہدف یہ ہے کہ وہ لوگوں تک یہ بات پہنچا دیں اس کی وحی کے ذریعہ آپ کو تعلیم دی ہے اور یہ مقام نبوت کا ارتقاء ہے کہ آپ کو ان معارف وشرائع سے تفصیلی اور وسیع صورت میں آگاہ کیا گیا ہے اور آپ کے اندر اس تفصیلی صورت کا ایمان وایقان پیدا کیا ہے۔

اس بناء پر وہ آگاہی اور وہ ایمان جو رسولؐ خدا نے مقامِ نبوت کے ارتقاء کے بعد حاصل کیا، وہ معارف وشرائع کی تفصیلی آگاہی تھی اور ان کا تفصیلی اقرار تھا، اور یہ چیز اس بات میں مانع نہیں ہے کہ پیغمبر خدا بعثت سے پہلے خدا پر ایمان رکھتے تھے اور خدا کے سامنے خضوع وخشوع کرتے تھے، کیونکہ بعثت سے پہلے قرآن کے مضامین کے تفصیلی آگاہی تھی اور ان کا تفصیلی اقرار تھا اور یہ چیز اس بات میں مانع نہیں ہے کہ پیغمبر خدا بعثت سے پہلے خدا پر ایمان رکھتے تھے اور خدا کے سامنے خشوع کرتے تھے کیونکہ بعثت سے پہلے قرآن کے مضامین کے تفصیلی علم وایمان کی نفی، خدا پر ایمان رکھنے اور ان معارف پر اجمالی اعتقاد رکھنے سے مانع نہیں ہے۔

اس اعتراض کے حل کی کلید ایک لفظ ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا نزول وحی نے اصل علم وایمان پیغمبر کو دیا ہے نبوت سے پہلے تفصیلی علم وایمان کا نہ ہونا اس سے پہلے کے اجمالی علم وایمان سے مانع نہیں ہے، اور قرآن کی دوسری آیات بھی اس حقیقت کو بیان کر رہی ہیں، جیسا کہ فرماتا ہے۔

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ بِمَاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ ‌ۖ وَاِنۡ كُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِيۡنَ‏ ﴿۳﴾ (یوسف)

''ہم وحی قرآن کے ذریعہ بہترین داستان تجھ سے بیان کرتے ہیں، اگرچہ تم وحی سے پہلے ناآگاہ لوگوں میں سے تھے۔

ایک اور دوسری آیت میں فرتا ہے۔

تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَاۤ اِلَيۡكَ‌ ۚ مَا كُنۡتَ تَعۡلَمُهَاۤ اَنۡتَ وَلَا قَوۡمُكَ مِنۡ قَبۡلِ هٰذَا‌ ۛؕ فَاصۡبِرۡ‌ ۛؕ اِنَّ الۡعَاقِبَةَ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴۹﴾ (ھود)

''یہ غیب کی خبریں ہیں، جن کی ہم نے تیری طرف وحی کی ہے تم اور تمہاری قوم ان سے آگاہ نہیں تھے پس تم صبر کرو، عاقبت پرہیزگاروں کے لیے ہی ہے۔''

اس افراطی گروہ کا نظریہ، جن کا خیال یہ ہے کہ پیغمبر کی وضع و کیفیت میں نبّوت کے بعد علم و آگاہی اور ایمان کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑا، ان آیات کے ذریعہ غلط اور باطل ہے حق وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے کہ پیغمبرؐ خدا بعثت سے پہلے معارف و شرائع کے متعلق اجمالی آگاہی اور ایمان رکھتے تھے اور مقام نبوت پر ارتقاء کے بعد ان کے علم و آگاہی اور ایمان نے اپنے اندر تفصیلی رنگ پیدا کیا۔

۲۔ پیغمبر نور ہیں

اگر قرآن خود کو نور کہتا ہے تو پیغمبر گرامی کو بھی نور کہتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ (مائدہ)

آیت میں نور سے مراد ''وکتاب مبین'' کے جملہ سے مقابلہ کے قرینہ سے پیغمبر ہی ہیں اور اس بات کا سبب کہ قرآن اور پیغمبر کو نور کہا گیا ہے۔ نور حسّی کے آثار کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔

۳، ۴۔ تورات و انجیل نور ہیں

آسمانی کتابیں چونکہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہیں اور ان کا سرچشمہ نور وحی ہے، اس لیے وہ امتوں کی راہ کو روشنی بخشنے والی ہیں جنہیں خدا کے پیغمبران کے لیے لائے ہیں جیسا کہ فرماتا ہے۔

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ (انعام۔۹۱)

''کہہ دیجئے کہ اس کتاب (تورات) کو موسیٰ کے لیے کس نے بھیجا تھا جو لوگوں کے لیے نور اور ہدایت تھی۔''

اور انجیل کے بارے میں کہتا ہے:

وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ (مائدہ۔۴۶)

''ہم نے عیسیٰ مسیح انجیل دی جس میں ہدایت اور نور ہے۔''

تورات و انجیل کی تعریف و توصیف ان دو آیات کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ کئی آیات میں ''تورات'' کو ''امام'' کہا گیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ (ھود۔۱۷، احقاف۔۱۲)

''قرآن سے پہلے موسیٰ کی کتاب امام و رحمت تھی۔''

البتہ اس بات کی طرف توجہ رہنی چاہیے کہ یہ تعریف ان دو واقعی کتابوں کی ہے جن میں تحریف نہیں ہوئی تھی، نہ کہ ان رائج عہدین کی جو خیالی، باتوں اور بے بنیاد چیزوں سے پُر ہیں۔

۵۔ایمان یا ایمانی بصیرت

قرآن مجید میں کئی آیات میں ''ظلمات'' کو جمع کی صورت میں اور ''نور'' کو مفرد کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔'' اور تمام آیات کے ملاحظہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان سے مراد ان دو معانی میں سے ایک ہے۔

۱۔ایمان ۲ایمانی بصیرت

''نور'' سے مراد چاہئے ''ایمان'' ہو یا ''ایمانی بصیرت'' دونوں میں ہی ایک طرح سے نور اور روشنی ہے جیسا کہ ''کفر'' اور ''الحادی سوجھ بوجھ'' ظلمت اور تاریکی ہیں۔

کیونکہ ایمان سے مراد خلل ناپذیر واقعات کے ایک سلسلہ، مثلاً خدا، سرائے جاودانی، فرشتے، پیغمبر اور ان کی کتابوں کا اقرار ہے اور اس قسم کا اقرار حقیقت ہونے کی بناء پر عین نور اور روشنی ہے جب کہ ''کفر'' ان مسلمہ حقائق سے انکار کے معنی میں عین ظلمت و تاریکی ہے۔ البتہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہر اقرار روشنی کا سبب اور ہر انکار تاریکی کی علت ہے، بلکہ اس سے مراد اس قسم کے محکم اقرار ہیں اور غیر محکم و استوار انکار ہیں کہ جن میں سے ہم ایک کو ایمان اور دوسرے کو کفر کہتے ہیں۔

یہ صرف ایمان اور کفر ہی نہیں ہیں جو اپنے ساتھ روشنی اور تاریکی لیے ہوئے ہیں بلکہ الحادی اور ایمانی بصیرتیں بھی اسی قسم کی حالت رکھتی ہیں۔ ایمانی بصیرت روشنی دینے والے ایمان کی وجہ سے استوار و محکم ہے جب کہ الحادی نظر اپنے ساتھ ظلمتِ تاریکی رکھتی ہیں ایمانی بصیرت روشنی دینے والے ایمان کی وجہ سے استوار و محکم ہے جب کہ الحادی نظر اپنے ساتھ ظلمتِ تاریکی رکھتی ہے اور ان دونوں بصیرتوں میں سے ایک سرچشمہ نور ہے اور دوسری کا ظلمت ہے اور اس قسم کے سرچشمے بصیرتوں اور پھر روشوں میں بے تاثیر نہیں ہوتے۔

یہاں ہم ان آیات کو پیش کرتے ہیں جن میں ایمان سے پیدا ہونے والی بصیرت کو ''نور'' اور ان کے نقطۂ مقابل کو ''ظلمات'' کہا ہے مثلاً:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ (بقرہ۔۲۵۷)

''خدا ان لوگوں کا دلی ہے جو ایمان لائے۔ وہ انہیں تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور کافروں کا ولی طاغوت ہے۔ وہ انہیں روشنی سے نکال کر تاریکی میں وارد کر دیتا ہے۔''

اس آیت کا مضمون مائدہ ۱۶، ابراہیم ۵ اور فاطر ۲۰ میں بھی وارد ہوا ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ (زمر۔۲۲)

''کیا وہ شخص جس کے سینہ کو خدا نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے اور وہ خدا کی جانب سے ایک نور رکھتا ہے (اس شخص کے برابر ہے کہ جو ایسا نہیں ہے)؟

خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات میں ''نور'' سے مراد ایمان ہے یا وہ بصیرت ہے جو ایمان صاحبِ ایمان کو بخشتا ہے۔ اور اسی طرح سے ذیل میں بیان کردہ آیات ہیں۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ (انعام۔۱۲۲)

''کیا وہ شخص جو مردہ تھا اور ہم نے اُسے (ایمان کے ذریعہ) زندہ کیا اور اس کے لیے ایک نور قرار دیا جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، اس شخص کی مانند ہے جو تاریکی میں بھٹک رہا ہے اور اس سے باہر نہیں نکل پاتا۔''

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ (نور)

''اور وہ شخص کہ جسے خدا نے نور نہیں دیا ہے تو پھر اس کے لیے کوئی روشنی نہیں ہے۔''

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ (حدید۔۲۸)

''اے ایمان لانے والو! خدا کی مخالفت سے پرہیز کرو اور اس کے پیغمبر پر ایمان لے آؤ تو وہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصہ عطا کرے گا اور تمہارے لیے زندگی میں ایسا نور دے گا جس کے ذریعہ تم معاشرے میں چلو پھرو گے اور وہ تمہارے گناہ کو بخش دے گا۔''

ان آیات کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان، نور اور روشنی کا ایک ایسا خزانہ ہے جو زندگی کے معنوی اور مادی پہلوؤں کو انسان کے لیے واضح اور روشن کر دیتا ہے اور دونوں پہلوؤں میں انسان کو طاقت بخشتا ہے۔

دوسرے جہان میں عمل کا نور

تجسم اعمال کا مسئلہ ان مسائل میں سے ایک ہے جن سے قرآن نے پردہ اٹھایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ جو عمل بھی انسان اس جہاں میں کرتا ہے وہ

عمل دوسرے جہاں میں اس گھر سے مناسبت رکھنے والی صورت میں مجسم ہوجاتا ہے گویا عمل کی واقعیت اور حقیقت تو ایک ہی ہوتی ہے، لیکن اس کا لباس اور شکل وصورت ہر جہان کی مناسبت سے ہوتا ہے مثلاً نماز عالمِ مادہ طبیعت میں حرکات واذکار کے ایک سلسلہ کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے لیکن عالمِ برزخ میں ایک خوبصورت اور نورانی موجود کی صورت میں جلوہ دکھاتی ہے یہاں تک کہ جولوگ برزخی آنکھ رکھتے ہیں وہ اس جہان میں بھی اپنے عمل کی برزخی صورت مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

قرآن مجید اس حقیقت کو کئی آیات میں صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے ہم ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝٥ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝٦ (تکاثر)

''اگر تم علم الیقین رکھتے (تو اس جہان میں) دوزخ کو دیکھ لیتے۔''

''علم الیقین'' آگاہی کا ایک خاص مرتبہ ہے۔ اگر انسان آگاہی کے اس مرتبہ تک پہنچ جائے تو برزخی موجودات بلکہ دوسرے جہاں سے مربوط امور کو یہیں سے مشاہدہ کر لیتا ہے۔

يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝٣٥

(توبہ)

''اس دن خزانہ میں جمع کیا ہوا سونا چاندی دوزخ کی آگ میں گرم کئے جائیں گے اور اُن سے خزانہ کرنے والوں کی پیشانی، پہلو اور پشت کو داغا جائے گا (اور ان سے یہ کہا جائے گا کہ) یہ وہی آگ ہے جسے تم نے خود ذخیرہ کیا تھا۔ پس تم (عالمِ طبیعت میں کئے ہوئے) اپنے کام کا نتیجہ چکھو۔''

یہ آیت اس بات کی ترجمانی کرتی ہے کہ ایک عمل اس جہان میں ایک صورت میں اور دوسرے جہان میں دوسری صورت میں مجسم ہوگا۔ اس جہان میں تو خزانے اور فریب دینے والے سونا اور چاندی کی صورت میں، جو دنیا کے طلبگاروں کے سر سے عقل وہوش کو ختم کر دیتا ہے لیکن وہی دوسرے جہان میں بھڑکتی ہوئی آگ کی صورت میں خود کو پیش کرے گا۔

اس مطلب کی تصدیق، ان لوگوں کے لیے جو معارف قرآنی سے آشنائی رکھتے ہیں یا جنہوں نے تہذیب نفس اور تصفیہ باطن کی بناء پر برزخی آنکھ پیدا کر لی ہے، بہت ہی سہل اور آسان ہے۔

امیر المؤمنینؑ نے اس حقیقت کی وضاحت کے لیے ایک مثال بیان فرمائی ہے ہم اُسے یہاں پر بیان کرتے ہیں۔

ایک عرب مشرک کی ہڈی، جو زمین سے باہر نکلی پڑی تھی، اٹھا کر امام کے پاس لایا اور کہا کہ تمہارے عقیدے کے مطابق کافر اور مشرک مرنے

کے بعد خدا کی تیار کی ہوئی آگ میں عذاب پا رہے ہیں، جبکہ میں اس ہڈی پر ہاتھ لگاتا ہوں تو یہ پورے طور پر ٹھنڈی ہے۔
امام نے فرمایا، آہن، لوہا (چقمقاق) اور پتھر لاؤ۔ اس کے بعد امام نے دونوں کو اٹھا کر ایک دوسرے پر مارا تو اس میں سے ایک آگ نکلی۔ پھر آپ نے اس مرد عرب سے کہا کہ اپنا ہاتھ لوہے اور پتھر پر رکھو۔ جب اس نے اپنا ہاتھ اس پر رکھا تو آپ نے فرمایا کہ کیا تمہیں ان دونوں سے آگ کی حرارت محسوس ہوتی ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ پھر یہ حرارت اور آگ ان جسموں میں کہاں چھپی ہوئی ہے۔[1]
اس میں شک نہیں کہ امامؑ کا بیان ایک مثال ہے جو کافروں کے عالم برزخ میں معذّب ہونے کی مشکل کو کسی حد تک واضح کرتی ہے اور یہ بات ہرگز لازم نہیں ہے کہ ہر مثال اپنے مورد کے ساتھ ہر لحاظ سے مطابق اور یکساں ہو۔
اس لحاظ سے اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ انسان کے کچھ اعمال دوسرے جہان میں ''نور'' کی صورت میں تمثل پیدا کرلیں گے اور محشر کے راستے کو روشن بنادیں گے جیسا کہ فرماتا ہے:

يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑧ (تحریم)

''اس دن خدا نبی اور اہل ایمان کو رسوا نہیں کرے گا۔ اس دن ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب چلے گا۔ وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار تو ہمارے نور کو درجہ کمال تک پہنچا دے اور ہمیں بخشش دے بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

دوسری آیت میں فرماتا ہے:

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ (حدید۔۱۲)

''تم اس دن صاحب ایمان مردوں اور عورتوں کے نور کو دیکھو گے کہ وہ ان کے آگے آگے اور دائیں طرف چل رہا ہے۔ یہ تمہارے لیے خوشخبری ہے۔''

وہ نور جس کا ذکر قرآن ان دونوں آیات میں کر رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے۔ کہ وہ محشر کو نورانی کردے گا اور صاحبِ ایمان لوگ اس کی روشنی میں چلیں گے، وہ ایمان اور عمل صالح کی وہ باطنی تجلی ہوگی جو صاحبِ ایمان لوگ اس جہاں میں رکھتے تھے اور اس نور کی واقعیت اور حقیقت کیسا نور

---

[1] الغدیر ج۸ ص۹۱۲ نجف منقول از زین الفتی مخطوط تالیف عاصمی۔

ہے کیا وہ نور حسی کے مشابہ ہے یا کوئی اور واقعیت رکھتا ہے سردست ہمارے لیے واضح نہیں ہے۔

معنوی انوار میں حسّی نور کے آثار

انوار معنوی کے سلسلہ میں گذشتہ بحث نے واضح طور پر ثابت کر دیا ہے کہ قرآن، توریت، انجیل، پیغمبرؐ اسلام، ایمان اور عملِ صالح خدائی معنوی انوار ہیں اور ان کی حسّی نور کے ساتھ مشابہت اس بناء پر ہے کہ ان معنوی انوار میں ایک طرح ظاہری نور اور روشنی کے آثار پائے جاتے ہیں کیونکہ معنوی انوار بھی حسّی انوار کی طرح ذیل میں بیان کردہ خصوصیات رکھتے ہیں۔

۱۔ اگر نورِ حسّی راہ کو چاہ سے اور راہ راست کو برائی سے واضح کرتا ہے تو آسمانی کتب اور خدا کے پیغمبر راہِ سعادت وخوش بختی کو روشن کرنے والے حق کو باطل سے جدا کرنے والے، جیسا کہ خدا قرآن کے بارے میں فرماتا ہے۔

یَّهۡدِیۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَیَهۡدِیۡهِمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۱۶﴾ (مائدہ)

''خدا قرآن کی برکت سے ان لوگوں کو جو اس کی خوشنودی (کے وسائل) کی پیروی کرتے ہیں، امن والے راستوں کی ہدایت کرتا ہے اور انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور ان کی راہِ راست کی طرف رہبری کرتا ہے۔

اور پیغمبر گرامی کے بارے میں فرماتا ہے۔

وَاِنَّكَ لَتَهۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۵۲﴾ (شوریٰ)

''اے پیغمبر بے شک تم صراطِ مستقیم کی طرف رہبری کرتے ہو۔''

اور اسی طرح سے دوسرے معنوی انوار ہیں جن میں سے ہر ایک، کسی نہ کسی طرح سے، انسانوں کی مادی ومعنوی زندگی کی راہ کو روشنی بخشتا ہے۔

۲۔ اگر نورِ حسّی جسم وجان کی پرورش کرتا ہے، اس طرح سے کہ اگر سورج کی روشنی وقتی طور پر ایک مدّت کے لیے کرۂ زمین پر نہ پڑے تو یہاں سے حیات کا خاتمہ ہو جائے۔ اسی طرح سے معنوی انوار بلا استثناء انسان کی معنوی زندگی کا سبب ہیں اور قرآن اس مطلب کے ذیل میں بیان کردہ آیت میں تصریح کرتا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاكُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡكُمۡ ۚ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوۡلُ بَیۡنَ الۡمَرۡءِ وَقَلۡبِهٖ وَاَنَّهٗۤ اِلَیۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾ (انفال)

''اے ایمان لانے والو خدا اور اس کے رسول کی آواز پر لبیک کہو، کیونکہ وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف بلاتا ہے جو تمہیں زندہ کرتی ہے۔ جان لو کہ خدا انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوجاتا ہے۔ اور تم سب کے سب (قیامت کے دن) اس کے پاس جمع ہوگے۔''

حیات وزندگی، اس کے برخلاف جو اپنے آپ سے آگاہی نہ رکھنے والے لوگ خیال کرتے ہیں، صرف حیات مادی کے ساتھ ___ جس کا ظاہری اثر چلنا پھرنا اور تولیدِ مثل ہے ___ مخصوص نہیں ہے کیونکہ حیات اخلاقی حیاتِ علمی وفرہنگی حیاتِ سیاسی، حیات اقتصادی اور دوسرے میدانوں میں حیات بھی حیات کے مصادیق میں سے ہے اور یہ آیت اسلام کے ہدف ومقصد کو ایک ہی جملہ میں واضح کررہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ''اسلامی تعلیمات انسان سے مربوط تمام مسائل میں حیات اور زندگی بخشنے کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے''

قرآن اس انسان کو جو ایمان نہیں رکھتا۔ اور جس میں طبعی طور پر فکری اور عقلانی حیات نہیں ہے، مردہ کہتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (انعام ۱۲۲۔)

''کیا وہ شخص جو مردہ تھا اور ہم نے اسے ایمان کے ذریعہ زندہ کیا ہے اور اس کے لیے ایک ایسا نور قرار دیا ہے کہ جس کے ساتھ وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے۔'' (اس شخص کے ساتھ جو ایسا نہیں ہے، یکساں ہے)

فاقدِ ایمان قومیں جو گذشتہ جاہلیت کے زمانہ میں زندگی بسر کرتی تھیں یا مادین کا وہ الحادی گروہ جو بیسویں صدی کے زمانہ جاہلیت میں زندگی بسر کررہا ہے صرف حیوانی حیات رکھتا ہے، لیکن ان میں معنوی اور صحیح عقلانی حیات موجود نہیں ہے۔

یہ بیان اس مطلب کو واضح کرتا ہے کہ دینِ اسلام چند خشک اذکار اور صحیح انسانی زندگی سے دور چند تعلیمات کا نام نہیں ہے بلکہ دین کی حقیقت تو وہی حیات اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں تحریک ہے اور اگر کچھ لوگوں نے لفظ ''لما یحییکم'' کی تفسیر جہاد وغیرہ سے کی ہے تو درحقیقت اس نے اسے حیات کے صرف ایک عامل پر منطبق کیا ہے ورنہ تمام اسلامی تعلیمات حیات وزندگی کا سبب ہیں۔

۳۔ اگر مال ودولت کے چوررات کی تاریکی میں اپنے بلوں اور غاروں سے نکل کر لوگوں کی زندگی میں دستبرد کرتے ہیں لیکن روشنی کے وقت ظاہر ہونے کی جرات نہیں کرتے، تو اسی طرح سے سعادت وخوش بختی کے چور اور عیار لوگ بھی اس معاشرے میں جہاں مذہب اور دین کی حکومت ہوتی ہے اور پیغمبر اور آسمانی کتابیں لوگوں کی رہنما ہوتی ہیں اور معاشرے کے افراد ایمان وتقویٰ کی طاقت سے مسلح ہوتے ہیں، خودنمائی کی قدرت نہیں رکھتے اور ایک گوشہ میں رینگتے رہتے ہیں وہ تو صرف فاسد اور علم وایمان سے فارغ معاشروں میں خودنمائی کرتے ہیں اور باطل اور غلط علم وتمدن کے پروپیگنڈے میں مشغول ہوجاتے ہیں اور فرقہ سازی اور گروہ بندی میں لگے رہتے ہیں۔

۴۔ اگر اس نور میں سریع ترین حرکت ہے کہ ہر سیکنڈ میں تیس لاکھ کلومیٹر طے کرلیتا ہے تو نورِ قرآن وایمان بھی آمادہ ماحول اور پاک دلوں میں بجلی

کی طرح سے نفوذ کرتا ہے۔ اور ایک بہت بڑے علاقہ کو تھوڑی سی دیر میں روشن کر دیتا ہے۔
اس بناء پر ''نورِ حسّی'' میں جو چار خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب معنوی انوار میں دل پذیر انداز میں موجود ہیں۔

۶۔ خدا نور ہے

قرآن، اس سے قطع نظر کہ اسلام، ایمان اور دوسروں چیزوں کو نور کہتا ہے، خود ''خدا'' کا بھی نور کے ساتھ تعارف کراتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ مَثَلُ نُوۡرِہٖ کَمِشۡکٰوۃٍ فِیۡہَا مِصۡبَاحٌ ؕ اَلۡمِصۡبَاحُ فِیۡ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّہَا کَوۡکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوۡقَدُ مِنۡ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیۡتُوۡنَۃٍ لَّا شَرۡقِیَّۃٍ وَّلَا غَرۡبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیۡتُہَا یُضِیۡٓءُ وَلَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡہُ نَارٌ ؕ نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ ؕ یَہۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَیَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۳۵﴾ (نور)

''خدا آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے اس کی روشنی ایک ایسی چیز ہے جو اس چراغدان کی طرح ہے کہ جس کے اندر ایک چراغ ہو چراغ شیشہ کے اندر ہو اور وہ شیشہ ایک درخشاں ستارہ کی طرح ہو، جو ایک بابرکت زیتون کے درخت سے جلتا ہو، جو نہ تو شرقی ہو اور نہ ہی غربی، اس کی روشنی آگ کے اس تک پہنچے بغیر ہی جل اٹھنے والی ہو، نور بالائے نور ہے خدا جسے چاہتا ہے اپنی روشنی کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ خدا لوگوں کے لیے ان مثالوں کو بیان کرتا ہے اور خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔''

اس سے مراد کہ خدا ''آسمانوں اور زمین'' کا نور ہے، یہ ہے کہ وہ کائنات کو وجود میں لانے والا اور موجودات کو ''عدم'' ''نیستی'' کی تاریکی سے وجود و ہستی کی روشن فضا میں ظاہر کرنے والا ہے کوئی تاریکی ''عدم'' سے بدتر نہیں ہے اور اگر خداوند عالم کی طرف سے فیضِ وجود منقطع ہو جائے تو تاریکی مطلق جس میں کسی قسم کا نور اور روشنی اور ایک چیز کی دوسری چیز سے تمیز نہیں ہوتی مسلط ہو جاتی ہے اور یہ نورِ ''وجود'' امکانی ہے کہ جس نے عالم کو نور بخشا ہے اور جس نے ''نورِ حسّی'' کو بھی چمک اور روشنی عطا کی ہے۔
اس مثال کے بارے میں تشریح و بحث جو آیت نور میں آئی ہے کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

٦۔ضلالت وگمراہی کے عوامل

کیا انسان کی آفرینش میں اس ہدف کی طرف جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے ہدایت وکشش کے عوامل رکھے گئے ہیں۔؟اس طرح سے کہ اگر خارج سے اس کی وضع روحی وفکری میں کوئی عامل یا عوامل دخل انداز نہ ہوں تو وہ ہمیشہ اس مقصد کی راہ میں جس کے لیے وہ خلق ہوا ہے چلتا رہتا ہے؟ یا آفرینش میں سعادت وشقاوت اور اچھائیوں اور برائیوں کے لیے اس کی نسبت یکساں ہے۔اور ہمیشہ یہ عامل خارجی ہوتا ہے جو اسے ایک طرف کو کھینچتا اور جذب کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں کیا جس طرح سے صحت وتندرستی اور خلقت میں سلامتی تو انسان میں بنیادی اور اصل چیز ہے،اور بیماری اور خلقت میں نقصان انسان میں قانون خلقت سے ایک طرح کا انحراف ہے اسی طرح سے ہدایت اور راہیابی بھی تندرستی کے مانند انسان کی خلقت میں اصل واستوار ہے اور گمراہی اور جادۂ حقیقت سے خروج، بیماری کی طرح، قانون آفرینش سے خروج ہے جسے کچھ عوامل انسان کے اُوپر لاد دیتے ہیں؟ یا یہ معاملہ اس طرح سے نہیں ہے بلکہ انسان کی نسبت ہر دوطرف سے یکساں ہے؟

قرآن مجید پہلے نظریہ کا طرف دار ہے اور انسان کی آفرینش کو ہدایت کے اندرونی عوامل کے ساتھ، جو اُسے مادی ومعنوی تکامل کی طرف رہبری کرتے ہیں، ہمراہ سمجھتا ہے اور فطری انسان قرآن کی نظر میں وہ انسان ہے جس کی خلقت اور سرشت میں ان عوامل کو خمیر کیا گیا ہے اور راہ یابی کے تمام وسائل ایک نقشہ کی صورت میں اس کے وجود میں پوشیدہ ہیں اور مکتبی انسان ایک ایسا انسان ہوتا ہے جس کے کام فطرت اور فطری قدروں کے مطابق ہوں اور اس قسم کا آدمی ہی ایک سچا انسان ہوتا ہے اور اس کے مدمقابل آدمی مسخ شدہ انسان ہوتا ہے۔

یہاں ''اگیزسٹنسلزم'' (نظریہ وجود ہستی) نے مخالفت کی ہے اور اس نے دوسرے نظریہ کو اختیار کیا ہے۔اس مکتب نے اپنے نظریہ کی بنیاد حفظ آزادی کو قرار دیا ہے اور اس نے انسان کے لیے فطرت اور طبعی وجدان کا انکار کر دیا ہے، کیونکہ اس مکتب کے پیروکاروں کی نظر میں اس قسم کی سرشت کا وجود اس کے میدان کار اور اس کی خواہشات کو محدود کر دیتا ہے لہٰذا پھر وہ فطرت کے برخلاف کوئی کام نہیں کر سکتا، یا اس کے میلان کے پلڑے کو ایک طرف زیادہ وزنی بنا دیتا ہے اور اس قسم کی محدودیت اور میلان آزادی کے برخلاف فطرت ووجدان کا فاقد ہے بلکہ طبیعت وماہیت اور ہر قسم کی ذاتی قید وبند کا فاقد ہے جو اس کی آزادی کے مخالف ہو۔اس مکتب میں انسان فقط وجود رکھتا ہے اور جو چیز انسان کو قید ورنگ دیتی ہے وہ خود آپ ہی ہے اور وہ بھی انتخاب وآزادی کی راہ سے۔

ہم سردست اس نظریہ کے اثبات یا اس پر تنقید کے درپے نہیں ہیں۔ ہمارا ہدف اس بارے میں قرآن کے ہدف کی شناخت ہے لہٰذا ہم ''اگیزسٹنسلزم'' (نظریہ وجود وہستی) کے سلسلہ میں صرف دو نکتے بیان کرتے ہیں:

ا۔موجودہ زمانہ کا علم نفسیات انسان کے لیے ان اصلی احساسات کو، جو اس کے روحی پہلوؤں کو تشکیل دیتے ہیں، ثابت کرتا ہے اور ایسے میلان کے لیے انسان کی روح ورواں میں گہری جڑ بنیاد کا قائل ہے، مثلاً۔

حس اخلاق ونیکی، حس، ہنر وزیبائی حس علم وتلاش اور ایک گروہ کے نظریہ کے مطابق حس مذہب وخدا جوئی، اور روح انسانی کے دوسرے پہلوؤں میں گہری تحقیقات انہیں اس عقیدہ میں اور بھی زیادہ محکم اور راسخ کردے گی اور اس نے ان تمائلات اور احساسات کو مکتب خلقت کے سوا کسی اور مکتب سے نہیں سیکھا۔ اب اس صورت میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ انسان ماں کے پیٹ سے ہر قسم کی خصوصیات اور تمائل سے خالی پیدا ہوا ہے اور ہر قسم کی روحانی قید وبند جو وہ پیدا کرتا ہے، اُسے وہ اختیار اور ارادہ سے حاصل کرتا ہے۔

۲۔ چونکہ اندرونی خواہشات اور تمائلات ایک نقشہ کی صورت میں انسان کے اندر موجود ہوتے ہیں، وہ ہرگز بھی انسان سے اختیار وآزادی کو سلب نہیں کرتے۔ اس کا شاہد یہ ہے کہ انسان ایک مدت تک اپنی خواہشات کی سرکوبی کرسکتا ہے۔ مثلاً علم وجستجو کی حس رکھنے کے باوجود تحقیق کی کوشش نہیں کرتا۔ اور حس اخلاق اور نیکی کی طرف میلان کے باوجود قبیح اور بُرے کام کے پیچھے لگ جاتا ہے۔

انسان میں اس قسم کے میلان ایسے امور کی انجام دہی کے لیے جو اس کی خواہش کے مطابق ہوتے ہیں۔ ایک نرم اور مناسب کشش پیدا کردیتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود انسان کا ارادہ اور اختیار تمام خواہشات سے بالاتر ہے اور وہ فطری اختیار کے سائے میں زندگی کی باگ ڈور سنبھال سکتا ہے۔ اور جس طرف چاہے پیش قدمی کرسکتا ہے۔

بعض اوقات انسان کچھ ملاحظات کی بناء پر اندرونی تمائلات کو دوسرے مسائل پر مقدم کردیتا ہے۔ اور خارجی وجوہات کی بناء پر ان کے سامنے سرخم نہیں کرتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی آزادی انسان کے ذاتی احساسات اور خواہشات کے انکار کی رہین منت نہیں ہے بلکہ انسان کے مستقل ارادہ اور اصل اختیار کے ثابت کرنے میں ہے۔

وہ آیات جو قرآن میں دین ومذہب کے فطری ہونے، بلکہ انسان میں وجدانِ طبیعی کے وجود کی گواہی دیتی ہیں بہت زیادہ ہیں۔ اور اکثر قارئین کرام ان آیات سے آشنا ہیں مثلاً ذیل میں بیان کردہ آیات:

۱۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ (روم۔۳۰)

''تم خدا کے سچے دین کی طرف رخ کرلو، وہ دین جس پر خدا نے انسان کی خلقت کو برقرار کیا ہے۔''

۲۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۞ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۞ (شمس)

''قسم ہے انسان کی اور اس خدا کی جس نے اُسے پیدا کیا ہے، اور نیکی اور بدی کا اُسے الہام کیا ہے۔

۳۔ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۞ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۞ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۞ (بلد)

''کیا ہم نے اُسے دو آنکھیں ایک زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں کئے اور خیر وشر کی اسے پہچان نہیں کرائی۔''

۴۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ (دھر)

''ہم نے اُسے سیدھے راستے کی ہدایت کی ہے اب چاہے وہ شکر گزار بن جائے یا ناحق شناس۔''

ان آیات میں انسان کو اچھائیوں یا برائیوں، یا اس راستے کی آشنائی جو اُسے سعادت کی طرف رہبری کرتی ہے۔ فطری بتائی گئی ہے اور قرآن اس مطلب کو ایسے موقع پر پیش کرتا ہے جب انسان کی خلقت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔

اس بناء پر ہدایت اور رہیابی انسان میں اصالتاً موجود ہوتی ہے اور یہ خارجی عوامل ہوتے ہیں جو بعض اوقات امر فطرت کو بیکار بنا دیتے ہیں اور وہ اس کی گمراہی کا سبب بن جاتے ہیں۔ اور قرآن نے گوناں گوں آیات میں فطرت اور اندرونی وجدان کی خراب کرنے والے عوامل کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہم ان عوامل کی وضاحت کرنے سے پہلے گمراہی کے عوامل کی دو قسموں میں تقسیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں سے ایک تو مبدء ہدایت بھی ہے اور مبدء ضلالت و گمراہی بھی اور دوسرا ہمیشہ ہی مبدء گمراہی ہوتا ہے البتہ پہلی قسم کا مبدء ضلالت ہونا دوسری قسم کے مبدء ضلالت ہونے سے مختلف ہے، جو اثناء بحث میں واضح ہوگا۔

گمراہی کے اسباب دو قسم کے ہیں

۱۔ وہ چیز جس کی طرف ہدایت و ضلالت (دونوں) کی نسبت دی جاتی ہے، مثلاً خدا اور قرآن

۲۔ وہ چیز جس کی طرف صرف ضلالت کی نسبت دی جاتی ہے

ان دونوں اقسام کی تفسیر یہ ہے۔

قرآن حالانکہ خدا کی ہدایت کا سرچشمہ کہتا ہے اور دوسرے عوامل کی ہدایت کو اس کے ارادہ و مشیت سے وابستہ سمجھتا ہے اس کے باوجود بعض اوقات ضلالت و گمراہی کو بھی خدا ہی کی طرف نسبت دیتا ہے۔ اور ایک آیت میں اسی کو دونوں چیزوں کا مبدء شمار کرتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (ابراھیم)

''وہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ قادر اور حکمت والا ہے۔''

آیت کے آخر میں خدا کی ''عزیز'' و ''حکیم'' کے ساتھ توصیف دونوں کاموں پر اس کی قدرت کی طرف اشارہ ہے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہر شخص کے بارے میں اس کی مشیت اور ارادہ حکیمانہ ہوتا ہے اور اس کے کام ہر قسم کے غیر حکیمانہ عوامل سے دور ہوتے ہیں اور حکیم وہ ہوتا ہے جو ہر کام کو اس کے موقع محل کے مطابق انجام دیتا ہے۔

بعینہ یہی مطلب قرآن کے بارے میں بھی حکم فرما ہے کیونکہ قرآن اگرچہ مومنین کے لیے شفاء و رحمت ہے لیکن ستمگروں کے لیے خسارہ اور زیان کا سبب ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا

خَسَارًا﴿۸۲﴾

(اسراء)

''قرآن میں ہم وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے شفاء اور رحمت ہے اور یہی قرآن ظالموں کے لیے خسارے اور زیاں کاری کے اضافہ کا سبب بن جاتا ہے۔

قرآن ایک گروہ کے لیے یاد آوری اور خدا کی طرف جذب ہونے کا سبب ہے لیکن دوسرے گروہ کے لیے رحمت خدا سے دوری کا سبب ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ۭ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا﴿۴۱﴾ (اسراء)

ہم نے اس قرآن میں (حقائق) بیان کئے ہیں تاکہ لوگ متذکر ہوں اور مشرکین کے لیے خدا سے دوری کے علاوہ کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتا۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے جس کا تفاسیر اور عقائد کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ جواب دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا اور قرآن کس طرح سے ہدایت کا مبدء بھی ہیں اور ضلالت کا سرچشمہ بھی؟ کیا یہ صحیح ہے کہ خدائے رحمن ورحیم اور مہربان وعادل اپنے بندوں کو گمراہ بھی کرے اور پھر انہیں گمراہی کی بناء پر عذاب بھی کرے؟''

اس سوال کے جواب کی یہاں گنجائش نہیں ہے کیونکہ تمام آیات کو جمع کرنے اور خدا وقرآن کے بارے میں ہدایت وضلالت کی حقیقت کی تشریح کے بغیر جامع جواب ممکن نہیں ہے لیکن اس غرض سے کہ ہم اس سوال کو بغیر جواب کے نہ چھوڑیں، ہم قرآن کی نظر سے عمومی اور خصوصی دو قسم کی ہدایت کی وضاحت کرتے ہیں اور خصوصی ہدایت کے معنی میں غور وفکر کرنے سے خدا کے اضلال اور گمراہ کرنے کا معنی واضح ہو جائے گا۔

سب کے لیے عمومی ہدایت

اس سے مراد یہ ہے کہ خدا نے دعوت وکشش فطرت، نور وعقل وخرد اور پیغمبروں کے بھیجنے کے ذریعہ تمام انسانوں کو سعادت وشقاوت کی نشاندہی کرا دی ہے اور خدا کی مشیت یہ ہے کہ تمام افراد بشر اس ہدایت سے بہرہ اندوز ہوں اور قرآن میں بہت سی آیات اس عمومی وہمگانی ہدایت کی گواہی دیتی ہیں۔ مثلاً''

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ﴿۱۰۸﴾ (یونس)

تمہارے رب کی طرف سے حق کی دعوت تمہاری طرف آ چکی ہے جو شخص ہدایت کو قبول کرے وہ اس کے نفع میں

ہے اور جو اس سے روگردانی کرے تو یہ خود اسی کے ضرر میں ہے اور میں ہرگز تم پر مسلط نہیں ہوں۔"

قرآن اس آیت میں من اهتدٰی فانما یهتدی لنفسه۔ کے جملہ کے ذریعہ وسیع اور عمومی ہدایت کی خبر دیتا ہے اور اس قسم کی ہدایت الٰہی سب کو شامل ہوتی ہے اور سب لوگ ان وسائل سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ان سے ہدایت حاصل کرنا خود انسان کے اختیار میں ہے اور کوئی بھی اس ہدایت کے حاصل کرنے سے محروم نہیں ہے۔

خصوصی ہدایت

اس سے مراد وہ غیبی کمک اور انسان کے اختیار سے باہر ایسی امدادیں ہیں جو انسان کو انتہائی تیزی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہیں اور اس قسم کی ہدایت ان لوگوں کے لیے ہوتی ہے جنہوں نے پہلی قسم کی ہدایت سے فائدہ اٹھا لیا ہو یعنی وہ کشش فطرت، عقل و خرد کی رہنمائی اور پیغمبروں کی دعوت کی مخالفت میں نہ اٹھے ہوں اور انہوں نے نسیم رحمت کے چلنے کی راہ پر خود کو ڈال لیا ہو تو یہ گروہ وہ خدا کی مخصوص عنایات سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ اور انہیں سعادت کے حصول میں سو فیصد کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد۔ ۱۷)

"جنہوں نے عمومی ہدایت کو قبول کر لیا۔ وہ ان کی ہدایت "اور توفیق" میں اضافہ کر دیتا ہے۔"

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾
(عنکبوت)

"وہ لوگ جو ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کی راہنمائی کرتے ہیں، اور خدا نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔"

اگر قرآن مسئلہ ہدایت میں تعبیض کا قائل ہوا ہے اور یہ فرماتا ہے کہ: ویهدی من یشاء" (وہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے) تو اس سے مراد اس قسم کی ہدایت ہے جو عمومی اور سب کے لیے نہیں ہو سکتی اور وہ صرف اسی گروہ کے لیے ہوتی ہے جن کے لیے مشیت الٰہی ہو، اور مشیت الٰہی صرف اسی گروہ کے لیے ہوتی ہے جنہوں نے ہدایت عمومی سے بہرہ مند ہونے کی وجہ سے خود کو اس قسم کی ہدایت کے راستے پر ڈال لیا ہو اور مقابل جملہ فیضل الله من یشاء" میں ضلالت سے مراد اس معین گروہ سے مخصوص عنایات کا قطع ہو جانا ہے جنہوں نے ہدایت عمومی کو قبول کرنے سے منہ موڑ لیا ہے اور اس قسم کا گروہ کبھی بھی خدا کی مخصوص عنایات سے بہرہ مند نہیں ہوتا اور مشیت الٰہی کا محل قرار نہیں پاتے اور اس قسم کی تخصیص تعبیض نہیں ہے کیونکہ واقعی مقصر تو خود انسان ہے جو نہیں چاہتا کہ محل ارادہ الٰہی قرار پائے اور اگر وہ عمومی ہدایت سے فائدہ اٹھاتا تو یقیناً وہ ایسے لوگوں میں سے ہو جاتا جو خدا کے لطف خاص سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔

چونکہ ہدایت سے مراد ان لوگوں کے لیے وسائل سعادت مہیا کرنا ہے جنہوں نے عمومی ہدایت سے فائدہ اٹھایا ہے اور ضلالت سے مراد اس قسم کی رحمت کا منقطع ہو جانا اور طرف مقابل کو خود اس کے نفس کے سپرد کر دینا ہے لہٰذا قرآن ضلالت سے مربوط آیات کے حصہ میں اس طرح

فرماتا ہے۔

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ (ابراہیم۔۲۷)

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُۨ ﴿۳۴﴾ (مؤمن)

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾ (مؤمن)

یہ آیات اوران ہی جیسی دوسری آیات جن کی قرآن میں کمی نہیں ہے خدا کے گمراہ کرنے کی علت کوواضح کرتی ہیں اور یہ کہتی ہیں کہ:
چونکہ یہ گروہ ظالم، مسرف اور کافر ہے، یعنی انہوں نے اس عمومی ہدایت سے جوان کے اختیار میں تھی، فائدہ نہیں اٹھایا، لہٰذا خدا کی خصوصی ہدایت ان کے شامل حال نہ ہوئی اور خداان کی سعادت کے مقدمات فراہم نہیں کرتا، کیونکہ ان میں فسق وظلم اسراف کی وجہ سے اس بات کی لیاقت نہیں ہے کہ وہ فوق العادہ خدائی لطف کے مشمول قرار پائیں۔اس کی ٹھیک مثال یہ ہے کہ تم کسی ایسے شخص کو جوکسی خاص منزل کے بارے میں سوال کرتا ہے یہ کہتے ہو کہ اس شاہراہ سے چلے جاؤ آگے جا کر ایک علامت ملے گی اس کی طرف توجہ کرنے سے تم اپنی منزل اور مقصد کو معلوم کرلو گے تو یہ شخص اس علامت سے اسی صورت میں فائدہ اٹھائے گا اور اپنی منزل اور مقصد کو معلوم کرے گا جب کہ وہ پہلی ہدایت سے جو وہی شاہراہ کو طے کرنا ہے، استفادہ کرے ورنہ دوسرے عامل سے فائدہ اٹھانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ جوخصوصی ہدایت کے ساتھ مخصوص ہے اور ہدایت سے مقصود سعادت کے مقدمات کوفراہم کرنا اور ضلالت سے مراد اس قسم کی عنایت کا منقطع ہونا ہے ہرگز جبر نہیں ہے۔
بحث کے اس گوشہ کے واضح ہونے کے ساتھ اب ضلالت کے عوامل کی دوسری قسم کا ذکر کرنا چاہیے جو انسان کے لیے صرف ضلالت وانحراف کا سبب ہے۔

عوامل ضلالت کی دوسری قسم

قرآن گوناں گوں مناسبتوں سے ایسے مختلف عوامل کا نام لیتا ہے جو صرف ضلالت کے عامل ہیں اور وہ بندوں کو راہِ راست سے گمراہ کرنے کے علاوہ اور کوئی نتیجہ نہیں دیتے۔ اپنی سعادت کے طلب گار بندوں کے لیے ان عوامل کی پہچان تکامل وارتقاء کا باعث ہے کیونکہ یہ تو ٹھیک ہے کہ یہ نقصان رساں عوامل انسانوں کے ایک گروہ کی بدبختی اور برے انجام کا سبب بن جاتے ہیں جو حریت وآزادی کے ساتھ اپنی زندگی کی مہاران کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں لیکن یہی عوامل باایمان اور ہوشیار افراد کے لیے مایہ تکامل اور دینی واخلاقی بنیادوں کے استحکام واستواری کا سبب بن جاتے ہیں۔

اصولی طور پر توجہ کرنا چاہیے کہ ہر قسم کے رقیب اور دشمن کا وجود نفع اور سود سے خالی نہیں ہے کیونکہ دشمن انسان کے تکامل وارتقاء اور اس کے نقاط ضعف اور جہالت نقص سے آشنائی کا سبب ہوتا ہے اور نتیجہ میں اس کے رفع کرنے کا سبب بن جاتا ہے جس معاشرے میں معقول قسم کی رقابتیں ڈیرے ڈال لیں تو ایک مدت تک تو وہ معاشرہ قائم رہتا ہے لیکن انجام کار جب قدم پیچھے ہٹاتا ہے تو نابود ہو جاتا ہے۔

سب سے بڑا دشمن جس نے انسان کی قسم کھائی ہے وہ ''شیطان'' ہے لیکن اس دشمن کا وجود جس نے دشمنی کی قسم کھائی ہے [1] اولیاء الٰہی بیدار افراد اور اپنی زندگی کے انجام سے لگاؤ رکھنے والے لوگوں کے لیے جو اس کی قدرت وطاقت اور حیلوں اور مکاریوں سے آگاہ ہیں مایہ تکامل اور ایمان کی زیادتی کا ذریعہ ہے کیونکہ وہ اپنے غیر مرئی دشمن کے ساتھ مسلسل پیکار کے ذریعہ اپنی قدرت وطاقت اور استقامت واستواری میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

فرد اور معاشرے کے لیے دشمن کا وجود بدن کے اندر مفید جراثیم کی مانند ہے جو انسان کی استقامت اور مصونیت میں اضافہ کرتا ہے وہ لوگ جو یہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسے ماحول میں زندگی بسر کریں جو جراثیم سے پاک ہو اور وہ ہر قسم کی جراثیمی آلودگی سے دور رہیں اور ہمیشہ پھل، سبزی اور ضرورت کے برتنوں کو (سترلائز) صاف اور عفونت سے پاک کرتے ہیں وہ غیر مرئی دشمن (خوردبینی جراثیم) کے ہجوم کے مقابلہ میں فوراً شکست کھا جاتے ہیں۔ اور ندی کے کنارے کھڑے ہوئے بید کی طرح ہوا کے ہر جھونکے سے لرزنے لگتے ہیں جب کہ موجودہ زمانہ کے ڈاکٹروں کے قول کے مطابق خوردبینی جراثیم سے دوری کے مسئلہ میں درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہیے تاکہ دشمن کے حملے کے مقابلہ میں بدن کی قوت مدافعت کم نہ ہو۔ اب اس مختصر سے پیش لفظ کے بعد ان گمراہی پیدا کرنے والے عوامل کی تشریح کرنا چاہیے جو ہمیشہ انسان کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔ وہ عوامل یہ ہیں۔

---

[1] شیطان ذیل میں بیان کردہ آیت میں خدا کی عزت کی قسم کھاتا ہے اور کہتا ہے: قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿٨٣﴾ (ص) ترجمہ: تیری عزت کی قسم میں تمام بندوں کو گناہ کی ترغیب دلاؤں گا، سوائے مخلصین کے گروہ کے۔

۱۔شیطان

قرآن ذیل میں بیان کردہ آیات میں شیطان کی پیروی کو گمراہی کا سبب قرار دیتا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَنْ تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُ يُضِلُّهُ وَيَهْدِيهِ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿٤﴾ (حج)

''یہ مسئلہ حتمی اور یقینی ہے کہ جو بھی شیطان کو دوست رکھے گا وہ اسے گمراہ کردے گا اور اسے دوزخ کے عذاب کی طرف لے جائے گا۔''

شیطان نے اپنے مقام سے دھتکارے جانے کے بعد خدا سے اس طرح کہا۔

لَعَنَهُ اللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ﴿١١٨﴾

وَلَأُضِلَّنَّهُمْ (نساء۱۸۔۱۹)

''میں تیرے بندوں میں سے ایک حصّہ کو لے لوں گا، اور یقینی طور پر انہیں گمراہ کردوں گا۔''

دوسری آیت میں خدا، شیطان کے ذریعہ گمراہ شدہ بندوں سے کہتا ہے:

وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۖ أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ﴿٦٢﴾ (یس)

''شیطان نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کردیا ہے تم غور کیوں نہیں کرتے۔؟''

۲۔ہوا وہوس

خواہشات واحساسات انسانی زندگی کی بقاء کا سبب ہیں اور اگر انسانی زندگی سے انہیں حذف کردیا جائے تو انسان نابود ہوجائے گا، لیکن اس کے باوجود اگر ان میں اعتدال نہ ہو اور ان کی حدود اور سرحدیں مشخص نہ ہوں اور انسان اپنی غیر محدود خواہشات کا کھلونا بن جائے تو پھر بھی نابود ہوجائے گا۔قرآن اس بارے میں فرماتا ہے:

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ (ص۔۲۶)

''ہوا وہوس کی پیروی نہ کرو وہ تجھے خدا کی راہ سے روک دے گی۔''

قرآن کی نگاہ سے وہ گروہ جو اپنی زندگی کی مہار اپنے نفس اور اس کی غیر معتدل خواہشات کے ہاتھ میں دے دیتا ہے وہ ہوا وہوس کے پرستار ہیں جنہوں نے اُسے اپنا معبود بنالیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ (جاثیہ۔۲۳)

''کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے ہوا و ہوس کو اپنا خدا بنالیا ہے۔

درحقیقت ہوا و ہوس وہی حیوانی خواہشات اور احساسات ہیں جن کے لیے کوئی حد اور سرحد نہ ہو۔ اور اگر وہ کسی شخص کی طرف سے یا شریعت کے ذریعہ محدود اور ایک سرحد میں بند ہو جائیں تو پھر وہ نہ صرف یہ کہ ہوا و ہوس نہیں رہتے بلکہ زندگی کی بقاء کا سبب بھی بنتے ہیں۔

۳۔ ناپسندیدہ دوست

انسان کے لیے کسی کو دوست بنانا اور ہم نوع و ہم سال اور ہم فکر افراد کے ساتھ زندگی گذارنا ایک فطری امر ہے اور ایک فطری امر کی مخالفت پانی کے بہاؤ کے برخلاف تیرنا ہے جس کا نتیجہ قہراً شکست کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ہر شخص دوستی کے لائق نہیں ہے ایسا شخص جس کی دوستی زندگی میں شرعی و اخلاقی قیود کو چھوڑ دینے کا سبب بنے وہ انسان کی بدبختی کا باعث بن جاتی ہے قرآن اس قسم کے دوستوں کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿٢٧﴾
يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿٢٨﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ

(فرقان۔ ۲۷ تا ۲۹)

''اس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹے گا اور کہے گا اے کاش! میں نے پیغمبر کے ساتھ دوستی کا رشتہ جوڑا ہوتا۔ اے کاش میں فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بناتا۔ اس نے مجھے گمراہ کر دیا اور قرآن کے نزول کے بعد اس نے مجھے اس کی پیروی سے باز رکھا۔

تاریک بشریت میں برے دوستوں اور ''یاروں'' کے بارے میں بہت سی داستانیں ملتی ہیں جن کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ ایک ناپسندیدہ شخص کے ساتھ مختصر سی معاشرت ایک پورے خاندان کی زندگی کا شیرازہ بکھر جانے کا سبب بن گئی ہے۔

۴۔ سوچے سمجھے بغیر، سرداروں کی پیروی

قرآن ضلالت کا ایک عامل عشائر و قبائل وغیرہ کے رؤساء اور سرداروں کی پیروی کو جانتا ہے، جیسا کہ اس طریقہ سے گمراہ ہونے والوں کی زبان سے قیامت کے دن اس طرح نقل کرتا ہے۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿٦٦﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿٦٧﴾

(احزاب)

''اے کاش! ہم نے خدا اور رسول کی اطاعت کی ہوتی، وہ کہیں گے کہ ہم نے اپنے بڑوں اور سرداروں کی (اندھے تعصب کی بناء پر) پیروی کی تھی اورانہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔''

ایک اور آیت میں بھی اسی عامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ (اعراف۔۳۸)

''جب ایک گروہ جہنم میں داخل ہوگا تو وہ دوسرے گروہ کولعنت کرے گا جب وہ سب کے سب وہاں جمع ہو جائیں گےتو ہر گروہ اپنے سے پہلے گروہ کے بارے میں جوان کی گمراہی کا سبب ہوا تھا خدا سے درخواست کرے گا کہ ان کے عذاب کو دو چند کر دے۔

اس آیت میں ان سرداروں کو، جوان کی گمراہی کا سبب ہوں گے،لفظ''اولاھم'' سے جو پیش روؤں کے معنی میں ہے،تعبیر کیا ہے۔

۵۔بے سوچے سمجھے آباؤاجداد کی پیروی

''اگر چہ اسلام میں آباؤاجداد کے لیے ایک خاص احترام کا حکم ہے لیکن اس قلبی تعلق کو انسان کے فکر ونظر کے لیے تعطل کا سبب نہیں بننا چاہیے اور خودکو پورے طور پران کے اختیار میں نہیں دے دینا چاہیے اسی لیے قرآن جہاں ان کے احترام کا حکم دیتا ہے وہاں یہ بھی کہتا ہے کہ اگر ماں باپ اپنے بیٹے کوشرک کی دعوت دیں تو پھر ان کی پیروی نہیں کرنی چاہیے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا

(لقمان۔۱۵)

''اگر وہ یہ کوشش کریں کہ تو خدا کے لیے کسی کو شریک قرار دے لے،تو پھر تو ان کی اطاعت نہ کر۔''

قرآن کچھ آیات میں بے سوچے سمجھے''والدین'' کی پیروی کو گمراہی کا سبب جانتا ہے اوراس بارے میں خود گمراہوں کی زبانی اس طرح

نقل کرتا ہے۔

بَلْ قَالُوْۤا اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ۝۲۲ وَ كَذٰلِكَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ۝۲۳ (زخرف)

''ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اسی طریقہ پر پایا ہے اور ہم ان ہی کی پیروی کر رہے ہیں اسی طرح سے ہم نے کسی رسول کو کسی علاقہ میں نہیں بھیجا مگر وہاں کے اسراف کرنے والوں اور خوشحال بڑے لوگوں نے یہ کہا کہ ہم نے تو اپنے آباؤ اجداد کو اسی طریقہ پر پایا ہے۔ اور ہم ان ہی کی پیروی کریں گے۔''

قرآن اس قسم کے تعصب پر تنقید کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْــٴًـا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ۝۱۰۴ (مائدہ)

''(کیا وہ پھر بھی انہیں کی پیروی کریں گے) چاہے وہ کسی بھی چیز سے آشنا نہ ہوں اور حقیقت کی گہرائی تک نہ پہنچے ہوں۔''

حر اور آزاد انسان ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو حقیقت کو دیکھنے میں رکاوٹ ڈالنے والے ہر قسم کے حجاب کو پارہ کر دے اور حقیقت کو ہر چیز سے زیادہ دوست رکھے اگرچہ ماں باپ گرامی اور مکرم ہوتے ہیں لیکن حقیقت جوئی اور اس کی پیروی ہر چیز سے زیادہ گرامی اور زیادہ عزیز ہے۔

۶۔ جن وانس کا ایک گروہ

قرآن جن وانس کے ایک گروہ کو بھی گمراہی کا سبب بتاتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَاۤ اَرِنَا الَّذَیْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا (حٰم السجدہ:۲۹)

''کافر لوگ کہیں گے: خدایا جن وانس کے اس گروہ کو جو ہماری گمراہی کا سبب بنے ہیں ہمیں دکھا دے، تا کہ ہم انہیں اپنے پاؤں کے نیچے رکھیں۔''

احتمال یہ ہے کہ یہ گروہ وہی شیاطین، بڑے لوگ، سردار یا ناپسندیدہ دوست ہوں گے جو انسانوں کی گمراہی کا سبب بنے ہیں اس صورت میں اس قسم کی پیروی وہی اندھا تعصب ہے کہ جس کے بارے میں قرآن نے بھی گفتگو کی ہے اور اسی بناء پر والدین کی اطاعت بھی اسی حد تک لازم سمجھی

ہے کہ وہ گناہ کا حکم نہ دیں[1]

۷۔ مجرم اور گناہگار لوگ

گمراہی کا ایک اور عامل مجرموں کی پیروی ہے قرآن قیامت کے دن گنہگاروں کی زبان سے اس طرح نقل کرتا ہے۔

وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الۡمُجۡرِمُوۡنَ﴿۹۹﴾ (شعراء)

''ہمیں سوائے مجرموں کے اور کسی نے گمراہ نہیں کیا۔''

البتہ ممکن ہے کہ یہ گروہ وہی قبائل کے سرداروں، قبیلہ کے بزرگوں، یا ناپسندیدہ دوستوں، یا کوئی اور شخص اور گروہ میں سے ہو جن کا گذشتہ اقسام میں نام لیا گیا ہے اور وہ سب ہی انسان کو گمراہی کی طرف کھینچتے ہیں۔

۸۔ بت

بت بھی گمراہی کے دوسرے عوامل میں سے ایک ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضۡلَلۡنَ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ‌ۚ (ابراہیم:۲۶)

''پروردگارا! ان بتوں نے (اپنے حامیوں اور ترویج کرنے والوں کے ضمیمہ کے ساتھ) بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔

۹۔ احساسِ بے نیازی

اگر چہ مال و دولت سعادت کا سبب بن سکتے ہیں۔ لیکن خدا سے بے نیازی کا احساس گمراہی کا سبب بن جاتا ہے قرآن اس بارے میں فرماتا ہے:

وَلٰـكِنۡ مَّتَّعۡتَهُمۡ وَاٰبَآءَهُمۡ حَتّٰى نَسُوا الذِّكۡرَ‌ ۚ وَكَانُوۡا قَوۡمًۢا بُوۡرًا‏﴿۱۸﴾ (فرقان)

''پروردگارا! تو نے انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو نعمتوں میں غرق کر دیا یہاں تک وہ تجھ سے بے نیازی کا احساس کرنے لگ گئے اور انہوں نے تجھے یا تیرے قرآن کو فراموش کر دیا اور وہ زیاں کار گروہ تھا۔''

---

[1] وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ۙ فَلَا تُطِعۡهُمَا ''اگر ماں باپ یہ کوشش کریں کہ تو نادانستہ میرے ساتھ کسی کو شریک بنائے تو ان کی اطاعت نہ کر۔'' (لقمان۔۱۵)

ایک دوسری آیت میں یہ حقیقت ایک دوسری صورت میں بیان ہوئی ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ (علق)

''جب انسان اپنے اندر بے نیازی کا احساس کرتا ہے تو وہ سرکش ہوجاتا ہے اور حدود خداوندی کی پرواہ نہیں کرتا۔

۱۰۔جاہل اکثریت کی پیروی

قرآن جاہل اکثریت کی پیروی کو گمراہی کا سبب شمار کرتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (انعام)

''اگر تم روئے زمین کے اکثر لوگوں کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں خدا کی راہ سے ہٹادیں گے کیونکہ وہ صرف گمان اور اٹکل پچو باتوں کی پیروی کرتے ہیں۔

آیت کے آخری جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر اکثریت کی پیروی گمراہی کا سبب نہیں ہے، بلکہ صرف اسی اکثریت کی پیروی گمراہی کا سبب ہے جو''ان یتبعون الا الظن۔کے مصداق ہیں۔

البتہ گمراہی کے ان دس عوامل کے ساتھ جو کلی صورت میں قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔قرآن میں گمراہی کے کچھ جزئی عوامل کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے جن سے ہمیں سر دست کوئی سروکار نہیں ہے۔مثلاً قرآن بنی اسرائیل کی قوم کے لیے''سامری'' کو گمراہی کا سبب بتاتا ہے اور فرماتا ہے۔

وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝ (طٰہٰ)

''سامری نے موسیٰ کی قوم کو گمراہ کردیا۔''

گمراہی کے مختصر کلی عوامل یہ تھے جن میں سے ہر ایک کی تشریح کے لیے ایک وسیع بحث کی ضرورت ہے۔

۷۔ بہشت کی جاودانہ نعمتیں

انسان مادہ و معنیٰ جسم و روح اور بدن و نفس کا ایک معجون مرکب اور مادی و معنوی امور کا ایک سلسلہ ہمیشہ اس کی زندگی کی اطراف کو گھیرے رکھتا ہے ، یہاں تک کہ ایک مادی شخص بھی جو مادہ کی اصالت کا دم بھرتا ہے وہ بھی امور معنوی کے ایک سلسلہ مثلاً علم و دانش ، ایثار و قربانی اور ظلم و ستم میں دبے ہوئے انسانوں کی رہائی کے لیے مبارزوں کا منکر نہیں ہوسکتا اور آخر کار ہم سب کو اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ انسان اس جہان میں اپنی زندگی میں مادی و معنوی نعمتوں کے ایک سلسلہ میں غرق ہے جو اس کی زندگی کی اساس اور بنیاد کو تشکیل دیتے ہیں اور قرآن نے ان دونوں قسم کی نعمتوں کو بیان کرنے کے لیے ایک خاص تعبیر پیش کی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَاَسۡبَغَ عَلَیۡکُمۡ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ (لقمان۔۲۰)

''خدا نے ظاہری اور باطنی نعمتوں کی تم پر ارزانی کی ہے۔''

گویا لفظ ''ظاہرۃ'' جسمانی نعمتوں کی طرف اور لفظ ''باطنۃ'' معنوی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے۔

اگر انسان کو اس عالم کی زندگی میں مادی اور معنوی دو قسم کی نعمتیں عطا کی گئی ہیں تو دوسرے جہاں کی زندگی میں تو، جو اس جہان کی زندگی سے کئی درجہ برتر و بالاتر ہے اُسے انواع و اقسام کی نعمتوں اور تفضلات الٰہیہ سے بہرہ اندوز ہونا چاہیے کیونکہ یہ بات معقول نہیں ہے کہ انسان اس جہاں کی پست زندگی میں تو اس قسم کی دونوں نعمتوں کا حامل ہو لیکن اخروی زندگی میں جسے قرآن:

وَاِنَّ الدَّارَ الۡاٰخِرَةَ لَهِیَ الۡحَیَوَانُ ۘ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۴﴾ (عنکبوت)

''دوسرے جہاں کی زندگی ہی واقعی اور حقیقی زندگی ہے اگر تم جانو''

کے جملہ سے تعبیر کرتا ہے، ان دونوں قسم کی نعمتوں سے محروم ہو۔

کچھ لوگوں کے خیال کے برخلاف جنہوں نے دوسرے جہان کی نعمتوں کو صرف مادی نعمتوں، مثلاً باغ اور قصر، مہ پیکر حوروں، انواع و اقسام کے میوؤں، پھلوں اور مشروبات وغیرہ میں منحصر سمجھ لیا ہے انہوں نے بہشت کی معنوی نعمتوں کی طرف جنہیں قرآن نے مختلف سورتوں میں ذکر کیا ہے توجہ نہیں کی ہے۔

قرآن نے سورہ ''دخان''، ''صافات''، ''محمد''، ''الرحمن''، ''واقعہ'' اور ''انسان'' (دھر) '' میں انواع و اقسام کی مختلف مادی نعمتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو شاید انسان کے اس جہاں کے مختلف انواع کے نیک کاموں اور اعمال صالح کے تجسم کی طرف اشارہ ہے اور ہم سب ہی کم و بیش ان نعمتوں سے آگاہی رکھتے ہیں لیکن وہ چیز جو بحث اور بیان کرنے کے لائق ہے وہ جنت کی معنوی نعمتوں سے آگاہی ہے جو کامل انسانوں اور با معرفت نفوس کے لیے زیادہ لذت بخش اور زیادہ سرور انگیز ہیں اور اس حصہ کو بیان کر کے اس سوال کا ایک واضح و روشن جواب دیا جارہا ہے کہ قرآن نیکوکار لوگوں کے لیے جسمانی نعمتوں کے ایک سلسلہ کا وعدہ کیوں دیتا ہے۔ اور معنوی نعمتوں کا نام کیوں نہیں لیتا۔

یہ بات کسی ایسے شخص کی کہی ہوئی ہے جس نے اس بارے میں قرآن کی آیات کا غور سے مطالعہ نہیں کیا۔ ورنہ قرآن نے تو معنوی نعمتوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے اور اس قسم کی نعمتوں کی طرف اشارہ کرنے سے پہلے لازم وضروری ہے کہ ہم ایک نکتہ کو بیان کردیں اور وہ یہ ہے کہ وہ تمام آیات جو جسمانی اور معنوی نعمتوں کے سلسلہ میں قرآن میں وارد ہوئی ہیں، وہ ان نعمتوں کی دور سے ایک جھلک ہے جو اس جہان میں اس جہاں سے برتر، ایک واقعیت رکھتی ہیں لیکن چونکہ اس قسم کی نعمتوں کو سمجھانے کے لیے الفاظ کے ایک سلسلہ سے مدد لینے کے لیے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا لہٰذا قرآن ان الفاظ سے مدد لیتا ہے۔ اور یہ بتاتا ہے کہ اُخروی نعمتوں کی حقیقت وواقعیت انسان کے لیے پنہاں ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٧﴾

(سجدہ)

''کوئی انسان نہیں جانتا کہ کس قسم کی روشنی بخش نعمتیں اس کے لیے ذخیرہ کی گئی ہیں۔''

یعنی ان نعمتوں کی واقعیت یا درجہ کمال جن کا نام قرآن میں آیا ہے تمام انسانوں پر مخفی اور پنہاں ہے جب تک انسان اس جہان میں نہ جائے۔ اور ان نعمتوں کو قریب سے نہ دیکھے ان کی واقعیت کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اگر اس جہان کی زندگی اس جہان سے برتر اور بالاتر ہے تو قہراً اس کی نعمتیں بھی اس سے برتر و بالاتر ہوں گی۔

لہٰذا جب جنت والے جنت کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں گے تو کہیں گے۔

هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ (بقرہ۔۲۶)

''وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی نعمتیں ہیں جو دنیا میں ہمیں دی گئیں تھیں حالانکہ ان کے مشابہ نعمتیں انہیں دی گئی ہیں۔''

اب مذکورہ اصل کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو بہشت کی مادی اور معنوی نعمتوں کے بارے میں بیان کی گئی ہے بہشت کی چند معنوی نعمتوں کو بیان کرتے ہیں۔

۱۔ لقاء اللہ

دوسرے جہاں کے اجر اور جزاؤں میں سے ایک لقاء پروردگار ہے، جیسا کہ فرماتا ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿١١٠﴾

(کہف)

(جو شخص لقاء پروردگار کا خواہاں ہے (اُسے چاہیے کہ) وہ نیک اور اچھا عمل انجام دے، اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔

لقاءاللہ'' سے مراد پروردگار عالم کا باطنی شہود ہے نہ کہ حسی و بصری شہود کیونکہ پروردگار عالم عظمت وجلال اور کمال و جمال کے لحاظ سے غیر متناہی ہے لہذا نا متناہی جمال کا شہود بھی دائمی اور جاودانی ہوتا ہے، طبعاً مومن لوگ ہر لحظہ ایک نئے کمال کا باطنی آنکھ سے مشاہدہ کریں گے۔

البتہ کچھ مفسرین نے اس عظیم نعمت کی قیامت کے مختلف مناظر، یا خدا کی جزاؤں اور سزاؤں سے تفسیر کی ہے۔لیکن اس قسم کی تفسیر ظواہر آیات کے خلاف ہے[1]

۲۔رضوان اللہ

قرآن نے اس عالم کی نعمتوں کو شمار کرنے کے بعد ''رضوان اللہ'' کے مسئلہ کو تمام اجروں اور جزاؤں سے بالاتر قرار دیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾ (توبہ)

'خدا نے صاحبِ ایمان مردوں اور عورتوں کو جنت کے باغات کا وعدہ دیا ہے جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور بہشت میں پاکیزہ گھر انہیں نصیب ہوں گے اور خدا کی خوشنودی، ان سب سے بالاتر ہے اور یہی تو سب سے بڑی کامیابی ہے۔

کوئی فرد بشر اس عظیم نعمت کی لذت کی اس جہان میں تصویر کشی نہیں کرسکتا لیکن ایک بہت ہی کم رنگ صورت میں ایک مثال کے ذریعہ اس کی اہمیت کا ادراک کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ لذت جو انسان مدتوں کے فراق کے بعد ایک مہربان اور مخلص دوست کے دیدار سے حاصل کرتا ہے، یا اس روحانی لذت کا احسان جو انسان کو ایک مسئلہ کے حل ہونے کے بعد حاصل ہوتا ہے وہ مادی اور جسمانی نعمتوں کے ساتھ قابل قیاس نہیں ہے۔

اس صورت میں خدا کی خوشنودی، جو عارفین کے دلوں کا کعبہ ہے اس قدر جذبہ اور نشاط انگیز ہے کہ انسان اس کے مقابلہ میں تمام نعمتوں کو ناچیز اور حقیر شمار کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ:

ورضون من اللہ اکبر

---

[1] عارف ربانی مرحوم ملکی تالیف کتاب ''لقاءاللہ'' کی طرف رجوع کریں۔

''خدا کی اپنے بندے سے رضا و خوشنودی، سب نعمتوں اور جزاؤں سے بالاتر ہے۔''

۳۔ ہر قسم کے جسمانی اور روحانی امراض سے سلامتی

جیسا کہ فرماتا ہے:

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۴۶﴾ (حجر)

''سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔''

اس کے علاوہ فرماتا ہے۔

ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿۳۴﴾ (ق)

''ہر قسم کی جسمانی اور روحانی بیماری سے سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے۔''

پھر فرمایا۔

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ (انعام)

''ان کے لیے سلامتی کا گھر ہے اور خدا ان کا ولی اور دوست ہے، یہ ان نیک کاموں کی بناء پر ہے جو انہوں نے انجام دیئے ہیں۔''

۴۔ ہر خطرے سے امن میں رہنا

جیسا کہ فرماتا ہے۔

يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ (دخان)

''وہ بہشت میں جس قسم کی نعمت چاہیں گے وہ ان کے لیے آمادہ ہوگی اور وہ ہر خطرے سے امن و امان میں ہوں گے۔''

پھر فرماتا ہے۔

اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۫ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾ (سبا)

''مگر وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے عمل صالح انجام دیا ہے ان کے لیے ان نیک کاموں کی وجہ سے جنہیں وہ انجام دیتے تھے دوہرا اجر وثواب ہے اور وہ قصروں میں امن سے رہیں گے۔

۵۔ ہر قسم کے بُرے اخلاقی صفات سے روح کی پاکیزگی

جیسا کہ فرماتا ہے

وَنَزَعۡنَا مَا فِيۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ تَجۡرِيۡ مِنۡ تَحۡتِهِمُ الۡاَنۡهٰرُ (اعراف۔ ۴۳)

''حسد و کینہ و عداوت و خیانت جیسے برے صفات میں سے ہر قسم کے بُرے صفات سے، ہم نے ان کے سینوں کو پاک کر دیا ہے۔

یہی مضمون ایک دوسری آیت میں بھی وارد ہوا ہے۔

جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَنَزَعۡنَا مَا فِيۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ اِخۡوَانًا (حجر۔ ۴۷)

''ہم نے ان کے سینوں کو ہر قسم کی برائی سے پاک کر دیا ہے اور انجام کار وہ بھائیوں کی طرح سے زندگی بسر کریں گے۔''

۶۔ برادری اور بھائی چارہ کا نزدیک ترین پیوند

ہم نے ان کے درمیان برادری اور بھائی چارہ پیوند قرار دیا ہے جو کہ محبت کا نزدیک ترین پیوند ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَنَزَعۡنَا مَا فِيۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ اِخۡوَانًا (حجر۔ ۴۷)

''ہم نے ان کے سینوں کو ہر قسم کی برائی سے پاک کر دیا ہے اور وہ بھائیوں کی طرح زندگی بسر کریں گے۔''

۷۔ ان کی زندگی سراسر آسائش ہوگی۔ اور وہاں خستگی نہ ہوگی۔

جیسا کہ فرماتا ہے۔

لَا يَمَسُّنَا فِيۡهَا لُغُوۡبٌ ۝۳۵ (فاطر)

''وہاں ہمیں کوئی رنج اور تکلیف نہیں ہوگی اور نہ ہی کوئی کمزوری اور خستگی ہوگی۔

پھر فرماتا ہے۔

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ (حجر۔۴۸)

''پرہیزگاروں کو جنت میں تکان اور خستگی عارض نہیں ہوگی''

۸۔وہ ہمیشہ ہمیشہ بہشت میں رہیں گے

قرآن میں بہشت کی ہیشگی اوراس کی نعمتوں کی فروانی کو''خالدون'' کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور کشف الآیات کی طرف رجوع کرنے سے ان آیات کے بارے میں واضح ہوجاتا ہے ہم صرف ایک آیت کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

(بقرہ)

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیا اور اہل بہشت ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

۹۔۱۰ نہ وہاں خوف ہوگا نہ ہی کوئی غم واندوہ

خوشگوارترین زندگی وہی ہوتی ہے کہ جس میں نہ تو کوئی خوف ہو اور نہ ہی کوئی غم واندوہ اور اہل بہشت کی زندگی ایسی ہی پرنشاط ہوگی جیسا کہ فرماتا ہے۔

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾ (اعراف)

''تم جنت میں داخل ہوجاؤ، تمہارے لیے اس میں نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ ہی تم اس میں محزون ہوگے۔''

پھر فرمایا ہے:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ (یونس)

''اولیاء خدا کے لیے نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی کوئی حزن وملال۔''

پھر فرماتا ہے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ﴿۳۴﴾

(فاطر)

''انہوں نے کہا، حمد وستائش اس خدا کے لیے ہے کہ جس نے ہمارے دلوں سے حزن وملال کو دور کر دیا، ہمارا پروردگار بخشنے والا اور قدردان ہے۔''

اور یہ مضمون قرآن کی متعدد سورتوں میں وارد ہوا ہے۔

۱۱۔ دوستوں اور احباب سے انس، جو زندگی کے لیے لذت بخش ہیں

جیسا کہ فرماتا ہے۔

فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝ (صافات)

''نعمتوں والی جنت میں ایک دوسرے کے روبرو تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔'

اور یہ موضوع سورہ حجر کی آیت ۴۷۔ دخان کی آیت ۵۳ اور سورہ واقعہ کی آیت ۱۶ میں بھی وارد ہوا ہے۔

۱۲۔ وہ گرامی اور عزیز ہوں گے

وہ لذت جو انسان اس عزت واحترام سے حاصل کرتا ہے جو لوگ اس کی کرتے ہیں وہ جسمانی لذتوں سے بالاتر ہوتی ہے اور اکثر اوقات وہ جسمانی لذتوں کو اس پر قربان کر دیتا ہے۔ اور اہل جنت کو اس قسم کی لذتیں حاصل ہوں گی جیسا کہ فرماتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۝

(معارج۔ ۳۵)

''وہ جنت میں عزت واحترام کے ساتھ ہوں گے۔''

اور دوسری آیت یہ کہتی ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ۝ (صافات)

''ان کے لیے معین رزق ہے اور میوے اور پھل بھی اور وہ عزت واحترام کے ساتھ رہیں گے۔''

۱۳، ۱۴۔ وہاں بیہودہ گفتگو اور جھوٹ نہیں ہوگا۔

جس سے روح کو تکلیف ہوتی ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ۝ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۝ (نبا)

وہ اس میں کوئی بیہودہ اور جھوٹی گفتگو نہیں سنیں گے یہ وہ اجر اور جزا ہے جو تیرے پروردگار کی طرف سے عطا ہوئی ہے۔

یہ مضمون دوسری سورتوں میں بھی آیا ہے۔

۸۔ وجدان یا ندائے درونی

سائکولوجی اور نفسیات کے علاج کے علوم نے وجدان کے مسئلہ اور اس کی تحلیل کے ذریعہ کچھ اصولِ تجربی وضع کر کے اس کی قلمرد میں کچھ مسائل پیش کئے ہیں اور ان سے کچھ نتائج حاصل کئے ہیں اور ان تمام مسائل میں سے ایک مسئلہ جو وجدان کے ساتھ مربوط ہے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اور وہ انسان کی سرشت میں اس کے وجود کی جڑ بنیاد کا بیان اور اس کی تحلیل ہے ہم بھی اس سے مربوط دسرے مباحث میں سے اسی بحث کو سامنے رکھتے ہیں۔ اور اختصار کے ساتھ اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

انسان کی سرشت میں وجدان کی جڑیں

تجربے اور بہت سی آزمائشیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ انسان کے اندر ایک خاص ادراک اور آگاہی[جو اس کو اچھائیوں اور برائیوں سے آگاہ کرتی ہے[موجود ہے۔ اور اس قسم کے ادراک اور آگاہی کو وجدانیات'' کہتے ہیں اور فلسفہ اسلامی میں عقل عملی کا ایک حصہ شمار ہوتی ہے۔

یہ قوت ادراک اچھائیوں اور برائیوں کی تشخیص میں ماہیت عمل میں غور کرنے کے سوا کسی چیز کی اور فیصلہ کرنے کے لیے اپنی عدالت کے سوا کسی عدالت میں اور فیصلہ میں سوائے اپنی ذات کے کسی کی محتاج نہیں ہے اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ وجدان ایک ایسا محکمہ ہے جو قاضی کا محتاج نہیں ہے تو اس سے مراد ہے کہ کسی اور فیصلہ کرنے والے کا محتاج نہیں ہے اور وجدان اپنے فیصلہ میں مستقل ہے۔

تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ وجدان کی جڑیں انسان کی خلقت وآفرینش میں موجود ہیں اور جس دن سے بچہ صفحہ ہستی میں قدم رکھتا ہے، یہ قوت دوسری قوتوں کی طرح اور دوسری طبیعی خواہشات کے مانند اس کی سرشت میں ''قوۃ'' اور زمینۃ'' کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے رشد وتکامل کے ساتھ ساتھ پرورش پاتی رہتی ہے۔

اس بناء پر وجدان کی ندائیں اور اس کے تحسین آمیز یا سرزنش کرنے والے ادراکات کوئی ایسی چیز نہیں ہیں جو باہر سے اُسے القاء ہوئے ہوں اور اصطلاح کے مطابق کسی معلم نے اُسے تعلیم دی ہو بلکہ وہ سب کے سب ایک قسم کی ندا اور ایسا ادراک ہوتے ہیں جنہیں انسان اپنی باطنی ضمیر اور وجود کے اندر سے سنتا ہے اور یہ ایک فطری اور پیدائشی امر ہوتا ہے۔ جسے دست خلقت وآفرینش نے ہر انسان کے اندر ودیعت کیا ہے جو اس کی سعادت کی راہ میں مدد کرتا ہے۔

وجدانِ فطری اور وجدان اخلاقی کا فرق

اب ہم ایک مثال پیش کر کے فطری نداؤں کو ان کے غیر سے مشخص کرتے ہیں کیونکہ ممکن ہے ان میں سے بہت سی فطری نما بھی ہوں۔
اس میں شک نہیں ہے کہ عہد شکنی اور امانت میں خیانت کرنا اور کسی مسلمان کے حقوق میں تجاوز کرنا دنیا کی تمام اقوام کے نزدیک برا اور قبیح فعل شمار کیا جاتا ہے۔ اور جو شخص بھی اپنے باطن میں جھانک کر دیکھے گا۔ وہ اسے واضح طور پر معلوم کرے گا اور اس پر عمل کرنے والوں کو سرزنش کرے گا اس قسم کی ہمہ گیر ندا، جو تمام براعظموں اور تمام اقوام وملل کے تمام افراد بشر کی ضمیر سے سنائی دیتی ہے وہ اجتماعی تربیتوں اور اقتصادی حالات کی پیدوار یا سیاسیات اور تبلیغات کے اداروں کے پروپیگنڈوں کا نتیجہ نہیں ہوسکتی کیونکہ دنیا کی اقوام وملل کسی وقت بھی ایک ہی تربیت یا ایک معین سیاست، یا کسی خاص قسم کے اقتصاد کے ماتحت نہیں رہیں، بلکہ ہمیشہ اقتصاد وسیاست وتربیت کے لحاظ سے گوناں گوں حالات سے دوچار رہی ہیں۔ اس کے باوجود اس قسم کا ادراک تمام افراد بشر کے ضمیر کے اندر موجود ہے اور سب کے سب یہی کہتے ہیں کہ امانت میں خیانت اور عہد شکنی بری چیز ہے اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنا برا ہے اسی وجہ سے اس قسم کی نداؤں اور فیصلوں کو فطری اور پیدائشی ہونے کی نشانی سمجھنا چاہیے۔ باہر سے وارد ہونے ولی کوئی بھی فکر، جسے خاص قسم کے عوامل انسان کے اندر پیدا کردیتے ہیں، وہ اس قسم کی وسعت کے حامل نہیں ہوسکتے۔
اس کے مقابلہ میں اعمال کا ایک ایسا سلسلہ ہے جسے ایک بہت بڑی اکثریت برا سمجھتی ہے جب کہ ایک دوسرے گروہ کے نزدیک ایسا نہیں ہے مثلاً محارم کے ساتھ نکاح کرنا جس کے حرام ہونے پر تمام آسمانی شرائع متفق ہیں اور آسمانی کتابوں کے پیروکاروں کے نزدیک اس میں ایک خاص قسم کی قباحت اور برائی ہے لیکن اس کے باوجود ایک گروہ کے نزدیک اس میں اس قسم کی قباحت اور برائی نہیں ہے اور اسے برا عمل شمار نہیں کیا جاتا۔ اگر اس قسم کے عمل کی قباحت اور برائی فطری اور نہادی ہوتی تو انسانوں میں اس کے لیے ہرگز بھی اختلاف نظر پیدا نہ ہوتا۔ اس بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ انسان کے وجود میں اس قسم کے عمل کی برائی فطری جڑ بنیاد نہیں رکھتی اور اگر یہ ایک فطری نما امر کی صورت میں سامنے آئی ہے تو پے در پے تذکروں اور آسمانی شرائع کی تبلیغ کی واضح وکیفیت کی وجہ سے ہے جس نے اس قسم کی قباحت وبرائی کو ہمارے اندر جگہ دے دی ہے۔ اور اگر اس قسم کا عامل بروئے کار نہ ہوتا تو ہرگز اسے قابل نفرت اور برا نہ سمجھا جاتا۔
اس بیان کی بنیاد پر یہ کہنا پڑے گا کہ ان دونوں اقسام کے ادارک کی تمیز کے لیے پہلے کو ''وجدان فطری'' اور دوسرے کو ''وجدان اخلاقی'' کہیں اور اگر ''فروید'' یہ کہتا ہے کہ وجدانی مسائل ان باتوں سے پیدا ہوئے ہیں جن کی معاشرے میں نہی ہوتی رہی ہے اور وہ ضمیر کے باطن میں بھر گئے ہیں تو وہ دوسری قسم کے بارے میں بالکل صحیح اور درست ہے یعنی مختلف (زمانوں میں ایک موضوع کی نہی ہوتی رہی ہے اور انسان نے ان کے بارے میں مختلف گروہوں کی زبان سے ''نہ کر'' کی نداسنی ہے تو طبعی طور پر وہ مسئلہ اس کے لیے ایک فطری امر کی صورت اختیار کر گیا ہے، جبکہ اس قسم کی بات کی انسان کی فطری اور نہاد میں کوئی جڑ بنیاد نہیں ہے۔
لیکن یہ بیان، ادراکات کی اس قسم کے بارے میں جو ہمگانی اور سب کے لیے ہیں اور طرح طرح کے تربیتی، سیاسی اور اقتصادی حالات رکھنے

کے باوجود سب کی زبان سے سنے جاتے ہیں، صحیح اور درست نہیں ہوسکتا۔

وجدان کے بارے میں قرآن کا فیصلہ

قرآن اپنی پے درپے قسموں میں سورہ ''والشّمس'' میں انسان کے نفس اور اس کے پیدا کرنے والے کی قسم کھاتے ہوئے کہتا ہے۔

''**ونفس وماسوّاها**۔'' اس کے بعد اس کی اس طرح سے توصیف کرتا ہے، **فالهمها فجورها وتقواها**۔ اسے اچھائیوں اور برائیوں کا الہام کیا۔

مسلمہ طور پر اس آیت میں ''نفس'' سے مراد انسان کی روح ہے نہ جسم و بدن اور نہ ہی خصوصیت کے ساتھ حضرت آدم کی روح اور چونکہ آیت انسان کی برائیوں اور اچھائیوں سے آگاہی کا سرچشمہ، خدائی الہام کو سمجھتی ہے، نہ کہ خود انسانی مدرسوں سے تعلیم و تربیت کو لہٰذا لازماً اس قسم کی تعلیم فطری ہونے کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھ سکتی۔

اگر انسان کی خیر و شر سے آگاہی اور قرآن کی تعبیر میں ''تقویٰ'' اور فجور'' سیاست، تبلیغ اور جغرافیائی حالات وغیرہ جیسے مادی عوامل کے معلول ہوتے تو ہرگز اُسے الہام کی طرف نسبت دینا صحیح نہ ہوتا۔

قرآن ایک دوسری آیت میں سرزنش کرنے والے نفس کی قسم کھاتے ہوئے کہتا ہے:

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ۝۲ (قیامة)

''**نفس لوامه**'' سے مراد خصوصیت کے ساتھ حضرت آدم کا نفس نہیں ہے اور اسی طرح اس سے مراد خصوصیت کے ساتھ قیامت میں ملامت کرنے والا نفس نہیں ہے جو اس دن انسان کو برے اعمال کے ارتکاب پر ملامت کرے گا۔[1] بلکہ اس سے مراد عام انسان کا ملامت کرنے والا اور سرزنش کرنے والا نفس ہے جس میں ارتکاب گناہ اور اس کی جلدی گذر جانے والی لذت کے بعد اس کے چہرہ میں ندامت و پشیمانی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں۔ اور وہ باطن میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتا ہے۔

گویا انسان ہر عمل کے بعد ایک پکار سنتا ہے، کبھی تو تعریف کرنے والے کی، جو اس کی روح و رواں کو آرام و سکون بخشتی ہے اور کبھی سرزنش اور ملامت کرنے والے کی جو اس کی روح کو بے چین کئے رکھتی ہے، اور بعض اوقات وہ اسے اپنی مخفی ضربوں کے ذریعہ ریزہ ریزہ کر دیتی ہے، مولوی جلال الدین رومی کے قول کے مطابق:

این صدادر کوه دلها، بانگ کیست
که پراست ازبانگ این که ، گه تهی است

---

[1] جیسا کہ کہتا ہے: یٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ۝۵۶ (زمر) اس وقت وہ ہوش میں آجائے گا اور ''واحسرتا'' کی آواز بلند کرے گا، اور کہے گا، وائے ہو مجھ پر کہ میں نے فرائض کے انجام دینے میں کوتاہی کی اور پیغمبروں کی باتوں کا مذاق اڑایا۔

ہر کجا است آں حکیم است اوستاد
بانگ اوزیں کوہ دل ، خالی مباد[1]

ترجمہ:

دلوں کے پہاڑ میں یہ کس کی آواز گونج رہی ہے اس کی گونج سے کون پُر ہے اور کون خالی ہے جہاں کہیں بھی ہے وہی حکیم استاد ہے اس کی پکار اس کوہ دل سے خالی نہیں ہونی چاہیے

اکثر اوقات انسان ایک بُرے کام کو انجام دیتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک تکلیف کا احساس کرتا ہے لیکن خود کو اس سے منحرف کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر سرزنش کرنے والا نفس، یا محکمہ وجدان کا قاضی، اسے بے چین و بے قرار بنائے رکھتا ہے اور اپنے نظر نہ آنے والے تازیانہ کے ساتھ اس پر حملہ کر دیتا ہے۔

سرزنش کرنے والے وجدان کے نمونے

قرآن نے گذشتہ اقوام کی سرگذشت کے بیان میں اس اندرونی قوت کے ظہور کی طرف اشارہ کیا ہے ہم اس کے دوموارد کو بیان کرتے ہیں۔

ا۔توحید کے ہیرو ابراہیمؑ نے بابل کے بت خانے کے سب بتوں کو توڑ دیا، سوائے بڑے بت کے جسے اسی حال میں رہنے دیا۔

ابراہیمؑ کا بت پرستی پر علی الاعلان تنقید کرنا اس بات کا سبب بن گئی کہ حکومت وقت ابراہیم کو اس واقعہ کا عمل سمجھے اور ان پر عدالت میں مقدمہ چلائے جب عدالت کے ججوں نے اس سے کہا: کیا تم نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کام کیا ہے۔؟

تو اس نے جواب میں کہا: یہ کام ان کے بڑے نے انجام دیا ہے، اگر وہ بات کر سکتے ہوں تو تم انہی سے پوچھ لو۔ ابراہیم کے جواب نے انہیں شدت کے ساتھ ہلا کر رکھ دیا اور انہیں ان کی پرانی غلطی سے آگاہ کیا اور انہیں ان کے وجدان کے سامنے شرمندہ کر دیا کیونکہ انہیں معلوم ہو گیا کہ انہوں نے زندگی کا ایک حصہ اس احمقانہ عمل میں گذار دیا ہے اور وہ اس کے مرتکب ہوئے ہیں لہٰذا انہوں نے پلٹ کر ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھا اور کہا:

''ابراہیم ستمگر نہیں ہے، بلکہ تم خود ستمگر ہو اور خود تم نے ہی اپنے نفس کے اوپر یہ سب تجاوز اور ستم کیا ہے۔''

جیسا کہ فرماتا ہے۔

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝۶۴ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى

[1] مثنوی دفتر دوم ص ۳۲ چاپ میر خانی

رُءُوۡسِهِمۡ ۚ لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا هٰۤؤُلَاۤءِ يَنۡطِقُوۡنَ ﴿۶۵﴾ (انبیاء)

''وہ اپنے وجدان کی طرف لوٹے اور کہا، یقیناً ستمگر تو تم ہی ہو۔ اس وقت انہوں نے ابراہیم کے قوی برہان کے سامنے سر جھکا لیا اور کہا: تم تو جانتے ہو کہ بت بات کرنے کی طاقت نہیں رکھتے'' فَرَجَعُوۡۤا اِلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ '' کا جملہ، وجدان کی بیداری اور ہر قسم کے حجاب کے ہٹ جانے کو، جو اندر کی آواز کو سننے میں مانع ہوتا ہے، بیان کر رہا ہے۔

زلیخا، وہ عورت جس نے یوسف کو بُرے ارادہ کے ساتھ متہم کیا اور عزیز مصر سے یہ کہا۔

مَا جَزَآءُ مَنۡ اَرَادَ بِاَهۡلِكَ سُوۡٓءًا اِلَّاۤ اَنۡ يُّسۡجَنَ اَوۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۲۵﴾ (یوسف)

''اس شخص کی سزا، جو تیرے اہلِ خانہ کے بارے میں برا ارادہ کرے، قید ہونے یا سخت عذاب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔''

لیکن اسی زلیخا نے ایک مدت کے بعد جب حقیقت کھل گئی اور یوسف کی نزاہت اور پاکیزگی اور معنوی مقامات آشکار و واضح ہو گئے تو اُسے ہوش آیا اور اس کے وجدان نے اُسے پریشان کر دیا اور وہ بے اختیار پھٹ پڑی اور اپنے گناہ اور یوسف کی پاکدامنی کا صراحت کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

الۡـٰٔنَ حَصۡحَصَ الۡحَـقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنۡ نَّـفۡسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۵۱﴾ (یوسف)

''اب تو حقیقت کھل چکی ہے میں نے ہی اُسے مقصد برآری کی پیش کش کی تھی اور وہ عفت اور پاکدامنی کے دعویٰ میں سچا تھا۔''

گویا زلیخا مدتوں کے سکوت کے بعد اس طرح اپنے وجدان کے دباؤ میں آئی کہ بے اختیار اپنی قاطع شہادت کے ساتھ وجدان کی شرمندگی کی تلافی کر دی۔

قرآن چودہ سو سال پہلے سے وجدان فطری اور سرزنش کرنے والے نفس کو پیش کر رہا ہے، حالانکہ اس زمانہ میں انسانی فہم نے اُسے سونگھا بھی نہیں تھا۔ دوسری آیات اور اسلامی احادیث میں بھی اس موضوع کو پیش کیا گیا ہے۔

وجدان کی توانائی کا مرتبہ

وہ ندا جسے انسان اپنے اندر سے سنتا ہے وہ آواز جو اس کے باطن کے ضمیر سے اٹھتی ہے، وہ وجدان کی پکار ہے اور وہ نصیحت کرنے والا اور سرزنش کرنے ولا رہنما، جو کبھی تحسین اور کبھی سرزنش کرتا ہے خود اس کا وجدان ہے اور یہ اندرونی طاقت جو کبھی بھی خاموش اور آرام سے نہیں بیٹھتی، اور انسان چاہے جتنا بھی چاہے کہ خود کو اس کے چنگل سے چھٹکارا دلائے لیکن اس سے چھٹکارا نہیں ملتا، اور حافظ کے قول کے مطابق:

درآندرون من خسته دل ندانم کیست؟

که من خموشم واودرفغان ودرغوغا است

ترجمہ:

میرے خستہ دل کے اندر معلوم نہیں کون ہے؟ کہ میں تو خاموش ہوں لیکن وہ نوحہ وفغان اور شور وغوغا کر رہا ہے

خلاق عالم نے انسان کی سعادت کی طرف ہدایت ورہنمائی اور شقاوت وبدبختی کے عوامل سے باز رکھنے کے لیے کئی معلم اور استاد مبعوث کیے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی مخصوص قلمرو کے اندر اپنا وظیفہ اور فریضہ انجام دیتا ہے۔ عقل وخرد روشن چراغ سے لے کر آسمان نبوت وامامت کے تابناک ستاروں تک اور معاشرے کے علماء اور دانش مندوں سے لے کر فطرت ووجدان کی غوغا آفرین نداؤں اور پکاروں تک سب کے سب ہی زندگی کے نشیب وفراز میں انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے سعادت وخوش بختی کی راہ دکھاتے ہیں اور بدبختی کے عوامل کی طرف جھکنے سے روکتے ہیں۔

قرآن مجید خدا کی اس آخری نعمت کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے۔

أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ ۝٨ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۝٩ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝١٠ (بلد)

''کیا ہم نے (اس کی زندگی کی حفاظت کے لیے) اُسے دو آنکھیں، زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں کئے اور خیر وشر کی راہ میں اس کے لیے آشکار نہیں کی۔''

''نجدین'' سے مراد وہی خیر وشر ہے اور ''نجدین'' کی طرف ہدایت کی حقیقت، وہی اس کی اندرونی اور فطری ہدایت ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ ہدایت دوسری طبیعی نعمتوں، مثلاً دو آنکھوں، زبان اور دو ہونٹوں کے ساتھ وارد ہوئی ہے تو اس صورت میں اس سے مراد وہی سرشتی وفطری ہدایت ہی ہوگی جسے انسان معلم واستاد کے بغیر اپنے اندر سے پالیتا ہے۔

اسلامی احادیث میں اس قسم کے ایک اندرونی ادراک اور فطری وسرشتی آگاہی کے موجود ہونے کی طرف، جو کبھی پند ونصیحت کرتی ہے اور کبھی سرزنش، وضاحت کے ساتھ اشارہ ہوا ہے، اور امیر المومنین اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"واعلموا انه من لم یعن علی نفسه حتی یکون له منها واعظ وزاجر لم یکن له من غیرها زاجر ولا واعظ۔ [۱]

"جان لو! وہ شخص جس کی خدا مدد نہ کرے اور اس کے اندر سے کوئی پند و نصیحت اور سرزنش کرنے والا نہ ہو۔ تو اس کے لیے دوسروں کی پند و نصیحت اور سرزنش ہرگز موثر نہیں ہوگی۔

پھر امیر المومنین اندرونی رہنمائی کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"ومن کان له من نفسه واعظ کان علیه من الله حافظ [۲]

وجدان کی مقاومت کا مرتبہ

یہ ٹھیک ہے کہ دست خلقت وافرنیش نے اس قسم کا اندرونی رہنما ہم میں ودیعت کر رکھا ہے جس کے ذریعہ ہم اچھائیوں اور برائیوں کا ادراک کرتے ہیں۔ اور وہ ہمیں نیکیوں کی انجام دہی اور برائیوں سے دور رہنے کی دعوت دیتا ہے اور مخصوص مواقع پر تحسین وسرزنش کی زبان کھولتا ہے، لیکن یہ بات مدنظر رہے کہ وجدان کی دعوت کی قدرت اور نفسانی طوفانوں اور شخصی منافع کے مقابلہ میں اس کی مقاومت کا پایہ۔ ٹھہرنے کی قدرت اور روکنے کی قدرت بہت محدود ہوتی ہے اور اس کی ناتوانی کا سبب ذیل میں بیان کردہ دو اسباب میں سے کوئی سا ایک ہوتا ہے۔

غلط اعمال اور بُرے کام، ندامت کی صورت میں ایک ہولناک اور وحشت ناک کام کی صورت میں وجدان کے سامنے تجلی کرتے ہیں اور اندرونی طاقت ہمیشہ اس سے وحشت کرتی ہے اور انسان کو اس کے ارتکاب سے روکتی ہے لیکن جب عمل میں تسلسل اور تکرار ہوتا رہے تو وہ کام آہستہ آہستہ اپنی قباحت اور چھبن کھو بیٹھتا ہے اور وہ کام ایک عارضی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور انجام کار وجدان ایک معزول حاکم کی طرح ہو جاتا ہے جو اپنے کام کی قلمرو میں کسی کام کی انجام دہی پر قادر نہیں ہوتا۔

اندرونی تملائلات اور جلدی گذر جانے والے مادی منافع اس بات کا سبب بن جاتے ہیں کہ انسان اپنے برے اور قبیح کاموں کی توجیہ کرنے لگے اور نفسانی شیطنتیں ان سب کو ایک خاص طریقہ سے بنا سنوار کر اس کی نظر میں اچھا کر کے جلوہ نما کر دیتی ہیں۔ اور انجام کار انسان کا وجدان دھوکا کھا جاتا ہے اور اپنے بُرے اعمال کو صحیح اور درست سمجھنے لگتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایک صحیح وسالم انسان کا مزاج کسی بھی قسم کے دھویں کو قبول نہیں کرتا اور صحیح وسالم انسان جب پہلے مرحلہ میں دھواں دینے والی چیز کو اپنے لبوں کے درمیان رکھتا ہے تو اُسے کھانسی چھینکیں اور آنکھوں سے پانی آنے لگتا ہے لیکن اس عمل کا تکرار اس کے

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۸۷ چاپ عبدہ۔

[۲] کلمات قصار شمار ۸۹۵۔

مزاج میں اس طرح کی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے کہ وہ تمام کھانے اور پینے کی چیزیں اس لیے کھا تا پیتا ہے کہ ان سے فارغ ہو کر سگرٹ پیئے اور اپنے پھیپھڑوں کو دھویں سے بھرے حالانکہ ابتدائی دنوں میں معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا اور دھویں کے نزدیک جانا سر درد، چھینکنے اور آنکھوں سے پانی نکلنے کا سبب تھا۔ اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ انسان کا مزاج غلط اعمال کے تکرار کے زیر اثر ایک خاص قسم کی دگرگونی پیدا کر لیتا ہے۔

وجدان بھی انسان کے صحیح سالم مزاج کی طرح ہے اور عمل کا تکرار اور نفسانی شیطنتیں وجدان کی آنکھ کو اندھا اور اس کی تشخیص کو دگرگوں کر دیتی ہے اور وہ حقائق کو ہرگز اس طرح سے نہیں دیکھ سکتا جس طرح سے وہ ہیں بلکہ وہ ان کی منافع شخصی اور اپنے روزمرہ کے اعمال کے طریقہ سے توجیہ کرتا ہے۔

قرآنی گواہ

آیات قرآن واضح طور پر اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اندرونی میلانات اور شخصی منافع اور تربیتی و فرہنگی عوامل وجدان کی تشخیص میں اثر انداز ہوتے ہیں اور غلط اور بُرے کاموں کی توجیہ پیش کرتے ہیں اور معاملہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ انسان غلط کام سے معمولی معمولی پریشانی بھی محسوس نہیں کرتا۔

اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَهٗ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ۫ۖ فَلَا تَذۡهَبۡ نَفۡسُكَ عَلَیۡهِمۡ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ ﴿۸﴾

(فاطر)

''کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا عمل زینت پا گیا ہے اور اس نے اُسے ایک اچھا کردار سمجھ لیا ہے (اس شخص کے ساتھ جو ایسا نہیں ہے برابر ہے) خدا جس کو چاہتا ہے گمراہی میں رہنے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے پس تم ان کی راہ حق سے روگردانی پر حسرت اور افسوس نہ کرو۔ خدا ان کے کاموں سے آگاہ ہے۔''

''زین له سوء عمله'' کا جملہ وجدان کی دگرگونی اور اس کے اس حد تک دھوکہ کھانے کو بیان کرتا ہے کہ برا عمل اس کی نظر میں اچھا دکھائی دینے لگتا ہے اور اس کا نتیجہ وجدان کے دائرے کی محدودیت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

بعض اوقات مادی تمایلات بھی وجدان کی آنکھ کو نابود کر دیتے ہیں اور وہ ہر قسم کے بُرے عمل کو جو اس کے مادی ہدف اور مقصد میں مدد دے، عین عدالت و انصاف شمار کرنے لگتا ہے۔

اس میں شک نہیں کو موجودہ زمانہ میں تمام عالمی سپر طاقتوں کا ہاتھ پس پروہ کام کرتا ہے اور لاکھوں افراد کے قتل ہونے اور گھروں کی بربادی کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن مادی مقاصد کے ساتھ لگاؤ ان کے وجدان کو اس طرح سے اندھا کر دیتا ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں کی توجیہ کرتے ہیں

اور ہرگز انہیں غلط نہیں سمجھتے۔

اسرائیل کے جنوبی لبنان پر ہولناک حملہ کو، اور صبرا و شتیلا کے کیمپوں میں آوارہ وطن فلسطینیوں کے اجتماعی طور پر قتل کئے جانے کو چند مہینے سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا اور نزدیک و دور کی ساری ہی دنیا اسرائیل کی غاصب حکومت کے خوفناک جرائم کو شاہد تھی لیکن یہاں ایک دو اسرائیلی سپاہیوں اور افسروں کے سوا (وہ بھی معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے) ان میں سے کسی نے بھی اپنے کام کو برا نہیں کہا اور اپنے کردار کو قبیح نہیں سمجھا۔ بلکہ سب ہی نے وجدان کے سکون کے ساتھ ہزاروں فلسطینی عورتوں اور بچوں کا خون بہایا کیونکہ وہ ان کو قتل کر دینے میں ہی اپنا نفع سمجھتے تھے۔

مجرم امریکہ اپنی تمام مکاریوں کے لیے دنیا میں اپنے منافع کے عنوان سے توجیہ کرتا ہے اور کسی کام کے کرنے سے مضائقہ نہیں سمجھتا۔

روس فقیر ترین اور بے چارہ ترین ملک، یعنی "افغانستان" پر حملہ کرتا ہے اور افغان بچوں، عورتوں اور مجاہدین کے جو اپنے گھر سے دشمن کو دور کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں گلے کاٹ رہا ہے۔ اور وہ معمولی سی پریشانی کا بھی احساس نہیں کرتا۔

کچھ ہی دن ہوئے کہ صدامیوں نے ہنستے بستے شہر ڈزفول کی آبادیوں کے حصوں پر دور مار راکٹوں کے ساتھ حملہ کر دیا، اور عورتوں، بچوں اور ضعیف و ناتوان بوڑھوں کو آدھی رات کے وقت، خاک و خون میں غلطاں کر دیا اور اس طرح سے اپنے کرایہ کے سپاہیوں کو رسوا کرنے والی شکست پر، اپنے شیطانی غصہ کو ٹھنڈا کیا۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں یہ کہنا پڑے گا کہ دنیا کا وجدان مردہ ہو چکا ہے اور اس نے اپنے احساس و ادراک کو کھو دیا ہے اور قرآن کی تعبیر کے مطابق "زین له سوء عمله"

قرآن اس حقیقت کو دوسری آیات میں بھی بیان کرتا ہے ہم ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۲۔ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ (رعد۔ ۳۳)

"مسلمانوں کے بارے میں کافروں کی حیلہ سازیوں نے ان کی نظر میں اچھا جلوہ دکھایا ہے۔

۳۔ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴿۱۲۲﴾ (انعام)

۴۔ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ (توبہ۔ ۳۷)

۵۔ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴿۱۲﴾ (یونس)

۶۔ وَ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ (مؤمن۔ ۳۷)

ان آیات کے مفہوم کا خلاصہ یہ ہے کہ کافروں، اسراف کرنے والوں اور فرعون کے لیے ان کے بُرے اعمال، ان کی نظروں میں اچھے دکھائی دینے لگ گئے تھے۔

۷۔ اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَہٗ سُوۡٓءُ عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا ؕ (فاطر۔۸)

''کیا وہ شخص کہ جس کے عمل کی برائی اس کی نظروں میں اچھی دکھائی دینے لگ گئی ہے۔اس شخص کے برابر ہے کہ جو حقائق کو اسی طرح سے درک کرتا ہے کہ جس طرح سے وہ ہیں۔''

اگر خدا نے آیت وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ۔''(حجرات۔۷) کے مطابق ایمان کو انسان کی فطرت میں رکھا ہے اور اسے اچھا اور خوبصورت کر کے دکھایا ہے تو یہ کام اس سے مانع نہیں ہے کہ شیطانی عوامل اس کے اوپر پردہ ڈال دیں اور بعض مواقع پر کفر و شرک کو اس کی نظر میں اچھا کر کے پیش کریں۔

جیسا کہ فرماتا ہے۔

۸۔ وَلٰکِنۡ قَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَزَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۳﴾ (انعام)

''ان کے دل سخت ہو گئے ہیں اور شیطان نے کفر کو ان کی نظروں میں زینت دے دی ہے۔''

بعض اوقات تربیتی اور فرہنگی عوامل انسان کی نگاہ اور فیصلہ میں اس طرح کی دگرگونی پیدا کر دیتے ہیں کہ انسان اپنی اولاد اور جگر گوشوں کو قتل کرنے سے لذت محسوس کرتا ہے۔جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَکَذٰلِکَ زَیَّنَ لِکَثِیۡرٍ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ قَتۡلَ اَوۡلَادِہِمۡ شُرَکَآؤُہُمۡ (انعام۔۱۳۷)

''اور اسی طرح سے بہت سے مشرک افراد کے لیے اپنی اولاد کو قتل کرنا خوبصورت بنا دیا گیا۔''

۹۔قرآن مجید میں بارہا۔''تسویل نفس'' کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے،اور اس کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ نفس انسانی،نفسانی تمایلات کی بناء برے کاموں کو اس کی نظروں میں اچھے کر کے دکھائے۔اسی وجہ سے بعض نے انسان کے لیے ایک نفس''مسولہ'' نامی ثابت کیا ہے۔''نفس مطمئنہ'' یا''لوامہ'' یا''راضیہ'' کے مقابلہ میں،مثلاً یعقوب اپنے بیٹوں کو،جنہوں نے یوسف کو کنویں میں پھینکا تھا اور ریاکارانہ طور پر کہا تھا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے اس طرح کہتے ہیں۔

بَلۡ سَوَّلَتۡ لَکُمۡ اَنۡفُسُکُمۡ اَمۡرًا ؕ فَصَبۡرٌ جَمِیۡلٌ ؕ (یوسف۔۱۸)

''تمہارے نفس نے تمہارے کام کو تمہارے سامنے خوبصورت بنا کے پیش کیا ہے۔پس صبر اور بردباری ہی اچھی ہے۔''

نیز سامری کے بارے میں جس نے لوگوں کو گوسالہ کی پرستش کی دعوت دی تھی کہتا ہے:

كَذٰلِكَ سَوَّلَتۡ لِىۡ نَفۡسِىۡ ﴿۹۶﴾ (طٰہٰ)

''میرے نفس نے میرے لیے میرے کام کو خوبصورت کر کے دکھایا ہے۔''

۱۰۔رسول گرامیؐ ایک موقع پر ایک گروہ کی کیفیت کی خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں تمہارے جوان فاسد ہو جائیں گے اور تم برے کاموں کا حکم دو گے اور اچھے کاموں سے روکو گے۔'' ناگہاں ایک شخص تعجب کے ساتھ پوچھتا ہے۔

''کیا ایسی حالت پیش آئے گی۔''

رسول اکرمؐ فرماتے ہیں۔

''اس سے بھی بدتر حالت ہو جائے گی۔ایک وقت آئے گا کہ تم حق کو باطل سے اور اچھے کو برے سے پہچان نہ سکو گے۔اور انجام کار اچھے کام تمہاری نظر میں بُرے کام تمہاری نظر میں اچھے دکھائی دیں گے۔[۱]

اگرچہ قرآن وجدان کے دھوکہ کھا جانے اور نفس انسانی کی خود آرائی کی تصدیق کرتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اگر انسان اپنے وجدان کی گہرائیوں کی طرف بازگشت کرلے۔تو وہ اپنی واقعی اور حقیقی وضع و کیفیت سے صحیح طور پر آگاہ ہو جائے گا اور اپنی خطا اور جرم کا اعتراف کرے گا، جیسا کہ فرماتا ہے۔

بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰى نَفۡسِهٖ بَصِيۡرَةٌ ۙ﴿۱۴﴾ وَّلَوۡ اَلۡقٰى مَعَاذِيۡرَهٗ ؕ﴿۱۵﴾ (قیامت)

''انسان اپنے نفس سے آگاہ ہے، چاہے اپنی توجیہ کے لیے کتنے ہی عذر تراشے''

اس بیان سے ''ژان ژاک روسو'' کی گفتگو کی قدر و قیمت کی تہہ معلوم کی جاسکتی ہے جیسا کہ وہ کہتا ہے۔

اے وجدان، اے او وجدان اے خدائی فطرت، اے ملکوتی و ازلی ندا، اے مطمئن و موتمن رہنما، ایک نادان و محدود موجود لیکن صاحب عقل و خرد اور آزاد، اے خیر و شر کی تشخیص میں خطا سے محفوظ قاضی، تو انسان کی طبیعت کو عالی اور اس کی رفتار کو اخلاقی بنا دیتا ہے[۲]

انسان کے وجدان کی یہ تمام تعریفیں بہت ہی اچھی اور عین حقیقت ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ شخصی منافع، ابلیسی پروپیگنڈے اور شیطانی تزیینیں وجدان کے چہرے پر پردہ نہ ڈال دیں اور اس کی نظر کی قدرت تشخیص کو کم نہ کردیں اور خلاصہ یہ ہے کہ وجدان کی ان واضح اور آسان شکستوں کے باوجود وجدان کو دین و ایمان کی جگہ قرار دینا ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔اور کوئی بھی عامل چاہے وہ تعلیم و تربیت ہو یا تمدن و صنعت، وجدان اور اندرونی ادراک کی پرورش ہو، یا پولیس کے وسیع ذرائع، یا انصاف کی عدالتوں کی مضبوطی کوئی بھی دین کی طرح موثر اور تمام شئون و حالات میں دین کے نقش و اثر کو پورا نہیں کرسکتے۔

---

[۱] وسائل الشعیہ ج ۱۱ ص ۳۹۷۔

[۲] فلسفہ اخلاق۔

۹۔رجاء و خوف یا اُمید و بیم

صحیح حرکت کے لیے دونوں طرف سے دو ہم آہنگ قوتیں:

جہان خلقت جذب و دفع کی بنیاد پر قائم ہے اور یہ دونوں مختلف قوتیں عالم کبیر مثلاً منظومہ شمشی پر بھی اور عالم صغیر مثلاً ایک ایٹم کی شناخت پر بھی حکمران ہیں اور نتیجہ میں اسے نظم و ضبط بخشتی ہیں۔

اگر عالم پر صرف ''جذب''وکشش کی حکومت ہوتی تو تمام سیارے سورج کے ساتھ مل جاتے اور اگر تنہا ''دفع'' کی حکومت ہوتی تو نظام عالم پر اگندہ ہو جاتا، اور ہر سہارا کہیں سے کہیں جا گرتا۔صرف یہی دونوں قوتیں ہیں جو نظام کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں اور صفحہ طبیعت کو نظم اور بقاء بخشے ہوئے ہیں۔

انسان کے وجود میں بھی دو عظیم مرکز ہیں جنہیں ''نفس'' اور ''عقل'' کہتے ہیں جو حقیقت میں آگے بڑھانے والی اور روکنے والی دو قوتوں کی مانند ہیں اور ان دونوں کی فعالیت کے اعتدال سے انسان رشد و نشو و نما پاتا ہے اور تکامل وارتقاء کی منزل تک جا پہنچتا ہے۔

نفس انسان کے وجود میں گاڑی کے انجن کی طرح ہے جو انسان کو حرکت اور قدرت بخشتا ہے اور اس کو سعی و کوشش اور فعالیت پر آمادہ کرتا ہے۔

اگر انسان میں نفس نہ ہو تو وہ اپنی مادی اور طبیعی حیات کو کھو بیٹھے گا اور وہ پھر کسی بھی چیز کے لیے فعالیت اور کوشش نہیں کرے گا۔اور حقیقت میں یہ غرائز نفسانی اور اندرونی خواہشات ہی ہیں جو اُسے غصہ اور شہوت کے وقت جوش و خروش بخشتے ہیں اور مال و منصب کی خاطر اس کی حرص اور لالچ کو تحریک کرتے ہیں۔

اگر نفس انسانی بدن کے لیے انجن ہے تو عقل و خرد جس کا کام امور کی جانچ پڑتال کرنا اور پھر فیصلہ کرنا ہے ''بریک'' کے مانند ہے جو انسان کو غیر سنجیدہ کاموں اور ایسی جلدی گذر جانے والی لذتوں سے جن کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔روکتی ہے اور اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ انسان کی غرائز اور اندرونی خواہشات ایک ایسی قدرت کی صورت میں جس کی کوئی حد اور حدود نہ ہو سعی و کوشش اور فعالیت کریں۔

تکامل وارتقاء کے اسباب اور تربیت کے اصولوں میں سے ایک سبب ''رجاء'' و ''خوف'' یا ''امید'' و ''بیم'' کا مسئلہ ہے اور یہ دونوں روحانی حالتین عالم افرینش پر دو حاکم قوتوں یا وجود انسان پر حاکم دو مرکزوں کی طرح اس کی حیات اور زندگی میں کامل طور سے موثر ہیں، رجاء وامید کا نقش واثر، تحریک بخشنا اور سعی و کوشش کو ایجاد کرنا ہے اور خوف و ترش کا نقش واثر انسان کو نقصان پہنچانے والے امور سے روکنا ہے۔

اور علم اخلاق کے علماء کی تعبیر کے مطابق امید و خوف پرندے کے دو پروں کی مانند ہیں کہ اگر ان دونوں کے درمیان توازن و مساوات برقرار رہے گی تو پرندہ ہوا کے سینہ کو چیر کر پرواز کرے گا، لیکن اگر اس کا ایک پر نہ ہو تو پھر وہ پرواز نہیں کر سکے گا۔

اُمید کے تحریک بخش ہونے کے لیے بس یہی کافی ہے کہ حضرت مسیح کہتے ہیں کہ۔

''میں نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا جو اپنے بیلچے کے ساتھ زمین میں کام کر رہا تھا۔اور زمین میں ہل چلا رہا تھا میں نے خدا سے دعا کی کہ اس

کے دل سے امید کو نکال دے اچانک میں نے دیکھا کہ اس بوڑھے نے بیلچہ رکھ دیا اور زمین پر لیٹ گیا۔ چند لمحات کے بعد میں نے خدا سے دعا کی امید کو اس کے دل میں پلٹا دے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ بوڑھا کھڑا ہو گیا اور اپنے بیلچہ کے ساتھ کام کرنے لگا۔ تو اس وقت میں نے اس سے پوچھا کہ تو نے اپنے کام کو کیوں چھوڑ دیا تھا اور پھر دوبارہ اپنے کام میں کیوں لگ گیا۔''

اس نے میرے جواب میں کہا کہ:

''میں کام میں مشغول تھا کہ اچانک میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ میں کب تک کام کرتا رہوں گا۔ اب تو میں بوڑھا ہو چکا ہوں لہٰذا میں بیلچہ رکھ کر لیٹ گیا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک دوسرا خیال پیدا ہوا اور میں نے اپنے آپ سے کہا کہ: چاہے میری عمر کا ایک دن ہی باقی رہے میں پھر بھی معاش کا محتاج ہوں۔ اس لیے میں دوبارہ کام میں مشغول ہو گیا۔[۱]

یہ واقعہ زندگی میں ''امل'' و ''رجاء'' کی حیثیت کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اور وہ انسان جس میں کوئی امید نہ ہو، مردہ ہے اور اگر نہ بھی مرے تو ایک زندہ نما ہے، جو کسی ایک گوشہ میں پڑا ہوا ہو۔

اسی بناء پر پیغمبر گرامی نے فرمایا:

''الامل رحمة لامتی ولو لاالامل مارضعت والدة بولدها ولاغرس غارس شجرا۔[۲]

''امید و آرزو میری امت کے لیے رحمت ہے اور اگر آرزو نہ ہوتی تو نہ ماں بچہ کو دودھ پلاتی اور نہ ہی باغبان کوئی درخت لگاتا۔''

قرآن و رجاء

قرآن مسئلہ رجاء کو دو صورتوں میں پیش کرتا ہے اور وہ دونوں ہی بندوں کی ترتیب میں ایک خاص اثر رکھتی ہے۔

---

[۱] سفینۃ البحار ج ۱ ص ۳۰ مادہ ''امل''۔

[۲] گذشتہ ماخذ (سفینۃ البحار ج ۱ ص ۳۰۔ مادہ ''امل''

رحمت خدا کی اُمید

قرآن متعدد آیات میں اور صاحب ایمان افراد کی تعریف و توصیف کے ضمن میں امید اور رحمت خدا کے مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

يَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ (زمر۔۹)

''وہ دار آخرت (کے عذاب) سے ڈرتا ہے اور خدا کی رحمت کی امید رکھتا ہے۔

اور دوسری آیت میں فرماتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ (بقرہ۔۲۱۸)

''وہ خدا کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔''

لیکن اس بناء پر کہ کہیں خدا کی رحمت کی امید منفی پہلو اختیار نہ کرے اور انسان خدا کی رحمت کو بہانہ بنا کر شرعی واجبات و فرائض سے ہی سبکدوش نہ ہو جائے اس لیے قرآن پہلی آیت کی ابتداء میں فرماتا ہے کہ۔

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ (زمر۔۹)

کیا وہ شخص جو آدھی رات کے وقت خدا کی حالت سجدہ اور قیام میں عبادت کرتا ہے اور آخرت کے گھر (کے عذاب) سے ڈرتا ہے (دوسرے افراد کے ساتھ جو ایسے نہیں ہیں یکساں ہے)

اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی رحمت کی مفید امید وہ ہے جو رات کی تاریکی میں عبادت کے ساتھ جو ایک مستحبی عبادت ہے توام ہو اور انسان کو ہرگز اس بہانہ سے کہ خدا کی رحمت وسیع ہے فرائض تو رہے ایک طرف، نوافل کو بھی ترک نہیں کرنا چاہیے۔

ایک شخص نے حضرت صادق علیہ السلام سے کہا:

''آپ کے دوستوں کا ایک گروہ خدا کی امید کے بہانہ سے نافرمانی کرتا ہے۔'' تو امامؑ نے فرمایا۔

''وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ ہمارے شیعہ نہیں ہیں۔ اس کے بعد فرمایا:

''اُمید عمل سے جدا نہیں ہے جو شخص کسی چیز کی اُمید کرتا ہے وہ اس کے عمل کو انجام دیتا ہے۔[1]

---

[1] ارشاد ص ۳۷۱

خدا کی رحمت سے مایوس ہونا

خدا کی رحمت سے ناامید ہونا چاہیے اس جہان میں ہو یا دوسرے جہان میں، گناہان کبیرہ میں سے ہے۔ اور سعادت کی نابودی میں اس کا اثر کسی انسان کو قتل کرنے سے زیادہ ہے خدا کے لطف سے مایوس آدمی خاص طور سے وہ آدمی جو دوسرے جہان میں خدا کی مغفرت سے مایوس ہو، وہ ہر جرم کر گزرتا ہے کیونکہ وہ اپنے دل میں یہ خیال کرتا ہے کہ میں تو ہر حال میں دوزخی ہوں تو میں گناہ کرنے سے جس سے لذت نفس حاصل ہوتی ہے۔ کیوں رکوں۔ اسی لیے قرآن مایوس لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے۔

وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴿۸۷﴾

(یوسف)

''تم خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بے شک خدا کی رحمت سے تو صرف کافر لوگ ہی نا اُمید ہوتے ہیں۔

امام سجادؑ کے معاصرین میں سے ایک شخص زہری ہے۔ اس کا ہاتھ ایک بے گناہ کے خون میں آلودہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے اسی گناہ اور عذاب اخروی کے خوف سے حواس میں خلل آ گیا تھا۔ جب امام سجادؑ نے اس کی کیفیت کو مشاہدہ کیا تو فرمایا۔

''والله لقنوطه من رحمة الله اشد من قتله۔'' [1]

''اس کا خدا کی رحمت سے نا اُمید ہو جانا محترم انسان کے قتل کرنے سے بھی بدتر ہے۔

عبداللہ بزار نیشاپوری کہتا ہے کہ میں ماہ رمضان کے دنوں میں حمید بن قحطبہ طوسی کے پاس گیا۔ اس نے اپنے سامنے دستر خوان بچھایا اور کھانا کھایا۔ میں نے پوچھا کہ کیا امیر بیمار ہے؟ اس نے کہا: کہ نہیں! میں نے کہا پھر تم نے روزہ کیوں نہیں رکھا۔؟ وہ میرے سوال کے جواب میں رونے لگا اور کوئی جواب نہ دیا۔ جب وہ کھانا کھانے سے فارغ ہوا تو کہنے لگا میں نے ہارون کے حکم سے ساٹھ علوی سادات کو قید خانہ سے باہر نکالا اور سب کو قتل کر دیا اور ان کے جسموں کو کنویں میں پھینک دیا۔ اب اس شرمناک عمل اور ہولناک جرم کرنے کے بعد نماز روزہ مجھے کیا فائدہ دیں گے [2] اب اس قسم کا مایوس و ناامید شخص اپنے شیطانی اہداف کے لیے کسی بھی جرم کے انجام دینے میں کوتاہی نہیں کرے گا۔

قرآن اُمید کے مسئلہ کو ایک اور طرح سے بھی پیش کرتا ہے۔ اور دونوں میں ہی اس بات کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ رجا و امید کو اصلاح کرنے والا ہونا چاہیے یعنی وہ عمل اور کام کے ساتھ ہو۔

---

[1] ارشاد القلوب ص ۱۷۶۔

[2] تتمۃ المنتہی ص ۲۵۶

بعض اوقات تو وہ اسے ''لقاء خدا کی امید'' کے ساتھ پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا (کہف۔۱۱۰)

''جو شخص اپنے پروردگار کی لقاء کی امید رکھتا ہے تو وہ اس قسم کی لقاء کے لیے نیک کام انجام دیتا ہے۔''

اور بعض اوقات وہ اس کو ''دوسرے دن کی اُمید'' کی صورت میں پیش کرتا ہے، اور فرماتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ

(احزاب۔۲۱)

''پیغمبر خدا ان لوگوں کے لیے جو خدا اور دوسرے دن کی اُمید رکھتے ہیں، بہترین اسوہ اور نمونہ ہیں۔''

پہلی آیت میں جہاں لقاء خدا کی اُمید پیش کرتا ہے تو اس کے بعد فرماتا ہے۔

''فلیعمل عملاً صالحاً۔''

''اُمید کو کام اور کوشش کے ساتھ توام ہونا چاہیے۔''

دوسری آیت میں اس گروہ کے لیے، جو خدا اور آخرت کے دن کی اُمید رکھتے ہیں۔ رسول گرامی کو اسوہ اور نمونہ کے طور پر معرفی کراتا ہے پیغمبر اکرمؐ حضرت صادقؑ کی تعبیر کے مطابق، اُمیدوار ہونے کے باوجود خدا سے سب سے زیادہ خائف تھے امام صادقؑ فرماتے ہیں۔

''کان رسول الله احسن النّاس ظناً بالله والبسطھم له رجاء وکان اعظم الناس منه خوفاً۔''[۱]

''پیغمبر، خدا سے سب سے زیادہ حسن ظن رکھتے تھے، اور اس کی رحمت کو سب سے زیادہ وسیع سمجھتے تھے اور تمام لوگوں سے زیادہ خدا کا خوف رکھتے تھے۔''

البتہ اس طرح کے اور ان سے مشابہ موارد میں ''رجاء'' اس قسم کی امید ہوتی ہے جو خوف اور ڈر کے ساتھ توام ہو اور اکثر رجاء خوف اور امید و بیم ایک دوسرے کے لازم وملزم ہوتے ہیں۔[۲]

دعائے افتتاح میں، جو محمد بن عثمان بن سعید عمری کے ذریعہ، جو امام زمانہؑ ارواحنا فداہ کے ایک نائب خاص تھے۔ نقل ہوئی ہے، اسمیں اس طرح

---

[۱] ارشاد ص ۱۷۴۔

[۲] مفردات راغب ص ۱۹۰۔

آیا ہے۔

"وایقنت انك ارحم الرّاحمین فی موضع العفو والرحمة واشد المعاقبین فی موضع النکال والنقمة۔[1]

"مجھے یقین ہے کہ تو ارحم الرحمین ہے، عفو و رحمت کے مقام میں اور اسی طرح سے عقوبت و انتقام کے موقع پر سخت ترین سزا دینے والا ہے۔

امید کے اسباب و نتائج

انسانی زندگی میں "رجاء" کے وجود کی ضرورت اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں "امید" کا اصلاحی اثر، اتنا واضح ہے کہ استدلال کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اور حقیقتاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ "ناامید انسان" کامل طور سے "مردہ انسان" کے مساوی ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ مردہ انسان حیات کے نہ ہونے کی وجہ سے رنج والم سے دور ہے جب کہ ناامید انسان رنج اور دکھ میں ڈوبا ہوا ہے۔

وہ عوامل جو ہمیں خدا کی رحمت کی امید اور اس کے لطف پر آمادہ کرتے ہیں، بہت زیادہ ہیں ان میں سے صرف انسان کی خلقت اور ان اعضاء کا مطالعہ ہی، جو انسان کے وجود کے ڈھانچے میں لگائے گئے ہیں ہماری روح کی فضا کو رجاء و امید سے مالا مال کر سکتے ہیں، کیونکہ خدا نے، نہ صرف ہمارے وجود کو زندگی کے ضروری ساز و سامان سے آراستہ کر دیا ہے کہ اگر اعضاء و جوارح ہمارے وجود کے ڈھانچے میں نہ ہوتے تو زندگی ہمارے لیے ایک امر محال ہو جاتی، بلکہ ہماری خلقت میں ایسے آلات بھی سجائے گئے ہیں جو ہماری زندگی کی زینت اور ہماری حیات کی شیرینی کا سبب ہیں اور اگر یہ نہ ہوتے تو انسانی زندگی مختل نہ ہوتی، اگرچہ اس شان و شوکت اور آرائش کی حامل بھی نہ ہوتی۔[2]

ایسا مہربان خدا، جو حیات انسانی کی شیرینی اور اس کے سکون و آرام تک کا خیال رکھتا ہے محال ہے کہ وہ ہماری سعادت و خوش بختی اور نیک انجام کی فکر میں نہ ہو۔ یقیناً وہ ہماری ہدایت و سعادت کا خواہاں ہے اور اگر ہم اس مقصد تک نہیں پہنچیں تو یہ ہماری طرف سے کوتاہی ہے اور اس مطلب میں گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بہت سے شواہد اور قرائن اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ رؤف و مہربان خدا انسان کی سعادت اور ہماری خوش بختی کا خواہاں ہے بلکہ گفتگو ایک دوسری جگہ ہے اور وہ یہ ہے کہ امید کا خمیر مایہ کیا ہے؟ اور انسان کس صورت میں امیدوار اور نا اُمید ہوسکتا ہے یہ جگہ امید و رجاء کے جھوٹے دعویداروں کی واقعی امیدواروں سے جدائی کا مقام ہے۔

---

[1] اقبال سید بن طاؤس ص ۲۹۶۔

[2] مثلاً آنکھوں کے رنگ کا اختلاف، دونوں لبوں کی سرخی، دونوں ابروؤں کا کمائی دار ہونا، وغیرہ۔

رجاء و اُمید کے موافق باتیں

قرآن وضاحت کے ساتھ بیان کر رہا ہے کہ یہ انسان کے نیک کام اور سچی کوشیں ہیں جو دلوں میں رجاء کا بیج بوتے اور امید کا نور چھڑ کتے ہیں۔ اور اس کے بغیر ہر قسم کی رجاء وامید دعوؤں اور خیال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

صرف آیات قرآن ہی نیک عمل کو امید کے لیے زینہ ساز نہیں سمجھتیں بلکہ ہماری روزانہ کی زندگی بھی اس مطلب کی گواہی دیتی ہے۔

وہی کسان کسی چیز کا امیدوار ہوسکتا ہے جو اچھا اور صحیح بیج لائق اور اچھی طرح بنائی ہوئی زمین میں ڈالے اور زمین کو بیہودہ گھاس سے پاک صاف کرنے اور موقع پر اس کی آبپاشی کرنے اور کھاد دینے میں پوری پوری کوشش کرے۔ اس قسم کے کسان کو اپنے کھیت کے محصول اور نتیجہ کا امیدوار سمجھا جاسکتا ہے نہ کہ اس شخص کو جو بالکل اس کے نقطہ مقابل میں ہو اور کام اور کوشش سے پشت پھیرنے کے سوا اس نے کچھ نہ کیا ہو۔

عرب کے ایک سخن ساز شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

ترجوا النجاة ولم تسلك مسالكها!

ان السفينة لا تجرى على اليبس!

''تو دریائے متلاطم میں جب طوفان کشتی کو پر کاہ کی طرح ادھر اُدھر ہچکولے دیتا ہے اپنی نجات کی امید رکھتا ہے؟''

حالانکہ تو نے نجات کے راستوں کو طے ہی نہیں کیا۔ کیا کسی نے یہ سنا ہے کہ کشتی خشکی میں بھی چلتی ہے؟

اسی بنا پر خدا کی رحمت اور اس کی مغفرت کا وہی شخص امیدوار ہوتا ہے جو دل کی زمین میں ایمان کا بیج بوئے۔ اس کے عمل صالح اور خدا کی اطاعت کے ساتھ اس کی آبیاری کرے یہ وہ موقع ہے کہ رحمت کی امید کر بیٹھے اور کشادگی کا انتظار کرے۔

وہ آیات جو انسان کے صالح کاموں اور کوششوں کو، امید و رجاء کے لیے زینہ ساز جانتی ہیں یہ ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾ (بقرہ)

''وہ لوگ کہ جو ایمان لائے، اور وہ کہ جنہوں نے ہجرت کی اور راہ خدا میں جہاد کیا، وہی تو خدا کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور خدا بخشنے والا رحیم ہے۔

یہ آیت کامل صراحت کے ساتھ اسی گروہ کو رجاء و امید کا مستحق جانتی ہے جو خاص شرائط و حالات کے حامل ہوں مثلاً۔

۱۔اٰمنوا

وہ سرزمین روح میں ایمان کا بیج بوئیں

۲۔والذین ھاجروا

جنہوں نے کفر کی سرزمین سے اسلام کی سرزمین کی طرف ہجرت کی ہوتا کہ پورے وسائل اور امکانات کے ساتھ مذہبی فرائض کو انجام دیں۔

۳۔وجاھدوا فی سبیل اللہ:

اور خدا کی راہ میں سعی و کوشش اور جدو جہد کریں اور کفر کے ساتھ مخصوص جنگ کر کے خدا کے دین کو عالم میں پھیلائیں۔

ایک اور دوسری آیت میں فرماتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾ (فاطر)

’’جولوگ کتاب خدا کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے وہ پنہاں و آشکار خرچ کرتے ہیں۔ یہ گروہ اس لائق ہے کہ وہ اس تجارت کا جس میں کوئی خسارہ نہیں ہے، اُمیدوار ہو۔

اس آیت میں دلوں میں نجات کے بیج کے تحقق کے لیے ذیل میں بیان کردہ شرائط کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

۱۔یتلون کتاب اللہ۔‘‘

قرآن کو (اس کے احکام پر عمل کرنے کے لیے) پڑھیں۔

۲۔واقاموا الصلاۃ‘‘

اور نماز کو قائم کریں۔

۳۔وانفقوا مما رزقناھم۔‘‘

جو کچھ خدا نے انہیں دیا ہے اس میں سے پنہاں و آشکار خرچ کریں۔

یہ تمام شرائط جو ان دونوں آیات میں اور دوسری آیات میں وارد ہوئی ہیں وہ ایمان اور عمل صالح میں خلاصہ ہوتے ہیں۔

قرآن اس فاقد ایمان اور فاقد عمل صالح گروہ پر تنقید کرتا ہے جو لیاقت وشائستگی پیدا کئے بغیر خدا کی رحمت کے انتظار میں بیٹھے ہوئے یہ کہتا ہو"سیغفر لنا"خدا ہمیں بخش دے گا، جیسا کہ فرمایا ہے۔

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ وَّرِثُوا الۡكِتٰبَ يَاۡخُذُوۡنَ عَرَضَ هٰذَا الۡاَدۡنٰى وَيَقُوۡلُوۡنَ سَيُغۡفَرُ لَنَا ۚ وَاِنۡ يَّاۡتِهِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُهٗ يَاۡخُذُوۡهُ ؕ (اعراف۔۱۶۹)

"ان کے بعد کچھ ایسے لوگ کتاب (تورات) کے وارث ہوئے (جنہوں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہں کیا) انہوں نے اس پست دنیا کا مال ومتاع لے لیا۔ (اور اسے خدا کے حکم وفرمان پر مقدم رکھا۔) وہ یہ کہا کرتے تھے کہ ہم گنہگار ہیں، خدا عنقریب ہمیں بخش دے گا، لیکن اگر پھر انہیں پہلے کی طرح کچھ مال ہاتھ لگ جایئے تو وہ اُسے پھر لے لیں (اور خدا کے حکم کو پس پشت ڈال دیں)۔

قرآن پیغمبروں کی اولاد میں سے اس گروہ کو جس نے حق وارثت کی رعایت نہیں کی، اور اپنے بزرگوں کے راستے سے منحرف ہو گئے، نماز کو چھوڑ دیا۔ اور خواہشات نفس کی پیروی کی، گمراہ افراد کہتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ۙ﴿۵۹﴾

(مریم)

"ان کے بعد ایک ایسا گروہ ان کا جانشین بن گیا جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا۔ اور شہوات کی پیروی کرنے لگے، وہ عنقریب اپنی گمراہی کا نتیجہ بھگتیں گے۔"

آخر کار پیغمبر گرامی اس گروہ کے بارے میں جو آمادگی اور شائستگی کے بغیر خدا کی رحمت کے انتظار میں ہیں اس طرح فرماتے ہیں۔

الاحمق من اتبع نفسه هواها وتمنی علی الله الرجاء۔"[1]

"احمق ہے وہ جو ہوائے نفس کی پیروی کرے، اور خدا سے اُمید کی تمنا رکھے۔"

ایک شخص نے حضرت صادقؑ سے کہا: آپ کے دوستوں میں سے ایک گروہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہتا ہے کہ ہم خدا سے امید رکھتے ہیں۔ امام نے فرمایا۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں وہ ہمارے دوستوں میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جن پر نفسانی خواہشات اور تمناؤں کا غلبہ ہوا ہے اس کے بعد فرمایا ہے۔

---

[1] احیاء العلوم ج ۴ ص ۱۴۲

"من رجا شیئاً عمل له ومن خاف شیئاً فر منه۔"[1]

"جو شخص کسی چیز کی اُمید کرتا ہے وہ اس کے لیے سعی و کوشش کرتا ہے۔ اور اگر وہ کسی چیز سے ڈرتا ہے تو وہ اس سے دور بھاگتا ہے۔"

ایک اور دوسری حدیث میں فرمایا!

"حقیقی مومن وہ ہے جس میں دو حالتیں موجود ہوں، خوف اور امید کی حالتیں، اور یہ دونوں حالتیں اسی صورت میں انسان میں پیدا ہوتی ہیں کہ جس سے وہ ڈرتا ہے، یا جس کی وہ امید رکھتا ہے اس کے لیے کام اور کوشش کرے"[2]

امید پیدا کرنے والے دوسرے عوامل

اگر ایمان اور ایمان کی راہ میں انسان کی کوششیں، اُمید کے لیے زمینہ ساز ہیں تو باب توبہ کا کھلنا اولیا، خدا کی شفاعت کا قبول ہونا، خدا کی رحمت کا وسیع ہونا، ایسے عوامل ہیں جو بعد کے مراحل میں انسان کے دل میں اُمید کا بیج بوتے ہیں۔ یعنی ایمان اور کوشش کے بعد ان عوامل کو جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے، دلوں میں رجاء و اُمید کے ایجاد ہونے کے لیے، دوسرے درجہ کے عوامل جاننا چاہیے، ان کا بیان یہ ہے:۔

ا۔ خدا کی وسیع مغفرت

اہل ایمان کے دلوں میں، شائستہ کوششوں کے بعد، امید پیدا کرنے والا پہلا عامل وہی خدا کی وسیع رحمت کا اعتقاد ہے۔ وہ خدا جس کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے۔[3]

قرآن نے کئی موارد میں اس معنی کی تصریح کی ہے، اور فرماتا ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۵۳ (زمر)

"میرے ان بندوں سے جو گناہ کے ارتکاب میں حد سے بڑھ گئے ہیں، کہہ دیجئے کہ وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، خدا تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔"

اور دوسری آیت میں فرماتا ہے۔

---

[1] کافی جلد ۲ ص ۶۷ حدیث ۶۔

[2] لایکون المؤمن مؤمناً حتی یکون خائفاً راجیاً ولا یکون خائفاً راجیاً حتّٰی یکون عاملاً لما یخاف ویوجر "(کافی ج ۲ ص ۷۱ حدیث۔

[3] یامن سبقت رحمته غضبه۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ (رعد۔٦)

تیرا پروردگار لوگوں کے لیے گنہگار اور ستم گار ہونے کے باوجود، صاحب بخشش ہے۔

اس قسم کی آیات، خصوصاً دوسری آیت، اس قسم کی بخشش کے ساتھ مربوط ہے جو بعض اوقات توبہ کے بغیر ہی بندوں کے شامل حال ہوجاتی ہے اور اگر اس سے مراد اس قسم کی بخش ہوتی جو توبہ کے بعد انسان کو حاصل ہوتی ہے، تو لفظ 'علی ظلمھم ''(ان کے گناہ کے باوجود) کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے قطع نظر پہلی آیت کا لب ولہجہ بھی اس طرح کا ہے کہ جسے خصوصیت کے ساتھ حالت توبہ پر حمل نہیں کرسکتے، کیونکہ آیت کا لب ولہجہ ایک وسیع رحمت ومغفرت کو بیان کررہا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے دور ہوجانے والے بندوں کے دل میں اُمید کا نور اور رجاء کی چمک روشن کرے۔

٢۔فرشتوں کا استغفار

اُمید آفرین عوامل میں سے ایک فرشتوں کا استغفار ہے کیونکہ حاملان عرش اور وہ فرشتے جو اس کے گرداگرد ہیں صاحب ایمان افراد کے حق میں طلب مغفرت کرتے ہیں جیسا کہ فرماتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (مؤمن۔ ٧)

''حاملین عرش اور وہ فرشتے جو اس کے اردگرد میں، خدا کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں، وہ خود بھی خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور صاحب ایمان لوگوں کے لیے طلب مغفرت کرتے ہیں اور یہ کہتے یں پروردگار! تیری غیر متناہی رحمت اور علم نے ہر جگہ کو گھیر رکھا ہے۔''

٣۔اولیاء خدا کی شفاعت

رجاء وامید کا تیسرا عامل اولیاء خدا کی شفاعت ہے، جس کا قرآن رسول گرامی کے بارے میں 'مقام محمود' کے عنوان سے نام لیتا ہے، اور فرماتا ہے۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝٧٩ (اسراء)

''رات کے ایک حصہ میں، نماز نافلہ کو انجام دینے اور تہجد کے لیے بیدار ہو، شاید تیرا خدا تجھے بہت ہی پسندیدہ مقام کے لیے منتخب کر لے''

دوسری آیت میں بیان کرتا ہے کہ خدا پیغمبر کی شفاعت کو اس حد تک قبول کرے گا کہ اُسے راضی کر دے، جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۞ (الضحیٰ)

''تیرا خدا تجھے اتنا دے گا (اور تیری شفاعت کے سائے میں امت کے گنہگاروں کو بخشے گا) کہ تو راضی ہو جائے گا۔

پہلی آیت جو خدا کے وسیع لطف کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے کیا وہ زیادہ امید آفرین ہے یا آخری آیت جو پیغمبر کی شفاعت سے مربوط ہے؟ خاندان رسالت کی احادیث یہ بتلاتی ہیں کہ شفاعت سے مربوط آیت پہلی آیت کی نسبت زیادہ رجاء آفرین ہے اگرچہ دوسرے لوگوں نے اس کے برخلاف قول کو اپنایا ہے لیکن امیر المومنین سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے جو پہلے قول کی تائید کرتی ہے۔[1]

آخر میں ہم یہ کہتے ہیں کہ اس قسم کے وسائل رحمت اور امید آفرین عوامل کے ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دینا چاہے۔ اور ان عوامل کی امید پر فرائض کے انجام دینے میں کوتاہی نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ امیر المومنین فرماتے ہیں کہ: مقامات خداوندی کا عارف وہ ہے جو لوگوں کو خدا کی رحمت سے مایوس نہ کرے اور انہیں گناہوں کے عکس العمل سے مطمئن نہ کرے۔[2]

[1] مجمع البیان ج ۴ ص ۵۰۳، صیدا و احیا العلوم ج ۴ ص ۱۶۷۔

[2] انما العالم الذی لا یقنط النّاس من رحمۃ اللہ ولا یومنھم من مکر اللہ۔'' (کافی جلد ا ص ۳۶)

۱۰۔ آیہ ''ویسئلونك عن الرّوح'' میں رُوح سے کیا مراد ہے؟ [1]

قرآن مجید سورۂ اسراء کی آیت ۸۵ میں فرماتا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾

''اے پیغمبر یہ تجھ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ ان کے جواب میں کہہ دیجئے۔ کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے۔ اور تمہیں بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔''

اس آیت میں ایک سوال کے دو نکات موجود ہیں۔

۱۔ جو سوال کیا گیا ہے اس میں ''روح'' سے کیا مراد ہے؟

۲۔ اس کا معنی کہ ''روح میرے پروردگار کے امر سے ہے'' کیا ہے؟ اور یہ جملہ کس ہدف اور مقصد کو بیان کرتا ہے؟

دونوں موضوعات کی وضاحت کے لیے کئی پہلوؤں پر توجہ دینی پڑے گی جو ابھی بیان ہوتے ہیں۔

سوال کرنے والے کون تھے؟

سوال کرنے والوں کی روحی و فکری خصوصیات سے آشنائی حقیقت کے انکشاف میں مدد کرے گی تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سوال کرنے والے وہ یہودی علماء تھے جو مدینہ میں رہتے تھے، اگرچہ ظاہراً سوال کرنے والے مشرکین مکہ تھے۔ اس سلسلہ میں ایک شان نزول نقل کرتے ہیں، جسے ہم سیرۃ ابن ہشام سے جو اصل اور قدیم ماخذ ہے نقل کر رہے ہیں وہ لکھتا ہے کہ۔

مشرکین مکہ میں سے ''نصر اور ابن معیط نامی'' دو شخص قریش کے نمائندوں کے طور پر، مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تا کہ پیغمبر اسلام کی نبوت کے موضوع کے سلسلہ میں تحقیقات کریں اور یہ معاملہ علماء یہود کے سامنے جو ان مسائل میں زیادہ بصیرت رکھتے تھے پیش کریں۔ علماء یہود نے کہا کہ تم ذیل میں بیان کردہ تین موضوعات کے بارے میں ''محمدؐ'' سے سوال کرو۔ اگر اس نے تینوں سوالات کے جواب دے دیئے تو وہ خدا

---

[1] ہم نے ''روح قرآن'' کے بارے میں ایک علیحدہ رسالہ ''اصالت روح از نظر قرآن'' شائع کیا ہے، اس لیے یہاں اس بحث میں اس آیت میں وارد ''روح'' کے بارے بحث کی ہے۔''

کا پیغمبر ہے اور اگر یہ صورت نہ ہو وہ جھوٹا مدعی ہے اور وہ تین موضوعات یہ ہیں۔

۱۔اصحاب کہف کی سرگذشت

۲۔ذی القرنین کی سرگذشت

۳۔روح

انہوں نے مکہ واپس آنے کے بعد یہودیوں کے سوالات پیش کیے اور ان کے جواب میں وحی الٰہی نازل ہوئی اور پہلے اور دوسرے سوال کا جواب سورہ کہف کی آیت ۹۔۲۲ و ۸۳۔۹۸ میں اور تفسیر سوال کا جواب سورۂ اسراء کی آیت ۸۵ میں دیا۔اس کے بعد ابن ہشام نے ان تمام آیات کی اپنی سیرت میں تفسیر پیش کی ہے۔[1]

بعض تفاسیر میں یہ کہا گیا ہے کہ علماء یہود نے یہ کہا کہ اگر محمد نے پہلے دوسوالوں کا جواب دیا اور تیسرے سوال کے جواب سے پہلو تہی کی تو یہ اس کی راستگوئی کی نشانی ہے۔

لیکن پہلی شانِ نزول میں زیادہ اصالت پائی جاتی ہے اور مفسرین نے بھی اسی پر تکیہ کیا ہے۔قرآن نے بھی تیسرے موضوع کو مبہم صورت میں بیان کیا ہے، نہ یہ کہ اس کا جواب ہی نہیں دیا۔اس سے قطع نظر قرآن کہتا ہے کہ خدا نے تمام اسماء (حقائق اشیاء) آدم کو سکھلائے (بقرہ ۳۱) او رپیغمبر کے بارے میں کہتا ہے۔

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ (نساء)

''اور جو کچھ تو نہیں جانتا تھا اس کی تجھے تعلیم دی اور خدا کا لطف وکرم تیرے لیے بہت ہی بڑا ہے۔''

اس کے علاوہ پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ وہ یہ کہیں۔

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾ (طٰہٰ)

''کہہ دیجئے پروردگار! میرے علم میں زیادتی فرما۔''

کیا اس صورت میں یہ صحیح ہوگا کہ پیغمبر جواب دینے سے کترائیں اور یہ کہہ دیں کہ میں اس کا جواب دینے سے عاجز و ناتواں ہوں۔

اس لیے یہ کہنا پڑے گا کہ پہلا شانِ نزول درست ہے اور دوسرا حقیقت سے عاری ہے۔

اس سوال کے بارے میں مفسرین کے نظریات

مفسرین اس سوال کے بارے میں اور یہ کہ روح سے مراد کیا ہے، مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ہم انہیں اجمالی طور پر بیان کرتے ہیں۔

[1] سیرۃ ابن ہشام ج۱ص ۳۰۰۔۳۰۸، تفسیر الدار المنثور ج۳ص ۹۹۔

ا۔اس سے مراد حیوانی اور انسانی روح ہے جو مبدءحیات وزندگی ہے۔

۲۔اس سے مراد قرآن ہے اور کئی آیات میں خدا نے وحی کو''روح'' کہا ہے۔مثلاً:

وَ كَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ (شوریٰ۔۵۲)

''اسی طرح ہم نے روح کی تیری طرف وحی کی۔''

۳۔اس سے مراد خدا کے فرشتوں میں سے وہ عظیم ترین فرشتہ ہے جو جبرئیل ومیکائیل کے علاوہ ہے۔

۴۔اس سے مراد وہ روح ہے جو آیت:

يَوۡمَ يَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَالۡمَلٰۤٮِٕكَةُ صَفًّا ۚ (نبا۔۳۸)

''اس دن روح اور فرشتے صف کشیدہ کھڑے ہوں گے۔''

میں وارد ہوا ہے۔

۵۔اس سے مراد وسیع معنی میں مطلق روح ہے۔

۶۔اس سے مراد جبرائیل روح الامین ہے۔[۱]

اسلامی احادیث جو آیت کی تفسیر کے بارے میں وارد ہوئی ہیں انہوں نے روح کو عظیم فرشتے کے ساتھ تفسیر کی ہے اور مؤلف البرہان کی نقل کردہ بارہ روایتوں میں سے اور مؤلف نورالثقلین کی نقل کردہ سات روایتوں میں سے صرف ایک روایت میں روح انسانی کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے۔ سیوطی نے تفسیر''درا المنثور''میں کئی روایات نقل کی ہیں۔جن میں سے شاید ایک سے زیادہ روح انسانی وحیوانی کے ساتھ مربوط نہیں ہے۔

جبرائیل کے بارے میں یہودیوں کا مخصوص عقیدہ

آیات قرآنی اوران کے بارے میں وارد شدہ شانِ نزول یہ بتلاتی ہیں کہ یہودی معاشرہ، یا کم از کم پیغمبر کے ہم عصر یہودی، جبرئیل سے دشمنی رکھتے تھے اوراسے عذاب کا فرشتہ کہتے تھے۔یہاں تک کہ اس کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ خدا نے تو انہیں یہ حکم دیا تھا کہ نبوت کو اسرائیل کے بیٹوں کے سلسلہ میں قرار دیں لیکن جبرئیل نے اُسے اسماعیل کے بیٹوں میں قرار دے دیا اور''خان الامین''(روح الامین نے خیانت کی) کا جملہ ــــ جس کی جاہل اور نادان لکھنے والے شیعوں کی طرف نسبت دیتے ہیں ــــ اسی گروہ سے مربوط ہے جنہوں نے اُسے نبوت کا مقام بدل دینے میں خیانت کرنے سے متہم کیا ہے اور کئی اسباب کی بناء پر اس سے دشمنی رکھتے تھے[۲] اور میکائیل سے محبت کا اظہار کرتے تھے اور

---

[۱] تفسیر فخری رازی ج ۴ ص ۷ ۴۴۔۸ ۴۴ ط ۱۳۰۸۔مجمع البیان ج ۳ ص ۷ ۴۳۔۸ ۴۳۔

[۲] تفسیر فخر رازی ج ۱ ص ۷ ۴۳ ط مصر ۱۳۰۸ مجمع البیان ج ۱ ص ۱۶۷۔

جبرئیل سے عداوت رکھتے تھے۔ قرآن اس عقیدہ پر تنقید کرتے ہوئے اس طرح فرماتا ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ (بقرہ)

''کہہ دیجئے جو جبرئیل کا دشمن ہے (وہ خدا کا دشمن ہے، وہ تو مامور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا) اس نے تو خدا کے اذن سے تیرے دل پر قرآن نازل کیا ہے، جو گذشتہ کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ اور مومنین کے لیے ہدایت اور موجب بشارت ہے۔''

پھر فرماتا ہے۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

(بقرہ)

''جو شخص خدا، اس کے فرشتوں، انبیاء و رسل اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہے (یقیناً وہ کافر ہے) اور اللہ کافروں کا دشمن ہے۔''

ان آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کئی وجوہات کی بناء پر ''روح الامین'' سے دشمنی رکھتے تھے اور قرآن جبرئیل کو ہر لغزش اور غلطی سے مبرا سمجھتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ وہ مامور خدا تھا۔

چونکہ یہودیوں کا ایک گروہ جبرئیل کو خیانت کے ساتھ متہم کرتا تھا لہٰذا خدا نے اس کی ''الامین'' کے لفظ سے توصیف کی ہے، اور فرماتا ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ (شعراء)

''روح الامین نے قرآن کو تیرے دل پر نازل کیا ہے تاکہ تو ڈرانے والوں سے ہو۔''

ان مقدمات کی طرف توجہ کرتے ہوئے خاص طور پر اس لیے کہ سوال کرنے والے یہودی تھے اور وہ جبرئیل کے بارے میں ایک خاص عقیدہ رکھتے تھے اور اسے اس بناء پر کہ وہ عذاب پر مامور تھے اور اس نے بخت نصر کے ذریعہ بنی اسرائیل کی حکومت کے زوال کی خبر دی تھا (ان مطالب کی طرف توجہ کرتے ہوئے) کہا جاسکتا ہے کہ ان کی روح سے مراد وہی ''روح الامین'' ہے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ اس طریقہ سے جبرئیل کے بارے میں پیغمبر کا نظریہ معلوم کریں۔ اگر وہ ان کے نظریہ کے ساتھ موافقت رکھتے ہوں تو ان کی تائید سے فائدہ اٹھائیں اور اگر یہ صورت نہ ہو تو پھر ان کی مخالفت کریں۔ اس بناء پر انہوں نے قریش کو سکھایا پڑھایا کہ وہ آنحضرت سے ''روح'' کے بارے میں سوال کریں۔

اس بناء پر، اس آیت میں روح کی تفسیر اس روح کے ساتھ کرنا جو انسانوں اور حیوانوں میں ''مبدء حیات'' ہے بہت ہی بعید ہے اور یہ تفسیر صرف ایک ہی روایت میں وارد ہوئی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ بعید بات یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ سوال کا مورد روح انسانی کا قدیم و حادث ہونا ہے جو اس زمانہ کے یہودیوں اور زمانہ جاہلیت کے عربوں کے لیے ہرگز قابل فہم اور مورد نظر نہیں تھا۔

یہاں تک واضح ہوگیا کہ ''الرّوحُ'' سے مراد اس سوال میں وہی روح الامین اور جبرئیل ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن نے اس سوال کا کیا جواب دیا؟''

دوسرے لفظوں میں یہ تو ثابت ہوگیا کہ روح سے مراد جو ''ویسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربی میں ہے وہی ''روح الامین'' ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کے جواب قل الرّوح من امر ربی سے کیا مراد ہے۔؟

مفسرین کا (قل الروح من امر ربی'' کے جملہ کی تفسیر میں اختلاف ہے اس اختلاف کا ایک حصہ تو الروح۔ کے مقصود سے اختلاف کے ساتھ مربوط ہے جو سوال میں موجود ہے ہم یہاں ان کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنا نظریہ بیان کریں گے۔

''سوال میں واقع روح'' سے مراد قرآن ہے کیونکہ خدا نے کئی موارد میں لفظ ''روحاً'' یا (الرّوح) کو قرآن سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ (شوریٰ۔ ۵۲)

''اور اسی طرح سے ہم نے قرآن کو اپنے امر سے تجھ پر نازل کیا ہے''

پھر فرماتا ہے۔

يُنَزِّلُ الۡمَلٰٓـئِكَةَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖۤ (نحل۔ ۲)

''ہم فرشتوں کو اپنے امر سے وحی کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں نازل کرتے ہیں۔''

اس سے قطع نظر زیر بحث آیت سے پہلے اور بعد میں قرآن کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے مہربانی فرکر سورہ اسراء کی آیت ۸۲ و ۸۶ کی طرف رجوع فرمایئے [1] اور اس بات کی علت کہ خدا قرآن کو روح کہتا ہے یہ ہے کہ اگر روح انسانی بدنِ انسانی کی حیات و زندگی کا سبب ہے تو قرآن بھی انسان کی عقل و خرد کی حیات کا سبب ہے۔

کیونکہ مشرکین قرآن کے ساتھ توصیف کرتے تھے، تو خدا ان کے جواب میں کہتا ہے۔ قل الرّوح من امر ربی۔ قرآن انسان کی بات کی جنس سے نہیں ہے بلکہ اس کا سرچشمہ امر و فرمان خدا ہے اور خدا کے حکم ہی سے نشاندہی کراتا ہے گویا لفظ (ظہر) جواب میں مقدر ہے اور مراد یہ ہے کہ (قل الرّوح ظهر من امر ربی) [2] کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ظاہر ہوا ہے۔

یہ نظریہ چنداں واضح نہیں ہے کیونکہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ سوال کرنے والوں نے اپنے سوال کو لفظ روح کے ساتھ پیش کیا جب کہ مشرکین اور

---

[1] یعنی آیہ: ونُنزل من القرآن ماهو شفاء ورحمة للمؤمنين۔'' (اسراء ۸۲) ''وَلَئِنۡ شِئۡنَا لَنَذۡهَبَنَّ بِالَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ۔ (اسراء ۸۶)

[2] مفاتیح الغیب ج ص ۳۴۸۔

یہودی قرآن کی لفظ ''روح'' سے ہرگز توصیف نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اُسے روح کا نام دیتے تھے۔
اس صورت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے اور جواب کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کا سرچشمہ فرمان خدا ہے۔اس سے قطع نظر لفظ ''ظهر'' کی تقدیر مکمل طور پر بے دلیل ہے۔
۲۔مورد سوال میں روح سے مراد وہی انسانی روح یا مطلق اشیاء کی روح ہے کہ جسے قرآن نے روح کا نام دیا ہے اور سوال کا ہدف ومقصد روح انسانی کی ماہیت وواقعیت سے آگاہی یا مطلق روح سے کسب آگاہی ہے۔اس صورت میں جواب کا ہدف (قل الرّوح من امر ربی) کے جملہ سے یہ ہے کہ روح کے وجود کی جنس وقسم عالمِ امر کے موجودات کی قسم اور جنس سے ہے۔
اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ ذیل میں ذکر شدہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم دو عالم رکھتے ہیں ایک کا نام عالم خلق ہے اور دوسرے کا نام عالم امر ہے اور یہ دونوں ہی خدا کی طرف سے ہیں اور ان کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے۔جیسا کہ فرماتا ہے۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط (اعراف ۵۴)

''آگاہ رہو کہ خلق اور امر کا اختیار اسی کو ہے۔''

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں جہانوں میں کیا فرق ہے؟''
موجودات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک حصہ عالم خلق ہے اور دوسرا حصہ عالم امر ہے اور دوسرے لفظوں میں موجودات خلقی اور موجودات امری۔
علامہ طباطبائی نے اس سلسلہ میں ایک تحلیل وتجزیہ پیش کیا ہے ہم اسے مختصر طور پر یہاں نقل کرتے ہیں۔
''مادی موجودات جو بتدریج وجود وہستی کو قبول کرتے ہیں اور ان کا وجود مادی اور طبیعی علل واسباب کے ایک سلسلہ کا مرہون منت ہوتا ہے اور مکاں وزمان ان پر احاطہ کئے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ ان دونوں سرحدوں کے جنگل سے آزاد نہیں ہو سکتے ایسے موجودات عالم خلق سے مربوط ہیں لیکن وہ موجودات جو صفات وحالات اور شرائط کے لحاظ سے اس قسم کی موجودات کے نقطہ مقابل میں ہوتے ہیں اور ان کا ہستی وجود کو قبول کرنا یکا یک اور ایک دم ہوتا ہے نہ کہ تدریجی اور ان کا وجود مادی وطبیعی علل واسباب کے کسی سلسلہ کا مرہون منت نہیں ہوتا اور وہ زمان ومکان کی حدود وقیود سے بالاتر ہوتے ہیں اس قسم کے موجودات امری موجودات ہوتے ہیں اور وہ عالم امر کے ساتھ مربوط ہوں گے۔
زیادہ واضح الفاظ میں مادی موجودات جن کی حقیقت وواقعیت تدریجی پیدائش کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتی اور وہ مادی حالات وشرائط اور علل کے ایک سلسلہ کے ماتحت وجود وہستی کو قبول کرتے ہیں اور ان کا وجود مکان وزمان کی قید کے ساتھ معین ہوتا ہے وہ سب کے سب خلقی وجود رکھتے ہیں جب کہ مجردات جو وجود وہستی کو قبول کرنے میں ان صفات وخصوصیات کے ٹھیک نقطہ مقابل میں ہوتے ہیں اور ان کی خلقت و پیدائش میں صرف خطاب ''کن'' کافی ہوتا ہے اور ایک خطاب ایجادی (یعنی کن) سے بغیر کسی تدریج کے ایک کامل وجود کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، وہ سب کے سب ''امری'' وجود رکھتے ہیں۔

قرآن چند آیات میں موجودات امری کی واقعیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـئًا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ﴿۸۲﴾ (یٰس)

''امر خدا کی واقعیت وحقیقت یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو اسس کو کہتا ہے۔'' ایک جہت سے عالم خلق سے اور دوسری جہت سے عالم امر سے مربوط سمجھا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد استاد عالی قدر بیان فرماتے ہیں کہ عالم طبیعت کا دولحاظ سے مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور اس کو ایک جہت سے عالم خلق سے اور دوسری جہت سے عالم امر سے مربوط سمجھا جاسکتا ہے۔[1]

اس کے بعد وہ یہ نتیجہ پیش کرتے ہیں کہ سوال جو پوچھا گیا ہے وہ (ان لوگوں کے نظریہ کے برخلاف جو یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد روح انسانی ہے) ایک مطلق چیز ہے جسے قرآن نے مختلف موارد میں روح کا نام دیا ہے اور (قل الرّوح من امر ربی) سے مراد یہ ہے کہ وجود روح کی قسم مطلق طور پر، چاہے وہ روح انسانی ہو یا روح حیوانی ونباتی، یہاں تک کہ (یوم یقوم الروح والملائکۃ صفاً'' (نبا۔۳۸) کی آیت میں جو روح ہے مذکورہ عالم امر کی قسم سے ہے اور ان چند مفسرین کے نظریہ کے برخلاف جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن نے روح کے بارے میں سوال کا جواب دینے سے کنارہ کشی کی ہے قرآن نے اس سوال کا جواب دیا ہے۔ اور یہ بیان کیا ہے کہ روح کی قسم وجنس امری موجودات کی قسم سے ہے جن کی حیثیت وخواص اور آثار کے بارے میں تمہیں بہت کم علم ہے، جیسا کہ آیت کے ذیل کہتا ہے۔

وما اوتیتم من العم الاّقلیلاً

''اور تمہیں بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔''

اس نظریہ پر تنقید

اس نظریہ پر اس تفصیل کے ساتھ دو اعتراض وارد ہوتے ہیں۔

الف: انسان کی روح کی حقیقت کے بارے میں سوال کسی فلسفی کو درپیش ہوتا ہے نہ کہ گروہ یہود کے لیے جو نہ تو اس بارے میں کچھ اطلاعات رکھتے تھے اور نہ ہی کوئی تخصیص۔ اس سے بھی زیادہ بعید بات یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اس سے مراد وہ مطلق موجودات ہیں جن کا قرآن نے لفظ روح اـ کے ساتھ نام لیا ہے، کیونکہ سوال کرنے والے چاہیے یہودی ہوں چاہیے مشرکین! انہیں قرآن میں لفظ[2] روح کے موارد استعمال سے متعلق کوئی اطلاع نہیں تھی تا کہ وہ اس کے بارے میں سوال کرتے۔

---

[1] اس حصہ کی وضاحت کے لیے تفسیر المیزان ج ۱۳ ص۔ ۲۱۰۔۲۱۱ کی طرف رجوع کریں۔

[2] کشف الآیات میں مادہ ''روح'' کی طرف رجوع فرمائیں۔

ب۔لفظ۔امر'' کی تفسیر چاہیے(الا له الخلق والامر) کی آیت میں ہو اور چاہیے زیر بحث آیت میں ان موجودات سے کرنا، جو زمان ومکان کی قید سے عاری اور مادی وطبیعی اسباب سے خارج ہوں آیات قرآنی کے ظواہر سے دور ہے اور اس قسم کی تفسیر کا باعث پہلے سے موجودات کی تقسیم کی ان دو قسموں میں آگاہی وعلم کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہوئی۔

۳۔کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد روح انسانی ہے لیکن (قل الروح من امر ربی) کے جملہ کا ہدف یہ ہے کہ حقیقت روح سے آگائی فعل خدا سے مربوط ہے اور انسان کی حقیقت کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

اس نظریہ کی تائید اس شان نزول سے ہوتی ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ یہودیوں نے مشرکین سے یہ کہا کہ اگر محمدؐ دو سوالات کا جواب دے اور روح کے بارے میں سوال کا جواب نہ دے تو یہ بات اس کی گفتار کی صداقت کی نشانی ہے[1]

یہ نظریہ بھی چنداں محکم واستوار نہیں ہے کیونکہ۔

اوّلاً۔

سیرت ابن ہشام جس کی اصالت اس بارے میں بہت زیادہ ہے، شان نزول کو ایک دوسرے طریقہ سے نقل کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہودیوں نے قریش کے نمائندوں سے یہ کہا تھا کہ اگر محمدؐ نے ہمارے تینوں سوالوں کا جواب دے دیا تو وہ پیغمبر ہے اور اگر جواب نہ دیا تو وہ دروغگو ہے۔[2]

ثانیاً

روح کی معرفت وشناخت خدا کی معرفت وشناخت سے تو بالاتر نہیں ہے۔انسان خدا کو اس کے صفات وآثار کے طریقہ سے پہچانتا ہے، اس طرح سے وہ روح کو بھی اس کے آثار کے ذریعہ، جس کے عمدہ آثار میں سے نقل وتفکر اور بینائی وشنوائی ہیں پہچان سکتا ہے۔اور صفات کی شناخت خود کسی چیز کی شناخت کا ایک دریچہ شمار ہوتا ہے۔

اور اگر ہدف ومقصد روح کی حقیقت وماہیت کی شناخت ہو تو یہ صرف روح ہی نہیں ہے کہ جس کی حقیقت انسان کی شناخت کے افق سے باہر ہے بلکہ بہت سے مادی موجودات ایسے ہیں جو ہمارے ارگرد پھیلے وئے ہہیں لیکن وہ بھی ہمارے شناخت کے افق سے باہر ہیں اور اشیاء کی حقیقت سے آگاہی تو ان کے پیدا کرنے والے میں ہی منحصر ہے۔

ہم بجلی کو دیکھتے ہیں جو فضا کو روشن ومنور کر دیتی ہے لیکن اس کی ماہیت کیا ہے، ہم پر واضح نہیں ہے ہم ایٹم کے آثار سے آشنا ہیں۔لیکن اس کی حقیقت کیا ہے، یہ بات ہرگز ہمیں معلوم نہیں ہے۔

---

[1] مفاتیح الغیب ج۵ ص۴۴۶

[2] سیرۃ ابن ہشام ج۱ ص۳۰۱

اس بناء پر خاصیت وحقیقت سے ناآ گاہی صرف انسان کی روح کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔

استوار و محکم نظریہ

اس بحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو اس سوال کے بارے میں انجام پائی ہے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ روح سے مراد، اس سوال میں، امین وحی جبرئیل ہیں جن پر یہودی لوگ بہت ہی غضب ناک تھے اور اس سے ''قل الرّوح من امر ربّی'' کے جملہ کی تفسیر بہت ہی واضح ہوگئی ہے۔
اور وہ یہ ہے کہ امین وحی پروردگار کے مامورین میں سے ہے اور وہ جس کام کو بھی انجام دیتا ہے اسی کے امر و فرمان سے انجام دیتا ہے اگر کسی قوم کو نابود کرتا ہے تو اور اگر حضرت محمدؐ کو رسالت سے مفتخر کرتا ہے تو، یہ سب کچھ اذن خدا سے تھا۔ وہ اسی کے فرمان سے الہام لیتا ہے لہٰذا اس صورت میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ تم اس سے دشمنی رکھو اور اس سے مخاصمت کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔
اور اسی لیے قرآن ایک دوسری آیت میں اسے (مطاع) و (امین) کہتے ہوئے فرماتا ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍۙ ﴿۱۹﴾ ذِىۡ قُوَّةٍ عِنۡدَ ذِى الۡعَرۡشِ مَكِيۡنٍۙ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍؕ ﴿۲۱﴾

(تکویر)

''قرآن ایک بزرگ رسول (جبرئیل نے) بیان کیا ہے۔ صاحب عرش واقتدار خدا کے نزدیک وہ ایک صاحب قوت وقدرت فرشتہ ہے۔ اس کے حکم کی (دوسرے فرشتوں پر) اطاعت واجب ہے اور وہ وحی کا امین ہے۔''

ابن عباس کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے جبرئیل سے کہا تم جتنی ملاقات ہم سے کرتے ہو اس سے زیادہ کیوں نہیں کرتے تو اس موقع پر پیغمبر کے سوال کے جواب میں ذیل میں ذکر شدہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمۡرِ رَبِّكَ‌ۚ (مریم۔ ۶۴)

''ہم تو تیرے پروردگار کے حکم سے نازل ہوتے ہیں اور اسی کے فرمان کے پیرو ہیں۔ [1]

ان مطالب کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ (قل الرّوح من امر ربی) کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ اے پیغمبر سوال کرنے والوں سے کہہ دے کہ روح (الامین) سوائے اس کے کہ وہ خدا کے مامورین میں سے ایک مامور ہے اور کوئی مقام وحیثیت نہیں رکھتا اور وہ فرمانبرداری میں اس حد پر پہنچا ہوا ہے کہ گویا سراپا (امر) و (فرمان) خدا ہے بالکل اسی طرح جس طرح سے کہ بعض اوقات جب کوئی شخص عدالت و پاکیزگی کے لحاظ سے اس مرتبہ کو پہنچ جائے کہ یوں کہنے لگیں کہ وہ تو عین عدل وعدالت ہے۔

[1] سورہ مائدہ کی آیت ۶۹ بھی اسی مضمون کی ہے۔

اسی بناء پر اے قوم یہود آ ؤ اور جبرئیل کی عداوت اور کینہ دل میں نہ رکھو اور اسے خیانت سے متہم نہ کرو کیونکہ وہ تو اپنے فرائض کو انجام دینے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کرتا۔

۱۱۔ کیا ہر دین کی پیروی نجات کا سبب ہے؟

بعض اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ قرآن کی دوسری سورہ کی آیت ۶۲ کا سہارا لے کر دوسرے دینوں کی حقانیت پر استدلال کرتے ہیں اور اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کہ قرآن کی نگاہ میں ہر انسان اس آیت میں ذکر شدہ جس دین کی بھی پیروی کرے وہ قیامت کے دن نجات پانے والوں میں ہوگا وہ آیت یہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

(بقرہ)

وہ لوگ کہ جو ایمان لائے (مسلمان) اور یہودی وعیسائی اور صابئین جو بھی خدا اور آخرت کے دن (قیامت) پر ایمان لائے گا اور نیک عمل انجام دے گا۔ اس کا اجر ثواب ان کے پروردگار کے پاس ہے۔ اور ان کے لیے کوئی خوف وڈر اور حزن وملال نہیں ہوگا۔ [1]

قرآن ان گواہوں کی نجات کے لیے صرف تین شرائط پیش کرتا ہے یعنی خدا پر ایمان آخرت پر ایمان اور عمل صالح انجام دینا اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جو شخص بھی ان تین شرائط کا حامل ہو وہ چاہیے جس فرقے اور گروہ سے ہو وہ اہل نجات ہوگا۔

کیا واقعاً آیت کا ہدف ومقصد یہی ہے جو یہ لوگ اس آیت سے لیتے ہیں یا آیت کسی اور مقصد کو بیان کر رہی ہے جو ان لوگوں کے حاصل کردہ نتیجہ سے تلف ہے؟

اس مسئلہ کے لیے اصولی تحقیق اور علمی وضاحت اور جواب کی ضرورت ہے۔

آیت کے ہدف اور مقصد سے آ گاہی کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے ان مطالب کو بیان کریں جن کو چند مستقل حصوں میں لیکن ایک ساتھ مربوط کر کے، دیکھا جانا چاہیے۔

---

[1] سورہ مائدہ کی آیت ۶۹ بھی اسی مضمون کی ہے۔

اُمت یہود کے برگزیدہ ہونے کا نظریہ

ساری دنیا کے یہودی اور اسی طرح رسول اللہ کے زمانہ کے عیسائی دونوں ہی اپنے لیے ایک خاص قسم کی برتری کے قائل تھے اور اسی شبہ کا سہارا لے کر اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور افضل خیال کرتے تھے۔

مثلاً ساری دنیا کے کان امت یہود سے یہ جملہ سن چکے ہیں کہ وہ خود کو ایک برگزیدہ امت اور منتخب ملت جانتے ہیں اور قرآن اپنی ایک آیت میں اس نکتہ کو بیان کرتے ہوئے یہ اعلان کرتا ہے کہ موسیٰ کی امت کے علاوہ عیسائی بھی اپنے لیے اسی قسم کی حیثیت کے قائل تھے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ (مائدہ۔۱۸)

''یہود و نصاریٰ نے یہ کہا ہے کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔ آپ ان کے جواب میں کہہ دیجئے۔ اگر تمہارا گمان صحیح ہے۔ تو پھر وہ تمہیں تمہارے اعمال کی وجہ سے عذاب کیوں کرے گا بلکہ تم بھی دوسرے افراد کی طرح بشر اور خدا کی مخلوق ہو۔''

جیسا کہ دیکھائی دے رہا ہے کہ خدا ان کے تصور اور شبہ کی سرکوبی کے لیے فرماتا ہے کہ:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ

''پھر وہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے تمہیں عذاب کیوں کرے گا بلکہ تم بھی دوسرے افراد کی طرح بشر اور خدا کی مخلوق ہو۔''

یہود کی خودخواہی اور برتری طلبی اس مقام تک پہنچی ہوئی تھی کہ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں چند دن کے سوا عذاب نہیں ہوگا، گو یا انہوں نے خداوند عالم سے اپنی اس بات کے لیے عہد و پیمان لیا ہوا تھا اور وہ یہ کہتے تھے۔

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ (بقرہ۔۸۰)

''وہ کہتے تھے کہ ہم چند دن کے سوا جہنم کی آگ میں نہیں رہیں گے۔''

قرآن ان کی تہمت کے بعد ان کی گفتگو کو بے بنیاد قرار دینے کے لیے فرماتا ہے۔

قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰ (بقرہ)

''کہہ دیجئے کہ کیا تم نے اس مطلب کے لیے خدا سے کوئی عہد و پیمان لیا ہوا ہے کہ خدا اپنے اس عہد پر عمل کرے گا اور اس سے تخلف نہیں کرے گا، یا تم خدا پر جہالت کی وجہ سے تہمت لگا رہے ہو؟''

ان مطالب سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ خود کو سب سے ممتاز اور جدا سمجھتے تھے اور ایک طرح سے ایک خاص قسم کی برگزیدگی کے قائل تھے گویا وہ خدا کے عزیز و رشتہ دار ہیں اور خدا ان کے لیے ایک خاص لطف اور دوسری محبت رکھتا ہے یہ ایک مطلب ہے۔

یہودی اور عیسائی جیسے الفاظ باعث نجات نہیں ہیں

آیات کے ایک سلسلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم برگزیدگی کے عقیدہ کے علاوہ جنّت و دوزخ اور ہدایت وضلالت کے موضوع کے بارے میں بھی ایک خاص نظریہ رکھتی تھی اور بہشت و ہدایت کو ان ہی لوگوں کے ساتھ مخصوص سمجھتی تھی جو بنی اسرائیل کی قوم یا موسیٰ وعیسٰی کے دین کے ساتھ منسوب ہوں۔

گویا قوم بنی اسرائیل کے ساتھ منسوب ہونا، یا ان دونوں دینوں سے منسوب ہونا ہی انسان کو جہنم کی آگ سے نجات دلا سکتا ہے، اور بہشتیوں میں شامل کرا سکتا ہے اور اس کے سامنے ہدایت کے دروازے کھول سکتا ہے۔ چاہے اس نے کچھ بھی عمل نہ کیا ہو، جیسا کہ وہ کہتے تھے۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ (بقرہ۔۱۱۱)

''وہ یہ کہا کرتے تھے کہ جنت میں یہودی یا عیسائی کے علاوہ اور کوئی دوسرا شخص داخل نہیں ہوگا۔''

قرآن مجید اس قسم کے باطل اور بے بنیاد نظریہ کی سرکوبی کے لیے بعد والی آیت میں وضاحت کے ساتھ فرماتا ہے۔

یہودی اور عیسائی دین کی طرف منسوب ہو جانے سے جنت نہیں ملتی بلکہ وہ چیز جو انسان کو جنتی بنا سکتی ہے وہی قلبی ایمان، باطنی تسلیم اور نیک عمل ہے اور صرف وہی افراد جنت کو اپنی جاگیر سمجھ سکتے ہیں جن میں حقیقت ایمان موجود ہو اور زندگی کی راہ میں نیک کام انجام دیتے ہوں جو ایمان اور اعتقاد قلبی کے مظہر ہوتے ہیں جیسا کہ فرماتا ہے۔

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ (بقرہ)

''یہ مطلب (کہ جنت فقط یہودی اور عیسائی کے لیے مخصوص ہے) ایک تمنا اور آرزو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور اگر ان کے پاس اپنی اس بات کے لیے کوئی دلیل ہے تو پیش کریں بلکہ بہشت تو صرف اسی شخص کے لیے ہے

جو خدا کے سامنے اپنے پورے وجود کے ساتھ سر تسلیم خم کئے ہوئے ہو اور ساتھ ہی وہ نیکوکار بھی ہو، اس کے لیے ہی بارگاہ خداوندی میں اجر وثواب ہے اور انہیں کوئی خوف اور حزن وملال نہیں ہے۔

''من اسلم'' کا جملہ ایمان واقعی کے لازم ہونے کی ترجمانی کرتا ہے اور ''وھو محسن'' کا جملہ دین وشریعت پر عمل کرنے کے لازم ہونے کا ترجمان ہے اور دونوں جملے یہ بتلاتے ہیں کہ قیامت کے دن یہودی یا عیسائی نام ہونا نجات کا سبب نہیں بنے گا۔ بلکہ سعادت وخوش بختی کا اصل سبب تو وہی ایمان اور عمل صالح ہی ہے۔ ایک اور آیت میں پھر ان کے اس بے بنیاد خیال اور تصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وہ صرف یہودی یا نصرانی نام رکھنے کو عمل اور نجات کا سبب سمجھتے ہیں چاہیے وہ شرک اور دوگانہ پرستی میں آلودہ ہوں جیسا کہ فرماتا ہے:

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ (بقرہ۔۱۳۵)

''وہ یہ کہتے ہیں کہ تم یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے۔''

خدا ان کی کمزور اور بودی منطق کو بے بنیاد ظاہر کرنے کے لیے فوراً راہ ہدایت اور نجات کے سبب کی نشاندہی کرتا ہے اور فرماتا ہے۔

یہودیت یا نصرانیت کے نام رکھ لینے میں ہدایت نہیں ہے بلکہ ہدایت اس بات میں ہے کہ دین حنیف ابراہیم کی پیروی کرو جو مشرکین میں سے نہیں تھا۔''

دوسری آیات میں ''یہودیت'' یا ''نصرانیت'' کے بے معنی ناموں کی طرف مائل ہونے کو بے قدر وقیمت بتانے کے لیے ابراہیم کو ان دونوں ناموں کی طرف منسوب ہونے سے مبرا جانتا ہے اور اس گروہ کو برتری اور تفوق کا قائل ہوا ہے جو خود کو ناموں کی قید وبند سے آزاد رکھیں اور مکتب ابراہیم کی جو وہی خالص ایمان، توحید اور عمل صالح ہے، پیروی کریں، اور فرماتا ہے۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٦٧﴾ (ال عمران)

''ابراہیم ہرگز یہودی ونصرانی نہیں تھے بلکہ وہ تو دین حنیف کی، جو دین توحید ہے پیروی کرتے تھے۔ اور وہ ہرگز مشرکین میں سے نہیں تھے۔''

ان آیات او ان ہی جیسی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ملت یہود ونصاریٰ ''خصوصاً پہلی ملت'' ہمیشہ خود کو دو باتوں سے خوش رکھتے تھے اور فرائض کے انجام دینے سے پہلوتہی کرتے تھے۔'' اور وہ دو مطلب یہ ہیں۔

۱۔ وہ اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ امت سمجھتے تھے۔

۲۔ وہ مذہبی ذمہ داریوں اور آسمانی فرائض کے مقابلہ میں ''جن کی بنیاد خالص ایمان اور عمل صالح ہے'' صرف یہودیت اور نصرانیت کے نام کو ہی

کافی سمجھتے تھے۔

اور قرآن نے جب بھی ان کے دونوں خیالات اور تصورات کو پیش کیا ہے تو اپنی مخصوص منطق کے ساتھ ــــــ (کہ تمام افراد بشر برابر ہیں اور انسانوں کی نجات، ایمان، تسلیم واقعی، فرائض الٰہی پر عمل کرنے اور نیک کام انجام دینے میں ہے اور بس) ــــــ سختی سے ان کی سرکوبی کی ہے۔

اب ہم مورد سوال آیت کی تحقیق کرتے ہیں

اس وسیع بحث سے زیر بحث آیت کا مفہوم ومفاد ــــــ جو اسلام کے عالمی ہونے کے منکر ایک گروہ کی دستاویز قرار پایا ہے ــــــ واضح ہوجاتا ہے۔

قرآن مجید اس آیت میں ان دوسری آیات پر تکیہ کرتے ہوئے جن میں ملت یہود ونصاریٰ کے کمزور افکار وخیالات کو منعکس کیا گیا ہے ان کے خیالات پر تنقید کرتے ہوئے ایک عالمی اور عمومی پکار کے ساتھ فرماتا ہے کہ تمام انسان خدا کی بارگاہ میں یکساں ہیں اور کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ پر برتری نہیں رکھتا اور یہ الفاظ اور نام جو ہر ایک گروہ نے اپنائے ہوئے ہیں اور انہوں نے یہ خیال کرلیا ہے کہ ان ناموں کے ساتھ منسوب ہونا کہ میں مسلمان ہوں یا یہودی ہوں یا نصرانی ہوں و ــــــ باعث نجات اور موجب رستگاری نہیں ہے بلکہ یہ تو کھوکھلے اور بے ثمر الفاظ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں کہ انسان سچ مچ صمیم قلب سے ایمان لے آئے اور اپنے ایمان کو عمل صالح کے ساتھ، جو اس کے دل میں ایمان کے وجود کی نشانی ہے، ملادے اور ان دونوں باتوں کے علاوہ ان مذاہب میں سے کسی بھی فرد کے لیے ہرگز امید کا کوئی دریچہ نہیں ہے۔

اس بناء پر زیر بحث آیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام قدیمی شریعتیں قانونی حیثیت رکھتی ہیں اور انسان ان طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ کا انتخاب کرنے میں مختار آزاد ہے۔ بلکہ آیات کا ہدف اور مقصد ایک گروہ کے برتری اور افضلیت کے خیال وتصور کو باطل کرنے اور یہودیت وغیرہ ناموں کے الفاظ کو بے بنیاد شمار کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اور یہ حقیقت نہ صرف ان آیات میں واضح طور پر منعکس ہوتی ہے بلکہ قرآن کی دوسری آیات میں بھی منعکس ہوئی ہے اور سورہ (والعصر) کی تمام آیات اسی حقیقت کو بیان کر رہی ہیں اس سورہ کی آیات یہ ہیں۔

وَالْعَصْرِ ﴿١﴾ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ﴿٢﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿٣﴾ (العصر)

''عصر کی قسم، انسان خسارے میں ہے۔ سوائے ان کے کہ جو ایمان اور عمل صالح رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کو حق اور صبر واستقامت کی نصیحت کرتے ہوں''

قرآن مجید اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے کہ ایمان واقعی اور فرائض شرعیہ کا انجام دینا ہی موجب نجات ہے، زیر بحث آیت میں لفظ ایمان کو دو مرتبہ بیان کررہا ہے۔ اور فرماتا ہے۔ ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا والنصارٰی والصابئین (من اٰمن باللہ) اس صورت میں آیت کی ابتداء میں ''اٰمنوا'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو بظاہر اسلام قبول کرچکے ہیں اور ان پر مومن کا لفظ بولا جاتا ہے اور اس کے آثار ان کے

اعمال وافعال میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ان مقدمات کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ آیت کا ہدف اور مقصد ''یہودی گری'' اور ''مسیحی گری'' جیسے نیشنلزم کے نوعی افکار وخیالات کی سرکوبی کرنا ہے اور یہ کہ ان دوادیان کے پیروکاروں کے لیے کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ تمام افراد بشر خدا کی بارگاہ میں یکساں ہیں۔ اس طرح تنقید کا مقصد کسی نام سے منسوب ہونے پر اکتفا کرنا اور طہارت نفس، ایمان قلبی اور اعمال صالح کو بھول جانا ہے۔

اس صورت میں آیت سے ''صلح کلی'' کے نظریہ کا استفادہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ تمام مذاہب ومسالک کے پیروکار اہل نجات ہیں کیونکہ زیر بحث آیت میں اس قسم کے تصورات اور فکر کا بیان نہیں ہے بلکہ یہ آیت تو یہود ونصاری کے گروہوں کی خودخواہی اور انحصار طلبی کے باطل خیالات کی نفی کررہی ہے نہ کہ اس مطلب کا اثبات کہ جس دین ومذہب کی پیروی کرلی جائے نجات ہوجائے گی اور تمام پیغمبروں کا پروگرام تمام زمانوں میں سعادت ونجات کا موجب ہے بلکہ اس مطلب کے لیے دوسری آیات کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

اصولی طور پر تفسیر قرآن کے سلسلہ میں ہرگز ایک آیت کو نہیں لینا چاہیے اور اس کو حق وباطل کا معیار قرار دینا چاہیے اور دوسری آیات سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن کی آیات ایک دوسرے کی مفسر اور ایک دوسرے کی وضاحت اور تشریح کرنے والی ہوتی ہیں۔ آیاتِ قرآنی کے بارے میں امیرالمومنین نے ایک جملہ فرمایا ہے جس کی تفسیر قرآن سے لگاؤ رکھنے والے تمام افراد کو پیروی کرنا چاہیے۔ آپؑ فرماتے ہیں۔

"وینطق بعضه ببعض، ویشهد بعضه علی بعض۔"[1]

''ہر (آیت) دوسری (آیت) کے ذریعہ بولتی ہے اور اپنے مقصود اور مفہوم ومطلب کو آشکار کرتی ہے اور اس کا بعض دوسرے بعض کی گواہی دیتا ہے۔

جب ہم پیغمبر کی رسالت کے بارے میں دوسری آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن اہل کتاب کو اس وقت ہدایت یافتہ سمجھتا ہے جب وہ اس چیز پر ایمان لے آئیں جس پر مسلمان ایمان لائے ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ (بقرہ۔۱۳۷)

''اگر اہل کتاب اسی طرح سے ایمان لے آئیں جس طرح سے تم ایمان لائے ہو تو اس صورت میں وہ بھی اس پر ایمان لے آئیں۔

مسلمان یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام پیغمبروں کے سلسلہ کے آخری نبی اور ان کے خاتم ہیں۔ جیسا کہ خداوندتعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ (احزاب۔۴۰)

''لیکن وہ تو خدا کا پیغام لانے والے اور پیغمبروں کے خاتم ہیں۔''

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ شمارہ ۱۹۲ طبع عبدہ۔

خدا کی طرف سے یہ پیغام لانے والا ایک وسیع نظام اور ایک کامل شریعت کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ اور وہ اپنے دین کو کامل ترین شریعت اور اپنی کتاب کو تمام کتابوں کی خاتم اور دوسری کتابوں کی نگرانی ونگہبانی جانتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ

(مائدہ۔۴۸)

''ہم نے کتاب کو حق کے ساتھ تم پر نازل کیا ہے جو گذشتہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور ان کی مراقب ونگہبان ہے۔''

''**مهیمن**'' اصل میں محافظ ونگہبانی اور شاہد ومراقب کو کہا جاتا ہے۔قرآن کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور ان کی مراقب کو کہا جاتا ہے۔ اور مقصود یہ ہے کہ جب گذشتہ کتابوں میں کوئی تحریف اور ردوبدل ہو تو یہ کتاب ان کی نگہبانی کرتی ہے اور اس کتاب کی طرف رجوع کرنے سے ان میں تحریف شدہ باتوں کا پتہ چل جائے گا۔

قرآن کو لانے والا چونکہ پیغمبروں کے سلسلہ کا آخری حلقہ ہے اور لوگوں کے لیے کامل ترین اور جامع ترین شریعت لے کر آیا ہے، لہٰذا تمام دنیا جہان کے لوگوں کو ''قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعَا'' (اعراف۔۱۵۸)[1] کی پکار کے ساتھ مخاطب کیا ہے اور اپنے عالمی وجہانی ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اور اپنے آنے کے بعد دوسری کتابوں کی پیروی کے لیے کسی قسم کی اجازت نہیں دیتا اور اپنی بعثت کے ساتویں اور آٹھویں سال تمام ممالک کے سربراہوں کو، جو زرتشت یا مسیح کی پیروی کرتے تھے۔ خطوط لکھے اور ان کے لیے اپنے دین کی پیروی کو لازم قرار دیا۔ اور آپ کے تبلیغی خطوط کے تین تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔[2]

نتیجہءکلام

خلاصہ یہ ہے کہ آیت کا ہدف ان موہوم امتیازات کی نفی ہے جن کا یہودی اور عیسائی معاشرہ اپنے لیے قائل تھا۔ لیکن یہ بات کہ اس زمانہ میں کس دین اور کس کتاب کی پیروی کرنا چاہیے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ دوسری آیات اور احادیث کی طرف رجوع کیا جائے اور وہ سب کی سب متفقہ طور پر حضرت ختمی مرتبتؐ کی شریعت کی پیروی کو ضروری سمجھتی ہیں اور دسرے دینوں کی پیروی کو جن میں سے ہر ایک کسی خاص زمانہ کے لیے تھا، تجویز نہیں کرتیں۔

---

[1] آپ کی رسالت کے عالمی ہونے پر دلالت کرنے والی آیات اتنی زیادہ ہیں کہ یہاں نقل نہیں ہوسکتیں۔''

[2] ان خطوط کے لیے کتاب فروغ ابدیت ج ۲ ص ۲۰۴۔ ۲۳۶ کی طرف رجوع کریں۔

۱۲۔قرآن میں تأویل کیا ہے؟

لفظ ''تأویل'' ان الفاظ میں سے ایک ہے جو قرآن اور احادیث اسلامی میں نمایاں طور پر آیا ہے۔ یہ لفظ اس سے قطع نظر کہ ان دو اسلامی سرچشموں میں آیا ہے، لوگوں کے محاورات میں بھی اکثر استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں: فلاں آدمی نے فلاں کی بات کی تاویل کی۔

لفظ ''تأویل'' سارے قرآن میں سات سورتوں میں سترہ مرتبہ وارد ہوا ہے۔ اور لفظ تاویل کے صحیح اور جامع معنی معلوم کرنے کے لیے آیات کا غور کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے۔ وہ آیات یہ ہیں۔

آل عمران آیت ۷ (دو مرتبہ) نساء آیت ۵۹ اعراف آیت ۵۳ (دو بار) یونس آیت ۳۹، یوسف آیات ۶، ۲۱، ۳۶، ۳۷، ۴۴، ۴۵، ۱۰۰، ۱۰۱، اسراء آیت ۳۵ و کہف آیات ۷۸ و ۸۲۔

''تأویل'' کا معنی سمجھنے کے لیے، قرآن میں کلی طور پر اور سورہ آل عمران کی ساتویں آیت کو خاص طور پر، سمجھنے کے لیے، جو قرآن کی آیات کو دو قسموں (محکم) و (متشابہ) میں تقسیم کرتی ہے اور جو خاص طور پر متشابہ آیات کے لیے ایک تاویل کی قائل ہے[1] ہمیں ان تمام آیات کو، جن میں لفظ تاویل وارد ہوا ہے، پیش کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد مختلف نظریات پر تحقیق و تنقید کریں گے پہلے ہم چند پیش کرتے ہیں۔

۱۔ محمد بن جریر طبری (متوفی۔ ۳۱۰) کی تفسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں تأویل و تفسیر ایک ہی معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے جس وقت وہ چاہتا ہے کہ ''آیت کی تفسیر'' کہے تو وہ کہتا ہے ''آیت کی تأویل'' اور سیّد مرتضیٰ کی اپنی امالی میں اور سیّد رضی کی اپنی تفسیر میں یہی روش ہے۔

''کشف الظنون'' میں لکھتا ہے کہ: ''ابوعبید'' اور ایک گروہ تفسیر تاویل کو ایک ہی معنی میں لیتے تھے اور ہر ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرتے تھے جب کہ ایک گروہ نے اس نظریہ کو رد کیا ہے۔ اور مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔

راغب کہتا ہے لفظ ''تفسیر'' الفاظ و مفردات میں استعمال ہوتا ہے۔ جب کہ لفظ ''تأویل'' زیادہ تر معانی اور جملوں میں استعمال ہوتا ہے۔

دوسرا یہ کہتا ہے کہ کسی آیت کے الفاظ کی توضیح و تشریح جس میں ایک سے زیادہ احتمال نہ ہوں، آیت کی تفسیر ہے جب کہ لفظ یا کسی جملہ کو جس میں کئی احتمال پائے جاتے ہوں، قرآن اور دوسرے دلائل کی مدد سے ایک معنی کی طرف لوٹانا تأویل ہے۔[1]

ان تعریفوں اور دوسری تعریفوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو تأویل و تفسیر کے بارے میں وارد ہوئی ہیں واضح ہو جاتا ہے کہ مفسرین کے ایک گروہ کے نزدیک آیت کی تفسیر اور ہے اور آیت کی تأویل اور ہے۔ مفردات اور ہیت ترکیبی اور آیت کے ظاہر سے مربوط دوسری خصوصیات کے لحاظ سے آیت کی توضیح و تشریح تو آیت کی تفسیر ہے جب کہ آیت کو آیات و احادیث اسلامی یا دوسرے عقلی و نقلی دلائل کے ذریعہ اس کے اصلی

---

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۲۴۲ بحث ''علم التاویل'' اور ص ۲۹۷ بحث ''علم التفسیر'' ان دونوں بحثوں میں تاویل و تفسیر کے فرق کے بارے میں بہت ہی قریب اور نزدیک اقوال و نظریات نقل ہوئے ہیں، لہٰذا اختصار کیلئے ان کو یہاں پر نقل کیا جاتا۔

مفہوم ومقصود کی طرف پلٹانا، تأویل ہے۔

بہرحال تفسیر وتأویل کے درمیان اس قسم کی تفصیل، ٹھیک ہو یا نہ ہو مفسرین اسلامی نے صدیوں تک اس بنیاد پر بحث کی ہے اور آیت کی تفسیر کو اس کی تاویل سے مختلف جانا ہے۔ اور تفسیر کو مفردات اور جملوں کے معانی سے پردہ اٹھا کر آشکار کرنے کے مفہوم میں سمجھا ہے جب کہ آیت کو اس کے واقعی معنی اور اصلی مفہوم کی طرف پلٹانے کو تاویل کہا ہے۔

یہ نظریہ ساتویں صدی ہجری تک ایک استوار اور محکم نظریہ رہا ہے۔ اور کوئی بھی اس کا مخالف نہیں تھا۔ لیکن آٹھویں صدی کی ابتداء میں ابن تیمیہ حرانی دمشقی نے ایک نیا نظریہ پیش کیا اور آیت کی تأویل کو مفاہیم ومعانی کے قبیل سے نہ سمجھا اور اسے کچھ تکوینی اور خارجی واقعیتیں خیال کیا[1] اور اس سلسلہ میں بہت کوششیں کیں جنہیں ہم آئندہ پیش کریں گے اور معروف مصری شیخ محمد عبدہ نے بھی اس کی تائید کی ہے[2]

موجودہ زمانہ میں استاد بزرگ حضرت علامہ طباطبائی تاویل کو حقیقت کے بارے میں ایک مخصوص نظریہ رکھتے ہیں، جسے انہوں نے سورہ آل عمران کی ساتویں آیت کی تفسیر میں پیش کیا ہے۔

۴۔ اس سے پہلے کہ ہم ان آیات کو جن میں لفظ ''تأویل'' وارد ہوا ہے۔ نقل کرکے تجزیہ وتحلیل کریں، اس کے لغوی معنی کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی اصل اور جڑ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لغت عرب کی (ریشہ یابی) ''جڑ بنیاد معلوم کرنے'' کا استاد فن ''ابن فارس'' کی قابل قدر کتاب ''المقائیس'' کا مؤلف ہے جو مصر میں چھ جلدوں میں چھپی ہے۔ اس شخص نے اس تالیف کے ذریعہ لغت اور تفسیر کی انتہائی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ اور اس کامل احاطہ کی وجہ سے جو اُسے زبان پر حاصل تھا۔ ہر لفظ کے اصل معانی کی جڑ بنیاد کو معلوم کرلیا ہے اور کتنے ہی دس دس معانی کی جڑ بنیاد کو ایک یا دو معانی کی طرف پلٹایا ہے۔ وہ اس بارے میں کہتا ہے۔ تأویل، فعل ماضی ''آل'' کا مصدر ہے جو ''رجع'' کے معنی میں ہے اور عرب کہتے ہیں۔

''اوّل الحکم الیٰ اھلہ۔

یعنی حکم کو اس کے اہل کی طرف پلٹادے مشہور شاعر اعشیٰ کہتا ہے۔

واوّل الحکم الیٰ اھلہ
لیس قضائی بالھوی الجائر

قضاوت اور فیصلہ اس کے اہل کے سپرد کردے، میرا فیصلہ ہوا وہوس کی بناء پر نہیں ہے۔

جس وقت عربی زبان میں ''تأویل الکلام'' کہا جائے تو اس سے گفتگو کی عاقبت اور انجام مراد ہوتا ہے کہ جس کی طرف کلام لوٹتا ہے۔[3]

---

[1] مجموعۃ الرسائل الکبریٰ ج ۲ ص ۱۵۔۲۰۔

[2] تفسیر المنارج ۳ ص ۱۷۳۔۱۷۳۔

[3] المقابیس ج ا ص ۱۵۹۔

اس گفتگو اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو راغب نے مفردات میں بیان کی ہے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ لفظ تاویل دو میں سے کسی ایک صورت میں استعمال ہوتا ہے، یا تو وہ مصدر کے معنی میں ہوتا ہے یعنی کسی چیز یا جملہ کو اس کے واقعی معنی کی طرف لوٹانا، یا اسم مفعول کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی کسی چیز کا مآل اور سرانجام۔

اب ہم تأویل کے واقعی معنی کو خود قرآن سے معلوم کرتے ہیں تاکہ ہم ہر قسم کے پہلے سے کئے ہوئے فیصلہ سے باز رہیں پہلے ہم ان تمام آیات کو جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں زیر غور لاتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے آخری اور اصلی فیصلہ کو پیش کریں گے۔ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ بحث کے ختم ہونے سے پہلے ہر قسم کے اظہار نظر سے اجتناب فرمائیں۔

ان تمام آیات کے مطالعہ سے جن میں لفظ تأویل وارد ہوا ہے کہا جا سکتا ہے کہ یہ لفظ ذیل کے موارد میں استعمال ہوا ہے۔

خوابوں کی واقعیت

سورہ یوسف میں لفظ ''تأویل'' اس واقعیت کے بارے میں استعمال ہوا ہے جس کی خواب حکایت کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان جو کچھ خواب میں دیکھتا ہے وہ ان تلخ و شریں حوادث اور واقعیتوں کے ایک سلسلہ کی بدلی ہوئیں یا غیر تبدیل شدہ صورتیں ہوتی ہیں۔ جو آئندہ واقع ہوں گی اور وہی خواب کی تأویل شمار ہوتی ہیں۔ اور خواب ایک طرح سے انہیں کی حکایت کرتا ہے۔

مثلاً کوئی آدمی خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ گھوڑے پر سوار ہے اور اس کو اچھی طرح سے دوڑا رہا ہے۔ تو تعبیر بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ گھوڑے پر سوار ہونا اقتدار ہونا اقتدار تک پہنچنے کی نشانی ہے، تو یہاں پر ایک واقعیت ہے جس کا نام اقتدار کا حاصل ہونا ہے جو اس خواب کی واقعیت اور تأویل شمار ہوتا ہے اور وہ خواب ایک طرح سے اس کی ترجمانی کرتا ہے اب اس خواب کی اس واقعیت کے ساتھ نسبت ہے اور اس کا آپس میں کس طرح کا رابطہ ہے۔ سردست ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف وہ بات جو ہم کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہے کہ خواب کی صورت خارجی واقعیتوں کے ایک سلسلہ کی تبدیل شدہ یا غیر تبدیل شدہ ذہنی صورت ہے جو آئندہ صورت پذیر ہوگئی۔

سورہ یوسف میں لفظ تأویل اسی قسم کی حقیقت پر استعمال ہوا ہے۔ ہم آیات کو اختصار کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

یوسفؑ اور سورج اور چاند ستاروں کا سجدہ

یوسف خواب میں دیکھتے ہیں کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند انہیں سجدہ کررہے ہیں۔ وہ اپنا خواب اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں۔ باپ انہیں بھائیوں سے خواب بیان کرنے سے منع کرتے ہیں، اور انہیں بتلاتے ہیں۔

وَ كَذٰلِكَ يَجۡتَبِيۡكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنۡ تَاۡوِيۡلِ الۡاَحَادِيۡثِ (یوسف۔ ۲)

''اسی طرح سے تیرا خدا تجھے منتخب کرے گا اور تجھے خوابوں کے ایک سلسلہ کے سرانجام سے آگاہ کرے گا۔''

اور اکیسویں آیت میں خدا اپنا احسان جتاتے ہوئے کہتا ہے ہم نے اس طرح سے یوسف کو اس سرزمین میں جگہ دی اور ہم اُسے ''تأویل الاحادیث'' سے آگاہ کریں گے جیسا کہ فرماتا ہے۔

''ولنعلّمه من تأويل الاحاديث۔''

ان دونوں آیات میں یہ وعدہ دیا گیا ہے کہ یوسف ''تاویل الاحادیث'' سے آگاہ ہوں گے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ ''تأویل الاحادیث'' سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد ان خوابوں کی واقعیت وحقیقت ہے جوان کے دو قیدی ساتھیوں اور مصر کے بادشاہ نے دیکھے تھے اور ان کی یوسف نے مکمل واقع بینی کے ساتھ تاویل کی تھی اور انہیں ان واقعیتوں سے جن کی ان کے خواب حکایت کرتے تھے آگاہ کیا تھا اور اس بات کی علّت کہ خواب کو ''احادیث'' کہتے ہیں یہ ہے کہ احادیث جمع ہے حدیث کی، جو کسی واقعہ کو نقل کرنے کے معنی میں ہے۔اور چونکہ انسان خواب کو ہر کسی سے بیان کرتا ہے اس وجہ سے خواب کو بھی حدیث کہا جاتا ہے۔

دو قیدی ساتھیوں کے خواب کی تعبیر

یوسفؑ دوسرے جوانوں کے ساتھ جن سے کوئی معمولی سی جان پہچان بھی نہیں تھی قید خانے میں داخل ہوتے ہیں۔ان دونوں قیدیوں میں سے ایک یہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ شراب کے لیے انگور نچوڑ رہا ہے۔اور دوسرا یہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہے جنہیں پرندے کھا رہے ہیں۔اس کے بعد وہ ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ انہیں ان کے خواب کی تعبیر بتلا دیں۔

یوسف انہیں توحید کی کچھ تبلیغ کرنے کے بعد پہلے سے کہتے ہیں کہ تو جلدی ہی قید سے چھوٹ جائے گا اور اپنے بادشاہ کی شراب کا ساقی بنے گا۔ اس کے بعد دوسرے کی طرف رخ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تجھے سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے تیرے سر کا گوشت کھائیں گے۔[1]

ان آیات میں اس قسم کی دو خارجی واقعیتوں (ساقی ہونا اور سولی پر لٹکایا جانا) کو تأویل کہا گیا ہے اور ان میں سے کوئی بھی مفاہیم ذہنی اور مقولہ معانی میں سے نہیں ہے بلکہ یہ عینی اور تکوینی حقائق کا ایک سلسلہ ہے جو خواب کی صورت میں عینی ہوسکتی ہے جیسا کہ خواب کو ان عینی حقائق کی ضعیف اور تغیر یافتہ صورت سمجھا جا سکتا ہے۔

بادشاہ کے خواب کی تعبیر

مصر کا بادشاہ خواب میں دیکھتا ہے کہ سات دبلی پتلی گائیں سات موٹی تازی گائیوں کو کھا رہی ہیں اور سات سرسبز خوشے سات خشک خوشوں کے ساتھ ہیں۔جب یوسفؑ سے یہ درخواست کی گئی کہ آپ بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتائیں۔تو آپؑ نے فرمایا۔

''تم سات سال تک کوشش کے ساتھ زراعت کرو گے اور جو کچھ تم کاٹو اس میں سے تھوڑے سے کے علاوہ جسے تم کھاؤ گے باقی کو ان کے خوشوں

[1] سورہ یوسف آیت ۳۶۔۴۲

میں رکھ دو (اور ذخیرہ کر دو) اس کے بعد سات سال سختی کے آئیں گے تو جو کچھ تم نے ذخیرہ کر رکھا ہے۔ اس میں سے تھوڑے سے کے سوا جسے تم بیج کے لیے ذخیرہ کرو گے، کھالو گے۔[1]

قرآن نے اس قسم کی واقعیت عینی کو خواب کی تاویل کہا ہے اور لفظ تاویل کو تکوینی واقعیتوں کے لیے استعمال کیا ہے۔

خود یوسفؑ کے خواب کی تعبیر

یوسف کی اپنے ماں باپ سے جدائی ختم ہو جاتی ہے اور آخر کار ماں باپ اور بھائی مصر میں آتے ہیں اور وہ سب کے سب یوسف کو سجدہ کرتے ہیں۔ اس موقع پر یوسف ماں باپ اور بھائیوں کے سجدہ کو اس خواب کی تعبیر سمجھتے ہیں جو انہوں نے بچپن میں دیکھا تھا اور باپ سے بیان کیا تھا اور اس کا خلاصہ یہ تھا کہ انہوں نے خواب میں یہ دیکھا تھا کہ سورج، چاند اور گیارہ ستارے انہیں سجدہ کر رہے ہیں اس خواب کی واقعیت وہی ماں، باپ اور گیارہ بھائیوں کا سجدہ کرنا تھا جو کئی سال کے گذرنے کے بعد پورا ہوا[2] اور قرآن اس قسم کی خارجی واقعیتوں کو ''تاویل'' کا نام دیتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے: یاابت هذا یاویل رؤیای (آیت ۱۰۰) اور پھر فرماتا ہے: ''و علّمتنی من تأویل الاحادیث'' (آیت۔۱۰۱)۔

یہاں تک ان آیات کا ایک حصہ جن میں لفظ تاویل وارد ہوا ہے زیر غور آیا ہے۔ جس سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ ان موارد میں لفظ تاویل خوابوں کی واقعیت کے بارے میں استعمال ہوا ہے جو سب کے سب عینی جنبہ رکھتے ہیں اور مفاہیم ذہنی کی قسم سے نہیں ہیں۔ اب ہم ان دوسری آیات پر جن میں لفظ ''تاویل وارد ہوا ہے، غور کریں گے۔

اہم اور پراسرار کاموں کے اسرار و اسباب

سورہ کہف میں موسیٰؑ کی خدا کے ایک خاص بندے کے ساتھ سرگذشت ۶۰ سے لے کر ۸۲ تک کی آیات میں وارد ہوئی ہے۔ موسیٰؑ کی سفر میں اس شخص سے آشنائی ہوتی ہے اور آپ اس کے خداداد علوم و معارف سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس سے درخواست کرتے ہیں کہ اس کے مصاحب ہو جائیں۔

وہ مرد خدا پہلے تو موسیٰؑ کی درخواست قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ موسیٰؑ میں اس کے کاموں پر صبر کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ آخر موسیٰ اس سے وعدہ کرتے ہیں کہ وہ صبر و استقامت اختیار کریں گے۔

موسیٰؑ کا ہم سفر ایسے عجیب و غریب کام انجام دیتا ہے جو عام معیار اور اندازوں کے مطابق نہیں تھے۔ مثلاً جب وہ دونوں ایک کشتی میں بیٹھتے ہیں تو

---

[1] سورہ یوسف ۴۳۔۴۸۔

[2] سورہ یوسف۔۱۰۰۔۱۰۱۔

وہ کشتی میں سوراخ کر دیتا ہے ہے لہٰذا موسیٰ فوراً اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ جواب دیتا ہے کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم میں میری مصاجت کی طاقت نہیں ہے۔ یا جب وہ ایک سرزمین میں اترتے ہیں تو وہ ایک جوان کو قتل کر دیتا ہے اور موسیٰ پھر دوبارہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کا ہم سفر بھی اسی جملہ کو دہراتا ہے پھر وہ دونوں اپنی مصاحبت کو جاری رکھتے ہیں اور انجام کار ایک گاؤں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ وہ وہاں ایک ایسی دیوار کو دیکھتے ہیں جو گرنے کے قریب ہے۔ تو وہ فوراً اس کی تعمیر شروع کر دیتا ہے۔ جب موسیٰ نے تیسری بار اعتراض کیا تو وہ موسیٰ سے اپنی قطعی جدائی کا اعلان کر دیتا ہے۔ اور اپنے کاموں کے فلسفہ کی تشریح کرنے کے بعد اُن سے جدا ہو جاتا ہے۔

وہ کشتی کو خراب کرنے کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ کشتی ایک مسکین گروہ کی ملکیت تھی جس سے وہ اپنی معاش حاصل کرتے تھے اور ہمارے راستے میں ایک ستم گر بادشاہ تھا جو کشتیوں پر قبضہ کر کے ہتھیا رہا تھا۔ میں نے اسے اس لیے عیب دار بنا دیا تا کہ وہ اس میں لالچ نہ کرے۔

جوان کو میں نے اس لیے قتل کیا ہے کہ اس کے ماں باپ مومن تھے۔ اگر جوان زندہ رہتا تو ماں باپ کو سرکشی اور کفر کی طرف کھینچ لے جاتا۔

اور دیوار کو میں نے اس لیے تعمیر کیا ہے کہ اس کے نیچے ایک ایسا خزانہ تھا جو دو بے نوا یتیم بچوں کی ملکیت تھا۔ خدا نے چاہا کہ وہ خزانہ دیوار کی بنیاد میں محفوظ رہ جائے تا کہ وہ بالغ ہونے کے بعد اپنے باپ کی دولت کو حاصل کر لیں۔

اس موقع پر موسیٰ کے مصاحب نے اس قسم کے فلسفہ اور اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

ذٰلِكَ تَأْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٨٢﴾ (کہف)

''یہ تھے اسرار و نتائج ان کاموں کے جنہیں تم برداشت نہ کر سکے۔''

اس موقع پر لفظ ''تاویل''، اہم اور پر اسرار کاموں کی علت غائی کے لیے استعمال ہوا ہے جو موسیٰ جیسی شخصیت سے بھی مخفی و پنہاں تھا۔ یقیناً یہ علت غائی خارجی اور عینی پہلو رکھتی ہے۔ اور یہ ذہنی اور فکری مفاہیم میں سے نہیں ہے۔

فلسفہ ء احکام

تیسرا مقام جہاں قرآن میں لفظ ''تاویل'' استعمال ہوا ہے فلسفہ احکام ہے، جسے قرآن ''احسن تاویلاً'' کے عنوان سے تعبیر کرتا ہے۔

سورۂ نساء کی آیت ۵۹ میں اس طرح حکم دیتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿٥٩﴾

''اے ایمان والو! خدا و پیغمبر اور اپنے میں سے صاحبان امر کے احکام کی اطاعت کرو اور اگر تمہارا کسی بات میں

نزاع واختلاف ہوتو اس کو خدا اور اس کے رسول کی طرف پلٹا دو۔ اگر تم خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو(کیونکہ) یہ کام تمہارے لیے بہتر اور اس کا انجام وعاقبت زیادہ اچھی ہے۔''

اس میں شک نہیں کہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت اور ہر قسم کے اختلاف کو ان دونوں کی طرف پلٹانے کا انجام نیک اور نتیجہ اچھا ہوگا۔ اور یہ مسلمانوں کو اختلاف، پراگندگی اور فرقہ واریت سے باز رکھے گا۔ حقیقت میں مسلمانوں کی وحدت کی حفاظت اس حکم کا فلسفہ اور تاویل ہے، جو مذکورآیت میں بیان ہوا ہے۔

سورہ اسراء کی آیت ۳۵ میں حکم دیتا ہے کہ۔

وَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ اِذَا كِلۡتُمۡ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِيۡمِ ؕ ذٰلِكَ خَيۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا ﴿۳۵﴾

''تو لیتے وقت پورا پورا تولا کرو۔ اور ٹھیک ترازو کے ساتھ وزن کیا کرو یہ کام تمہارے لیے اچھا ہے اور اس کا انجام نیک ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں آیات میں دو حکم دیئے گئے ہیں ایک اختلاف کے موقع پر خدا اور رسول کی طرف رجوع اور دوسرا پیمانہ کو پُر کرنے اور درست تولنے کے ساتھ لوگوں کے حقوق کو ادا کرنا۔ اس کے بعد دونوں احکام کو''احسن تأويلاً'' کے جملہ کے ساتھ مدلل کیا گیا ہے۔ اور دونوں احکام کا نیک اور اچھا انجام بہت ہی واضح اور روشن ہے کیونکہ جیسا کہ بیان ہو چکا خدا اور اسکے رسول کی طرف رجوع اتحاد و یگانگی کا سبب ہوتا ہے اور ٹھیک طرح سے پیمانہ کو پُر کرنا اور درست ترازو سے تولنا، عدل اجتماعی کو قائم کرنے کا سبب ہے اور ان دونوں کی نیکی اور اچھائی اتنی واضح ہے کہ جس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔ ان دونوں موارد میں تأویل کا مصداق وہی اجتماعی مصالح ہیں جو ان دونوں خدائی احکام پر عمل کرنے سے مرتب ہوتے ہیں اور وہ ہر گز مفاہیم ذھنی میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ایک قسم کی خارجی واقعیت ہے جو دونوں احکام پر عمل کرنے سے وجود میں آتی ہے۔

قرآن کے وعدوں کا واقعیت عینی کا تجسم

قرآن سورہ اعراف کی آیت ۵۲۔ ۵۳ میں کہتا ہے کہ ہم نے لوگوں کی ہدایت کے لیے اور رحمت کے طریق سے لوگوں کے لیے ایک کتاب بھیجی ہے اور اس میں ان جزاؤں اور سزاؤں کو بیان کیا ہے۔ جو قیامت کے دن انہیں ملیں گی غیر مومن لوگ یہ چاہتے ہیں کہ وہ ان جزاؤں اور سزاؤں کو اسی جہان میں دیکھ لیں حالانکہ جس دن یہ کام انجام پائے گا تو پھر اس دن کام ہاتھ سے نکل چکا ہوگا اور بیداری کوئی فائدہ نہ دے گی، جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۝۵۲ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاۗءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَاۗءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ۝۵۳

''ہم نے ان کے پاس ایک کتاب بھیجی جس میں ہم نے کمال علم کے ساتھ تفصیل بیان کی ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جو اہل ایمان کے لیے باعث ہدایت و رحمت ہے، کیا وہ اس انتظار میں ہیں کہ خدا کے وعدوں کے انجام کو دیکھ لیں (تو پھر ایمان لائیں گے) جس دن یہ کام انجام پا جائے گا تو وہ لوگ جنہوں نے خدا کے احکام کو پہلے بھلا دیا تھا یہ کہیں گے کہ ہمارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہماری طرف آئے تھے۔ کیا آج ہمارے کوئی شفاعت کرنے والے موجود ہیں جو ہماری شفاعت کریں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم واپس پلٹ جائیں اور جو کچھ ہم کرتے رہے تھے اس کے علاوہ دوسرا عمل انجام دیں؟ انہوں نے عمر کا سرمایہ ہاتھ سے کھو دیا ہے اور جھوٹے معبود ان کی نگاہ سے گم ہو گئے ہیں۔''

یہ آیت ان تمام غیبی حقائق کو جن کی قرآن نے خبر دی ہے تاویل اور واقعیت کہتی ہے۔ ایسی واقعیتیں جو جزاؤں اور سزاؤں کے ساتھ مربوط ہیں اور وہ دوسری تمام واقعتیں جو اس جہان میں ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں اور اس جہان میں حجاب اور پردہ ہٹنے کے بعد آشکار ہوں گی۔

اس آیت میں تاویل سے مقصود جزاؤں اور سزاؤں اور دوسرے غیبی امور کی تکوینی واقعتیں ہیں جو اسی سرائے آخرت میں مشاہدہ ہوں گی اور حقیقت میں بہشتوں کے درجات اور دوزخیوں کی جگہ اور برزخ و اعراف وغیرہ کے منازل ان آیات کی تاویل ہیں جن کے لیے قران اس جہان میں ترجمانی کرتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ یہ آیت سارے قرآن کے لیے اس تاویل و مآل اور انجام کار کو بیان کر رہی ہے جو قیامت کے دن مجسم ہوگا لیکن مراد اس سلسلہ آیات کی تاویل ہے جو غیبی امور کے بارے میں ہیں اور جن کا ظرف قیامت کا دن ہے، نہ کہ تمام آیات قرآن، مثلاً وہ آیات جو احکام و غزوات اور قصص کے ساتھ مربوط ہیں۔

سورہ یونس کی آیت ۳۸، ۳۹ میں عین یہی حقیقت بیان ہوئی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ

دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝۳۸ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ۝۳۹

''بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے قرآن کی خدا کی طرف جھوٹی نسبت دی ہے کہہ دیجئے! اگر تم سچ کہتے ہو تو اس کی مانند ایک سورہ ہی لے آؤ۔ اور خدا کے علاوہ تمام لوگوں کو اپنی مدد کے لیے طلب کرلو، (یہ خیال نہ ہو کہ وہ قران کا ازروئے علم وآگاہی انکار کرتے ہیں) بلکہ انہوں نے ایسی چیز کو جھٹلایا ہے جس کا انہیں قطعی کوئی علم نہیں ہے اور اس کی حقیقت وواقعیت تو ابھی ان پر کھلی ہی نہیں ہے اسی طرح سے پہلے لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا۔ اب تم دیکھو کہ ستم گروں کا انجام کیا ہوا۔''

دوسری آیت قرآنی آیات کے لیے ایک تاویل وعاقبت کو بیان کررہی ہے۔ اور یہ کہتی ہے کہ ان کو قرآن کی واقعیت وحقیقت معلوم ہی نہیں ہوئی کیونکہ اس قسم کی واقعیت کے ظاہر ہونے کا وقت قیامت کا دن ہے، نہ کہ یہ جہان اور حقیقت میں ''بل کذّبوا بمالم یحیطوا بعلمه ولما یأتهم تأویله۔'' کا جملہ وہی معنی دیتا ہے جو اس سے پہلی سورت میں ''هل ینظرون الّا تاویله یوم یأتی تأویله'' کا جملہ بتاتا ہے۔ اور دونوں سورتوں کی آیات قرآن کے امور غیبی کے لیے اس تأویل اور تکوینی واقعیت کو ثابت کرتی ہیں۔ جن کے مشاہدہ کا وقت صرف وہ دن ہے جس میں انسانوں کی نگاہوں کے سامنے سے پردہ اور حجاب برطرف ہوجائے گا جیسا کہ فرماتا ہے۔

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ۝۲۲

(ق)

''تو (قیامت) کی اس وضع وکیفیت سے پورے طور پر غافل تھا۔ ہم نے تیری نگاہوں کے سامنے سے پردہ ہٹادیا ہے اس وجہ سے آج تیری نگاہیں بہت تیز ہیں۔''

ان تمام آیات کے مطالعہ سے جو یہاں تک پیش کی گئی ہیں واضح ہوگیا کہ ایک خواب کی واقعیت، (ان خوابوں کے مانند جن کی یوسفؑ نے تعبیر بیان کی) یا ایک اقدام کا ہدف اصلی (جیسا کہ موسیٰؑ کے مصاحب کا اقدام تھا) یا احکام کے ایک سلسلہ کے اسباب (جیسا کہ اختلاف کے موقع پر خدا اور پیغمبر کی طرف رجوع کا لازم ہونا) یا ناپ تول میں عدالت کی رعایت، یا قیامت میں انسان سے پنہاں امور کے ایک سلسلہ کا مشاہدہ، سب ہی تاویل کے مصداق ہیں اور لفظ تأویل کی واقعیت تکوینی وعینی امور کا ایک سلسلہ ہے اور اس کا عالم مفاہیم اور امور ذہنی کے ساتھ کوئی ربط

نہیں ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا تأویل کا مصداق ان ہی یا ان سے ملتے جلتے امور میں ہی منحصر ہے یا تأویل کا کوئی اور دوسرا مصداق بھی ہے جو تأویل کا مصداق ہونے کے ساتھ ساتھ امور ذہنی اور عالم مفاہیم میں سے ہے اور اب اس مطلب کی وضاحت کی جاتی ہے۔

آیاتِ متشابہ کی تأویل

سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ سورہ آل عمران کی ساتویں آیت میں تاویل سے کیا مراد ہے؟ وہ آیت جو قرآن کی آیات متشابہ کی تاویل سے مربوط ہے اور اگر آیت میں تاویل کا معنی واضح ہو جائے تو پھر یقینی طور پر متشابہ کا معنی بھی واضح ہو جائے گا۔

''متشابہ'' کے معنی کو سمجھنے کی کلید اس آیت میں تاویل کے معنی کو سمجھنا ہے اور جب تک اس آیت میں تاویل کا معنی سمجھا نہیں جائے گا متشابہ کا معنی واضح نہیں ہوگا۔ اب ضروری ہے کہ ہم آیت کا معنی اور ترجمہ پیش کریں اور پھر اس آیت میں وارد ''تاویل'' کے معنی کی وضاحت کریں، آیت کا متن اور ترجمہ یہ ہے:

هُوَالَّذِیٓ اَنۡزَلَ عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ ۚ وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؕۘ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝۷

(آل عمران)

''وہی تو ہے کہ جس نے یہ کتاب (قرآن) تم پر نازل کی ہے جن میں سے بعض تو محکم (صریح وواضح) آیات ہیں جو اس کتاب کی اساسِ و بنیاد ہیں اور کچھ ان میں سے متشابہ ہوتے ہیں) وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں انحراف ہوتا ہے وہ فتنہ انگیزی اور نادرست تاویل کے لیے متشابہ آیات کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ ان کی تاویل خدا اور علم میں راسخ لوگوں کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔ وہی کہ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم متشابہ آیات پر ایمان رکھتے ہیں سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور صاحبانِ عقل وخرد کے سوا کوئی متذکر نہیں ہوتا۔

قرآن کی آیات میں ان پندرہ موارد کا مطالعہ، جن میں لفظ تأویل وارد ہوا ہے یہ ثابت کرتا ہے کہ ان میں تاویل سے مراد مفاہیم ذہنی وفکری نہیں ہے بلکہ ان میں تأویل کی حقیقت خارجی حقائق کا ایک سلسلہ اور لمسی اور حسی عینیتیں ہیں جو مثال کے طور پر یوسف اور ان کے قیدی ساتھیوں کے

خوابوں کی حقیقت کو تعبیر کرنے والے یا موسیٰ کے ہمسفر کے بظاہر چھبنے والے کاموں کے ایک سلسلہ کے اسرار کو بیان کرنے والے، یا ناپ اور تول میں عدالت کی رعایت والے احکام کے فلسفہ کی وضاحت کرنے والے ہو سکتے ہیں۔ اور ان موارد میں عینی واقعیتوں کو تأویل کہا گیا ہے نہ کہ مفاہیم ذہنی کے ایک سلسلہ کو۔

لیکن اس اعتراف کے باوجود یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا لفظ ''تأویل'' قرآن میں منحصراً صرف اسی ایک مورد یعنی خارجی واقعیتوں میں استعمال ہوا ہے اور دوسرے مورد میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ یا یہ کہ لفظ ''تأویل'' کے ایک وسیع معنی ہیں اور جس طرح سے خارجی عینیتوں میں استعمال ہوا ہے اسی طرح ان مفاہیم میں بھی جو متکلم کے کلام کا صحیح مقصود مراد ہو سکتے ہیں استعمال ہوا ہے؟

لفظ ''تأویل''، باب ''تفعیل'' کا مصدر ہے جو کبھی تو فاعل کے معنی میں یعنی ''لوٹانے'' کے لیے اور کبھی مفعول کے معنی میں یعنی کسی چیز کے ''مال'' وبازگشت اور سرانجام کے لیے ہوتا ہے اور اس کا مقصود و مصداق متعین کرنے کے لیے (کہ کیا خارجی عینیتیں مراد ہیں یا مفاہیم ذہنی) خارجی قرائن سے مدد لینی چاہیے خاص طور پر یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمیں کس چیز کی تاویل مطلوب ہے؟ اگر وہ چیز جس کی تاویل اور مال ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ رویا و خواب کی قسم سے ہے، یا وہ کوئی ایسا فعل ہے جو بظاہر چھبنے والا ہے یا وہ احکام کا فلسفہ ہے تو ان موارد میں اس چیز کی تاویل، مآل اور انجام کار کا مصداق مسلمہ طور پر خارجی حقائق اور عینیتوں کی قسم سے ہوگا۔

اور اگر وہ چیز کہ جس کی ہم تاویل معلوم کرنا چاہتے ہیں کسی ایسے جملہ کا معنی ہے جس کا ظاہر بھی ہو سکتا ہے اور باطن بھی۔ یا اس کا ایک ابتدائی اور متزلزل معنی بھی ہوگا۔ اور آخری اور مستقر معنی بھی۔ تو اس صورت میں تاویل کی حقیقت وہی متکلم کا اپنے کلام سے اصلی مقصود ہوگا اور اس قسم کا اصلی مقصود ذہنی مفاہیم کے ایک سلسلہ کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔

جب کوئی کلام کرنے والا کوئی ایسی بات کہے جس کا ظاہر دوسرے قرآئن اور دوسرے کلمات کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس کی مراد و مقصود نہ بن سکتا ہو اور غور و خوض کے بعد ہی اس کی بات کا کوئی صحیح مفہوم معلوم کیا جا سکتا ہو اور اس کی مراد کا پتہ چل سکتا ہو تو اس صورت میں دوسرا معنی، جو مفاہیم کی قسم میں سے ہے، اس کے کلام کی تاویل'' کے استعمال پر نہ صرف یہ کہ معمولی سے معمولی اعتراض نہیں ہے بلکہ یہ ان موارد میں استعمال بھی ہوا ہے، نمونے کے طور پر:

متشابہ کی تأویل کا نمونہ

خدا حضرت آدم کی خلقت، کے بارے میں فرشتوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ﴿٢٩﴾ (حجر)

''جب میں اس کی خلقت کو درست کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کو سجدہ کرنا۔''

یہاں آیت ایک ظاہری مفاد اور معنی رکھتی ہے جو موسیٰؑ کے ہم سفر کے کاموں کی طرح ظاہراً چھبنے والا ہے اور متکلم کے دوسرے کلمات کے ساتھ

سازگار نہیں ہے کیونکہ اس کا ظاہر یہ ہے کہ خدا کے بھی روح ہے۔اور اس نے اپنی روح کا ایک حصہ اپنی مخلوق میں پھونکا ہے یہ وہ منزل ہے کہ جہاں کوشش اور جدوجہد کرنی چاہیے اور قرآن کی دوسری آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو اس آیت کے اصلی معنی کو واضح کرنے والی ہوسکتی ہیں۔آیت کے واقعی مقصود کو جو اس کی تاویل و مآل ونتیجہ ہیں، معلوم کیا جانا چاہیے۔اس مورد میں تاویل مفاہیم ذہنی کی قسم سے ہوگی نہ کہ خارجی عینیتوں اور حقائق میں سے کیونکہ ہم جس چیز کی تاویل، یا حقیقت خود اسی جیسی تاویل رکھتی ہو بلکہ ہم تو کلام کے واقعی اور اصلی معنی معلوم کررہے ہیں جس کا ظاہر مقصود نہیں ہوسکتا۔اور عین اس حالت میں بھی اس کا ایک صحیح اور محکم معنی ہوسکتا ہے ایسے موقع پر تاویل کی حقیقت ایک ذہنی امر ہوگی نہ کہ خارجی عینیتیں اور واقعیتیں۔

اس نظریہ پر قرائن وشواہد

یہاں بہت سے قرائن اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ خاص طور پر آل عمران کی ساتویں آیت میں (جو زیر بحث ہے) تأویل سے مراد وہی آیت کے ابتدائی مفہوم کو اس کے واقعی مفہوم کی طرف لوٹانا ہے جس کی حقیقت کو خود اس آیت اور دوسری آیات میں غور کرکے معلوم کیا جاسکتا ہے اور اس معنی میں تأویل ایک ذہنی اور فکری امر کے سواء اور کوئی چیز نہیں ہے اور زیادہ واضح تعبیر ہیں۔تاویل سے مراد متشابہ کا وہی محکم کی طرف لوٹانا ہے یعنی محکم آیات سے مدد لیتے ہوئے متشابہ آیات سے تشابہ کو دور کرنا اور واقعی مقصود کو مقصود نما سے تمیز دینا اور الگ کرنا ہے اور اس مطلب کو ذیل میں بیان کردہ دو مطالب میں غور کرنے سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

خاص متشابہ کی تأویل نہ کہ کل قرآن کی تأویل

زیر بحث میں خاص طور پر متشابہ آیات کی تأویل مورد نظر ہے جب کہ سورہ اعراف کی آیت ۱۵۳ اور سورہ یونس کی آیت ۳۸، ۳۹ میں موضوع بحث تمام آیات کی تأویل ہے اور اس سے مراد وہ آیات ہیں جو برزخ وقیامت سے مربوط ہیں اور یہی فرق آیات متشابہ کی تأویل کے مقصود کو ان دونوں سورتوں میں تأویل کے مقصود سے جدا قرار دے سکتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت قرآن مجید کی آیات کو محکم ومتشابہ میں تقسیم کرنے کے بعد اس طرح فرماتی ہے۔

فاماالذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ماتشابه منه ابتغاءالفتنة وابتغاءتأویله ومایعلم تأویله الاّالله

''وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں انحراف ہے وہ فتنہ انگیزی اور اس کی تاویل کے لیے خصوصیت کے ساتھ متشابہ آیات کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ اس کی تأویل کو خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔''

اس آیت میں دو موقعوں پر لفظ ''تأویله'' میں موجود ضمیروں کی بناء پر خاص طور سے متشابہ کی تأویل ہی مدنظر ہے اور اس لفظ میں موجود ضمیر

لفظ ''ماتشابہ''میں موجود ''ما''موصولہ کی طرف لوٹتی ہے اور یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ ان دونوں الفاظ میں موجود ضمیر ''کتاب'' کی طرف، جو آیت کی ابتداء میں آیا ہے لوٹتی ہے کیونکہ دور کے مرجع کی طرف ضمیر کی بازگشت فصاحت کے خلاف ہے اور عام فہم ہونے سے دور ہے۔
جب کہ سورہ اعراف اور یونس کی ضمیر خود کتاب کی طرف کہ ان آیات کا مقصود عالمِ برزخ اور قیامت وغیرہ کے ساتھ مربوط ہے لوٹتی ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۝ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ (اعراف۔۵۲۔۵۳)

''ہم ان کی طرف کتاب لے کر آئے جس کی پورے علم اور آگاہی کے ساتھ تشریح کی ہے یہ کتاب ایماندار لوگوں کے لیے باعث ہدایت ورحمت ہے کیا انہیں اس بات کا انتظار ہے کہ وہ اس کتاب کے مآل وانجام کو دیکھ لیں (تو پھر ایمان لائیں گے) جس دن یہ کام انجام پائے گا۔''

اور سورہ یونس میں فرماتا ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (یونس۔۳۸۔۳۹)

''بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے خدا کی طرف قرآن کی جھوٹی نسبت دی ہے، کہہ دیجئے کہ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو وہ بھی اس کے مانند کوئی سورہ لے آئیں اور خدا کے سوا تمام لوگوں کو مدد کے لیے بلا لیں۔ (یہ تصور نہ ہو کہ وہ قرآن کا از روئے علم وآگاہی انکار کرتے ہیں) بلکہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا ہے جس کا انہیں کوئی علم ہی نہیں ہے۔ اور اس کی واقعیت ان کے لیے نہیں آئی اور آشکار نہیں ہوئی ہے۔ ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح سے جھٹلایا تھا۔

جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں ان دونوں سورتوں کی آیات میں کلام کا محور قرآن کی تمام آیات کی تاویل ہے کیونکہ ''یوم یأتی تأویله'' یا ''ولما یأتهم تأویله'' کے مطابق ان کی تاویل کے ظہور اور پورا ہونے کا وقت قیامت کا دن ہوگا۔
اس صورت میں اس سے مراد عالمِ غیب سے مربوط آیات ہیں جن کو قرآن نے بہت سے موارد میں بیان کیا ہے اور غیبی عوامل تکوینی اور غیبی امور کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتے لہٰذا ان دونوں سورتوں میں حقیقت تاویل وہی تکوینی اور غیبی تاویل ہے نہ کہ ذہنی وفکری مفہوم اور انسان اس آیت

کے مطابق:

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾

(ق)

''تو اس جہان سے غفلت میں تھا ہم نے تیری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا۔لہٰذا آج تیری نگاہیں بڑی تیز ہیں۔''

(اور اسی تیز بینی کی بنا پر) جن حقائق کو اس دنیا میں نہیں دیکھ سکتا تھا اُس جہان میں دیکھ لے گا۔

جب کہ سورہ آل عمران میں آیاتِ قرآنی کی بحث کا محور قرآن کی ایک خاص قسم کی آیات ....جنہیں متشابہ آیات کہتے ہیں___ کی ''تأویل'' ہے جو واقعی اور حقیقی مقصود ومراد کے لیے کوئی ثابت اور مستقر ظہور نہیں رکھتیں ، اور ہمیشہ صحیح مراد اور غیر مقصود معانی کی ایک دوسرے کے مشابہ اور ملتے جلتے ہوتے ہیں لہٰذا اس بارے میں کلام کے محور اور موضوع (متشابہ) کی مناسبت سے قہری طور پر تاویل سے مراد آیت کو اس کے معنی مقصود کی طرف لوٹانا اور متشابہ سے ابہام اور تزلزل کو دور کرنے کے لیے محکم سے مدد لینا ہے اور اس قسم کی تاویل ایک امر ذہنی وفکری کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

آیت کا شانِ نزول

ابن ہشام اپنی سیرت میں آیت کے نزول کو بہت ہی وسیع صورت میں نقل کرتا ہے۔ہم اس کا خلاصہ یہاں پر پیش کرتے ہیں۔

نجران کے عیسائیوں کہ دینی شخصیتوں میں سے ساٹھ افراد مدینہ میں وارد ہوئے اور ان میں ''العاقب'' اور ''الایہم'' نامی افراد بھی تھے وہ سب کے سب یہ کہتے تھے کہ مسیح خدا، خدا کا بیٹا اور تین خداؤں میں سے تیسرا ہے اور ان تمام موارد کے لیے اس طرح استدلال کرتے تھے۔وہ خدا ہے چونکہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے بیماروں کو شفاء تمام مواد کے لیے اس طرح استدلال کرتے تھے، وہ خدا ہے چونکہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے بیماروں کو شفا بخشتا ہے اور پوشیدہ امور کے بارے میں خبر دیتا ہے اور مٹی سے پرندہ کی شکل بناتا ہے اور اس میں پھونکتا ہے تو وہ اچانک پرندہ بن جاتا ہے وہ خدا کا بیٹا ہے چونکہ اس کا کوئی باپ نہیں تھا۔اور دو تین خداؤں میں سے تیسرا خدا ہے چونکہ خدا اپنے کاموں کو جمع کے صیغہ کے ساتھ بیان کرتا ہے،اور کہتا ہے۔

قضینا۔خلقنا اور اگر وہ واحد و یکتا ہوتا تو جمع کے صیغہ کی بجائے مفرد کا صیغہ لاتا ہے اور یہ کہتا: قضیت ،و___ تو اس موقع پر سورہ آل عمران کے

آغاز کی اسی (۸۰) سے کچھ اوپر آیات نازل ہوئیں[1]

اگر آپ اس سورہ کی آیات کو آیت ۸۵ تک ملاحظہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان آیات کے ایک حصہ کا محور سخن حضرت مسیح، ان کے معجزات، ان کی ولادت کی کیفیت اور ان سے مربوط دوسرے مسائل ہیں۔ اسی وجہ سے آیات کا متن بھی اس شان نزول کی صحت کی تائید کرتا ہے۔

یہ شانِ نزول اس بات کی ترجمانی کر رہا ہے کہ وہ گروہ کہ جن کے دلوں میں ''زیغ'' (کجی) اور باطل کی طرف میلان ہوتا ہے ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ آیات کے ظواہر سے ــــ جن میں مختصر سا تامل ان کے واقعی اور حقیقی معنی ومفاد کو واضح کر دیتا ہے؛ اپنے نفع میں فائدہ اٹھائیں جیسا کہ نجران سے بھیجے ہوئے گروہ نے اس قسم کے الفاظ کے ظواہر سے حضرت عیسیٰ کی ''الوہیت'' کا نتیجہ نکالا، حالانکہ اگر وہ انہیں آیات محکم کے ساتھ ملا دیتے تو واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ جمع کے یہ خطابات مثلاً ''قضینا'' و''امرنا'' یا مسیح کا بغیر باپ کے پیدا ہونا، ان کی ''الوہیت'' کی گواہ نہیں ہے۔

چند سوال:

اب جب کہ گفتگو یہاں تک پہنچ گئی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم چند سوالات کا؛ جو ''تفسیر'' و''تاویل'' کے بارے میں کئے جاتے ہیں؛ اختصار کے ساتھ جواب دیں اگرچہ ہم بحث کی ابتداء میں ''تفسیر'' و''تاویل'' کے بارے میں اجمالی طور پر گفتگو کر چکے ہیں لیکن مزید تشریح کے لیے ہم پھر اسی موضوع کی طرف پلٹ رہے ہیں تاکہ ان سوالات اور جوابات سے ''تفسیر'' و''تاویل'' سے مربوط تمام مسائل واضح وروشن ہو جائیں:

۱۔ کیا قرآن کی تفسیر ہی تاویل ہے یا ان دونوں میں فرق ہے؟

۲۔ فرق کی صورت میں قرآن کی تفسیر کچھ شرائط کے ساتھ جائز کیوں ہے، لیکن اس کے متشابہ کی تاویل خدا اور ''راسخون فی العلم'' کے سوا اور کسی کے لیے جائز کیوں نہیں ہے۔؟

۳۔ کیا تاویل آیات متشابہ کے ساتھ ہی مخصوص ہے، یا دوسری آیات کی بھی تاویل ہو سکتی ہے؟

۴۔ یہ کہ کچھ روایات میں یہ وارد ہوا ہے کہ قرآن کا ایک بطن ہوتا ہے اس سے کیا مراد ہے۔ اور کیا قرآن کا بطن وہی اس کی تاویل ہے یا نہیں؟

جواب:

تفسیر وتاویل کا فرق

تیسری اور چوتھی صدی کے مفسرین مثلاً! طبری' نے اپنی تفسیر ''جامع البیان'' میں اور مرحوم ''سید رضی'' نے ''حقائق التاویل'' میں اور ''سیّد

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۷۵ و مجمع البیان ج ۱ ص ۴۱۰۔

مرتضیٰ'' نے امالی'' میں تاویل کو عام طور پر تفسیر کی جگہ ہی استعمال کیا ہے۔ اور آیت کی تفسیر کی بجائے آیت کے تأویل کہتے ہیں اور اس قسم کے استعمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ دونوں الفاظ مترادف تھے جب کہ بعد کی صدیوں کے مفسرین نے ان دونوں الفاظ میں فرق رکھا ہے، ہم سردست اس مادہ سے کہ جس سے لفظ تفسیر لیا گیا ہے ___ کہ آیا یہ لفظ ''سفر'' کے مادہ سے ''اشتقاق مقلوب'' کی صورت میں اخذ ہوا ہے، یا ''فسر'' کے مادہ سے وضاحت وتشریح کے معنی میں لیا گیا ہے ___ کوئی سروکار نہیں رکھتے چونکہ اس بارے میں بحث طول کلام کا باعث بنے گی لہٰذا سردست جو چیز ہمارے پیشِ نظر ہے وہ آیت کے دونوں قسم کے معنی ومفاد کی وضاحت کو بیان کرنا ہے۔ جن میں سے ایک کو ''تفسیر'' اور دوسرے کو ''تأویل'' کہتے ہیں مفسرین اسلامی کے درمیان جو چیز معروف ومشہور ہے ہم اس کا خلاصہ یہاں پر پیش کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ لفظ تفسیر وتأویل دونوں ہی آیت میں ابہام کو دور کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں لیکن جب آیت کا ابہام لفظ کے معنی اور جملہ کے مضمون سے مربوط ہو تو اس قسم کے دفع ابہام کو ''تفسیر'' کہا جاتا ہے لیکن اگر آیت کے مفرد الفاظ'' یا ابتدائی مضمون میں کوئی ابہام نہ ہو بلکہ آیت کا اصلی مطلب اور مقصود ومراد زیادہ احتمالات کی وجہ سے مبہم وپوشیدہ ہو تو اس قسم کے ابہام کے دور کرنے کو تأویل کہا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں تفسیر آیت کے مفردات اور جملوں کے معنی اور مضمون سے پردہ اٹھانا ہے، اس طور پر کہ آیت کے معنی جس کے الفاظ اور جملے اس کے قالب ہیں معلوم ہوجائیں۔ اس صورت میں وہ آیت جس کی تفسیر کی جارہی ہے ہرگز دو مضمونوں کی جنہیں ''ابتدائی'' اور ''نہائی'' (اصلی) کہتے ہیں ___ حامل نہیں ہے بلکہ وہ صرف ایک ہی مضمون رکھتی ہے اور مفردات اور جملوں کی پہچان، یا شانِ نزول اور سیاق آیات کے ساتھ آیت کا پورا مضمون معلوم ہوجاتا ہے جب کہ تاویل میں آیت کا ابتدائی مضمون تو پورے طور پر واضح ہوتا ہے لیکن وہی مضمون اصلی کنایہ یا کسی دوسرے معنی کے لیے ایک پل ہوسکتا ہے۔

اس صورت میں آیت کو مقصود اصلی کی طرف پلٹانا تاویل ہوگا۔ اب دو مثالیں پیش کرنے سے ان دونوں قسم کے ابہاموں کو رفع کرنے کا فرق معلوم ہوجائے گا۔

سورۃ توبہ کی آیت ۳۷ میں اس طرح آیا ہے۔

إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا

''تاخیر کفر میں زیادتی ہے، کافر لوگ اس کے ذریعہ گمراہ ہوجاتے ہیں، ایک سال تو حرام قرار دیتے ہیں اور دوسرے سال اسے ہی حلال بنا دیتے ہیں۔''

جیسا کہ آپ ملاحظہ کررہے ہیں آیت کا مضمون پورے طور پر مبہم اور غیر واضح ہے اور انسان نہیں جانتا کہ ''نسیٔ'' جو تاخیر کے معنی میں ہے سے کیا مراد ہے؟ کونسی تاخیر کفر میں زیادتی کا سبب بنتی ہے؟ اور اگر ہم یہ جان بھی لیں کہ اس سے مراد حرام مہینوں کی تاخیر ہے تو پھر بھی یہ بات واضح نہیں ہے کہ یہ تاخیر کس طرح کی تھی اور کس مقصد کے لیے تھی۔ اور بعد میں اس کی تلافی کس طرح ہوتی تھی؟

آیت کے مضمون سے اس قسم کا پردہ اٹھانا اس کی تفسیر ہے، تأویل نہیں ہے۔

پھر اسی سورہ کی آیت ۱۱۸ میں یہی صورت ہے، آیت کا متن اس طرح ہے:

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ (توبہ)

''اوران تینوں افراد پر جو پیچھے رہ گئے تھے زمین اپنی پوری وسعت کے ساتھ تنگ ہوگئی اور ان کی روح خود ان پر تنگ ہوگئی اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ خدا سے سوائے اس کے اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہے خدا ان کی طرف رحمت کے ساتھ لوٹا تا کہ وہ توبہ کریں خدا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔''

باوجود اس کے کہ آیت کے مفرد الفاظ اور جملوں کے معنی واضح ہیں پھر بھی آیت کا مفاد پورے طور پر مبہم ہے اور انسان نہیں جانتا کہ ان تین افرد کے پیچھے رہ جانے سے کیا مراد ہے۔ اور کیا ہوا تھا کہ زمین ان کے لیے تنگ ہوگئی اور ان کی روح نے ان پر دباؤ ڈالا؟ اسی آیت کا باقی مضمون ہے اور آیت کے سیاق اور شانِ نزول کی طرف رجوع کئے بغیر آیت کا مفاد واضح نہیں ہوگا؟ آیت کے مفاد سے اس قسم کا پردہ اٹھانا تفسیر کہا جاتا ہے۔ آپ آیات کے سیاق اور شانِ نزول متصل اور منفصل قرائن کی صورت میں آیت کے مفاد کو واضح کرتا ہے۔

جب کہ تاویل میں مفرد الفاظ جملوں اور آیت کے ابتدائی مضمون کے ابہام کے بارے میں کوئی اتہ پتہ نہیں ہوتا اور اس بارے میں وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ معنی ایک اصلی مقصود کے لیے ایک گذر گاہ ہے جو انسان کے لیے ابتدا میں پورے طور پر پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کے ابتدائی معنی کو اس کے مقصود اصلی کی طرف لوٹانا تاویل کہلاتا ہے۔ مثلاً حضرت عیسٰی کے بارے میں آیا ہے۔

رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ (نساء ۱۷۱)

قرآن اس آیت میں حضرت عیسٰی کو اللہ کے کلمات میں سے ایک کلمہ اور اپنی ایک روح کہتا ہے'' کلمہ'' لوگوں کی اصطلاح میں وہی وضع کیا ہوا لفظ ہے کہ جس کے ساتھ تلفظ ہوتا ہے، یا کاغذ پر لکھا جاتا ہے اب انسان اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ حضرت عیسٰی ایک عینی فرد ہوتے ہوئے خدا کا کلمہ کس طرح ہوگئے اور وہ خدا کی روح کس طرح بن گئے اب اس حقیقت سے پردہ ہٹانا اور آیت کے ابتدائی معنی کو اس کے اصلی معنی کی طرف پلٹانا یہی تاویل ہے۔

آپ ان مثالوں سے جو پیش کی گئی ہیں تفسیر وتاویل کے فرق کو پورے طور پر معلوم کر سکتے ہیں اور ان دونوں کے موارد کو ایک دوسرے سے الگ کر کے پہچان سکتے ہیں۔

تفسیر مطلوب ہے لیکن تأویل دو قسم کی ہے

اس بیان سے تأویل کے ممنوع ہونے اور تفسیر کے مطلوب ہونے کی علت کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مفسر آیت کی تفسیر میں کوئی معمولی سے معمولی چیز بھی اپنی طرف سے نہیں رکھتا، آیت کے معنی ومفاد میں کوئی تصرف اور اپنی فکر کو آیت کے اوپر نہیں لادتا وہ لغت کی طرف رجوع اور قواعد زبان عربی سے آگاہی اور آیت کے شانِ نزول کی طرف توجہ سے خدا کے مقصود کو معلوم کرتا ہے وہ جس طرح سے ''امرأالقیس'' یا ''خنساء'' کے شعر کی تفسیر کرتا ہے اسی طرح سے آیات قرآنی کی بھی تفسیر کرتا ہے۔ اس قسم کی روش ساری دنیا میں بزرگوں کے اقوال وکلمات کی تفسیر میں جاری وساری ہے جب کہ آیت کی تاویل میں معاملہ اس طرح نہیں ہوتا۔ یہاں آیت پر ایک ایسے معنی کو لادا جاتا ہے جس پر آیت کے مفردات اور ہیت ترکیبی دلالت نہیں کرتے اور تأویل کرنے والا انسان ایسے معنی بیان کرتا ہے کہ ظاہری لحاظ سے الفاظ اور جملوں کے معنی کی طرف توجہ کرتے ہوئے کرنے والا انسان ایسے معنی بیان کرتا ہے کہ ظاہری لحاظ سے الفاظ اور جملوں کے معنی کی طرف توجہ کرتے ہوئے آیت اسکا قالب نہیں ہے اس صورت میں ایسے معنی کی طرف توجہ کرتے ہوئے آیت اس کا قالب نہیں ہے اس صورت میں ایسے معنی پر کس طرح سے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اور خدا کا اصلی مقصود جانا جا سکتا ہے۔

''محکم'' کی مدد سے ''متشابہ'' کی تأویل جائز ہے

تأویل کی حقیقت وماہیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ صرف ایک قسم کی تاویل صحیح ہے جس کی ممانعت نہیں ہے اور وہ ''متشابہ'' آیت کی ''محکم'' آیت کے ذریعہ تاویل ہے چونکہ اس قسم کی ''تاویل''، محکم'' آیت کی مدد سے انجام پاتی ہے اور محکم آیت بھی اپنے معنی ومفاد میں نص اور واضح ہوتی ہے اور آیت کے ابہام کو مدلول کے لحاظ سے رفع کر سکتی ہے لہٰذا وہ قطعی طور پر صحیح ہوگی اور اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی کیونکہ یہ بات تو صحیح ہے کہ مفسر اس قسم کی تاویل میں اپنی طرف سے کچھ کہتا ہے لیکن وہ اس کا خمیر خدا کے کلام سے لیتا ہے۔

اور دوسرے لفظوں میں اگر ایک آیت کی تفسیر دوسری آیت کی مدد سے صحیح واستوار ہے تو اسی طرح سے اس آیت کی تاویل بھی جو اپنے معنی میں ظہور ثابت نہیں رکھتی دوسری آیت کے ذریعہ جو اپنے مدلول میں صحیح اور واضح ہے، صحیح واستوار ہوگی۔

اسی لیے قرآن، اسی آیت کے ذیل میں جو قرآن کی آیات کو ''محکم'' ''متشابہ'' میں تقسیم کرتی ہے اور ایک گروہ کی متشابہ آیات کی پیروی کرنے کی بناء پر مذمت کرتی ہے، اس طرح فرماتا ہے۔

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ (آلِ عمران)

''اس کی تاویل خدا اور راسخون فی العلم کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ''متشابہ'' پر بھی ''محکم'' کی طرح ہی ایمان رکھتے ہیں اور یہ دونوں خدا کی طرف سے ہیں اور صاحبان عقل کے سوا اور کوئی متذکر نہیں ہوتا''

''علم میں راسخ لوگ'' چونکہ معارف الٰہیہ میں راسخ واستوار ہوتے ہیں لہٰذا وہ قطعی طور پر ''متشابہ'' کی تاویل سے پورے طور پر آگاہ ہوں گے، نہ یہ کہ متشابہ پر ایمان تو لائے ہیں لیکن ان کے معنی ومفاد سے آگاہ نہیں ہوں گے کیونکہ اگر معاملہ اس طرح سے ہوتا تو ضروری تھا کہ ''راسخون فی العلم'' کی بجائے ''راسخون فی الایمان۔'' استعمال کرتا۔''

یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن میں علم اور ایمان کا ایک ہی معنی ہے کیونکہ قرآن واضح طور پر علم وایمان کو ایک دوسرے پر عطف کرتا ہے اور انہیں ایک دوسرے سے الگ شمار کرتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ (روم۔۵٦)

''جنہیں علم اور ایمان دیا گیا تھا۔انہوں نے کہا۔''

ذہن سے پہلے سے کئے ہوئے ہر قسم کے فیصلے سے ہٹ کر سورۂ آل عمران کی آیت کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ''والراسخون فی العلم'' کا گروہ چونکہ قرآن کی شناخت اور معارف خداوندی میں راسخ اور ثابت قدم ہیں۔لہٰذا وہ قطعی اور یقینی طور پر متشابہ کی تاویل سے آگاہ ہیں کیونکہ یہ بات بلاغت سے بہت دور ہے کہ ہم کسی گروہ کو ''راسخون فی العلم'' بھی کہیں کہ وہ متشابہ کی تاویل سے بے بہرہ ہیں اور وہ بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح ہی صرف متشابہ کی حقانیت پر محکم کی طرح اور یہ کہ یہ دونوں ہی خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، ایمان لے آتے ہیں۔

''راسخون فی العلم'' کا کام کیا ہے؟ ان کا کام یہ ہے کہ وہ محکم آیات کی مدد سے جو مفاد ودلالت کے لحاظ سے بہت ہی واضح وروشن ہوتی ہیں متشابہ آیات کو ان کے واقعی مقصود کی طرف پلٹا کر ان سے تزلزل اور دو پہلو ہونے کو دور کردیتے ہیں۔

مثلاً ان موارد کی تاویل، جو نجران کے پادریوں کے ایک گروہ کے لیے دستاویز بن گئے تھے، دوسری آیات کی مدد سے بہت ہی سہل وآسان ہے اور ایک فرد مفسر جو علم میں راسخ ہے دوسری آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے۔روح اللہ'' کی اضافت اور ''خلقنا'' میں جمع لانے کی علت کی تشریح کرسکتا ہے اور خدا کے بارے میں جسمانیت یا مقام ذات، یا فعل خدا میں شرک کا شائبہ بھی پیدا نہیں ہوگا۔

اب رہی یہ بات کہ ''راسخون فی العلم'' سے مراد کون ہیں؟ کیا اس سے مراد ائمہ معصومین ہیں یا یہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور معصومین کا گروہ اس کا کامل واتم اور نمایاں مصداق ہے سردست ہمیں اس سے سروکار نہیں ہے۔اس مقام پر ہدف اور مقصد یہ ہے کہ ثابت ہوجائے کہ متشابہ کی تاویل ''محکم'' کی مدد سے غیر صحیح اور بے جا تاویلوں میں سے نہیں ہے۔

تأویل ممنوع کونسی ہے؟

تأویل ممنوع ان تاویلوں کی قسم سے ہے کہ جس میں ایک آیت کی تاویل کے لیے دوسری آیت سے مدد نہ لی جائے اور مفسر اسے اس کے

واقعی مقصود کی طرف پلٹانے کے لیے اپنی فکر ونظر اور پہلے سے رکھے ہوئے عقیدہ کے علاوہ کسی اور چیز سے مدد نہیں لیتا اور حقیقت میں بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو قرآن کی خدمت میں قرار دے، قرآن کو اپنے افکار کی خدمت کے لیے استعمال کرتا ہے اور حقیقت میں اس کا مقصد آیت کی تفسیر اور خدا کے مقصود سے آگاہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اپنے پہلے سے قائم کئے ہوئے نظریہ پر دلیل قائم کرنا ہوتا ہے چاہے قرآن کا مقصود وہ ہو یا نہ ہو۔

یہ وہی تأویل ہے جو باطل ہے اور دلیل اور قرینہ کے بغیر کی گئی اس قسم کی تاویل متشابہ آیات کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ آیات محکم کو بھی اپنی قلمرو میں لے لیتی ہے اور گذشتہ زمانوں میں گروہ باطنیہ اور پہلے سے فیصلہ کر لینے والے گروہ نے آیات کی تاویل سے چاہیے وہ مدلول کے لحاظ سے کتنی ہی واضح ہوں باز نہیں رہے اور اس راہ میں شخصی مقاصد اور اغراض کی خاطر پیش روی کرتے رہے۔

اعصار اسلامی کے طول میں اس قسم کی ممنوع تاویلات، مذاہب وعقائد کے پیدا ہونے کا سبب بنی ہیں جن سے اسلام بیزار ہے اور آیاتِ محکم اور احادیث روشن نے اس قسم کے کام سے منع کیا ہے اور مشہور حدیث، من فسر القران برأیہ__ اسی قسم کی تفسیر اور پہلے سے کئے ہوئے فیصلوں کو بیان کرتی ہے جو اسلام کو مسخ کر دیتی ہے۔ اور دین الٰہی __ جو مبدء ومعاد کے اعتقاد پر استوار ہے اور مادی دین، جو دونوں کا منکر ہے، کے درمیانی فاصلہ کو ختم کر دیتی ہے اور سچا اسلام، جو معنویات اور ماوراء طبعیت کے اعتقاد سے پُر ہے__ میٹریلزم کے ساتھ مل کر دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔

مثلاً گروہ باطنیہ طول تاریخ میں قرآنی آیات میں انتہائی ناروا تاویلات کا مرتکب ہوا ہے جو حقیقت میں معاد اور جہان ماوراء طبعیت کے انکار تک جا پہنچا ہے یہ صرف باطنیہ گروہ ہی نہیں ہے جو اس قسم کے خبط اور خطاء کا مرتکب ہوا ہے بلکہ عصر حاضر میں بھی مسلمان نما کچھ چھوٹے چھوٹے گروہ ایسے ہیں جنہوں نے اپنے مکتب کو اس قسم کی تاویلوں کی بنیاد پر، جن کا نتیجہ مادیت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے استوار کیا ہے۔ اور قرآن کی اصطلاح میں "ضل"، و"اضل" خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کی گمراہی کا بھی سبب بنے۔

اسی لیے اسلام نے عام افراد کے لیے ہر قسم کی تاویل کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ اور حضرات معصومین کے علاوہ جن کے علم ودانش کا سرچشمہ عالم وحی ہے کسی کو قرآن کی تاویل کی اجازت نہیں دی کیونکہ اس قسم کی تاویل دین کی نابودی اور اس کے اصول وفروع کی تحریف کا سبب ہے یہاں تک کہ دین الٰہی کو جو عوالم غیبی کی اساس پر استوار ہے نتیجہ کے لحاظ سے ایک سیاسی مکتب کے ساتھ یکساں سمجھا جا سکتا ہے موجودہ زمانہ میں اسلام مٹھی بھر مسلمان نما مادی منافقین کے ہاتھوں میں گرفتار ہے جو اسلام کے اصول وفروغ کو مادی میلان رکھنے والی تاویلات کے ساتھ فالتو چیز ظاہر کرتے ہیں اور اسلام کے تمام مقدسات کی تاویل کرنے کے باوجود اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں حالانکہ وہ عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے ایک مارکسٹ سے فرق نہیں رکھتے!

ممنوع تأویل کے نمونے

اب جب کہ ہم متشابہ کے معنی اور اس کی تاویل کے طریقہ سے آشنا ہو چکے ہیں تو اب یہ بتلاتے ہیں کہ جس طرح متشابہ آیات اپنے لیے تاویل رکھتی

ہیں اسی طرح قرآن کی تمام آیات اپنے لیے تاویل رکھتی ہیں جو قرآن کا بطن اور اندونی حصہ شمار ہوتی ہیں اور دونوں میں تاویل کی حقیقت ایک ہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ متشابہ آیات میں اصلی مقصود واضح نہیں ہوتا اور اس میں کئی ایک احتمال ہوتے ہیں اور اس کی تاویل کے ذریعہ ہم خدا کے مقصود تک پہنچ جاتے ہیں، لیکن قرآن کی دوسری آیات کی تاویل میں کوئی ابہام اور تزلزل نہیں ہوتا، اور آیت کے مفہوم میں معمولی سی چبھن بھی نہیں ہوتی، اس میں اتنی بات ہوسکتی ہے کہ آیت کا مفاد زیادہ گہرائی رکھتا ہو، اور اس کے پہلے معنی کے اندر ایک اور دوسرا معنی چھپا ہوا ہے۔

زیادہ واضح تعبیر میں: ہر آیت کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن، اس کا ظاہر اس کی تنزیل ہے اور اس کا باطن اس کی تاویل ہے اور آیت معنی مقصود کے لحاظ سے کئی درجات رکھتی ہے جس کا پہلا معنی تو سب کی سمجھ میں آجاتا ہے جب کہ اس کے دوسرے معانی ایک خاص گروہ کے لیے ہی، جو عالم وحی کے ساتھ ارتباط رکھتے ہیں قابل فہم ہیں اور جب تک وہ راستہ نہ دکھائیں دوسروں کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اس قسم کی تاویل کی طرف ہاتھ بڑھائیں، اس کے دو نمونے یہ ہیں!

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ اَصۡبَحَ مَآؤُکُمۡ غَوۡرًا فَمَنۡ یَّاۡتِیۡکُمۡ بِمَآءٍ مَّعِیۡنٍ ﴿۳۰﴾ (ملک)

''کہہ دیجئے کہ اگر روئے زمین کے پانی اس کے اندر چلے جائیں تو تمہارے لیے خوشگوار پانی کون لائے گا۔''؟

اس کا ظاہری معنی وہی ہے جو ترجمہ میں بیان ہوا ہے لیکن اس آیت کا ایک دوسرا معنی بھی ہوسکتا ہے جو پہلے معنی کے اندر چھپا ہوا ہے اور اس کے ساتھ منافات بھی نہیں رکھتا اور وہ یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ پانی سے مراد حجت خدا ہے کیونکہ جس طرح پانی مادی زندگی کا سبب ہے اسی طرح سے حجت خدا معنوی زندگی کا سبب ہے۔ اور پانی کے زیر زمین چلے جانے سے مراد حجت خدا کی موت اور اس دنیا سے چلے جانا ہے اور آیت کی تاویل یہ ہے کہ اگر خدا کی حجتوں میں سے کوئی ایک جس کا بیان اور عمل حیات معنوی کا سبب ہے۔ ختم ہو جائے تو تمہارے لیے دوسری حجت کو کون لائے گا [1]

ایسا معنی پہلے معنی کی تاویل ہے اور سوائے معصوم کے جو ہر قسم کی خطا اور لغزش سے محفوظ ہو کوئی شخص اس قسم کی تاویل کا حق نہیں رکھتا۔

وَلَیۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ ظُهُوۡرِهَا وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ اَبۡوَابِهَا (بقرہ۔۱۸۹)

''نیکوکاری یہ نہیں ہے کہ تم گھر کے پیچھے کی طرف سے آؤ جاؤ بلکہ نیکوکاری یہ ہے کہ تم پرہیز گاری اختیار کرو اور گھروں کے دروازے سے آؤ جاؤ۔''

---

[1] تفسیر صافی ج ۲ ص ۷۲۷ و مجمع البیان ج ۱ ص ۲۸۴۔ گذشتہ مباحث میں اس بناء پر کہ تمام قرآن تاویل رکھتا ہے ایک اور معنی بھی ہم نے بیان کیا تھا اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد ان حقائق کا مشاہدہ ہے جن کی قرآن خبر دیتا ہے مثلاً: بہشت، دوزخ اور برزخ سے مربوط اور یہ معنی اس چیز سے جواب بیان کیا گیا ہے واضح فرق رکھتا ہے لیکن ان دونوں معانی کے درمیان کوئی تضاد اور منافات نہیں اس لئے کوئی امر مانع نہیں ہے کہ مجموع قرآن دو قسم کی تاویل رکھتا ہو کہ ان میں سے ایک تو خارجی حقائق کے ساتھ مربوط ہو اور دوسری فکری اور ذہنی امور کی قسم سے ہو۔

آیت کا ہدف اور مقصد زمانہ جاہلیت کی ایک رسم کی سرکوبی کرنا ہے کیونکہ جب کوئی شخص حج کا احرام باندھ لیتا تھا تو وہ گھر کے پیچھے ایک سوراخ کر لیتا تھا اور وہاں سے آیا جایا کرتا تھا[1]

اگر چہ یہ آیت زمانہ جاہلیت کی اس رسم کی سرکوبی کرتی ہے لیکن یہ ایک اور معنی بھی رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر کام کو عقلائی اور طبعی سنتوں کے مطابق انجام دینا چاہیے اور اس کی تاویل کسی معصوم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اسلامی روایات میں وارد ہوا ہے کہ۔

ومافی القرآن اٰیة الاّ ولهاظهر و بطن

''قرآن میں ایک بھی آیت ایسی نہیں ہے کہ جس کا ایک ظاہر اور ایک باطن نہ ہو۔''

اس بیان سے چوتھے سوال کا جواب بھی واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کا باطن وہی تاویل اور اس کا وہ مخفی معنی ہے جس کو معدودے چند افراد کے سوا اور کوئی شناخت نہیں کرسکتا حالانکہ قرآن کے ظاہری معنی سے آگاہی کا باب سب کے لیے کھلا ہے۔

خلاصہ بحث

ا۔قرآن میں تأویل کا ہدف ومقصد کبھی تو عینی اور خارجی حقیقتیں ہوتا ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہوں گی اور کبھی اس سے مقصود آیت کے مفاد ظاہری کو اس کے مفاد واقعی کی طرف لوٹانا ہوتا ہے۔اور طبیعی طور پر اس صورت میں تأویل کا ہدف ومقصد عینی وخارجی حقیقت نہیں ہوگا

۲۔متشابہ کی تأویل کا ہدف ومقصد پہلا معنی نہیں ہوتا بلکہ وہی دوسرا معنی ہوتا ہے۔

۳۔''تفسیر'' آیت کے ظاہری معنی سے پردہ اٹھانا ہے جس پر الفاظ اور جملے عربی قواعد کے لحاظ سے دلالت کرتے ہیں۔اور ''تأویل'' آیت کے ظاہری معنی کو اس کے واقعی معنی کی طرف پلٹانا ہے چونکہ اکثر الفاظ میں اس کو ظاہر کرنے کی قدرت نہیں ہوتی۔

۴۔آیت کی تأویل کی ___ آیت کے ظاہری مفہوم کو دوسرے معنی کی طرف ''پلٹانے کے معنی میں ___ دو قسمیں ہیں۔

الف: جائز

اور وہ متشابہ کی محکم کے قرینہ کے مطابق تأویل ہے۔

ب: ممنوع

اور وہ آیت کے ظاہر کی قرآن کی مدد کے بغیر تاویل ہے اور یہ معصوم کے علاوہ کسی اور کیلئے جائز نہیں ہے۔

---

[1] تفسیر شبر ص ٦٧۔

۱۳۔ خدا کو بھول جانا خود فراموشی کا سبب بنتا ہے؟ [1]

خدا کے فراموش کرنے سے کیا مراد ہے؟

قرآن مجید کا نظریہ یہ ہے کہ خدا فراموشی کا لازمہ ہے کہ وہ خود کو بھول جاتے ہیں، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝۱۹

(حشر)

''تم ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا، جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تھا، تو خدا نے انہیں خود فراموشی میں مبتلا کر دیا وہی لوگ تو فاسق ہیں۔''

اور دوسری آیت میں خدا کے بھلانے کو اس بات کا سبب قرار دیا ہے کہ خدا بھی انہیں فراموش کر دیتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝۶۷ (توبہ)

''منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں وہ برے کاموں کا تو حکم دیتے ہیں اور اچھے کاموں سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو باندھ لیتے ہیں (اور خرچ نہیں کرتے) انہوں نے خدا کو بھلا دیا ہے پس خدا نے بھی ان کو بھلا دیا۔ اور منافق وہی فاسق ہیں۔''

تیسری آیت میں قیامت کے دن کو بھول جانے کا لازمہ قرار دیتا ہے کہ خدا بھی انہیں اس دن فراموش کر دے گا۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

اَلْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا (جاثیہ۔ ۳۴)

''آج کے دن ہم تمہیں بھلا دیں گے جیسا کہ تم نے اس دن ہماری ملاقات کو بھلا دیا تھا۔''

[1] اسی موضوع کے بارے میں پہلی جلد میں ایک اور طرح سے بحث ہو چکی ہے، لیکن یہاں ایک اور طرح سے بحث ہو رہی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ:

اوّلاً

خدا کو بھول جانا خود کو بھول جانے کا سبب کیسے بن گیا؟

ثانیاً۔

خدا کا انہیں بھلا دینے سے، جیسا کہ دوسری اور تیسری آیت میں آیا ہے، کیا مراد ہے؟

ہم یہ بتائے دیتے ہیں کہ سوال کے دوسرے حصہ کا جواب بہت ہی واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا ان کو بھلا دے گا، سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کو اپنی رحمت کے سایہ سے محروم کر دے گا۔

اس بات کا سبب کہ اس قسم کے خروج کو خدا کا فراموش کرنا کہا گیا ہے، یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کو فراموش کر دے تو پھر وہ اس کا کوئی کام انجام نہیں دے سکتا اور نہ ہی اس سے کسی قسم کی مہر و محبت کر سکتا ہے اسی طرح سے خدا کا معاملہ ہے کہ جب وہ کسی کو اپنی رحمت کے سایہ سے محروم کر دے تو گویا اُس نے اس کو بھلا دیا ہے۔ یہاں خدا کے فراموش کرنے سے مراد اس کا نتیجہ ہے، نہ کہ وہ خود۔

علماء نے اس قسم کے الفاظ کے بارے میں ایک قانون پیش کیا ہے جس کی علمی تعبیر یہ ہے کہ **خذوا الغایات واترك المبادی**' نتائج کو لے لو اور مقدمات کو چھوڑ دو۔

اس جملہ کی وضاحت اس طرح ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو بھول جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں نیکی اور اچھائی نہیں کرتا۔ ایسے موقع کے لیے ایک مقدمہ ہے اور ایک نتیجہ۔

مقدمہ بھلا دینے کی حالت ہے اور نتیجہ خوبی نہ کرنا ہے اب اگر ہم خدا کے بارے میں کہیں کہ خدا نے فلاں شخص کو بھلا دیا ہے تو وہ مقدمہ جو نفسانی حالت ہے وہ خدا میں موجود نہیں ہے لیکن وہ نتیجہ اور غرض جو فراموشی کی حالت میں طبیعی صورت میں مرتب ہوتی ہے، جو وہی لطف و محبت سے دوری ہے، وہ یقینا موجود ہے۔

یہ قانون اور قاعدہ ان تمام الفاظ میں جن کے معانی کا خدا میں موجود ہونا محال ہے حکم فرما ہے مثلاً غصہ اور غضب مہر و محبت رضا و خوشنودی وغیرہ اور اس بات کی عظمت کہ قرآن ان الفاظ کو خدا کے بارے میں استعمال کرتا ہے۔ یہ ہے کہ قرآن لوگوں کی زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ اور لوگ خدا کی ہمیشہ ان ہی الفاظ کے ساتھ تعریف و توصیف کرتے ہیں اگرچہ ان معانی کے حقائق خدا کے بارے میں متحقق نہیں ہوتے لیکن وہ نتائج و آثار جو ان معانی پر مرتب ہوتے ہیں وہ خدا میں متحقق ہیں۔

قرآن سورہ سجدہ کی آیت ۱۴ میں جہاں دوسرے گھر کے نسیان کو اس بات کا سبب سمجھا ہے کہ خدا بھی انہیں فراموش کر دے گا خدا کے فراموش کرنے کو عذاب چکھنے کے معنی میں تفسیر کرتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

''چونکہ تم نے آخرت کے دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا لہٰذا ہم نے بھی تمہیں بھلا دیا ہے۔لہٰذا اب تم ان اعمال کے سبب، جو تم نے انجام دیئے ہیں۔ ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھو۔''

وذوقوا عذاب الخلد۔کا جملہ نسینا کُم کے معنی کو بیان کر رہا ہے۔اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر خدا کسی کو فراموش کر دے تو طبعاً وہ شخص عذاب الٰہی میں گرفتار ہوگا۔

اور سورہ جاثیہ کی آیت ۳۴ اس مطلب پر ایک واضح گواہ ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

الْيَوْمَ نَنْسٰكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

''آج کے دن میں تم کو بھلا دوں گا جیسا کہ تم نے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا تمہارا ٹھکانا (جہنم کی) آگ ہے اور کوئی بھی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔''

ومأوا کم النار ''تمہارے رہنے کی جگہ آگ ہے'' کا جملہ ''ننسا کم'' کے جملہ کے بعد خدا کی فراموشی کے معنی کو ظاہر کر رہا ہے اور یہ وہی اس کی رحمت سے خروج اور اس کے عذاب میں داخل ہے۔ یہاں تک خدا کے فراموش کرنے کا مطلب واضح ہو گیا لیکن پہلے سوال کا جواب زیادہ اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ ''خدا فراموشی''خود فراموشی'' کا سبب کس طرح ہے۔

یہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن مارکسزم کے بالکل برخلاف (جو''خدا پرستی کو''خود سے بیگانہ ہونے'' کا سبب جانتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ خدا کی طرف توجہ اور اس کی پرستش اس بات کا سبب بنتی ہے کہ انسان اپنے آپ سے بیگانہ ہو جائے اور کسی دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو جائے) خدا فراموشی کو خود فراموشی کا سبب جانتا ہے اور پہلی آیت اس مطلب کی واضح گواہ ہے۔

یہاں ہم آیت کے مفاد کی وضاحت کے لیے چند نکات بیان کرتے ہیں۔

کمالِ مطلق سے ارتباط تکامل کا سبب ہے

خدا پرستی کا مطلب کمال مطلق سے ارتباط ہے کیونکہ خدا ایک مذہبی فرد کی نگاہ میں سراسر جمال و کمال ہے اور ہر عیب و نقص سے پاک و منزہ ہے۔وہ دانا و توانا آفریدگار ہے جس نے جہان و انسان کو وجود بخشا ہے۔اگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا فیض منقطع ہو جائے تو وحشت ناک تاریکی جو''عدم'' مطلق کے معنی میں ہے ہر جگہ کو گھیرے گی ایسے کمال مطلق کے ساتھ ارتباط انسان کی بلندی کا سبب ہے اور بیدار وجدانوں کو شعور

وادارک اور انسان کی تلاشِ علم اور جستجو کے احساس کو قدرت اور طاقت بخشتا ہے اور عالم میں انسان کی حیثیت کو کامل واقع بینی کے ساتھ واضح کرتا ہے۔اور اس کی نخوت وغرور اور جھوٹی بلندی پروازی میں کمی کرتا ہے۔

انسان کی اصالت کا یہ معنی نہیں ہے کہ ہم کمال مطلق سے اس کے تعلق کو منقطع کر دیں اور شخصیت عطا کرنے کے بہانے اس کو خود خواہ اور خود پرست بنا دیں جس کا مفہوم تمایلات نفسانی کے مقابلہ میں اس کے عجز وتوانائی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

کیا انسان کا علم ودانش، اخلاق ونیکوکاری اور ہنروزیبائی کے ساتھ تعلق اس کی اپنے آپ سے بیگانگی کا سبب ہے یا یہ کسب کمال کا سبب ہونے کی وجہ سے ایک قسم کی اپنی طرف بازگشت ہے؟ عین یہی بات خداجوئی اور خدایابی کے بارے میں بھی کارفرما ہے کیونکہ خداجو اور خداپرست انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ کمال مطلق کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی وجہ سے اپنے کمال میں اضافہ کرے۔

''ہیومنزم'' اور''اصالت انسان'' کی حفاظت کے صحیح معنی بھی اس کو اخلاقی قدروں اور انسانی خوبیوں کی طرف چلانا ہے جو اسی کی ذات کی طرف لوٹتی ہیں اور اس کی ذات میں جگہ لیتی ہیں۔

مارکسزم خدا پرستی کے اصلاحی آثار سے اس قدر غافل ہے کہ وہ خدا پرست کو فاقد شخصیت سمجھتا ہے اور خود پرستی اور نفس پرستی کو شخصیت کی تجلی کا سبب جانتا ہے۔

اس نے خدا کو ایک ستم گر اور خود غرض حاکم کی طرح تصور کر لیا ہے جو بندوں کو جھکانے اور ان کی شخصیت کو منہدم کرنے سے لذت حاصل کرتا ہے اور ان کی شخصیت کو سلب کرنے سے پہلے مقام کو اونچا سمجھتا ہے جبکہ خدا کی پرستش طلب کمال، خدائی رنگ میں رنگے جانے کی راہ پر چلنا، ایک قسم کی حق شناسی، اس کی نعمتوں کی قدردانی اور خدائی نعمتوں سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی لیاقت کے اظہار کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

خدا پرستی ایسے کمال آفرین اور قیمتی آثار کی حامل ہے جس میں کسی بھی عقلمند آدمی کو شک نہیں ہے۔

''خدا شناسی'' علوم ودانش میں تکامل کا سبب انسان کی بے حد وحساب خواہشات کو کنٹرول کرنے والی اخلاقی فضائل اور انسانی خوبیوں میں اضافہ کرنے والی اور سختیوں اور دشواریوں میں روح کو آرام وسکون دینے کا سبب ہے۔'' اور خدائی محققین نے عقائد ومذاہب سے مربوط کتابوں میں اس کے اخلاقی آثار کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔[1]

روح کے اندر مذہب کی جڑ

متفکرین کی نظر میں مذہب کی انسان کے روح ورواں میں ایک گہری جڑ ہے۔ خدا اور ماوراء طبیعت کی طرف توجہ اندرونی احساس کی تجلی ہے جو انسان کی پیدائش میں خمیر کی گئی ہے انسان نے اپنی زندگی کی تاریخ میں کئی عادات ورسوم ایجاد کئے۔ اس کے بعد اس نے انہیں بھلا دیا ہے۔ لیکن مذہب کبھی بھی اس کے قاموس زندگی سے حذف نہیں ہوا اور اس نے اسے وداع نہیں کیا اور اس کے بدلتے رہنے کی خاصیت نے مذہب

---

[1] مذکورہ بالا امور میں خدا شناسی کے ارزندہ آثار سے آگاہی کے لیے کتاب ''راہ خدا شناسی'' کی طرف رجوع کریں۔

کے بارے میں کوئی اثر نہیں دکھایا اور یہ سب باتیں اس بات کی ترجمانی کرتی ہیں کہ مذہب انسان کے اندر ایک گہری جڑ رکھتا ہے۔

موجودہ زمانہ کا ماہر نفسیات مذہبی حس کو چار حواس میں سے ایک سمجھتا ہے جو روح انسانی کے متن کو تشکیل دیتے ہیں اور وہ چار حواس یہ ہیں۔

۱۔تلاش علم اور جستجو کی حس

۲۔اخلاق و نیکوکاری کی حس

۳۔تلاش ہنر اور حسن پسندی کی حس

۴۔خدا جوئی اور مذہب کی حس

اورانہوں نے چاروں حواس کے بارے میں __ کہ یہ کس طرح روح انسانی کے ساتھ ملی ہوئی ہیں[1]۔ بہت ہی عمدہ باتیں کہی ہیں۔

اس صورت میں ٹھیک مارکس کے نظریہ کے برخلاف، خدا جوئی ایک قسم کی اپنے آپ کی طرف بازگشت ہے اور خدا کا انکار والحاد ایک قسم کے اپنے آپ سے بیگانگی ہے اور یہ حقیقت ذیل کی آیت میں واضح طور پر بیان ہوئی ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللهَ فَأَنْسٰهُمْ أَنْفُسَهُمْ ط (حشر۔۱۹)

''تم ان لوگوں کی مانند نہ ہوجاؤ جنہوں نے خدا کو فراموش کردیا، تو خدا نے بھی انہیں ''خودفراموشی'' میں مبتلا کردیا۔''

یہ آیت واضح طور پر ''خدافراموشی'' کو ''خودفراموشی'' کا سبب سمجھتی ہے۔

اس کا نکتہ وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

امیرالمومنین اپنے کلمات قصار میں سے ایک میں فرماتے ہیں۔

''من نسی الله انساہ نفسه واعمی قلبه۔''[1]

جو شخص خدا کو بھلادے خدا اسے خودفراموشی اور دل کے اندھے پن میں مبتلا کردیتا ہے۔''

علت کے ساتھ معلول کی حیثیت

اصولی طور پر فلسفی دلائل کے لحاظ سے معلول کا وجود علت سے وابستہ اور اس کے ساتھ قائم وجود کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے، اور معلول علت کے ساتھ لطیف ترین اور دقیق ترین وابستگی رکھتا ہے۔ اس بناء پر عالم امکان کی واقعیت اور حقیقت، چاہے وہ انسان ہو یا کوئی اور آفریدگار کے ساتھ ایک قسم کی وابستگی اور تعلق کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اس بناء پر خدائے یگانہ کے وجود کا اعتراف اور منبع کمال کی طرف توجہ ایک طرح سے

---

[1] فہرست غرار الحکم ۳۸۱۔

اس واقعیت کا اعتراف ہے جس سے فلسفی براھین نے پردہ اٹھایا ہے۔ اور خدا کا انکار والحاد اور اس کی طرف سے بے توجہی ایک طرح سے حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے۔

اگر واقعتا معلول ومخلوق، تعلق ووابستگی کے سوا اور کوئی حیثیت اور حقیقت نہیں رکھتے تو کیا اس تعلق کا اعتراف حقیقت پسندی ہے یا اس کا انکار؟......اور اگر انسان بالاتر اور برتر ذات کی مخلوق ہے تو ایسی وابستگی کے ساتھ توجہ جو اس کے وجود کی عین واقعیت ہے خود بیانگی ہے یا عین خودگرائی؟"

"مارکس" "خود بیگانگی" کے خیال کو "انسان کی مالکیت" کے بارے میں پیش کرتا ہے اور اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کا کسی چیز کا مالک ہونا انسان کے اپنے غیر سے تعلق پکڑنے کا سبب ہے اور "اقتصادی خود بیگانگی" سے فرار کرنے کے لیے اصل مالکیت کا انکار کرنا ہے۔

انسان کی مالکیت کے بارے میں گفتگو جو مارکس کے نظریہ کے مطابق "خود بیگانگی" کا سبب ہے، ہم کسی دوسرے وقت پر چھوڑتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں اجمالی بات یہ ہے کہ۔

اسلام میں مالکیت کی حقیقت مال کا انسان سے تعلق ہے نہ کہ انسان کا مال سے تعلق۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کی نظر میں مآل انسان کے لیے زندگی کا وسیلہ ہے نہ کہ ہدف ومقصد۔ مالکیت اس صورت میں خود بیگانگی کا سبب ہے جب دنیا ہدف اور آرزوؤں کا کعبہ ہو نہ کہ وسیلہ زندگی۔

امیر المومنینؑ نے اس بارے میں بہت ہی لطیف تعبیر بیان فرمائی ہے۔

آپ فرماتے ہیں۔

"ومن البصر بها بصرته ومن ابصر اليها اعمته۔"[1]

"جو شخص اس دنیا کی طرف پل اور گذرگاہ اور کام کے آلات اور وسیلہ کی نگاہ سے دیکھے تو یہ اس کے دل کی روشنی کا سبب بنتی ہے اور جو شخص ہدف اور مقصد کی نظر سے دیکھے تو وہ اس کو دل کا اندھا اور بے بصیرت بنا دیتی ہے۔

اس لحاظ سے اسلام میں دنیاداری اور تجمل پرستی مذموم ہے اور انسان کی سعادت کے نابود ہونے کا سبب سمجھی جاتی ہے۔

آخر میں ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ وہ نظریہ جو مارکس کی طرف سے مذہب کے سایہ میں انسان کی خود بیگانگی کے بارے میں نقل ہوا ہے وہ خود اس کے ساتھ مربوط نہیں ہے بلکہ یہ اس نے مادیت کے پیشوا "فویر باخ" سے لیا ہے جو "مارکس" سے پہلے ہوا ہے اور اس نے اسے "ہیومنزم" (اصالت انسان) کے تحت اپنے فلسفہ میں داخل کیا ہے۔

مادیگری کے فلسفہ میں اس اصل کو داخل کرنے کا مقصد مادیگری کے فلسفہ کی خشکی اور خشونت کو دور کرنا ہے جسے مغرب کا انسان محسوس کرتا ہے کیونکہ اٹھارہویں صدی کی مادی گری انسان کو ایک مشینری کی طرح سمجھتی تھی اور "مکانیسم" اس کو ایک مشین کی طرح خیال کرتا تھا۔ انیسویں

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۷۹، اہل ادب کے لیے "بھا" اور "الیھا" کا فرق واضح ہے اور امام اس مختصر سے جملہ میں دنیا کی طرف توجہ کے بارے میں اسلام کے نظریہ کو واضح کرتے ہیں۔

صدی میں میکانکی کا نظریہ مردود قرار پایا اور ''ڈائی لیکٹک'' ماویگری میکانیکی مادی گری کی جانشین ہوئی۔لیکن ہر حال میں دونوں اصالت مادہ اور نفسی معنویت کے زیر اثر ایک خاص قسم کی خشکی اور خشونت کے ساتھ__ جوا انسان کی لطیف اور معنویت خواہ روح کے ساتھ ساز گار نہیں ہیں[1] توأم ہو گئے ہیں۔

''فویر باخ''اپنی ایک گفتگو میں اس طرح کہتا ہے کہ''پرستش کرنے والے''انسان میں ایک قسم کے تعلق اور وابستگی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے کیا اچھا ہو کہ وہ اس حالت سے نکل آئے اور دوسرے لفظوں میں جب انسان خدا کی پرستش کرتا ہے اور اس کی فرمانبرداری کرتا ہے تو وہ ایک وابستہ موجود اور فاقد شخصیت دکھائی دیتا ہے پھر وہ اپنے آپ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ مارکس بھی ان ہی جملوں کا تکرار کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ''انسان کو خود اپنے گرد گھومنا چاہیے نہ کہ کسی دوسرے کے گرد۔

مارکسزم نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی اقتصادی بحث کے لیے ایک فلسفی اصل بھی سوچنا چاہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان کی مالکیت اپنے غیر سے اس کے تعلق کا سبب بنتی ہے اور انسان کو اشیاء وآلات کی طرح اپنے غیر سے متعلق وابستہ نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن مارکسزم اس اصرار کے باوجود جو وہ اس بارے میں انجام دے رہا ہے ابھی تک مادی گری کے فلسفہ کی خشونت وقساوت سے ذرہ برابر بھی کمی نہیں کر سکا۔ کیونکہ جو فلسفہ مادہ اور انرجی کے علاوہ اور کسی چیز کے بارے میں سوچتا ہی نہیں اور انسان کے ارتقاء وتکامل کو آلات تولید اور روابط اقتصادی کے تکامل کے سایہ میں سمجھتا ہے یہاں تک کہ وہ تکامل کا عامل بھی انسان کے اندر کسی امر کو نہیں سمجھتا اور اسے خارجی عامل (تکامل اقتصادی) سے اٹھنے والی ایک چیز سمجھتا ہے۔ وہ اصالت انسان اور انسان گرائی کے بارے میں کس طرح سے گفتگو کر سکتا ہے اور معنویت کا کیسے دم بھر سکتا ہے۔

اگر واقعتاً انسان گرائی کا مسئلہ درپیش ہے اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کے علاوہ کسی چیز کو اصالت نہیں دینی چاہیے تو پھر وہ انسان کے تکامل کو ذرائع پیداوار اور روابط اقتصادی سے وابستہ کیوں سمجھتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اقتصاد کو انسان کی خدمت میں قرار دیں، انسان کو اقتصاد اور ذرائع پیدوار کی خدمت میں لے آتے ہیں۔

اگر انسان اصل ہے تو پھر وہ اسے ایک مصرف کرنے والے حیوان کی حد میں نیچے کیوں لے آتے ہیں اور ہمیشہ یہ نعرہ لگاتے رہتے ہیں کہ ہر شخص سے اس کی''طاقت''اور توانائی کے مطابق کام لینا چاہیے اور اس کی ضرورت کے مطابق اسے دینا چاہیے۔

۱۴۔ پیغمبروں کی تدبیروں میں شیطان کے وسوسے

عقلی دلائل اور قرآنی آیات پیغمبروں کی عظمت پر گواہی دیتے ہیں اور قرآن وضاحت کے ساتھ یہ بتاتا ہے کہ شیطان کا خدا کے مخصوص بندوں پر ___ جن کے رأس و رئیس انبیاء و رسل ہیں......کوئی بس نہیں چلتا[1]

اس کے باوجود سورہ سجدہ کی آیت ۵۲، ۵۳ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب انبیاء مرسلین کسی کام کی تمنا کرتے ہیں تو شیطان ان کی تمناؤں اور خواہشوں میں مداخلت کیا کرتا تھا تو اس وقت خدا اس چیز کو جسے شیطان القاء کیا کرتا تھا۔ محو و نابود کر دیتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبروں کی تمناؤں میں شیطان کی مداخلت کیا ہے؟

اور اسی طرح سے خدا کی جانب سے اس مداخلت کے اثر کے محو و نابود ہونے سے کیا مراد ہے؟

جواب:

دونوں سوالات کے جواب کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم ان آیات کا معنی اور ترجمہ پیش کریں اور پھر دونوں سوالات کا جواب دیں۔

ان آیات کا متن اور ترجمہ یہ ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ‌ ۚ فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ‌ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۙ‏ ﴿۵۲﴾ (حج)

''ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ جب اس نے کوئی تمنا کی تو شیطان نے اس کی تمنا میں مداخلت کی اور خدا اس چیز کو جسے شیطان القاء کرتا ہے محو کر دیتا ہے۔ اور اپنی آیات کو استحکام بخشتا ہے اور اللہ دانا اور حکیم ہے۔''

لِّيَجۡعَلَ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ فِتۡنَةً لِّلَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ وَّالۡقَاسِيَةِ قُلُوۡبُهُمۡ‌ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ لَفِىۡ شِقَاقٍۢ بَعِيۡدٍ ۙ‏ ﴿۵۳﴾ (حج)

''خدا اس چیز کو جسے شیطان انجام دیتا ہے اس گروہ کے لیے کہ جن کے دل بیمار اور سخت ہیں آزمائش کا سبب بنا دیتا

---

[1] حجر۔ ۴۰، ص۔ ۴۳۔

ہے اور ستم گر اختلاف کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔''

وَّلِيَعۡلَمَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ اَنَّهُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَيُؤۡمِنُوۡا بِهٖ فَتُخۡبِتَ لَهٗ قُلُوۡبُهُمۡ‌ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ‏ ﴿۵۴﴾ (حج)

''تا کہ صاحبان علم یہ جان لیں کہ قرآن حق ہے اور پروردگار عالم کی طرف سے ہے وہ اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل اس کے سامنے خضوع کریں، خدا ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے۔''

اب ضروری ہے کہ ہم ''تمنی'' اور ''امنیته'' کے معنی سے آشنا ہوں اور ان دونوں الفاظ کے واقعی معنی سے صحیح آگاہی سے ہی آیت کے مقصد کی وضاحت ہو سکتی ہے۔

اور اس کے ضمن میں آیات کی تفسیر سے پہلے پیغمبروں کی سنت اور ان کے دشمنوں کے ردعمل کو بیان کرتے ہیں۔

ان دونوں حصوں کا بیان یہ ہے۔

ا۔ ''تمنی'' ''منی'' میم کی زبر اور نون کے سکون کے ساتھ[1] سے مشتق ہے اور یہ لفظ عربی زبان میں ایک سے زیادہ معنی نہیں رکھتا اور وہ کسی محبوب چیز کی تقدیر اور فرض کرنا ہے۔

اب اگر کسی چیز کی آرزو کرنے کو ''تمنی'' کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آرزو کرنے والا شخص اس چیز کے وجود خارجی کو فرض کر لیتا ہے۔

اور اگر انسان کے نطفہ کو ''منی'' کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے ایک انسان فرض ہوتا ہے، اور اگر موت کو منیہ کہتے تو اس کی علت یہ ہے کہ موت تمام جانداروں کے لیے فرض اور تقدیر کی گئی ہے۔

اور اگر آرزو کی صورت ذہنی کو ''تمنی'' کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے وجود کو اس نے خارج میں فرض کیا ہے۔

اگر سرزمین ''منی'' کو منی کہتے ہیں تو وہ بھی اس لحاظ سے ہے کہ گوسفند کا ذبح ہونا وہاں پر مفروض اور مقدر شمار کیا گیا ہے۔''[1]

۲۔ پیغمبران خدا ہمیشہ اپنی امتوں کے درمیان ہدایت کی نشر و اشاعت اور اپنے دین کو پھیلانے کے خواہاں ہوتے تھے اور اپنے اہداف و مقاصد کی پیش رفت کے لیے منصوبے بناتے تھے اور اس راہ میں انواع و اقسام کے مصائب و شدائد برداشت کرتے تھے اور صبر و استقامت دکھاتے تھے اور قرآن کی آیات امتوں کے تکلیف پہچانے اور انبیاء کے صبر و بردباری کی حکایت کرتی ہیں۔

پیغمبروں کے دشمن انسانوں اور خود ان کی امتوں میں ہی منحصر نہیں ہوتے تھے بلکہ شیطان اور اس کی اولاد ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال کر انہیں پیغمبروں کے خلاف ابھارنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے تا کہ پیغمبروں کو ان کے منصوبوں میں کامیاب نہ ہونے دیں اور انہیں ہدایت کے کاموں میں موفق ہونے سے باز رکھیں۔ قرآن مجید اس حقیقت کی طرف ذیل میں بیان کردہ آیت میں اشارہ فرماتا ہے۔

---

[1] المقابیس ج ۵ ص ۲۷۶۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ (انعام۔۱۱۲)

''ہم نے تمام نبیوں کے لیے جنوں اور انسانوں میں سے دشمن قرار دیئے ہیں اور وہ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے بنی سنوری باتیں ایک دوسرے کی طرف القاء کرتے ہیں۔

پیغمبر اسلام بھی اس قانون سے مستثنٰی نہیں تھے وہ بھی اپنے دینی مقاصد کی پیش رفت کے لیے منصوبے اور نقشے بناتے تھے اور اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کے حصول کے لیے کچھ مقدمات ترتیب دیتے تھے لیکن آخر کار وہ بھی لوگوں کی مخالفت اور مخالفین کے دلوں میں وسوسہ کے طریقہ سے شیطان کی مداخلت سے روبرو ہوتے تھے اور آپ کی فعالیت اور منصوبے ایک مدت تک بے کار ہو کر رہ جاتے تھے لیکن آخر کار خدا کی عنایات کے سایہ میں وہ مداخلت ختم ہو جاتی تھی۔اور پیغمبر اپنی آرزو تک جو مقاصد الٰہیہ کی پیش رفت تھی پہنچ جاتے تھے۔

اب آیات کے جملوں کا تجزیہ اور تحلیل پیش خدمت ہے۔

۱۔ وما ارسلنا قبلك من رسول ولا نبیّ۔''

''ہم نے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہ سب کے سب ذیل کے مقصد میں مشترک تھے۔''

۳۔ ''الّا اذا تمنّیٰ القی الشیطان فی امنیّته۔''

'جس وقت وہ کوئی تمنا اور آرزو کرتے اور کوئی منصوبہ بناتے تاکہ وہ کسی نتیجہ تک پہنچیں۔دوسرے لفظوں میں وہ اپنی خواہش کا کوئی وجود خارجی فرض اور مقدر کرتے تو فوراً شیطان ان کی خواہشات اور آرزوؤں میں مداخلت کر دیتا تھا۔اب دیکھنا یہ ہے کہ شیطان کا انکی خواہشات میں مداخلت کرنا اور ان کا محو کرنا کس طرح ہوتا تھا۔

پیغمبروں کی خواہشات میں شیطان کی مداخلت سے کیا مراد ہے؟

شیطان ان دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں مداخلت کرسکتا ہے۔

ا۔ یا تو وہ پیغمبروں کے ارادوں اور مقاصد میں شک اور شبہ پیدا کردیتا ہو اور یہ ان کے درمیان اور ان کے اہداف و مقاصد کے درمیان بے شمار رکاوٹیں ہیں اور ان رکاوٹوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے وہ اپنے اہداف میں کامیاب نہیں ہوں گے۔

۲۔ یا جس وقت پیغمبر کسی کام کے مقدمات فراہم کر لیتے ہیں تھے اور پیغمبر کے پختہ اقدام کی پختہ علامات اور قرآئن نظر آنے لگتے تو شیطان لوگوں کو پیغمبروں کے خلاف اکسا کر اور مقصد کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر کے انہیں اپنے مقصد اور خواہش میں کامیابی سے روک دیتا تھا۔

پہلا احتمال نہ تو قرآن کی دوسری آیات کے ساتھ سازگار ہے اور نہ ہی دوسری زیر بحث آیت کے ساتھ دوسری آیات کے لحاظ سے تو اس لیے چونکہ پوری صراحت کے ساتھ خدا کے واقعی بندوں پر شیطان کے تسلط کی نفی کرتا ہے چاہے وہ اس طرح ہو کہ وہ انہیں یہ ظاہر کرے کہ وہ اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو پورا کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔''

اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ (حجر۔ ۴۲۔ اسراء۔ ۶۵)

''میرے بندوں پر تیسرا تسلط نہیں ہوگا۔

اور پھر فرماتا ہے۔

اِنَّہٗ لَیۡسَ لَہٗ سُلۡطٰنٌ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ﴿۹۹﴾ (نحل)

''شیطان کا مومن اور کدا پر توکل کرنے والے بندوں پر تسلط نہیں ہوتا۔

یہ آیات اور دوسری آیتیں جو اولیاء اللہ کے دلوں میں شیطان کے نفوذ کی نفی کرتی ہیں اس بات کی گواہ ہیں کہ پیغمبروں کی آرزوؤں میں شیطان کی مداخلت ان کے ارادہ کو سست کرنا اور ان کی نظر میں کام کی رکاوٹوں کو بڑا کر کے دکھانا نہیں ہے۔

البتہ زیر بحث دوسری اور تیسری آیت خود اپنی نظر سے اس مداخلت کی اس طرح تفسیر کرتی ہے کہ ہم اس کام کے ذریعہ دو گروہوں کو آزماتے ہیں، ایک تو ان گروہوں کو کہ جن کے دل بیمار ہیں اور دوسرا عالم و دانا لوگوں کا گروہ جو خدا اور اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں۔

یعنی پہلے گروہ کو تو پیغمبروں کے اہداف کے برخلاف لوگوں کو ابھارنے کے طریقہ سے شیطان کی مداخلت، ان کی پیغمبران خدا کی مخالفت کا سبب بنتی ہے، جب کہ دوسروں کے بارے میں معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا اور وہ ان کے ثبات قدم اور استواری میں اضافہ کرتا ہے۔

اس بات سے کہ پیغمبروں کی خواہشات اور آرزوؤں میں شیطان کی مداخلت دو قسم کے مختلف اثر رکھتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی مداخلت دوسرے معنی میں ہے۔ یعنی ان کے برخلاف لوگوں کو بھڑکانے اور دشمنوں کے دلوں میں وسوسے ڈالنے اور ان کے اہداف و مقاصد کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے طریقہ سے صورت پذیر ہوتی ہے، نہ یہ کہ وہ پیغمبروں کے دل میں تصرف کرتا ہے اور ان کے ارادہ عزم کو شل اور

سست بناتا ہے۔

یہاں تک پیغمبروں کی تمناؤں میں شیطان کی مداخلت واضح ہوگئی اب ہم دوسرے مطلب، یعنی خدا کی طرف سے اس مداخلت کے آثار کو محو کردینے کی وضاحت کرتے ہیں۔

مداخلت کے آثار کو محو کرنے سے کیا مراد ہے؟

اگر شیطان کی مداخلت کا مطلب لوگوں کو لوگوں کے خلاف بھڑکانا ہے کہ وہ انہیں پیش رفت کرنے سے روکے تو اس صورت میں خدا کا شیطان کے کام عمل کو محو دنابود کرنا یہ ہے کہ خدا ان کے مکروفریب وشر کو اپنے رسولوں سے دفع کرتا ہے تاکہ مومنین پر حق آشکار ہوجائے اور تاریک دلوں کے لیے آزمائش ہو جیسا کہ دوسری آیت میں فرماتا ہے۔

اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (مومن۔۵۱)

''ہم پیغمبروں کی، اور ان لوگوں کی، جو ایمان لائے ہیں اس دنیا میں بھی مدد کرتے ہیں۔''

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن ان آیات میں خدا کی اپنے پیغمبروں کے بارے میں ایک دیرینہ اور پائیدار سنت کی خبر دیتا ہے اور وہ پیغمبروں کی طرف سے اہداف کی پیش رفت کی تمنا اور لوگوں کی ہدایت پر موفق ہونے کی آرزو ہے اس کے بعد شیطان اور جنوں اور انسان میں سے شیطان صفت افراد کی خدا کے رسولوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر کے مداخلت کرنا اور پھر خدائی امدادوں کا آن پہنچنا اور شیطانی منصوبوں کا محو دنابود کرنا ہے اور یہ خدائی سنت گذشتہ تمام امتوں کے درمیان رہی ہے اور پیغمبروں کی تاریخ اور نوحؑ وابراہیمؑ اور بنی اسرائیلؑ کے رسولوں، خصوصاً موسیٰؑ وعیسیٰؑ کے قصص وواقعات اور پیغمبر خاتم کی زندگی کی تاریخ، اس مطلب پر گواہی دیتے ہیں۔

۱۵۔قرآن کی تفسیر کا صحیح طریقہ [1]

بیسویں صدی میلادی یا چودہویں صدی اسلامی مشرق اور مشرق میں رہنے والوں، خصوصاً مسلمانوں کی بیداری کے ساتھ شروع ہوئی۔ اس صدی میں استعمار اور سامراج کا طلسم ایک حد تک ٹوٹ گیا۔ مستعمرہ ممالک آزاد یا نیم آزاد ملک کی صورت میں آ گئے، مسلمان اور ان کے فکری وعلمی رہنما کچھ اساسی اور بنیادی مسائل میں سوچنے اور غور وفکر کرنے لگے، انہوں نے کمزوری اور پسماندگی کے علل واسباب کا مطالعہ کیا اور چارہ جوئی کی کوشش میں لگ گئے۔

وہ مسائل جن کی طرف زیادہ توجہ دی گئی قرآن کے حقائق وعلوم کے معارف کی نشر واشاعت تھی کیونکہ گذشتہ صدیوں میں صرف علماء کا طبقہ ہی اس

[1] یہ حصہ تفسیر قرآن کے شائقین کی درخواست پر لکھا گیا ہے۔ اگرچہ دوسرے مواقع پر بھی ہم نے اس سلسلہ میں بیان کیا ہے۔

کتاب آسمانی کے حقائق وعلمی سے بہرمند ہوتا تھا اور لوگوں کے دوسرے طبقے صرف ناظرہ خوانی (دیکھ کر پڑھ لینا) پر اکتفا کرتے تھے اور زیادہ تر ناظرہ خوانی اور تجوید میں ہی کوشش کیا کرتے تھے اور تفسیر کی کتابیں جوان صدیوں میں لکھی گئیں ان کا مقصد صرف علماء اور دانشمندوں کے طبقہ کی رہنمائی تھی اور ایسا بہت ہی کم اتفاق ہوا ہے کہ کوئی مفسر مفاہیم قرآن کی طرف رہنمائی کے لیے تفسیر لکھے، یا تفسیر کے لیے کوئی مجلس تشکیل دے۔ گویا علماء اور دانشمندوں سے تو آیات قرآنی میں غور وفکر مطلوب تھا اور دوسرے تمام طبقات سے ناظرہ خوانی اور صرف تجوید وقرأت مطلوب تھی۔

یہ طرز فکر، علاوہ اس کے کہ بے شمار ضرر رکھتی تھی جس کے نقصانات کا علماء کو بعد میں پتہ چلا[1] خود صریح قرآن کے بھی مخالف ہے کیونکہ قرآن تمام لوگوں کو قرآنی آیات کے معانی میں غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اسے مشعل فروزاں اور متقیوں کے لیے بہترین رہنما اور ہادی اور ''تذکرہ'' اور یاد آوری کا ذریعہ بتاتا ہے اور ان لوگوں کی جو قرآن کے سننے اور اس کے معانی میں تدبر وتفکر کرنے سے روگردانی کرتے ہیں سخت ترین طریقہ پر مذمت کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿٤٩﴾ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾

(مدثر)

''انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ قرآن سے روگردانی کر رہے ہیں، گویا وہ بھاگنے والے گدھے ہیں۔ جو شیر سے بھاگتے ہیں۔

وہ آیات جو متقیوں اور عقل مندوں اور مفکرین اور ہوش مندوں کو قرآن کے مفاہیم کی طرف کان دھرنے اور انہیں یاد کرنے کی دعوت دیتی ہیں اس قدر زیادہ ہیں کہ ہم ان کے متن وترجمہ اور ان کے مواقع کے تعین کو چھوڑتے ہیں اور صرف ایک ہی آیت کے نقل اور ترجمہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور اس مطلب سے آگے گذر جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿١٧﴾ (قمر)

''ہم نے قرآن کو پند ونصیحت اور تذکر کے لیے آسان کر دیا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔''

یہ آیت اور اس کے مانند دوسری آیات یہ بتاتی ہیں کہ قرآن کو سمجھنا اور اس سے فائدہ اٹھانا کسی خاص طبقہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ عامۃ الناس کو آیات قرآنی سے فائدہ حاصل کرنے سے دور رکھنا ان تجربات کی روشنی میں، جن سے گذشتہ صدیوں میں نتیجہ حاصل ہوا ہے وہ اس کتاب آسمانی کے خود متن کے خلاف ہے۔

اس لحاظ سے وہ تبدیلیاں جو چودیں ہجری کے آغاز میں تفسیر کے بارے میں ظاہر ہوئی ہیں۔ وہ جلسات تفسیر کا عمومی ہونا اور عامۃ الناس کو اس

کتاب سے آشنا کرنا ہے اور اس سلسلہ میں اسلامی ممالک کے طول وعرض (مصر، شام، عراق، پاکستان، ایران) میں تفاسیر لکھی گئی ہیں اور ایسے جلسات تشکیل دیئے گئے کہ جن کا مقصد عامۃ الناس کو قرآن سے آشنا کرنا ہے۔

یہاں پر ضروری ہے کہ ہم صحیح تفسیر کی روش اور طرز کو اس طرح سے واضح کریں کہ اس طریقہ سے قرآن کے معارف ومفاہیم کو سمجھنے کے شائقین کی مدد سے قرآن کی نصیحتوں کی طرف بڑھیں۔

زبان عربی کے قواعد سے آگاہی

قرآن کی تفسیر کے لیے پہلی بنیاد یہ ہے کہ مفسر قرآن کو عربی زبان کے قواعد سے مکمل طور پر آگاہ ہونا چاہیے تاکہ علم وآگاہی کے ساتھ فاعل کو مفعول، ظرف کو مظروف، حال کو ذوالحال، معطوف کو معطوف علیہ سے اچھی طرح پہچان سکے۔ یہ صرف قرآن ہی نہیں ہے کہ جس کے لیے اس قسم کی باتوں کی مستقل ضرورت ہے بلکہ ہر کتاب سے استفادہ، چاہے وہ کسی بھی زبان میں ہو، اس زبان کی گرامر سے آگاہی کی مرہون منت ہے کیونکہ آیت کے معنی میں اکثر ایسے اشتباہات سامنے آتے ہیں جن کی اصل بنیاد زبانی عربی کے قواعد سے عدم آگاہی ہے۔

یہ شرط اتنی واضح ہے کہ ہمیں اس کے بارے میں کسی بھی قسم کی گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

البتہ علم وآگاہی سے مقصود علوم اشتقاق اور صرف ونحو میں سپیلشٹ اور ماہر ہونا نہیں ہے کیونکہ تفسیر قرآن کے لیے ان دوعلوم میں تخصص اور ماہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ اجمالی طور پر جان لینے سے اس قسم کے مسائل کو تشخیص کر سکے اور اشتقاق اور صرف ونحو کے بارے میں اس قسم کی تشخیص کے لیے ایک عمومی دورہ تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے۔

مفرداتِ قرآن کے معانی سے آگاہی

قرآن کے مفردات کے معانی سے آگاہی تفسیر قرآن کے لیے ایک بنیادی اور اساسی چیز ہے کیونکہ مرکب کو سمجھنا اس کے مفرد کو سمجھنے کی فرع ہے۔ اس شرط میں لازمی نکتہ یہ ہے کہ مفردات کے ان مفاہیم پر کہ جو ہمارے ذہن میں موجود ہیں ہرگز تکیہ نہیں کرنا چاہیے اور اس کی بنیاد پر آیت کی تفسیر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اکثر زمانہ کے گذرنے کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معانی میں تبدیلی واقع ہوجاتی ہے اور پیغمبر کے زمانہ میں جو معانی معروف تھے ان میں اسی طرح سے تغیر ہوا ہے۔ اسی وجہ سے لفظ کی اصل اور جڑ بنیاد کو معلوم کرنا چاہیے اور اس کے بعد اس اصل اور جڑ کے معانی کا پتہ چلانا چاہیے اور پھر آیت کی تفسیر کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔

''مثلاً لفظ ''عصیٰ'' و''غوٰی'' موجود زمانہ کے عرف عام میں گناہ کیا'' اور'' گمراہ ہوا۔'' کے معنی میں ہے حالانکہ ان الفاظ کے اصل ریشہ اور جڑ کے معانی اس چیز کے علاوہ ہیں جو آج ہمارے ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

ہم ایک گروہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ''وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ (طٰہٰ) سے پیغمبروں کی عدم عصمت پر استدلال کرتے ہیں

اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ''عصیٰ''، ''غویٰ'' کا معنی عصر رسالت میں بھی انہیں معانی میں تھا جو آج ہمارے اذہان میں موجود ہیں حالانکہ اگر ان دونوں الفاظ کی، معنی کے لحاظ سے جڑ بنیاد معلوم کی جائے تو ہم دیکھیں گے کہ یہ دونوں لفظ ایسے دو بنیادی اور اصل معنی میں کہ آج جو کچھ ان الفاظ کے بارے میں ہمارے ذہن میں بیٹھا ہوا ہے وہ انہیں اصل اور بنیادی معنی سے مشتق ہے اور ان دونوں لفظوں کے اصل اور بنیادی معنی سے اصطلاحی معصیت کے معنی ہرگز لازم نہیں آتے [1]

بہترین کتاب، جو الفاظ قرآن کے اصلی معانی کو معلوم کرنے کے سلسلہ میں ہماری رہنمائی ہو سکتی ہے وہ کتاب ''المقائیس'' تالیف احمد بن فارس بن ذکریا متوفی سال ۳۹۵ ہے۔

یہ کتاب مصر میں چھ جلدوں میں چھپی ہے اور کتاب کے مؤلف کی پوری کوشش یہ ہے کہ الفاظ کے اصل اور بنیادی معانی ہم تک پہنچادے اور اس کے بعد وہ یہ بتاتا ہے کہ پھر دوسرے معانی اس اصل بنیاد اور ریشہ وجڑ سے تدریجاً کس طرح مشتق ہوئے اور بہ ظاہر ایک مستقل معنی کی صورت اختیار کر گئے۔

آپ آج لغت کی اکثر کتابوں میں کچھ الفاظ کے لیے دس دس معانی ملاحظہ کرتے ہیں اور انسان یہ خیال کرتا ہے کہ یہ لفظ دس معنی کے لیے ہی وضع ہوا ہے اور اس کے دس ہی معانی ہیں لیکن جب وہ کتاب ''المقاییس'' کی طرف رجوع کرتا ہے تو واضح ہوجاتا ہے کہ اس لفظ کا صرف ایک ہی معنی ہے اور دوسرے معانی اس ایک ہی معنی کی مختلف شکلیں ہیں جنہوں نے صرور زمانہ کے ساتھ تعدد اور مستقل معنی کا رنگ اپنا لیا ہے۔

اس کتاب کے علاوہ ایک مفسر واقعی کو مفردات کے معنی کی تشخیص کیلئے ابوقاسم حسین بن محمد معروف بہ راغب اصفہانی متوفی سال ۵۰۲ کی تالیف **المفردات فی غریب القرآن** اور مجدالدین ابوالسعادت مبارک بن محمد جزری معرف بہ ابن اثیر متولہ ۵۴۴ متوفی ۶۰۶ کی تالیف ''النہایۃ فی غریب الحدیث و الاثر'' سے استفادہ کرنا چاہیے اور آخر کتاب مصر میں چھ جلدوں میں طبع ہوئی ہے اگرچہ یہ کتاب مفردات حدیث کے بارے میں ہے لیکن یہ تفسیر قرآں میں بھی شایان شان مدد کر سکتی ہے۔

قرآن کی قرآن سے تفسیر

قران خود کو پوری وضاحت کے ساتھ تمام چیزوں کو بیان کرنے والا کہتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَنَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَىۡءٍ (نحل-۸۹)

''ہم نے قرآن کو ہر چیز کا بیان کرنے والا بنا کر تجھ پر نازل کیا ہے۔''

جب قرآن ہر چیز کو بیان کرنے والا ہے تو پھر یقیناً اپنے آپ کو بھی بیان کرنے والا ہے۔ اس بناء پر اگر کسی آیت میں کوئی ابہام ہو اور طبعی طور پر ابہام گوئی میں مصلحت ہو تو دوسری آیات کی طرف رجوع کر کے جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں، پہلی آیت سے رفع ابہام کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] میں نے کتاب ''تفسیر صحیح، آیات مشکل قرآن'' میں اس آیت کے لیے ایک طرح کی بحث کی ہے اور دونوں کے اصل معنی کو واضح کیا ہے۔

یہاں ہم نمونہ کے طور پر ایک مثال بیان کرتے ہیں۔
خدا سورہ شعراء کی آیت ۱۷۳ میں قوم لوط کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ۝۱۷۳

''ہم نے ان پر بارش برسائی، ڈرائے گئے لوگوں کی بارش کس قدر بری تھی۔''

یہ آیت اجمالی طور پر بارش کے نازل ہونے کو بیان کر رہی ہے لیکن یہ بات واضح نہیں ہے کہ یہ بارش کس چیز کی تھی۔ کیا یہ پانی کی بارش تھی یا پتھروں کی بارش؟ لیکن دوسری آیت زیر بحث آیت کے ابہام کو دور کر دیتی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ۝۷۴ (حجر)

''ہم نے ان پر پتھروں کی بارش کی۔''

لفظ ''حجارۃ'' پہلی آیت کے ابہام کو واضح کرتا ہے۔
اس بناء پر کہ ہم اس بارے میں وسیع صورت میں گفتگو کریں ایک اور دوسرا نمونہ بھی پیش کرتے ہیں۔ قرآن ایک موقع پر فرماتا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۝۲۱۰ (بقرہ)

''یہودی اس بات کے انتظار میں ہیں کہ خدا بادل کے سائبانوں میں فرشتوں کے ساتھ ان کے پاس آئے (جبکہ) کاموں کا فیصلہ ہو چکا ہے (اور لوگوں کا انجام کار معین ہو گیا ہے) اور تمام کاموں کی بازگشت خدا کی طرف ہے۔''

اس آیت کا ظاہر ابہام سے خالی نہیں ہے کہ کیونکہ آنا اور جانا جسم کے اوصاف میں سے ہے اور ذات مقدس خدا جسم و جسمانیات سے پاک اور منزہ و مبرا ہے۔ اس صورت میں آیت کے ابہام کو ہمیں ایک دوسرے طریقہ سے دور کرنا پڑے گا۔ ان طریقوں میں سے ایک آیات متشابہ میں غور و خوض کرنا ہے کہ جن میں اس آیت کے مضمون کو دہرایا گیا ہے اور مذکورہ بالا آیت سے متشابہ سورہ نحل کی آیت ۳۳ ہے جو واضح طور پر یہ بتلاتی ہے کہ پروردگار کے آنے سے مراد خدا کے حکم کا آنا ہے جو عذاب و عقاب اور امر و نہی سے متعلق ہوتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۝۳۳

''کیا وہ اس کے علاوہ کوئی اور انتظار رکھتے ہیں کہ فرشتے ان کی طرف آئیں یا تیرے پروردگار کا فرمان آئے، گذشتہ لوگوں کی سیرت بھی اسی طرح تھی، خدا نے ان پر ستم نہیں کیا ہے، بلکہ خود انہوں نے اپنے اوپر ستم کیا ہے۔''

یہ آیت صراحت کے ساتھ پہلی آیت سے ابہام کو رفع کر رہی ہے اور لفظ ''امر'' کے ساتھ ''آنے'' کے واقعی فاعل کو واضح کر رہی ہے۔
(آیات کے ساتھ آیات کی تفسیر کی) یہ روش ایک محکم اور استوار روش ہے اور شیعوں کے آئمہؑ کا بھی یہی طریقہ تھا اور اب بھی محقق مفسرین اسی روش سے استفادہ کرتے ہیں۔
استاد بزرگ حضرت آقای طباطبائی کی تفسیر ''المیزان'' بھی اسی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔
البتہ یہ مسئلہ آیات قرآنی کے مجموعہ کی ہم آہنگی کی طرف توجہ کرنے کے مسئلہ سے جدا ہے جس پر بعد میں بحث کی جائے گی۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ ایک آیت کے اجمال کو دوسری آیت کے ذریعہ برطرف کیا جا سکتا ہے جبکہ بعد والے عنوان میں ہدف ایک دوسری چیز ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک آیت سے نتیجہ نکالتے وقت قرآن کی دوسری آیت سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے اور ہرگز یہ بات صحیح نہیں ہے۔ کہ ایک آیت سے، چاہے اس کے ظاہر میں کوئی بھی اجمال نہ ہو دوسری آیات کو نظر میں رکھے بغیر جو اسی بارے میں نازل ہوئی ہیں نتیجہ نکالیں اور اس کے مضمون کو خدا کی طرف نسبت دیں اور ان دو مطالب میں فرق واضح ہے۔

شان نزول کی طرف رجوع

قرآن مجید تیئس سال کے عرصہ میں سوالات وجوابات یا واقعات اور روئیدادوں کے ایک سلسلہ کے بعد نازل ہوا ہے۔ اس لیے شان نزول سے آگاہی، بعض اوقات، آیت کے مفہوم کو ایک خاص قسم کی روشنی بخشتی ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ شانِ نزول کے بغیر آیت کے معنی سے واقف ہی نہیں ہو سکتے اور اس کی تفسیر ہو ہی نہیں سکتی بلکہ آیات قرآنی، اس بناء پر کہ وہ ''ہدایت'' کا سبب اور ''بینۃ'' اور فرقان ہیں جیسا کہ فرماتا ہے۔

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ [1] (بقرہ۔ ۱۸۵)

اور پھر فرماتا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا [2] (نساء۔ ۱۷۴)

طبعی طور پر قابل تھیں، اور شان نزول کی طرف رجوع کئے بغیر بھی قابل فہم ہیں۔ لیکن شانہائے نزول کی طرف توجہ کرنے سے آیت کا معنی زیادہ روشن اور واضح ہو جاتا ہے۔
یہاں پر ہم ایک نمونہ پیش کرتے ہیں جو ہماری گفتگو کا شاہد بن سکتا ہے۔ سورہ توبہ میں اس طرح فرماتا ہے:

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ

---

[1] قرآن لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے اور اس میں ہدایت اور حق کی باطل سے جدائی کی نشانیاں موجود ہیں۔
[2] ہم نے تمہاری طرف واضح نور نازل کیا ہے۔

وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ (توبہ)

''خدا نے ان تین افراد کو، جنہوں نے جنگ سے تخلف کیا تھا، یہاں تک کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی۔ اور وہ خود بھی دل تنگ ہو گئے۔ اور وہ جان گئے کہ خدا کے علاوہ اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہے، تو اس وقت خدا نے انہیں ......توبہ کرنے کی توفیق دی تا کہ وہ توبہ کریں، خدا توبہ کو قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔''

اس میں شک نہیں کہ آیت کا معنی واضح ہے لیکن انسان یہ چاہتا ہے کہ اس آیت کے معنی کے سلسلہ میں ذیل میں بیان شدہ جہات سے بھی آ گاہ ہو۔

الف۔ یہ تین نفر کون تھے؟

ب: انہوں نے تخلف کیوں کیا؟

ج: زمین اُن پر کیسے تنگ ہوئی؟

د: ان کا سینہ زندگی سے تنگ اور روح میں دباؤ کیسے آیا؟

ھ: انہوں نے کس طرح سمجھا کہ خدا کے علاوہ اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہے؟

و: ان کے بارے میں توفیق الٰہی سے کیا مراد ہے؟

ان سوالات میں سے ہر ایک کا جواب اس آیت کے شانِ نزول کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوجائے گا۔ یہاں پر ہم ایک نکتہ کی یاددہانی ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہر شان نزول قابل اعتماد نہیں ہے۔ لہٰذا کسی شانِ نزول پر اعتماد کرنے کے لیے ان موازین سے کہ جن کے ذریعہ صحیح کو غیر صحیح سے تمیز دی جاتی ہے، استفادہ کرنا چاہیے، خصوصاً قصص قرآنی کے شانِ نزول میں گذشتہ پیغمبروں اور ان کی امتوں سے مربوط ہیں، احتیاط کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے۔ کیونکہ ان میں سے بہت سے شانِ نزول علماء یہود و نصاریٰ اور دوسرے افراد کے ذریعہ نقل ہوئے ہیں اور اس قسم کی تاریخی نقول پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اور بہت سی تفاسیر میں اس شرط کی رعایت نہیں کی گئی اور نا قابل اعتماد افراد سے ہر قسم کے شان نزول نقل کر دیئے گئے ہیں۔

صحیح احادیث کی طرف رجوع

آیات قرآنی کا ایک حصہ آیات احکام سے مربوط ہے، ایسی آیات جو مکلفین کے اعمال وافعال کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں اور ان کے حکم کو بیان کرتی ہیں۔

اس قسم کی آیات کی تعداد قرآن میں کم نہیں ہے یہاں تک کہ بعض نے انہیں پانچ سو آیات تک پہنچایا ہے۔ اگر چہ ان آیات کی تعداد اس مقدار سے کچھ کم ہی ہے۔ لیکن اس قسم کی آیات سے فائدہ اٹھانا صحیح اسلامی احادیث کی طرف رجوع کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ان آیات میں سے زیادہ تر تو وہ مطلقات ہیں کہ جن کی شرائط نبی اکرمؐ اور ان کے معصوم جانشینوں کی زبان سے وارد ہوئی ہیں، یا وہ عمومات ہیں جن کے مخصص بعد میں سنتِ نبی اکرمؐ میں بیان ہوئے ہیں اور یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ اطلاق مطلق یا عموم عام سے مقیدات ومخصصات کی طرف رجوع کئے بغیر استدلال کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس بناء پر کہ یہ مسئلہ زیادہ واضح صورت میں بیان ہو، ہم اس سلسلے میں دوبارہ گفتگو کرتے ہیں۔

(الف) قرآن مجید میں کچھ موضوعات ایسے وارد ہوئے ہیں کہ ان کے بارے میں احادیث اسلامی اور سیرت مسلمین کے سوا کسی قسم کی اور کوئی توضیحات نظر نہیں آتیں، مثلاً قرآن نے نماز، روزہ، زکات، خمس اور حج کو واجب کیا ہے جب کہ ان کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی ہے لہٰذا ہمارے لیے کوئی چارہ نہیں ہے۔ کہ ہم ان مجملات کی خصوصیات کو احادیث اسلامی اور سیرت مسلمین سے اخذ کریں اور ان مراجع کی طرف رجوع کئے بغیر ان کے بارے میں ہر قسم کی تفسیر وتوضیح ایک محال چیز کی آرزو کی حیثیت رکھتی ہے اور اسلام کے آغاز سے لے کر آج تک اس قسم کی آیات کی تفسیر میں ساری دنیا کے مسلمانوں کا طریقہ وہی ہے جو بیان ہوا ہے۔

(ب)۔ قرآن مجید میں کچھ عمومات اور مطلقات وارد ہوئے ہیں لیکن ان کے مخصصات اور مقیدات صرف سنت پیغمبرؐ اور احادیث معصومینؑ میں ہی موجود ہیں۔

یہ صرف قرآن کا ہی طریقہ نہیں ہے کہ قوانین کے تبصروں کو ان کے ساتھ ذکر نہیں کرتا، بلکہ ساری دنیا کی قانون گذاری کی رسم بھی اسی پر جاری ہے۔ یعنی ملک میں جاری قوانین پر زمانہ کے گذرنے کے ساتھ تبصرے اور تخصیصات اور تقییدات میں قانون بشری کے تبصروں کے ساتھ جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ قانون بشری میں تبصروں کی اصل سے جدائی کا سبب وہی آگاہی بشر کی محدودیت ہے جو اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ قوانین اور زمانہ کے ساتھ تبصرے پیدا کریں اور کچھ موارد قانون سے خارج ہوں اور کچھ موارد اس کے ساتھ ملحق ہوں جبکہ تشریع الٰہی کی دستگاہ میں محدودیت کا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا اور قانون کے تمام خصوصیات۔ چاہیے وہ ایسے ہوں جنہیں بعد بھی قانون سے خارج ہونا چاہیے اور چاہے وہ ایسے ہوں کہ جنہیں بعد میں قانون کے ساتھ ملحق ہونا چاہیے، ایک ایسے قانون گذار کے لیے جیسا کہ ''خدا'' ہے۔ واضح وروشن ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات مصالح اجتماعی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ خصوصیات قانون تدریجاً بیان ہوں اور تمام کے تمام مسائل ایک ہی جگہ بیان نہ ہوں۔

مثلاً قرآن سود کو حرام کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ (بقرہ۔۲۷۵)

لیکن احادیث اسلامی میں کئی موارد میں سود حلال شمار ہوا ہے، مثلاً باپ اور بیٹے کے درمیان یا شوہر اور بیوی کے درمیان سود اور ان تحلیلات کے مصالح کامل طور پر واضح ہیں کیونکہ ان دونوں موارد میں ان دونوں کے صندوق کی وحدت ''اور'' دونوں گروہوں کے ایک دوسرے سے ملاپ'' کی وجہ سے سود میں ظالمانہ رنگ نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ حلال شمار ہوا۔

اور ہمیں آیت: ''وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ

۔''(حشر ۷)

کے مطابق ان تمام احکام کو جو رسول خدا نے دیئے ہیں قبول کرنا چاہیے اور ان تمام باتوں سے جن کے ارتکاب کو آپ نے حرام قرار دیا ہے، دوری اختیار کرنا چاہیے۔

اب اگر مفسر یہ چاہے کہ اس قسم کی آیات کی تفسیر میں۔ جن کی تعداد قرآن میں کم نہیں ہے۔ خود قرآن کو ہی کافی سمجھے اور احادیث کی طرف رجوع کرنے سے روگردانی کرے تو اس نے مذکورہ بالا آیت کی مخالفت کی ہے اور اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

احکام سے مربوط آیات کے ایک حصہّ کی ضرورت نے (چاہے وہ مفاد ومعنی میں اجمال کی وجہ سے ہو، مثل نماز وزکوٰۃ کے اور چاہیے مخصص ومقید یعنی تبصرہ اور استثناء قانون کے لحاظ سے ہو) سنت واحادیث رسول کے طریقہ سے توضیح وتعبیر کرنے کے لیے فقہا کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ وہ اس قسم کی علیحدہ اور جداگانہ تفسیر کریں اور اس قسم کی مخصوص آیات کے بارے میں کتابیں لکھیں اور اس سلسلہ میں ''جصاص'' فاضل مقداد'' ''محقق اردبیلی'' اور ''جزائری'' کی تفسیر آیاتِ احکام بہترین کتابیں اور تفسیریں ہیں۔

اس غرض سے کہ قارئین کرام کو اس بارے میں اور زیادہ علم وآ گاہی حاصل ہو، ہم ان موارد میں سے دو اور نمونے پیش کرتے ہیں۔

(ج): قرآن مطلق طور پر ہر قسم کے لین دین کو جائز سمجھتا ہے یا ہر قسم کے عقد وقرار داد اور عہد و پیمان کو محترم سمجھتا ہے اور اس پر عمل کرنے کی ضروری جانتا ہے جب کہ سنت پیغمبر اور احادیث اسلامی۔ جو فریقین کے لیے مورد احترام ہیں۔ چند ایک معاملات کے غیر صحیح ہونے کا اعلان کرتی ہیں، مثلاً آلات قمار کی خرید وفروخت، مست کرنے والے مایعات، اور بیع منابذہ وملامسہ وغیرہ، جن کے تمام خصوصیات حدیث میں وارد ہوئے ہیں۔ تو اس بناء پر آیت ''وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ۔'' (بقرہ۔۲۷۵) کی تفسیر ان روایات واحادیث کی طرف رجوع کئے بغیر صحیح اور درست نہیں ہے۔

اسی طرح آیہ: ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ ''(مائدہ۔۱) کی تفسیر ان احادیث کی طرف رجوع کئے بغیر، جو بعض شرائط اور عہد و پیمان کو لغو اور باطل قرار دیتی ہے صحیح نہیں ہے جیسا کہ کہتا ہے:: الّا شرطًا احلّ حراماً وحرّم حلالاً۔ مگر وہ شرط جو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دے۔

قرآن کی گواہیاں

مذکورہ بالا مطلب ایک ایسی محسوس وملموس حقیقت ہے جسے ہر مفسر قریب سے لمس کرتا ہے اور واقعیت کو پسند کرنے والے ہر انسان کو قانع کرتا ہے۔ اس سے قطع نظر، قرآن واضح طور پر گواہی دیتا ہے کہ قرآن رسول اکرمؐ کے بیان کا محتاج ہے کیونکہ پیغمبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن کی لوگوں کے سامنے تلاوت کرنے کے علاوہ اس کے مقاصد کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کرے۔ ہم یہاں پر قرآن سے کچھ نمونے پیش کرتے ہیں اور اس کی تشریح وتفصیل کو چھوڑتے ہیں۔

(۱) وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۝۴۴

(نحل)

''ہم نے قرآن کو تم پر اس لیے نازل کیا ہے تا کہ تم اس کی، جو لوگوں کے لیے نازل کیا گیا ہے، بیان کرو تا کہ وہ اس میں غور وفکر کریں۔''

ہمارے مقصد پر آیت کی دلالت اس صورت میں واضح ہوگی جب کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ آیت پیغمبر کی ماموریت کو ''لتبین'' کی لفظ سے بیان کر رہی ہے اور اس کا مفاد ''لتقرأ'' کے مفاد کا غیر ہے یعنی پیغمبر دو ماموریتیں رکھتا ہے۔

(۱) قرآں کی آیات کو پڑھیے۔

(۲) آیات قرآن کو بیان اور اس کے مقاصد کی وضاحت کرے۔

اور اس آیت اور اسی جیسی آیات کا ہدف اور مقصد قرآن کی تمام آیات نہیں ہیں بلکہ آیات قرآنی کا وہ حصہ ہے جس کے مفاد یا تمام خصوصیات پر رسول اکرمؐ یا ان کے جانشینوں کے بیان کے بغیر اطلاع نہیں ہوسکتی، مثلاً آیات احکام میں سے مجمل آیات، یا وہ آیات جو تبصرہ اور استثنا رکھتی ہیں۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ۝۱۶ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ۝۱۷ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۝۱۸ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۝۱۹ (قیامت)

''قرآن کو پڑھنے کے لیے جلدی کی خاطر اپنی زبان کو حرکت نہ دو، آیات کو جمع کرنا اور ان کو پڑھنا ہمارے ذمہ ہے جب ہم تم پر پڑھ چکیں تو پھر تم اس کی پیروی کرو پھر اس کے بعد اس کے مقاصد کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔''

خدا اس آیت میں تین چیزیں اپنے ذمہ لیتا ہے۔

(۱) قرآن کا پڑھنا

(۲) آیات کا جمع کرنا

(۳) اس کے مفاہیم کی وضاحت

اور یہ بات کہے بغیر ظاہر ہے کہ پیغمبر کے لیے مفاہیم قرآن کی وضاحت وحی کے طریقہ سے ہی ممکن ہے، ورنہ لوگوں پر ہرگز براہ راست وحی نہیں آتی۔ اور پیغمبر پر وحی الٰہی کا مضمون یا تو قرآن میں یا اس کے رسول کی سنت میں ہی منعکس ہوتا ہے۔

اس بناء پر آیات کے معنی ومفاد کی وضاحت کے سلسلہ میں دونوں منابع کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ایک پر ہرگز اکتفا نہیں کرنا چاہیے۔

دوسرے لفظوں میں خدا اس آیت میں پیغمبر کو قرأت (پڑھنے) میں جلدی کرنے سے منع کرتا ہے۔

اس کے بعد اس کو جمع کرنے اور اس کے پیغمبر پر پڑھنے کو اپنے ذمہ لیتا ہے اور یہ حکم دیتا ہے کہ فرشتے کے پڑھنے کے وقت اس کی پیروی کرے اور اس کے بعد اس کے بیان (اور مطالب ومضامین) کی وضاحت اپنے ذمہ لیتا ہے جیسا کہ ''ثم ان علینا بیانه'' کی آیت کی صراحت ہے۔

یہاں اس بیان سے مقصود جسے خدا اپنے ذمہ لیتا ہے کونسا بیان ہے۔ یہ تصور نہ کیا جائے کہ مقصود الفاظ آیات کا بیان کرنا ہے کیونکہ یہ مطلب پہلے ''ان علینا جمعه وقرانه'' کے جملہ میں کہا جا چکا ہے اب اس کے دوبارہ تکرار کی ضرورت نہیں ہے مسلمہ طور پر اس سے مراد آیات کے مضامین کا بیان اور وضاحت ہے جو خدائی بیان کی محتاج ہیں اور پھر پیغمبر اور اس کے برحق جانشین مقام وحی سے اُسے دریافت کرنے کے بعد لوگوں سے بیان کرتے ہیں البتہ ہدف یہ نہیں ہے کہ ہر ہر آیت ہی بیان (وتشریح ووضاحت) کی محتاج ہے کہ کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ آیت ''ان الله علی کل شیءٍ قدیر۔'' بھی بیان کی محتاج ہے بلکہ غرض یہ ہے کہ ہم اجمالی طور پر مقاصد سے آشنائی کے سلسلہ میں وحی کے بیان کے محتاج ہیں اور سردست ہمیں اس کی مقدار کے بارے میں کوئی بحث نہیں ہے۔

البتہ جیسا کہ شانِ نزول کی طرف رجوع کرنے کے سلسلہ میں ہم نے ذکر کیا تھا تفسیر قرآن کے لیے ہر خبر اور حدیث کو لینے کے لیے تیار نہیں ہو جانا چاہیے، بلکہ حدیث کو سند اور دلالت کے لحاظ سے پرکھنا چاہیے۔ اور ''جامع الشرائط'' ہونے کے بعد اس سے مدد لینی چاہیے۔

تمام آیات قرآن کی ہم آہنگی کی طرف توجہ [۱]

جو کچھ بیان ہو چکا وہ اصل تفسیر قرآن کی بنیاد اور اساس ہے، لیکن تفسیر کی صحت اور اس کے اتقان واستواری کی اہم شرط یہ ہے کہ مفسر کسی بھی آیت کو اس سورہ کی دوسری آیات سے اور دوسری سورتوں کی آیات سے، اور خلاصہ یہ ہے کہ تمام قرآن سے جدا نہ سمجھے اور اس بات کا اطمینان رکھے

[۱] تمام آیات قرآن کی ہم آہنگی کی طرف توجہ آیت کی آیت کے ساتھ تفسیر کے لزوم کے علاوہ ایک چیز ہے جو تیسری شرط کی صورت میں بیان ہوئی ہے اور ان دونوں کا آپس میں مختلف ہونا بہت ہی واضح ہے۔

کہ تمام کی تمام آیات ایک ہی ہدف کو بیان کر رہی ہیں یا ایسے اہداف کو بیان کر رہی ہیں کہ سب کی سب ایک وسیع ہدف میں خلاصہ ہوتی ہیں۔

تفسیر میں سب سے بڑی لغزش اسی بات میں ہوتی ہے کہ کوئی شخص زبان عربی کی گرائمر سے آ گاہی کی بناء پر کسی آیت کی تفسیر کرنے لگے اور جو آیات اس آیت سے مشابہ وارد ہوئی ہیں ان سے غفلت اختیار کرے اور تفسیر کی یہی لغزش مختلف اسلامی مذاہب وعقائد کا سبب بنی ہے اور ہر ملت اور صاحب مذہب اپنے عقیدے پر قرآن سے دلیل اور گواہ لاتا ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ تمام صاحبان مذاہب چاہے وہ مجبرہ ہوں یا معتزلہ، مشبہ ہوں یا مجسمہ، مرجیہ ہوں یا دوسرے عقائد و مذاہب رکھنے والے، ہر ایک اپنے عقیدہ اور نظریہ پر قرآن ہی کی مختلف آیات سے استدلال کرتا ہے اور خود کو پیروقرآن سمجھتا ہے جب کہ یہ تمام کے تمام مذاہب سب کے سب یا سوائے ایک کے سب باطل ہیں، اور قرآن سے بہت دور ہیں۔

جب ہم ان مذاہب کے پیدا ہونے کی اصل اور جڑ کی جستجو کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان فرقوں اور مذاہب کی پیدائش کے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ ہر فرقہ ایک آیت کے ساتھ چمٹا ہوا ہے اور اس سلسلہ میں واردشدہ دوسری آیات سے۔ جو پہلی آیت کا بیان اور وضاحت ہوسکتی ہے۔غافل رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں کچھ ایسی آیات وارد ہوئی ہیں کہ اگر ان پر اکیلے ہی اکیلے تحقیق کی جائے تو وہ ہمیں طرح طرح کے افکار ونظریات مثلاً جبر واختیار، تشبیہ وتنزیہ وتجسیم کی طرف لے جائے گی اور ان تمام عقائد کو جو ایک دوسرے کے ضد ونقیض ہیں۔ ہرگز وحی الٰہی کے ساتھ مربوط نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی یہ سب قرآن کے مقاصد کو تشکیل دیتے ہیں، جب کہ قرآن خود یہ کہتا ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿٨٢﴾

(نساء)

''اگر قرآن خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا، تو اس میں بہت زیادہ اختلاف ہوتا۔''

یہ گرہ اس صورت میں کھولی جاسکتی ہے جب کہ ہم آیات کی ہم آہنگی اور ان کے مجموعہ کے ایک دوسرے سے نظم وانسجام سے غفلت نہ برتیں اور اس بات کی طرف توجہ کریں کہ قرآن ذیل میں بیان کردہ دوصفات کے ساتھ اپنی تعریف کرتا ہے۔

(ا)''مُتَشَابِهًا''ایک دوسرے سے مشابہ

(۲)''مَثَانِيَ'' مضمون کے لحاظ سے مکرر

جیسا کہ فرماتا ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (زمر۔ ۲۳)

اور طبعی طور پر ہر مشابہ دوسری مشابہ کے ساتھ اختلافی نقاط رکھنے کے باوجود یقینی طور پر مشترک پہلو بھی رکھتی ہے اور انہیں مشترک جہات کی بناء پر

ضروری ہے کہ ایک آیت کی تفسیر میں اس سلسلہ میں واردشدہ تمام آیات کو بھی دیکھنا چاہیے۔اس کے بعد ان کے مجموعہ سے کوئی نظریہ اخذ کرنا چاہیےاور یہی حال ایک ہی واقعہ کے لیے بار بار دھرائے جانے والے مضامین کا ہے۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں تفسیر کی ایک اور قسم کی بنیاد رکھنا جو اصطلاح میں تفسیر ''موضوعی قرآن'' ہے لازم ہوجاتا ہےاوراس روش سے مقصود یہ ہے کہ ایک موضوع کی تمام آیات کی مقدور بھر ایک جگہ جمع کردیا جائے اور پھر ایک دوسرے آیات کے قرینہ سے اور آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ کر کے تمام کے مجموعہ سے کوئی ایک نظریہ قائم کیا جائے۔

جب کہ قرآن کی تفسیر کی دوسری روش یعنی آیات قرآنی کی تفسیر،سورہ بہ سورہ کی صورت میں مفید اور سودمند تو ہے، یہاں تک کہ ایک طبقہ کے لیے تو اس روش کے علاوہ اور کوئی دوسری روش مفید واقع ہو ہی نہیں سکتی،لیکن اس کے باوجود قرآن کے مقاصد سے جامع الاطراف صورت میں، پردہ اٹھانا سوائے تفسیر موضوعی کے طریقہ کے جو آیات قرآن کی ''ہم آہنگی''اور ایک دوسرے کے ساتھ نظم وانسجام'' کی روح ہے ممکن ہی نہیں ہےاور یہ وہی راستہ ہے جسے مؤلف نے اس کتاب ''منشور جاوید قرآن''اور کتاب ''مفاہیم القرآن''[1] میں طے کیا ہےاور طبعی طور پر وہ بھی نقص سے خالی نہ رہا ہوگا۔اور آنے والے لوگ اس روش کی تکمیل کریں گے۔

سیاق آیات کی طرف توجہ

سیاق اور اصطلاح کے مطابق آیت کے ماقبل ومابعد کی طرف توجہ ایک طرح کی چھٹی شرط یعنی تمام قرآنی آیات کی ایک دوسرے سے ہم آہنگی'' کی شاخ ہے مثلاً جہاں قرآن کسی موضوع کے سلسلہ میں گفتگو کرتا ہے اور اس بحث میں کچھ آیات کو وارد کرتا ہے تو اس مورد میں ایک آیت کی طرف توجہ اور دوسری آیات سے انقطاع کا نتیجہ،لغزش اور قرآن کے مقصد سے دوری کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

یہ صرف قرآن ہی نہیں ہے کہ جس کے جملوں اور آیات کی تفسیر میں تمام ماقبل ومابعد کی آیات کو نظر میں رکھنا چاہیئے۔ بلکہ ہر حکیم ودانا کی گفتگو کی تشریح وتفسیر اسی بنیاد پر استوار ہے اس موضوع کی وضاحت کے لیے ہم اس بحث میں ایک نمونہ پیش کرتے ہیں:

قرآن سورہ اعراف کی آیت ۳۱ میں اس طرح فرماتا ہے۔

''یابنی اٰدم امّا یأتینّکم رسل منکم یقصون علیکم یاتی فمن اتقیٰ

---

[1] یہ عربی زبان میں تفسیر موضوعی ہے جس کی اب تک تین جلدیں چھپ چکی ہیں۔

۱۔معالم التوحید فی القراٰن الکریم۔''

۲۔معالم الحکومۃ الاسلامیۃ فی قرآن الکویم۔

۳۔معالم النبوّۃ فی القراٰن الکریم۔

اور چوتھی جلد چھپائی کے لیے تیار ہے اُمید ہے کہ عنقریب چھپ جائے گی۔

واصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔"[1]

"اے اولاد آدم اگر تمہاری طرف خود تمہاری ہی نوع میں سے پیغمبر آئیں اور تمہارے لیے ہماری آیات پڑھیں تو تم میں سے جو شخص (میرے احکام کی مخالفت سے) پرہیز کرے گا اور درستی واصلاح کی راہ (نہ کہ فساد کی راہ) اختیار کرے گا، تو اس کے لیے نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی کوئی حزن وملال۔"

اگر ہم آیت کی تفسیر میں "سیاق" آیت سے صرف نظر کرلیں، اور خود آیت کو اس کے ماقبل ومابعد سے کاٹ کر نظر میں رکھیں، تو آیت کا مفاد یہ ہوگا کہ قرآن رسول اکرمؐ کے بعد پیغمبروں کے آنے کی خبر دے رہا ہے۔ اور باب نبوت کو ختم اور بند نہیں سمجھتا جبکہ ایک دوسری آیت میں پیغمبر کا "نبی خاتم" سے تعارف کرا رہا ہے اور بتاتا ہے کہ باب نبوت اس کے ذریعہ بند ہے اور ابد تک کسی شخص پر نہیں کھلے گا۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔"

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (احزاب)

"محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ خدا کا رسول اور پیغمبروں کا خاتم ہے اور خدا ہر چیز کا عالم ودانا ہے۔

ان دو متناقض نتائج کی اصل جڑ بنیاد یہ ہے کہ پہلی آیت کی تفسیر میں سیاق آیات سے صرف نظر ہوا ہے اور ماقبل ومابعد سے کٹی ہوئی آیت محل تفسیر قرار پائی ہے حالانکہ اگر خود قرآن کی طرف رجوع کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت سورہ اعراف کی مجموعی چھبیس ۲۶ آیات (۱۱ تا ۳۶) کا ایک جز ہے جو سب کی سب اس حادثہ کو بیان کر رہی ہیں جو انسان کی پیدائش کی ابتداء میں پیش آیا تھا، یعنی خلقت آدم اور ان کے بہشت سے نکلنے اور اپنی اولاد کے ساتھ روئے زمین پر ٹھہرنے کے زمانہ کے ساتھ مربوط ہے۔

اس موقع پر خدا اولاد آدم کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے اے اولاد آدم! اگر تمہاری طرف پیغمبر آئیں تو جو شخص تقویٰ وپرہیزگاری کرے گا اور اصلاح کا راستہ اختیار کرے گا تو اس کے لیے خوف وہراس اور حزن وملال نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آدم کے زمین پر استقرار کے بعد بے شمار پیغمبر نوع بشر کی رہنمائی کے لیے خدا کی طرف سے آئے ہیں اور سب کا پروگرام یہ تھا۔

"فمن اتقیٰ واصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔"

اور اس قسم کا خطاب آغاز خلقت کے وقت اس چیز سے مانع نہیں ہے کہ ہمارے پیغمبر، پیغمبرؐ خاتم ہوں اور ان کے ذریعہ باب نبوت جو سالہا سال سے روئے بشر پر کھلا ہوا تھا کئی اسباب کی بنا پر بند ہو گیا ہو۔

---

[1] لفظ "اما" اصل میں "ان" "ما" تھا اور یہ دونوں حرف مخرج کے نزدیک ہونے کی وجہ سے "ن" کا مخرج "ما" کے مخرج کے ساتھ ایک دوسرے میں ادغام ہو گیا ہے اور حقیقت میں "اما" اس موقع پر شرطیہ ہے اور جملہ کا معنی یہ ہے کہ "بہ تحقیق اگر تمہاری طرف پیغمبر آئیں۔"

نتیجہ یہ ہے کہ قرآن زمانہ کے اس وقت کے خطاب کو ہمارے لیے نقل و حکایت کر رہا ہے نہ یہ کہ اس واقعہ کو ''جو نزول قرآن کے بعد وقوع پذیر ہوگا، بیان کر رہا ہے۔

اور یہ حقیقت اسی صورت میں واضح ہوگی جب ہم یہ جان لیں کہ قرآن اپنی چھبیس ۲۶ آیات میں اولاد آدم کو تین مرتبہ ''یا بنی آدم'' کے جملہ سے مورد خطاب قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے۔

(۱) یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا (اعراف۔۲۶)

(۲) یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ لَا یَفۡتِنَنَّکُمُ الشَّیۡطٰنُ کَمَاۤ اَخۡرَجَ اَبَوَیۡکُمۡ (اعراف۔۲۷)

(۳) یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ (اعراف۔۳۵)

ایک اور موقع پر بھی جہاں قرآن آغاز آفرینش کے خطابات کے سلسلہ میں گفتگو کر رہا ہے اس لفظ کو استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَیۡکُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ (یٰس۔۶۰)

اور اس قسم کے خطابات آغاز آفرینش کے زمانہ سے مربوط اور اس سے مناسبت رکھتے ہیں نہ کہ رسول اکرمؐ کے زمانہ سے۔

اس بیان سے واضح ہوگیا کہ زیر بحث آیت میں خطاب آغاز آفرینش کے زمانہ سے مربوط آفرینش کے ابتدائی خطابات کا جز ہے اور اس کا مفاد ختم نبوت سے کوئی ارتباط نہیں رکھتا اور اشتباہ اور غلطی کو جڑ بنیاد سیاق آیت کو نظر انداز کرتا ہے۔

سیاق آیات اور احادیث متواتر

اگر چہ آیت کے ماقبل و مابعدی طرف توجہ صحیح و استوار تفسیر کی ایک کلید ہے لیکن اس کے باوجود سیاق آیت اس وقت تک معتبر ہے کہ جب آیت استقلال اور اپنے ماقبل سے اس کی جدائی قطعی و یقینی دلیل سے آیات قرآنی کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ بعض اوقات (البتہ کبھی کبھار) قرآن ایک موضوع سے فارغ ہونے سے پہلے کسی مناسبت سے ایک نئے موضوع کو پیش کرتا ہے اور اس موضوع سے فارغ ہونے کے بعد دوبارہ پہلے موضوع کو بیان کرنا شروع کر دیتا ہے اور یہ قرآن کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے اور فصیح و بلیغ افراد کے کلام میں کم وبیش اس کی نظیر ملتی ہے۔

البتہ مقصود یہ نہیں ہے کہ قرآن ایک موضوع کے اثناء بحث میں بغیر کسی مناسبت کے نئے موضوع کو ذکر کر دیتا ہے اور اصطلاح کے مطابق ایک موضوع سے مربوط ایک آیت یا کچھ آیات کو دوسرے موضوع سے مربوط آیات کے درمیان ''اقحام'' (بغیر سوچے سمجھے داخل) کر دیتا ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ مناسبت کو محفوظ رکھتے ہوئے پہلے موضوع کے ختم ہونے سے پہلے نئے موضوع کو پیش کرتا ہے اور اس کے بعد دوبارہ پہلے موضوع کی آیات کی تکمیل کرتا ہے۔

اب ہم ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔

قرآن سورہ بقرہ میں آیت ۲۲۱ سے لے کر آیت ۲۴۰ تک زوجہ وشوہر، فرزند واولاد، طلاق اور شوہر کی موت اور اسی کے مانند مسائل سے مربوط باتوں کو بیان کرتا ہے۔ اور اس حصہّ کی تمام آیات کامل طور پر ایک پارچہ اور آپس میں ہم آہنگ ہیں لیکن ۲۳۷ آیت کے بعد آیت ۲۳۸، ۲۳۹ میں نماز کی ادائیگی، خصوصاً نماز ''وسطی'' کی اور جہاد اور جنگ کی حالت میں نماز کے موضوع کو پیش کرتا ہے۔ [۱]

اب رہی یہ بات کہ دونوں موضوعات کی آیات میں مناسبت کی وجہ کیا ہے وہ سردست ہمارے لئے درپیش نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی واقعیت ہے کہ جس ہم لمس کرتے ہیں۔

اسی بناء پر جب قطعی دلائل جیسے خبر متواتر، یا علم آفریں قرائن سے نزدیک خبر سیاق آیات کے برخلاف گواہی دے تو ان احادیث کے حجت ہونے کی بناء پر سیاق آیات سے دستبردار ہونا پڑے گا اور صحیح احادیث کی پیروی کرنا پڑے گی۔

ہم نمونہ کے طور پر دو موارد کا ذکر کرتے ہیں۔

قرآن سورہ احزاب میں آیت ۲۸ سے لے کر آیت ۳۵ تک پیغمبر کی بیویوں کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے لیکن آیت ۳۲ کے ذیل میں اس طرح فرماتا ہے۔

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴿٣٣﴾

سیاق آیت یہ کہتا ہے کہ یہ آیت رسول اکرمؐ کی بیویوں کے ساتھ مربوط ہے جب کہ فریقین کو متواتر احادیث اس کو ایک خاص گروہ کے ساتھ مربوط سمجھتی ہیں جو زیور عصمت سے آراستہ ہے تو اس قسم کے مورد میں قطعی احادیث اس قسم کے سیاق سے مقدم ہیں۔

اس کے علاوہ خود آیت میں دو واضح گواہ موجود ہیں کہ آیت پیغمبر کی بیویوں سے مربوط نہیں ہے اور وہ دو گواہ ''عنکم'' و ''یطھرکم'' ہیں جو آیت کے پیغمبر کی بیویوں سے ارتباط کو غیر صحیح بتاتے ہیں۔ [۲]

---

[۱] قارئین کرام مزید تحقیق کے لیے آیات کو خود قران میں مطالعہ کریں ہم رہنمائی کے لیے چند آیات کے آغاز کو پیش کرتے ہیں۔

الف۔وان طلقتموھن من قبل ان تمسوھن۔ (۲۳۷) اگر تم انہیں نزدیکی کرنے سے قبل طلاق دے دو۔

ب۔حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطیٰ (۲۳۸) نماز کی خصوصاً وسطی نماز کی حفاظت کرو۔

پ۔فان خفتم فرجالاً اور کباناً (۲۳۹) اگر تمہیں خوف ہو تو پھر پیادہ یا سواری ہی نماز پڑھو

ج۔والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً (۲۴۰) جو لوگ مرجاتے ہیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جاتے ہیں

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں پہلے اور آخری حصہّ کی آیات زوجہ وشوہر سے مربوط مسائل کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں جبکہ وسطی حصہّ کی آیات نماز کی محافظت اور نماز خوف کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں۔

[۲] ہم نے کتاب ''تفسیر صحیح آیت مشکلہ قرآن'' اور کتاب ''راہ سوم'' میں اس آیت کے سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور دلائل قطعی اور علم آفرین قرائن سے یہ ثابت کیا ہے کہ ''اہل البیت'' سے مراد ایک مخصوص گروہ ہے جن کے مشخصات نبی اکرمؐ کی زبانی بیان ہوئے ہیں۔

اب ''طہارت اھل بیت'' کو پیغمبر کی بیویوں کے بارے میں بحث کے ضمن میں بیان کرنے میں کیا مناسبت ہے سردست ہمیں اس سے سروکار نہیں ہے۔

۲۔قرآن سورہ مائدہ میں آیت ا سے ۵ تک لحوم (گوشت) اور اس کے ملحقات کے بارے میں ایک طرح کی بحث کرتا ہے لیکن تیسری آیت کے آدھے میں پہنچ کر فرماتا ہے۔

اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ

آیت کا سیاق یہ کہتا ہے کہ آیت کو محرمات مثلاً مردار خون، سور کا گوشت وغیرہ کی تحریم کے دن کے ساتھ مربوط کریں اور یہ کہیں کہ ''الیوم'' سے مراد وہ دن ہے کہ جس دن اس قسم کے گوشتوں کی حرمت کا اعلان ہوا تھا لیکن قطعی قرائن اور متواتر روایات گواہی دیتی ہیں کہ آیت اس قسم کے گوشتوں کی تحریم کے دن سے مربوط نہیں ہے بلکہ یہ آیت روز غدیر رہبر کے تعین کے طریق سے دین کی تکمیل کے دن نازل ہوئی ہے اور واقع اور حقیقت بین مفسر کو ان قطعی قرائن اور ان احادیث کے مقابلہ میں سیاق آیات سے صرف نظر کرنا پڑے گا۔

اس بارے میں اور بھی نمونے ہیں کہ جو ہماری گفتگو کے گواہ ہیں، لیکن ہم اختصار کے پیش نظر ان کو پیش کرنے سے صرف نظر کرتے ہیں۔

نظریات و آراء سے آگاہی

مفسرین اسلامی کے آراء و نظریات سے آگاہی حاصل کرنا جنہوں نے ایک عمر قرآن پر کام کرتے گذاری ہے اور حق بات یہ ہے کہ وہ استادفن شمار ہوتے ہیں__ تفسیر قرآن کی ایک بنیاد ہے۔

اس میں شک نہیں کہ نزول قرآن کے دن قرائن اور مکان و زمان کے مطابق لوگوں کی آگاہی کی بناء پر بہت سی آیات کے مفاہیم واضح تھے اور قرآن کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے ان آراء سے آگاہی کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن فاصلہ زمانی کی بناء پر، اور اس قسم کے قرائن کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے، ان اقوال و آراء سے جو اس قسم کے ہاتھ سے کھوئے ہوئے قرائن کو واضح کر سکتے ہیں__ مدد لینی چاہیے اور ہرگز تنہا اور اکیلے ہی تفسیر قرآن نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ایک جماعت کی فکر و نظر ایک فردی فکر و نظر سے بالاتر ہے اور ایک فردی فکر میں لغزش و خطا کا احتمال ایک جماعت کی فکر میں لغزش کے احتمال سے زیادہ ہے۔

البتہ یہ مطلب اس بات سے جدا ہے کہ ہم اپنی فکر کو دوسروں کے افکار کا اسیر بنالیں اور اپنے استقلال فکری کو ہاتھ سے دے بیٹھیں کیونکہ اس قسم کی پیروی سوائے خودکشی کے اور کچھ نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ آیت کی تفسیر میں ہم دوسرے نظریات سے غفلت نہ برتیں اور انہیں نظرانداز نہ کریں، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ ہمیں کسی نظریہ کے اپنانے اور اس سے نتیجہ اخذ کرنے میں مدد دیں، یا ہمیں ہماری غلطیوں سے واقف کریں۔

یہاں ایک نکتہ، جس کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ مفسر کو کس زمانہ میں آیت میں موجود آراء ونظریات کی طرف توجہ کرنا چاہیے؟ کیا آیت کے بارے میں نظریات و آراء کا مطالعہ پہلے کرنا چاہیے اوران پر آ گاہی حاصل کرنے کے بعد علمی وفکری کوشش کا آغاز کرنا چاہیے اور حق کو باطل سے جدا کرنا چاہیے یا پہلے خود اپنی تفسیر کی کوشش کرنا چاہیے اور آخری طور پر پختہ ارادہ کرنے کے موقع پر دوسروں کے اقوال ونظریات کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔؟

ایک مبتدی شخص کے لیے پہلا راستہ زیادہ مفید ہے جب کہ ایک محقق شخص کے لیے دوسری راہ متعین ہے، کیونکہ بعض اوقات آراء ونظریات سے آ گاہی انسان کو تحقیق وتفتیش سے روک دیتی ہے۔

پہلے سے کیے ہوئے ہر قسم کے فیصلہ سے پرہیز

آیات قرآنی کا پہلے سے بٹھائے ہوئے نظریات کے ساتھ مطالعہ تفسیر کی بہت بڑی مصیبت ہے جو شخص اپنے گذشتہ عقائد اور اپنے پہلے سے گھڑے ہوئے افکار کے ساتھ قرآن میں نگاہ کرے گا اور اس کا ہدف اور مقصد یہ ہو کہ اپنے نظریہ کے لیے قرآن سے کوئی دلیل تلاش کرے اس قسم کا آدمی قرآن کے واقعی مقاصد سے آ گاہ نہیں ہوسکتا اور مقصود کو حاصل نہیں کرسکتا۔ مفسر کو انتہائی غیر جانبداری اور پہلے سے کسی قسم کے بنائے ہوئے عقیدہ کے بغیر قرآن میں غور کرنا چاہیے تا کہ قرآن کے مقاصد کو حاصل کر سکے۔

ہر قسم کا پہلے سے کیا ہوا فیصلہ مفسر اور قرآن کے مقاصد کے درمیان ایک عظیم حجاب ہے اور یہ اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ مفسر عقیدہ کو قرآن پر پیش کرنے کی بجائے قرآن کی عقیدہ پر تطبیق کرتا ہے اور قرآن کی شاگردی کرنے کی بجائے اس کی استادی کرتا ہے۔

محدثین اسلام نے بالاتفاق رسول خدا سے ذیل میں بیان کردہ حدیث نقل کی ہے اور وہ یہ ہے۔

من فسر القرآن برأيه فليبوء مقعده من النار

''جو شخص اپنی رائے سے قرآن کی (پہلے سے کئے ہوئے فیصلے اور پہلے سے بنائے ہوئے نظریات کے مطابق) تفسیر کرے گا، تو اس نے اپنے لیے آگ میں جگہ بنالی ہے۔''

تفسیر بالرائی سے مراد اس کے علاوہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے، اور کچھ نہیں ہے۔

ایک آیت کی تاویل دوسری آیات کے ذریعہ، مثلاً متشابہ آیت کی تأویل محکم آیت کی مدد سے معمولی سے معمولی مانع بھی نہیں رکھتی۔ اور اس قسم کی ایک تأویل تفسیر بالرائی نہیں ہے بلکہ یہ قرآن کی خود قرآن کی مدد سے تاویل ہے اور ہم نے تأویل اور قرآن'' کی بحث والے حصہ میں اس بارے میں وسیع صورت میں بحث کی ہے۔

وہ چیز جو ممنوع ہے یہ ہے کہ ہم کسی آیت یا حدیث صحیح سے مدد حاصل کئے بغیر پہلے سے رکھے ہوئے عقیدہ کی بناء پر آیت کو اپنے شخصی مقصود پر منطبق کریں اس طرح سے کہ اگر وہ اس قسم کا عقیدہ نہ رکھتا ہوتا تو کبھی بھی آیت کی اس طرح تفسیر نہ کرتا۔

طول تاریخ میں گروہ باطنیہ اور کچھ عرفاء اور آخری زمانہ میں فرقہ ضالہ اور ہمارے زمانہ میں چھوٹے چھوٹے گروہوں نے آیات قرآنی کے ساتھ کھیل کھیلا ہے اور ان کی اپنے مذاق شخصی کے مطابق تفسیر کی ہے۔ وہ نہ صرف خود ہی گمراہ ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے دوسروں کی گمراہی کے اسباب بھی مہیا کئے ہیں۔

ہم یہاں ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کرتے ہیں اور اس کی تفصیل کو دوسرے وقت پر چھوڑتے ہیں۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿١٩﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿٢٠﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢١﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿٢٢﴾ (الرحمن)

''اس نے دو دریا ایسے بہائے ہیں جو ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں، ان کے درمیان دو حائل ہیں، جس سے وہ ایک دوسرے پر تجاوز نہیں کرتے، تم خدا کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے، ان دونوں دریاؤں سے لؤلؤ و مرجان (موتی اور مونگے) نکلتے ہیں۔''

اس آیت میں ذیل میں ذکر شدہ امور کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

۱۔ دو دریا آپس میں مل جاتے ہیں۔

۲۔ ان دوتوں کے درمیان ایک ایسا حائل ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں مخلوط نہیں ہوتے۔

۳۔ ان دو دریاؤں سے لؤلؤ و مرجان (موتی اور مونگے) جیسے جواہرات نکالے جاتے ہیں۔

ان دو دریاؤں سے مراد لؤلؤ و مرجان کے انخراج کے قرینے سے دو قسم کے مختلف پانی ہیں جو دنیا میں کسی خاص نقطہ پر ایک دوسرے سے آ ملتے ہیں، اور ایک کا پانی دوسرے کے پانی سے ہرگز بھی خلط ملط نہیں ہوتا۔ دونوں دریاؤں کا اختلاف طبعی ویقینی طور پر شریں وخوشگوار ہونے اور شور وتلخ ہونے، یا ان کے صاف وشفاف اور رنگ کے گہرے ہونے سے ہوگا۔ اب یہ دونوں طبیعی موجودات دنیا کے کس حصہ میں ہیں۔ اور کون سے سمندر کے اندر قرار پائے ہیں، سر دست ہمیں اس سے سروکار نہیں ہے۔

لیکن محی الدین ابن عربی جو فلسفہ کے عرفان میں غرق تھا جب اس آیت کی تفسیر تک پہنچتا ہے تو اسی فلسفی وعرفانی ذہن کے ساتھ آیت پر نظر ڈالتا ہے تو کہتا ہے کہ ''شور وتلخ'' دریا سے مراد امور مادی وجسمانی ہیں اور شیریں وخوشگوار' دریا سے مراد وہی روح ہے کہ یہ دونوں انسانی وجود کے اندر مل گئے ہیں اور ان دونوں کے درمیان حاجز وفاصل وہی نفس حیوانی'' ہے جو اگر صفا و پاکیزگی میں روح انسانی کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا لیکن کدورت وتیرگی میں اجساد واجسام سے بالاتر وبرتر ہے اس کے باوجود ان دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کی سرحد میں تجاوز نہیں کرتا، نہ روح

بدن کو تجرد بخشتی ہے اور نہ ہی بدن روح کو تنزل دیکر مادیات کے ہم ردیف بنا تا ہے [1]

یہ نمونہ میں تفسیر بالرأی کی حقیقت کی طرف ــــ اور یہ کہ پہلے سے کئے ہوئے فیصلے کس طرح تفسیر میں اثر انداز ہوتے ہیں ــ رہبری کر سکتا ہے۔

فلسفی و علمی بصیرتوں سے آ گاہی

فلسفی اور علمی افکار و نظریات سے آ گاہی ذہن کے کھلنے اور قرآن سے قیمتی نتائج حاصل کرنے کا سبب بنتا ہے یعنی اگر چہ ہر قسم کی تفسیر بالرأی سے پرہیز کرنا چاہیے اور قرآن کی پہلے سے اپنائے ہوئے عقائد کی تصیح کے لیے تفسیر نہیں کرنا چاہیے لیکن اس کے باوجود اسلام کے عظیم فلاسفہ کے افکار و نظریات ــ جو توحید اور خدا کے صفات و افعال کے بارے میں ہیں اور دوسرے مسائل جو مبدء و معاد سے مربوط ہیں [1] سے آ گاہی حاصل کرنا اسی طرح جو کچھ علم و دانش کی دنیا میں طبیعت مادہ اور انسان کے بارے میں گذر رہا ہے اس کی اطلاع حاصل کرنا۔ انسان کی بصیرت کے کھلنے کا سبب ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں انسان قرآن سے بہتر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

اس زمانہ میں انسان نے زمین، عالم، حیوان اور انسان کے متعلق بہت ہی بلند قدم اٹھائے اور روشناسی اور جامعہ شناسی کے متعلق بالکل نئے افق کشف کئے ہیں درست ہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے جو کچھ اس مقولہ میں کہا گیا ہے اور اس کی تصویر کشی کی گئی ہے وہ صحیح ہے لیکن اس قسم کے علمی انکشافات سے آ گاہی انسان کے فلسفی اور علمی دماغ کی تقویت کا سبب بنتی ہے اور مفسر کے ذہن کے کھلنے کا باعث ہوتی ہے اور اُسے ایک خاص قسم کی توانائی بخشتی ہے کہ وہ قرآن سے زیادہ کامل صورت میں فائدہ اٹھائے۔

اب ہم اس بارے میں ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔

وہ چھ آیات جو سورہ ''حدید'' کے آغاز میں وارد ہوئی ہیں اس بات کی واضح ترین گواہ ہیں اور ہم اُن چھ آیات میں سے صرف دو آیات کے نقل اور ترجمہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

جیسا کہ فرماتا ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ③ هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۚ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيرٌ ④ (حدید)

---

[1] تفسیر ابن عربی ج ۲ ص ۲۸۰۔ یہ تفسیر بالرأی کا ایک نمونہ ہے اور ابن عربی کی کتاب تفسیر اس کی کتاب ''فصول الحکم'' کی طرح ہی اس قسم کی بالرای تفسیروں سے پر ہے جو عقلاً و شرعاً ممنوع ہے۔

''وہ ازلی وابدی ہے، ظاہر و باطن ہے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔'' وہی ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا ہے پھر وہ عرش پر غالب آ گیا جو چیز زمین کے اندر جاتی ہے اور جو اس سے باہر نکلتی ہے اور جو کچھ آسمان سے نازل ہوتا ہے یا اس کی طرف اوپر چڑ تا ہے وہ ان سب کو جانتا ہے اور تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اُسے دیکھتا ہے۔

فلسفی اور اعتقادی مسائل جو ان دو آیات (اور دوسری چار آیات) میں چھپے ہوئے ہیں اتنے عظیم ہیں کہ امام سجادؑ ان کے بارے میں فرماتے ہیں۔

نزلت للمتعمقین فی اٰخر الزمان

یہ چھ آیات آخری زمانہ کے مفکر اور گہرائی میں جانے والے افراد کے لیے نازل ہوئی ہیں۔''

کوئی بھی باانصاف آدمی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ علوم عربی کے ذریعہ ان آیات کی تفسیر کی جاسکتی ہے کیونکہ جب ہم ان آیات کا فارسی (یا اردو) میں ترجمہ کرتے ہیں تو پھر بھی ان میں اجمال وابہام کی حالت باقی رہ جاتی ہے جبکہ ان باتوں سے آگاہی جو اسلامی محققین نے مبدء کے احاطہ وجودی وعلمی کے بارے میں پیش کی ہیں ذہن کے کھلنے کا سبب بنتی ہے اور آیت کے مفاد کے بہتر تجلی کرنے کا باعث ہوتی ہے۔

کیا ایک ان پڑھ آدمی جس نے استاد کی صورت ہی نہیں دیکھی ''وھو معکم اینما کنتم'' کے جملہ کی گہرائی تک پہنچ سکتا ہے؟

کیا وہ آدمی جو معارف الٰہی میں راسخ نہیں ہے ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ کی حقیقت کا ادراک کر سکتا ہے؟

پھر دوبارہ عرض کئے دیتا ہوں کہ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم یونانی یا اسلامی فلسفہ کی مدد سے یا علوم جدید کی مدد سے قرآن کی تفسیر کریں اور قرآن کو ان افکار پر منطبق کریں جو خطا سے محفوظ نہیں ہیں کیونکہ اس قسم کے کام کا سوائے تفسیر بالرأی کے جو عقلاً وشرعاً ممنوع ہے اور کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس قسم کی آگاہی ہمارے ذہن کو قدرت وتوانائی بخشتی ہے کہ ہم کتاب آسمانی کے مفاہیم ومقاصد میں زیادہ سے زیادہ دقت اور غور وخوض کریں اور اس کے مقاصد کو بہتر طور پر پالیں۔

موجودہ زمانہ میں روان شناسوں اور جامعہ شناسوں کے مباحث نے انسان کے بارے میں یا علوم طبعی کے ماہرین کی تحقیقات نے زمین اور جہان کے بارے میں قرآن میں نئے افق کھولے ہیں اور موجودہ زمانہ کے انسان کو یہ قدرت وتوانائی بخشی ہے کہ وہ قرآن میں جدید نگاہوں کے ساتھ غور کرے۔

یہاں آٹھویں امام حضرت علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کے ارشاد کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک شخص نے آپؑ سے سوال کیا۔

ما بال القراٰن لا یزداد عند النشر والدرس الا غضاضۃ

''آیات قرآن کا مطالعہ اور بحث ودرس اس کی طراوت اور تازگی کا باعث کیوں ہوتا ہے''؟

امامؑ نے جواب میں فرمایا:

"ان اللّٰہ تعالیٰ لم یجعله لزمان دون زمان ولا لنّاس دون ناس فھو لکل زمان جدید وعند کل قوم غض طری الی یوم القیامة۔ [1]

''خدانے قرآن کو زمانہ کے کسی خاص حصہ کے لیے یا لوگوں کے کسی خاص گروہ کے لیے نازل نہیں کیا۔ اسی وجہ سے قرآن تمام زمانوں میں تروتازہ رہتا ہے اور تمام ملل عالم اور اقوام کے لیے قیامت کے دن تک طراوت وتازگی رکھتا ہے۔

اور شاید ابن عباس نے اسی بنا پر یہ کہا ہے:

"القراٰن یفسرہ الزمان۔"

''زمانہ قرآن کی تفسیر کرتا ہے۔

زمانہ سے مراد وہی نئے افکار اور نئے علوم ودانش ہیں جو طرح طرح کے حالات میں انسانی معاشرے میں پیدا ہوتے ہیں اور مفسر کو ایک نئی بینش بخشتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں قرآن سے ایسے نئے نئے مطالب نکلتے ہیں جو گذشتہ مفسرین کے فکر ونظر میں ہرگز نہ سمائے تھے۔

صدر اسلام کی تاریخ سے آگاہی

''تاریخ اسلام'' سے مراد وہ واقعات ہیں جو پیغمبرؐ کی بعثت کے بعد اور خاص طور پر ہجرت کے بعد پیش آئے اور آیات قرآنی کا ایک حصہ ان ہی کے بارے میں ہے۔ لہٰذا ان کے لیے''غزوات'' اور''سریوں''[2] کی تاریخ سے آگاہی آیات قرآن کے ایک حصہّ کی تفسیر میں ایک موثر مدد دیتی ہے۔

قرآن مجید میں بہت سی آیات ''بدر'' ''احد'' ''احزاب'' ''بنی مصطلق'' ''حدیبیہ'' ''فتح مکہ'' اور یہود کے ایک قبیلہ ''بنی النضیر'' کے حوادث کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں ان حوادث کی وسیع تاریخ سے آگاہی جن کے بارے میں قرآن ایک خاص طرز پر بحث کرتا ہے اس قسم کے''غزوات'' ''سریات'' سے مربوط آیات کے مفاہیم کو واضح کرنے کا سبب بنتی ہے اور یہ مسئلہ ہر مفسر کے لیے ملموس اور واضح وروشن ہے۔

اس سلسلہ میں اصل اور مستند تاریخوں کی طرف...... جو بے غرض اسلامی مورخین کے قلم سے لکھی گئی ہیں...... رجوع کرنا چاہیے اور علمی اسلوب سے صحیح تاریخ کو غیر صحیح سے پہچاننا چاہیے۔

---

[1] تفسیر برہان ا ص ۲۸۔

[2] وہ بڑی جنگیں جن میں خود پیغمبر شریک ہوئے غزوات کہلاتی ہیں اور جن میں آپ نے شرکت نہیں کی سریہ کہلاتی ہیں (مترجم)

البتہ تاریخ وسیرت کی کتابوں میں بہت سی بے بنیاد باتیں بھی موجود ہیں جو نہ تو ہمارے عقائد اسلامی کے ساتھ ساز گار ہیں اور نہ ہی آیات قرآنی کے ساتھ

لیکن تحقیق کرنے والا آدمی تاریخ شناسی کے اصول کے ساتھ حق کو باطل سے جدا کر سکتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ پیش کش کی جاتی ہے کہ کتاب ''سیرۃ ابن ہشام'' مسعودی کی ''مروج الذہب'' مقریزی کی ''امتاع الاسماع'' اور '' کامل ابن اثیر'' سے استفادہ کیا جائے۔لیکن اس کے باوجود ان کتابوں کے مطالب اور مضامین کی سو فیصد ضمانت نہیں دی جاسکتی بلکہ ان میں اکثر ایسی بے بنیاد باتیں ملتی ہیں جو عقل ونقل کے بالکل برخلاف ہیں۔

نمونہ کے طور پر''ابن اثیر، تاریخ کامل'' میں جب زید اور اس کی بیوی ''زینب'' کی داستان پر پہنچتا ہے تو ایک ایسا مطلب بیان کرتا ہے کہ جسے دانا دشمنوں کے علاوہ کسی اور نے نہیں گھڑا۔[۱]

یا ہاتھیوں کے لشکر کے حملے اور ''ابابیل'' پرندوں کے ذریعہ ان کی ہلاکت اور تاریخی نابودی کو اس طرح سے بیان کرتا ہے جو نص قرآنی کے بالکل برخلاف ہے[۲]

سیرۃ ابن ہشام وہ بہترین کتاب ہے جو رسول اکرمؐ کی سیرت کے بارے میں لکھی گئی ہے اور یہ کتاب ''سیرۃ ابن اسحاق'' کا خلاصہ ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کا کوئی نسخہ اس وقت ہمارے پاس موجود نہیں ہے اور اگر محققین اسلام عالمی کتب خانوں کی سیرت کے کئی آفاق ہمارے سامنے کھل جائے جن کو دکھانے سے سیرۃ ابن ہشام عاجز وناتواں ہے، خاص طور پر اگر ہم اس بات کی طرف توجہ رکھیں کہ ''ابن اسحاق'' شیعہ تھا اور تلخیص کرنے والا ایک سنی شخص تھا اور دونوں بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف عقیدہ ونظر رکھتے تھے۔

پیغمبروں کی زندگی کے قصوں اور تاریخ سے آگاہی

آیات قرآن کا ایک عظیم حصہ گذشتہ انبیاء کی تاریخ سے مربوط ہے جو ہمیں ان کی پامردی اور اپنے اپنے زمانہ کے متکبرین اور جبارین سے مبارزہ کی طرز سے آشنا کرتی ہے۔

''عادؑ'' و''ثمودؑ'' و''صالحؑ'' اور ابراہیمؑ'' و''موسیٰؑ'' کے مانند پیغمبروں کے مبارزوں سے مربوط آیات کو واضح کرتی ہیں۔ بنی اسرائیل کے پیغمبروں خصوصاً داؤدؑ'' و''سلیمان'' کی زندگی کے حالات سے مطلع ہونا بہت سی آیات کو خاص قسم کی روشنی بخشتا ہے اور ان شخصیات سے مربوط آیات کی طرف رجوع ہماری گفتگو کی صداقت کو واضح کرتا ہے۔

البتہ اس حصہّ میں حزم واحتیاط کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے اور صحیح وقابل اطمینان تاریخ کو غیر صحیح سے جداُ کرنا چاہیے خصوصاً بنی اسرائیل کے

---

[۱] تاریخ کامل ج ۲ ص ۱۲۱۔

[۲] تاریخ کامل ج ۱ ص ۶۲۳۔

پیغمبروں کے بارے میں ''اسرائیلی'' ''جعلیات'' اور من گھڑت باتیں بہت زیادہ ہیں۔ اور ان پر ہرگز بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

نزول قرآن کے ماحول کی تاریخ سے آگاہی

قرآن ایک ایسے ماحول میں نازل ہوا جس میں رہنے والے لوگ ایک خاص قسم سے زندگی بسر کر رہے تھے اور آیاتِ قرآنی نے کئی مناسبتوں سے ان کی زندگی کے طریقے اور ان کے رسوم و آداب کی طرف اشارہ کیا ہے اور آخر میں ان پر تنقید کی ہے۔ لہٰذا ایک مفسر کے لیے ضروری ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کی زندگی کی کیفیت اور اس کے زمانہ کی حالت سے کچھ نہ کچھ آگاہ ہوتا کہ اس حصہّ سے مربوط آیات کو وضاحت سے معلوم کر سکے۔

مثلاً قرآن نے کچھ ایسے موضوعات کے بارے میں جیسے ''ازلام'' [1] اور کچھ بتوں کے بارے میں جیسے ''ود'' سواع'' ''یغوث'' ''یعوق''، نسر [2] ر عربوں کے آداب اخلاق کے بارے میں جیسے ''وأدالبنات'' [3] (بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا) اور یتیموں کے ساتھ ان کی معاشرت کے طریقے اور اسلام سے پہلے اور اسلام کے زمانہ میں عربوں کی زندگی سے مربوط دسیوں موضوعات کے بارے میں قرآن نے گفتگو کی ہے اور اس حصہ سے مربوط آیات کی کامل تشریح اس گروہ کے طرز زندگی سے آگاہی کی رہیں منت ہے کہ جن کے ماحول میں قرآن نازل ہوا ہے۔

بعض اوقات قرآن کوئی مثال پیش کر کے کچھ حقائق کو بیان کرتا ہے لیکن ایسی مثال کی واقعیت کو وہی لوگ معلوم کر سکتے ہیں جو بیابانی زندگی سے واقف ہوں یا جو خشک اور بے زراعت زمین میں زندگی بسر کرتے ہوں جیسا کہ ''حقیقت'' اور ''سراب'' کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ط (نور۔۳۹)

''ان لوگوں کے اعمال جنہوں نے کفر کیا ہے اس پیاسے کی مانند ہیں جو ہموار بیابان میں ''شورزار'' کو پانی خیال کرتا ہے۔

ایک بیابان میں رہنے والا، یا اس قسم کے لوگوں کی زندگی سے واقف آدمی اس مثال کی واقعیت کو بہتر طریقہ سے جانتا ہے لیکن وہ لوگ جو ہمیشہ دریاؤں کے کنارے پر سرسبز زمینوں میں زندگی گذارتے ہیں، ان کے لیے اس مثال کی واقعیت پہلے مرحلہ میں چنداں واضح نہیں ہوگی۔

مکیّ آیات کی مدنی آیات سے شناخت

آیات قرآنی زمانہ نزول کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہیں وہ آیات جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں اور وہ آیات جو اس کے بعد نازل

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۳ و ۹۰۔

[2] سورہ نوح آیت ۲۳۔

[3] سورہ تکویر آیت ۸۔

ہوئی ہیں پہلے حصہ والی آیات کو مکی اور دوسرے حصہ والی آیات کو مدنی کہتے ہیں۔ [1]

مکی آیات کا اپنا ایک لب ولہجہ ہے اور مدنی آیات کا ایک دوسرا لب ولہجہ ہے مکی آیات ایسے زمانہ میں نازل ہوئی ہیں جب مسلمان ایک مخفی گروہ کی صورت میں زندگی بسر کرتے تھے اور مبارزہ ومقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور ان کے حالات زندگی کی تشریع احکام جیسے نماز، روزہ، زکات، خمس اور جہاد کی اجازت نہیں دیتے تھے اس بناء پر ان آیات میں زیادہ تر روئے سخن مشرکین کی طرف ہے اور قرآن زیادہ تر عقائد اور بلند معارف کے بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔

جب کہ مدینہ کے حالات دوسری شکل کے تھے اور مسلمان ماحول کے سازگار ہونے کی بنا پر ایک عظیم قدرت کی صورت اختیار کر چکے تھے اور تشریع احکام کے حالات مکمل طور پر فراہم ہو چکے تھے اس بناء احکام سے مربوط آیات مثل نماز، روزہ، زکات، خمس اور جہاد، مدینہ میں نازل ہوئیں۔

ایک لکھنے والا مکی اور مدنی آیات کی صحیح شناخت نہ ہونے کی وجہ سے کہتا ہے کہ آیت ''الّا المودّة فی القربی۔ خاندان رسالت کے بارے میں نازل نہیں ہوئی ہے کیونکہ یہ آیت سورہ کے مکی ہونے کی بناء پر مکہ میں نازل ہوئی ہے اور اس زمانہ میں اس قسم کی چیز کا سوال کرنا بلاغت نہیں ہے۔

حالانکہ اگر وہ مکی آیات کی مدنی آیات سے تشخیص سے مربوط کتابوں کی طرف رجوع کرتا تو اس کے لیے یہ واضح ہوجاتا کہ سورت کا مکی ہونا اس کی تمام آیات کے مکی ہونے پر گواہ نہیں ہے کیونکہ بہت سی مکی آیات مدنی سورتوں کے درمیان قرار پائی ہیں اور اسی طرح اس کے برعکس (مدنی آیات مکی سورتوں میں)

اس سے قطع نظر، وہ مفسرین جو سورہ شوریٰ کو مکی سمجھتے ہیں وہی اس آیت کو اولیت حاصل ہے اگر چہ ان میں سے بعض کو بعض میں ادغام کیا جاسکتا ہے، مثلاً تاریخ اسلام اور پیغمبروں کے قصص وواقعات کو ایک طرح سے شانِ نزول میں داخل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہم نے زیادہ وضاحت کے لیے ہر ایک کی الگ الگ تحقیق پیش کی ہے۔

ایک سوال

یہاں تک صحیح تفسیر کے شرائط اور بنیادی باتیں واضح ہوگئیں۔ اب اس سلسلہ میں ایک سوال سامنے آتا ہے۔ جس کا ہم اب جواب دیتے ہیں، سوال یہ ہے:

[1] آیات مکی ومدنی کی تفسیر میں رائج اصطلاح وہی ہے جو لکھی گئی ہے اور اس سلسلہ میں ایک دوسری اصطلاح بھی ہے جو اھل فن سے مخفی نہیں ہے۔

عربی مبین سے کیا مراد ہے؟

اگر تفسیر قرآن اس قسم کے مقدمات کی محتاج ہے تو پھر قرآن اپنی اس طرح سے توصیف کیوں کرتا ہے:

وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾ (نحل)

''قرآن واضح عربی زبان میں ہے۔''

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾

(شعراء)

(اے پیغمبر) روح الامین نے قرآن کو تیرے قلب پر نازل کیا ہے تا کہ تو ڈرانے والوں میں سے ہو اور وہ واضح عربی زبان میں ہے۔

کیا ان دونوں آیات اور ان سے ملتی جلتی آیات کا مفاد یہ نہیں ہے کہ تفسیر قرآن خود زبان عربی سے آ گاہی کے علاوہ کسی اور چیز کی محتاج نہیں ہے۔

جواب:

چونکہ مشرکین عرب قرآن کی ''تحدی'' اور چیلنج کے مقابلہ میں ناتوانی کا احساس کرتے تھے۔ لہٰذا وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہتے تھے کہ اس کا کوئی مبدء منشاء سوچیں، آخرکار انہوں نے کہا کہ:

پیغمبر قرآن کو ''جبر'' و ''یسا'' نامی دو رومی غلاموں اور ان ہی جیسے دوسرے لوگوں سے لیتا ہے جیسا کہ آیت کا ماقبل اس بات کی حکایت کرتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾ (نحل)

''ہم جانتے ہیں کہ مشرکین یہ کہتے ہیں کہ محمدؐ کو ایک بشر سکھاتا ہے حالانکہ اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ قرآن کی نسبت دیتے ہیں عجمی ہے اور قرآن واضح عربی زبان میں ہے۔

''عجم'' اصل میں ابہام کے معنی میں ہے اور ''عجمی'' اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے بیان میں کوئی نقص ہو، چاہے وہ عرب ہو یا غیر عرب چونکہ عرب

اپنے غیر زبان سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے تھے لہٰذا وہ غیر عرب کو عجم کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ وہ عربی کو اچھی طرح نہیں سمجھتا یا ٹھیک طرح سے اس میں گفتگو نہیں کر سکتا۔

اس شان نزول کی طرف توجہ کرتے ہوئے جسے عام طور پر مفسرین نے نقل کیا ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آیت کا ہدف یہ ہے کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ یہ کہا جائے کہ پیغمبر نے قرآن اس قسم کے افراد سے لیا ہے حالانکہ قرآن سراسر فصاحت و بلاغت، جذب و کشش اور عذوبت و شرینی ہے جب کہ ان دونوں افراد کی گفتگو میں یہ خوبی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دو آدمی رومی ہونے کی وجہ سے یا تو عربی زبان جانتے ہی نہیں تھے اور اگر جانتے بھی ہوں تو وہ اچھی طرح سے اس میں گفتگو نہیں کر سکتے تھے اور ان کے کلمات اور باتیں تحریف اور غلطی سے خالی نہیں تھیں۔

اس بناء پر آیت کا مفاد یہ ہے کہ قرآن ایک صحیح کلام ہے اور ایک فصیح و بلیغ گفتگو ہے اور ہر قسم کی غلطی اور تحریف سے پاک ہے اس بنا پر یہ ان کے کلمات اور باتیں تحریف اور غلطی سے خالی نہیں تھیں۔

لیکن اس بات پر توجہ کرنا چاہیے کہ کلام کا فصیح و بلیغ ہونا یا غلطی اور تحریف سے پاک ہونا، اس بات کو لازم نہیں کرتا کہ ہم اس کی تفسیر میں بیان کردہ مقدمات کے محتاج نہ ہوں اور اس قسم کے مقدمات کی طرف محتاج ہونا ہرگز اس کے عربی مبین ہونے کے ساتھ منافات نہیں رکھتا۔

اس وقت دنیا کے تمام ممالک میں علمی کتابیں جو ابتدائی تعلیم و تربیت یا اعلیٰ تعلیم کے ساتھ مربوط ہیں بہت ہی سلیس اور اغلاق و پیچیدگی سے دور، نثر، میں لکھی گئی ہیں۔ اس کے باوجود وہ سب کی سب یا ان میں سے بہت سی معلم اور استاد کی تدریس سے بے نیاز نہیں ہیں۔

ہم اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اگر قرآن ایک واضح و آشکار عربی کی نثر ہے تو اس سے مقصود یہ ہے کہ اس کے گفتگو کرنے کا طریقہ زبان عربی سے ناآگاہ افراد کی گفتگو جیسا نہیں ہے جو چند غلط سلط اور محرف الفاظ کو ملا کر اپنے خیال میں عربی زبان میں گفتگو کر رہے ہوں بلکہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو زبان عربی کے اسلوب سے موافق اور ہر قسم کی تحریف و غلطی اور ہر قسم کی مغلق گوئی اور پیچیدہ سرائی سے دور اور خالی ہے۔

یہاں پر ہم دامن سخن کو کوتاہ کرتے ہوئے اپنی بحث کو امیر المومنینؑ کا ایک ارشاد نقل کرنے کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔

امیر المومنینؑ نے ابن عباس کو خوراج سے احتجاج کرنے کے لیے بھیجا اور اس طرح حکم دیا۔

لا تخاصمهم بالقرآن فان القرآن ذو وجوه و حمال تقول ويقولون ولكن حاججهم بالسنة فانهم لن يجدوا عنها محيصاً (نہج البلاغہ شمارہ، ۷۷)

اے ابن عباس خوراج سے مذاکرہ کے وقت قرآن کے ساتھ ہرگز احتجاج نہ کرنا کیونکہ آیات قرآنی کئی احتمالات کی حامل ہیں ہوسکتا ہے کہ تو ایک احتمال کو لے اور وہ دوسرے احتمال کو اور اس کے نتیجہ میں بحث و نزاع میں طول ہو جائے۔ ان کے ساتھ پیغمبر کی احادیث سے احتجاج کرنا، جو مطلوب پر دلالت کرنے میں زیادہ صریح ہیں۔

یہ اگرانما جملہ واضح طور پر بتلاتا ہے کہ کچھ آیات قرآنی کئی احتمال رکھتی ہیں اور کسی ایک احتمال کا تعین مقدمات کو طے کئے بغیر ہرگز امکان پذیر

نہیں ہے۔ اور صرف ادبی اطلاعات رکھنے کی بناء پر اس طرح کے ابہامات برطرف نہیں ہوتے۔ اس قسم کے ابہامات کو دفع کرنا انہیں طریقوں سے ہوتا ہے جن کی وضاحت کی جاچکی ہے۔

یہ حدیث یہ بتلاتی ہے کہ سب آیات قرآنی سرتا سر صریح الدلالہ نہیں ہیں اور آیت کے مفاد کو مختلف احتمالات میں سے معین کرنے کے لیے دوسرے مقدمات سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔

قم میدان شہداء مؤسسہ امام صادقؑ جعفر سبحانی

۲۷ محرم الحرام ۱۴۰۴ مطابق ۱۲ ابان ماہ ۱۳۶۲

اختتام ترجمہ

بروز ہفتہ بوقت نو بج کر دس منٹ بتاریخ ۱۸ اپریل ۱۹۸۷ء

مطابق ۱۸ شعبان المعظم ۱۴۰۷ھ

بر مکان سیٹھ نوازش علی ۸۱۔ ای ماڈل ٹاؤن لاہور

از قلم سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم

الحمدللہ اولاً و آخراً و صلی اللہ علی محمد و الہ ابداً دائماً۔

تفسیر موضوعی

جلد چہارم

قرآن کا دائمی منشور

آیۃ اللہ استاد جعفر سبحانی

مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

تعارف قرآن بزبانِ قرآن

قرآن مجید کی پہچان اور اس کے ابعاد، مشتملات اور مطالب کی عظمت اس بات کی محتاج نہیں ہے کہ ہم ادھر اُدھر تلاش کریں، مشرق و مغرب اور داخل و خارج سے شواہد تلاش کریں۔ اگرچہ ہمارے پاس مشرق و مغرب سے بکثرت ایسے شواہد موجود ہیں جو اپنی نوبت میں اہمیت و کیفیت کے لحاظ سے قابل ملاحظہ ہیں۔ لیکن سب سے نزدیک ترین اور سب سے زیادہ بنیادی راستہ یہی ہے کہ ہم خود قرآن ہی کی طرف رجوع کریں۔ اسی کے سامنے زانوئے ادب تہ کریں اور خود قرآن ہی میں تحقیق و مطالعہ کریں۔

کم از کم یہ حقیقت سب کے نزدیک، وہ قرآن پر ایمان لانے والے مسلمان ہوں یا کوئی اور، مسلّم ہے کہ قرآن فضول باتیں نہیں کرتا، اس کے مضامین و مطالب اور جملہ بندیاں، یہاں تک کہ اس کی تعبیریں بھی، سب کے سب جچی تلی، سنجیدہ اور ہر قسم کے مبالغہ اور افراط سے پاک ہیں۔

اس اصل کی طرف توجہ کرتے ہوئے اسی قدر کافی ہے کہ قرآن نے اپنے مباحث کے دوران خود اپنا جو تعارف کرایا ہے، اور جس قدر دقیق صورت میں انسان، عوالم، تعلیم و تربیت، جنگ و صلح ہدایت و ضلالت، سعادت و شقاوت، خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ نوع انسانی کی سرنوشت کے سلسلہ میں مختلف ادوار عالم میں مؤثر ہو سکتا ہے، اس کیلئے اپنے مقام اور حیثیت کو جس طرح مشخص کیا ہے، اسے ہم اسی زبانی سنیں۔

یقیناً یہ موضوع، ان لوگوں کیلئے، جو قرآن سے منسلک ہیں، بہت ہی بسیط موضوع ہے جو "تعارف قرآن بزبان قرآن" کے عنوان سے تفسیر موضوعی کی بحث کا ایک موضوع بنا سکتا ہے۔ ظاہر ہے وہ کتنی عمدہ بحث ہوگی۔

لیکن اختصار کی خاطر سر دست اتنا ہی کافی معلوم ہوتا ہے کہ ہم ذیل کی دقیق آیات کی طرف توجہ مبذول کریں:

۱۔ قرآن روشنی اور نور ہے اور تاریکیوں کو روشنی سے بدل دیتا ہے۔

قَدۡ جَآءَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ نُوۡرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۵﴾ (مائدہ)

۲۔ قرآن آمادہ اور پرہیزگار دلوں کیلئے کتاب ہدایت ہے:

ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۲﴾ (بقرہ)

۳۔ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو کرامتوں اور ارزشوں سے مملو ہے:

اِنَّہٗ لَقُرۡاٰنٌ کَرِیۡمٌ ﴿۷۷﴾ (واقعہ)

۴۔قرآن ایک غالب اور شکست ناپذیر کتاب ہے:

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ﴿۴۱﴾ (حٰم سجدہ)

۵۔قرآن ایک موزوں، سنجیدہ اور حکمتوں کی حامل کتاب ہے:

يٰسٓ ﴿۱﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ (یٰس)

۶۔اگر قرآن پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وہ سب کے سب اس کے سامنے خضوع کرتے اور پروردگار کے خوف سے پھٹ جاتے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ

(حشر :۲۱)

۷۔قرآن تمام حقائق کو پوری صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے:

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (زمر :۲۸)

۸۔قرآن مستقیم ترین راستے کی طرف، جس میں کسی قسم کی کجی اور ٹیڑھا پن نہیں، ہدایت کرتا ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (اسراء:۹)

۹۔اسی بناء پر اس کے مضامین اور مطالب میں کسی قسم کا تضاد، تناقض واختلاف نہیں ہے:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ (نساء:۸۲)

۱۰۔قرآن ایسی کتاب ہے جو حق کے محور کے گرد گھومتی ہے اور حق اس کے گرد گردش کرتا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ (بقرہ:۱۷۶)

۱۱۔قرآن ایک ایسی بابرکت کتاب ہے کہ جو اپنی آیات سے افکار کو بیدار اور عقلوں کو ہوشیار کرتی ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ (ص:۲۹)

۱۲۔قرآن اس لئے نازل ہوا ہے کہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کر کے عدل وانصاف قائم کرنے کیلئے اُٹھ کھڑے ہوں:

وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ (حدید:۲۵)

۱۳۔قرآن میں لوگوں کو عظیم ترین فکری انقلاب کی طرف متحرک کرنے کیلئے ہر قسم کی آگاہی بخش مثالیں بیان کی گئی ہیں:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ (کھف:۵۴)

۱۴۔قرآنی آیات کی تلاوت انسان کیلئے روح کی پاکیزگی، دل کے تصفیہ اور اعلیٰ ملکات اور رشد کی بالیدگی کا سبب ہے:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ (جمعه:۲)

۱۵۔قرآن بہترین باتوں پر مشتمل ہے ایسی باتیں جن میں ہر بات دوسری سے زیادہ دل پذیر اور زیادہ روح پرور ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا (زمر:۲۳)

۱۶۔قرآن جذب وکشش کے اعتبار سے اور بلندترین اقدار انسانی سے متعلق اخذ نتائج کے لحاظ سے بھی بہترین واقعات اور داستانوں کا حامل ہے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ (یوسف:۳)

۱۷۔وہ تمام مسائل جو انسان کی سرنوشت میں سعادت و نیک بختی یا شقاوت و بدبختی کے لحاظ سے موثر ہوسکتے ہیں اس میں بیان کیے گئے ہیں:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (نحل:۸۹)

۱۸۔اس طرح قرآں حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کی واضح ہدایت مہیا کرتا ہے اور نظام زندگی کیلئے اعلیٰ ترین معیار قائم کرتا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ﴿١﴾ (فرقان)

۱۹۔ان وجوہات کی بناء پر قرآن پیغمبر اسلام کی دعوت کی صداقت کے اثبات کیلئے ایک واضح ترین معجزہ ہے:

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ (عنکبوت:۵۱)

۲۰۔انہی دلائل کی بناء پر قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں کسی قسم کا کوئی شک و تضاد نہیں پایا جاتا:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۚ (بقرہ:۲)

دو اہم مباحث

قرآن کے اہم مباحث میں دو بحثیں دیگر مباحث کی طرح خاص اہمیت رکھتی ہیں، جو بالخصوص نسل حاضر کیلئے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔یہ دو بحثیں حسب ذیل ہیں:

۱۔نفاق اور منافقین

۲۔انسان کی شناخت

پہلی بحث کا تعلق اجتماعی اور معاشرتی ابعاد سے ہے جبکہ دوسری بحث کا تعلق فلسفہ انسانیت سے ہے۔پہلی بحث کی اہمیت کیلئے اسی

قدر کافی ہے کہ قرآن نے سورۃ بقرۃ کے آغاز ہی میں مشرک ومنافق دوگروہوں کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ پہلے گروہ کے بارے میں تو صرف دو آیات پر ہی اکتفا کی گئی ہے، جبکہ دوسرے گروہ کے بارے میں بحث کو تیرہ آیات جن میں دو عمدہ اور جالب مثالیں شامل ہیں، اختتام کو پہنچایا ہے۔

یہ امر اس بات کا ثبوت ہے کہ نفاق کا شر اور منافق سے خطرہ کافر ومشرک کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔

یہاں تک کہ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ اگر نفاق سے مربوط تمام آیات کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو قرآن کے تیس پاروں میں تیس پارے اسی موضوع پر بن جائیں کیونکہ درحقیقت قرآن کا دسواں حصہ صرف عہد رسالت کے منافقین کی زندگی اور ان کے مرض نفاق کے بیان پر مشتمل ہے۔

مؤلف نے اب تک منافقین اور نفاق سے مربوط آیات کو شمار تو نہیں کیا لیکن یاد رہے کہ اس موضوع پر درج ذیل سورتوں میں بحث کی گئی ہے۔

بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انفال، توبہ، عنکبوت، احزاب، محمد، فتح، حدید، مجادلہ، حشر اور منافقین

دوسری بحث کی اہمیت کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ انسان کیلئے کسی چیز کی شناخت خود اپنی شناخت سے زیادہ اہم نہیں، وہ دوسری چیزوں کی شناخت کو خود اپنی معرفت اور شناخت میں اضافہ کرنے کیلئے ضروری جانتا ہے جبکہ طبعاً خود اپنی شناخت ہی اس کا اصلی اور ذاتی ہدف ومقصد ہونا چاہیے۔

تاہم اس عجیب وغریب مخلوق کی شناخت ان متضاد صفات کے باعث جو اس میں پائی جاتی ہیں، ان صفحات میں نہیں سما سکتی، لہٰذا ایک محدود زاویہ سے ہی اس پر غور وخوض اور تحقیق کرنا ہوگی۔ اس بناء پر اس حصہ میں محور بحث، صرف اس کی خلقت وآفرینش، اس کے ذہنی غرائز ومیلانات، اس کی قدر وقیمت اور آخر میں اس کا اختیار وآزادی قرار پائے گا۔ دیگر متعلقہ ابعاد وجہات کی بحث کو پھر کسی وقت پیش کیا جائے گا۔

۱۳۵۴ھ میں مؤلف نے ایک کتاب ''دوست نما ہا'' کے عنوان سے سورۃ منافقین کی تفسیر میں پیش کی تھی۔ اس کتاب کو موجودہ نسل، خصوصاً نوجوان نسل نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ بارہا بہت زیادہ تعداد میں چھپی۔ یہی بات اس چیز کا موجب بنی کہ ''تفسیر موضوعی'' کی اس جلد میں نفاق ومنافقین کا موضوع زیادہ وسیع صورت میں پیش کیا جائے، اس موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ آیات کو سامنے رکھا جائے۔ ان آیات کی تاریخ اور ان کے شان نزول کے سلسلہ میں تاریخ ومذہب کے اصل مصادر سے مدد لی جائے۔ یاد رہے کہ ماضی قریب میں اس موضوع پر عربی زبان میں بھی دو کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں ایک کا نام المنافقون فی القرآن ہے۔[۱] جو عبدالامیر قبلان مفتی شیعیان لبنان کی تالیف ہے جبکہ دوسری النفاق والمنافقون عہد رسول اللہ مولفہ ابراہیم علی سالم مصری ہے۔[۲]

---

[۱] ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے مطبع نعمان سے ۱۳۸۰ھ ق میں طبع ہوئی

[۲] ۳۵۰ صفحات کی کتاب ہے مطبع حسنی سے ۱۳۶۸ھ ق میں طبع ہوئی۔

پہلی کتاب میں آیات کی جمع وتدوین پر زیادہ توجہ دی گئی ہے، جبکہ دوسری کتاب میں صدر اسلام میں منافقین کے واقعات اوران کی خصوصیات کو بیان کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ہم نے دونوں مؤلفین میں زیادہ تر دوسری تالیف سے،شکریہ کے ساتھ رہنمائی حاصل کی ہے اورانہی خطوط پر اس کتاب کو استوار کیا ہے۔

دوسری بحث میں اس کا فلفسیانہ پہلو زیادہ تر ہمارے مدنظر رہا ہے اسی لئے ہم نے انسان کی حریت وآزادی کے موضوع کو زیادہ وسیع پیمانہ پر مورد بحث قرار دیا ہے۔

آخر میں ہم ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے تفسیر موضوعی کی اس جلد کے مرتب کرنے میں ہمیں تشویق کی ،اور ہمارے اس حقیر کام کو لطف ومرحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اسے مفید اور سودمند قرار دیا۔ ہم خداوند تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں ''ثقلین'' کتاب وعترت۔پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دونوں یادگاروں کی خدمت کرنے میں خلوص اوراستقامت عطا فرمائے۔آمین!

جعفر سبحانی

قم: میدان شہداء موسسہ امام صادق علیہ السلام

۱۰۔شعبان ۱۴۰۵ھ ق

بمطابق ۱۱اردی بہشت ماہ ۱۳۶۴ھ ش

(۱)
مُنافقین اور اُن کی جماعت

''نفاق'' اور ''منافق'' عربی زبان کے الفاظ ہیں، جو کثرتِ استعمال کی وجہ سے فارسی (اور اُردو) زبان کا جزء بن گئے ہیں اور ہم لوگ ان دونوں الفاظ کے معانی مفہوم سے آشنا ہیں عربی زبان کی لُغت کے مطابق ''نفاق'' کے معنی ''اخفاء'' اور 'اغماض' کے ہیں[۱] ایک دورخے انسان کو جس کی گفتار اس کے دل کی بات سے مختلف ہو منافق کہتے ہیں کیونکہ اس نے اپنے دل کی بات کو چھپایا ہوا ہوتا ہے اور اس کا ظاہر اس کے باطن سے مختلف ہوتا ہے۔

دین اسلام نے ایک شریعت الہیہ کی صورت میں مکہ میں ظہور کیا پیغمبرؐ نے پورے تیرہ سال شریعت کی تبلیغ وترویج پر صرف کیے اور بہت زیادہ مصائب اور تکالیف برداشت کر کے ایک گروہ کو ہدایت کرنے اور اپنی ندائے آسمانی کو مکہ اور اطراف کے لوگوں کے کانوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

مکہ میں آپ پر ایمان لانے والے لوگ بہت کم اور کمزور تھے ان میں ''مومن'' مشرک'' اور منافق، نام کی مثلث کا کوئی پتہ نہ تھا صرف ایمان وکفر ایک دوسرے کے مُقابل تھے۔ تیسری صنف کا کوئی وجود نہ تھا۔

اسلام کے مقابلہ میں نفاقِ بہت بڑی خاصیت ہے جہاں اسلام اور مسلمان قدرت وطاقت رکھتے ہوں اور مخالفین خوف کی وجہ سے اپنی مخالفت کا اظہار نہ کر سکیں تو اس موقع پر مخالف گروہ کے افراد نفاق کی راہ اختیار کرتے ہیں، جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے زبان سے اس کے خلاف اظہار کرتے ہیں اس قسم کے حالات سے مسلمانوں کو صرف مدینہ میں دوچار ہونا پڑا۔

رسولِ اکرمؐ نے مکہّ میں تیرہ سال گزارنے کے بعد قریش کی سازش کو ناکام کرنے کے لیے، جو آپ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، سرزمین مکہ کو مدینہ میں قیام کرنے کا ارادہ سے ترک کر دیا اور ہجرت ایسے موقع پر صورت پذیر ہوئی جب ''انصار'' نے وجودِ پیغمبرؐ سے دفاع کے لیے آمادگی کا اعلان کیا اور ان کی ایک قابلِ ذکر اکثریت ایمان لے آئی۔ ان حالات میں انصار کے دو قبیلوں کے لوگوں میں سے ایک کے دل میں نفاق کا بیج پیدا ہوا اور نفسیاتی اسباب وتعصّبات کی بناء پر اس نے نشوونما پائی۔ اس حزب نفاق نے علاقہ کے مشرکین، خصوصاً اہلِ مکہ اور مدینہ وخیبر کے یہودیوں کی مدد سے کامل طور پر ایک جماعت کی شکل اختیار کر لی۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کے لیے بے شمار مصائب ومسائل پیدا کر

---

[۱] مقابیس اللغت'' ج ۸ ص ۴۵۵۔ اس کتاب کے مولف نے اس چیز کے علاوہ جو ہم نے متن میں بیان کی ہے ایک اور وجہ کا بھی اس موقع پر ذکر کیا ہے جس کا راغب نے بھی مفرادات میں ص ۵۰۲ پر ذکر کیا ہے۔ وہ ان دو چہرے والے افراد کو جنگلی چوہے کے بل کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے جس کے دو راستے ہوتے ہیں ایک ظاہری 'قاصعا'' نام کا اور دوسرا مخفی ''نافقا'' نام کا بالکل منافق افراد کی طرح جو ظاہری چہرے کے علاوہ ایک پوشیدہ چہرہ بھی رکھتے ہیں۔

دیئے اوراپنی سازشوں سے پیغمبر خداؐ کا بہت ہی قیمتی وقت ضائع کیا۔

مدینہ میں سرغنہ ہائے نفاق

تاریخ اوس، وخزرج کے قبیلوں میں سوسالہ جنگوں کی کئی داستانوں اورواقعات کا ذکر کرتی ہے یہ دونوں گروہ جو کئی خاندانوں اور شاخوں پر مشتمل تھے آخر کار جنگ سے تھک چکے تھے اوراب امن وصلح سے رہنے کا عزم رکھتے تھے۔ یہ لوگ اس بات پر آمادہ ہوئے کہ آپس میں ایک رئیس وسرپرست یا بادشاہ وسلطان منتخب کرکے سب کے سب اس کے جھنڈے تلے جمع ہوکر دشمنی کو دوستی میں بدلیں ۔سلطنت کا قرعہ فال عبداللہ بن ابی اوسی کے نام نکلا، جوایک سن رسیدہ شخص تھااوراپنی قوم میں ایک خاص احترام رکھتا تھا شایداس کی تاجپوشی کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔[1]

اسی دوران قبیلہ خزرج کے سردار جو خانہ خُدا کی زیارت کے لیے مکہ گئے ہوئے تھے۔لوٹتے وقت ستارۂ اسلام کے طلُوع کی خبر بطورِ تحفہ لے کروارد ہوئے۔اس کے بعد پیغمبرؐ کی طرف سے اسلام کے پہلے قاری اورتجربہ کار مُبلغ مصعب بن عمیر کا مدینہ کی طرف بھیجا جانا اور"اسعد بن زرارہ خزرجی" کا اس کی حمایت کرنا مدینہ میں اسلام کے متعارف ہونے کا سبب بنا۔اس طرح خزارجیوں"اور"اوسیوں" کے اکثر گھروں میں نورِ اسلام پھیلنے لگا پیغمبر خدا پے درپے دعوتوں کے بعد بعثت کے چودھویں سال،اورہجرت کے پہلے سال ربیع الاوّل کی بارہ تاریخ کوسرزمین مدینہ میں وارد ہوئے جن کا اوس وخزرج نے پرُ جوش استقبال کیا[2]

پیغمبر کے وُرود کے دن ہی جبکہ پیغمبراپنی سواری سے اُترنے بھی نہ پائے تھے اورآپؐ کی قیامگاہ کا بھی ابھی تعین نہیں ہوا تھا کہ آپ عبداللہ کے پاس سے گزرے، اُس نے خیال کیا کہ پیغمبرؐ اس کے پاس آرہے ہیں اس نے ایک خاص انداز سے پیغمبرؐ کی طرف رخ کیا اور کہا"جنہوں نے تمہیں دھوکا دیا ہے اورتمہیں یہاں لے کرآئے ہیں انہیں کے پاس جاؤاورہمیں دھوکہ نہ دو۔"

اس طرح اُس نے اپنی گفتگو سے رسولِ خُدا سے اپنے عناد کو ظاہر کیا،لیکن پیغمبرؐ ایک پر"شکوہ خاموشی کے ساتھ اس کے قریب سے گزرگئے ۔سعد بن عبادہ فوراًرسول اکرمؐ کی خدمت پہنچے،اوراس کی نارواباتوں کی عذرخواہی کرتے ہوئے عرض کیا۔آپ اس کی باتوں سے دل برداشتہ نہ ہوں،اوس وخزرج کے لوگوں نے اس کواپنا رئیس وفرمانروابنانے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔اب وہ دیکھ رہا ہے کہ آپ کی تشریف آوری نے اس کے عزائم کو یکسر بدل کررکھ دیا ہے اوراس کی سرداری چھن رہی ہے پس بہتر یہی ہے کہ آپ ہمارے ہاں تشریف لائیں۔ہم قبیلہ خزرج کے لوگ قوت وعزت والے ہیں[3]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۵۸۵۔

[2] سیرت ابنِ ہشام ج ۱ ص ۵۹۰۔

[3] اعلام الوریٰ ص ۶۴، بحار ج ۱۹ ص ۱۰۸۔

یہ پہلا اور آخری موقعہ نہ تھا کہ جب اس شخص نے اپنا کینہ اور بُغض ظاہر کیا ہو، بلکہ ایک زمانہ گزرنے کے بعد بھی جب اسلام قبول کر لیا تھا، پھر بھی وہ اپنی دشمنی کو کسی نہ کسی طرح ظاہر کرتا رہتا تھا۔

ایک دن حضرت رسولِ اکرمؐ سعد بن عبادہ کی عیادت کے لیے اس کے گھر کی جانب تشریف لے جا رہے تھے۔ جب آپ عبداللہ بن ابی کے قلعہ کے قریب پہنچے تو آپؐ نے دیکھا کہ وہ ایک گروہ کے درمیان باتیں کرنے میں مشغول ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے جو اخلاق کے اعلیٰ ترین مظہر نہ چاہا کہ بے اعتنائی سے ان کے قریب سے گزر جائیں۔ آپؐ اپنی سواری سے اُتر کر ان کے درمیان بیٹھ گئے۔ آپؐ نے قرآن کے کچھ حصہ کی تلاوت کر کے انہیں دینِ خدا کی دعوت دی سب کو خدا کی دعوت دی، سب کو خدا کی یاد دلائی اس کے غضب سے ڈرایا اور اس کی رحمت کی خوشخبری دی۔

جب آپؐ اپنی گفتگو سے فارغ ہوئے تو عبداللہ نے آپؐ کی طرف رُخ کر کے کہا۔ ''کوئی بات آپؐ کی باتوں سے بہتر نہیں ہے۔ اگر واقعتاً یہ حق کی باتیں ہیں تو بہتر یہی ہے کہ آپؐ اپنے گھر میں بیٹھ جائیں اور جو کوئی آپ کے پاس آئے اس سے یہ باتیں کریں۔ اگر کوئی آپؐ کے پاس نہ آئے تو لوگوں کو پریشان نہ کریں اور نہ ہی ان کے پاس جا کر ایسی باتیں کریں جن کو وہ پسند کرتے ہوں۔

اتفاق سے عبداللہ بن ابی کی اس مجلس میں ایک غیرت مند مسلمان عبداللہ بن رواحہ نامی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اس اہانت کی تلافی کے لیے جو عبداللہ بن ابی نے رسولؐ خدا کے لیے روا رکھی تھی۔ آپؐ کی طرف رُخ کر کے کہا: اے اللہ کے رسولؐ ہمیں اپنی رحمت کے سایہ میں لے لیجئے، اور ہماری مجالس اور ہمارے گھروں میں تشریف لایئے۔ خدا کی قسم! ہم آپؐ کی تشریف آوری سے خوش ہوں گے خدا نے ہمیں وسیلہ سے عزت بخشی اور ہدایت فرمائی ہے۔

پھر رسولؐ خدا وہاں سے سعد بن عبادہ کے گھر تشریف لے گئے۔ سعد آپؐ کے مُرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھ کو سمجھ گئے کہ کوئی ناگوار واقعہ پیش آیا ہے۔ جب اس معاملہ سے آگاہ ہوئے تو پہلی عذر خواہی کو دہرایا اور کہا: اے اللہ کے رسولؐ! اس سے درگذر فرمائیں۔ خدا کی قسم! جس روز آپ ہماری ہدایت کے لیے تشریف لائے تھے ہم عبداللہ بن ابی کی تاجپوشی کے انتظامات مکمل کر چکے تھے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ آپ اس کی اس حیثیت کے ختم ہونے کا سبب بنے ہیں [1]

منافقین کا دوسرا سربراہ اور رہبر ابو عامر اوسی تھا۔ اس نے تھوڑے عرصہ بعد ہی منافقت کے بجائے اپنے کفر کو ظاہر کر دیا۔ اس طرح وہ عبداللہ بن ابی کی طرح نفاق کے پردے میں چھپا نہ رہا۔ وہ بھی اپنی قوم میں قابل عزت و احترام سمجھا جاتا تھا یہ شخص دورِ جاہلیت میں عیسائیت کی طرف مائل تھا۔ اس نے عیسائیوں جیسی سخت بالوں کی عبا پہن لی تھی اور لوگ اسے ''راہب'' کہنے لگ گئے تھے اس ریاکارانہ عمل سے اس نے ایک مقام و حیثیت پیدا کر لی تھی۔

جب پیغمبر اکرمؐ دینِ کامل اور اس کی نمایاں و عظیم معنویت کے ساتھ مدینہ میں وارد ہوئے تو وہ رسُول خداؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۸۸

اس کے اور آپؑ کے درمیان حسبِ ذیل مذاکرہ انجام پایا:

ابو عامر: جو دین آپ لائے ہیں وہ کیا ہے؟

پیغمبرؐ: یہ آئین حنیف و دینِ ابراہیمؑ ہے۔

ابو عامر: میں بھی اسی دین پر ہوں۔

پیغمبرؐ: نہیں! ایسا نہیں ہے تو ہر گز اُن کے دین پر نہیں ہے۔

ابو عامر: آپؐ نے دینِ ابراہیم میں کچھ ایسے مسائل داخل کر دیئے ہیں جو ہر گز اس کا حصہ نہیں ہیں۔

پیغمبرؐ: میں دین ابراہیم کو واضح شکل وصورت اور زیب وزینت سے آراستہ کر کے لایا ہوں۔

ابو عامر: جو شخص جھوٹ بولتا ہے خدا اس کی موت کی مسافرت میں قرار دیتا ہے۔

پیغمبرؐ: میں بھی یہی کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جھوٹ بولنے والے کو اسی نوبت سے دو چار کرتا ہے۔

ابو عامر آنحضرتؐ اور مُسلمانوں کے برخلاف سازش کرنے سے باز نہ آیا۔ وہ مدینہ سے مکہ کی طرف فرار ہو گیا اور وہاں مشرکین کے ساتھ جاملا۔ فتح مکہّ کے بعد اس نے طائف میں پناہ لی۔ طائف کی فتح کے بعد وہ ملکِ شام چلا گیا اور دومۃ الجندل'' میں جو شام کا سرحدی علاقہ ہے سکونت اختیار کر لی۔ وہاں سے اس نے منافقین مدینہ کو مشورہ دیا کہ وہ دومتہ الجندل کے فرمانروا سے خط وکتابت کر کے اُسے مدینہ کی تسخیر پر آمادہ کریں۔

ابو عامر ہی وہ شخص ہے جس نے ''بنی غنم بن عوف'' کے منافقین کو مشورہ دیا تھا کہ وہ منافقین کے لیے ایک مرکز ''مسجد'' کے نام سے تعمیر کریں، اور نماز کے وقت سب وہاں پر جمع ہوا کریں یہ مرکز مسجد ''قبا'' کے قریب بنایا گیا۔ چونکہ یہ مقام سازش اور تفرقہ بندی کا مرکز تھی۔ اس لیے خدا نے اس کا نام مسجدِ ضرار رکھا[1]

آنحضرتؐ کو حکم دیا گیا کہ اُس مسجد کو مسمار کر کے زمین کے ساتھ ہموار کر دیں۔ انجام کار ابو عامر شام میں مسافرت کے عالم میں اپنے اہل وعیال سے دُور مر گیا۔

یہ دونوں اشخاص نفاق کے سرغنے تھے۔ دوسرے سرغنوں کے نام اور ان کی زندگی کے حالات ہم آئندہ صفحات میں مناسب مواقع پر پیش کریں گے۔

مثلثِ نحس

مُنافقین علاقہ کے یہودیوں کے ساتھ مل کر اور زیادہ سرگرم ہو گئے۔ ان یہودیوں کے تین قبیلے مدینہ میں رہتے تھے اور کچھ قبائل کی

---

[1] سورہ توبہ ۱۰۷

رہائش خیبر میں تھی۔اس طرح مکہ کے مشرکین کے ساتھ مل کر ایک منحوس مثلث جو منافقین، یہود اور مشرکین پر مشتمل تھی قائم ہوئی جس نے بہت سے ناگوار حوادث کو جنم دیا، پیغمبر اسلام کا بہت سا وقت ضائع کیا[1]

قرآن نے منافقین کے مسئلہ کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور سورہ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انفال، توبہ، حج، عنکبوت، احزاب، فتح، حدید، مجادلہ، حشر، منافقون، اور تحریم، میں ان کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ یہ بات بذاتِ خود پیغمبرؐ کے زمانہ میں اس جماعت کے خطرناک ہونے اور مشکلات پیدا کرنے کی دلیل ہے۔

اس زمانہ کے منافقین بھی دورِ حاضر کے بعض اسلامی ملکوں کے مسلمان نما منافقین کی مانند تھے، جو اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود بین الاقوامی صیہونیت اور کفر کے ساتھ مکمل ارتباط رکھتے ہیں۔ ان کے لشکروں میں شامل ہیں یہی ہیں وہ لوگ جو اس مثلثِ نحس کے اضلاع (شرک، نفاق اور یہود) بنے ہوئے ہیں۔

فلسطین کے مسئلہ کا حل نہ ہونا۔ القدس عزیز کا واپس نہ لیا جانا، اسلامی ممالک کا دن بدن ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ارتباط، استعمار وسامراج کے نفوذ کا غیر مرئی طور پر زیادہ عمیق ہونا یہ سب کچھ سرغنہ ہائے منافقین کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے جو دعوےتو اسلام کا کرتے ہیں۔لیکن عملاً یہودیوں اور کفار کے ساتھ اس قدر وابستہ ہیں کہ ان کا عضوِ حساس شمار ہوتے ہیں۔

نِفاق کا خطرہ تمام خطروں سے بڑا ہے

دوست نما دشمن جانے پہچانے دشمن سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔انسان جانے پہچانے دشمن سے تو بچتا ہے، اس کے مقابلہ میں اپنے آپ کو مسلح کرتا ہے۔مشکلِ تو دوست نما دشمن کی ہے جو دوستی کے روپ میں انتہائی کاری ضرب انسان پر لگاتا ہے۔

اسی بناء پر امیر المومنین رسُولِ خداؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:۔

''میں اپنی امت کے معاملہ میں مومن ومشرک سے نہیں ڈرتا، کیونکہ مومن کا ایمان اس کو ضرر پہنچانے سے روکتا ہے اور خدا مشرک کے شر کو باایمان افراد کی کوششوں سے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے گا۔ مجھے تو منافق سے خوف ہے جو گفتگو میں تو تمہارے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔لیکن مقامِ عمل میں وہ اپنے قول کے خلاف کام کرتا ہے[2]

صدر اسلام کے منافقین کے بارے میں اہم مسئلہ یہ ہے کہ جب تک پیغمبر اسلام زندہ رہے یہ گروہ مقامِ رسالت کے مقابلہ میں تو سرگرم عمل رہا، لیکن آنحضرت کی رحلت کے بعد اس طرح سکوت وجمود میں ڈوب گیا اور زیرزمین چلا گیا کہ تاریخ میں ان کی فعالیت کی کوئی خبر دکھائی نہیں دیتی۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ا ص ۵۸۵ تفسیر صافی ص ۲۱۴۔

[2] نہج البلاغۃ خط ۲۳

اس میں کیا راز تھا؟ یہ ایک ایسا مطلب ہے جس کا اس بحث کے آخر میں تجزیہ ضروری ہے تا کہ اس کے علل واسباب کو معلوم کیا جائے ۔ہم اب اجمالی طور پر بیان کریں گے کہ ایک نفاق تو ختم ہو گیا تھا لیکن ایک اور نفاق پیدا ہو گیا۔

نفاق اور جھوٹ وتقیہّ میں فرق

کذب ونفاق یا دروغ ودورُوئی وہ الفاظ ہیں جن سے انسان دُوری اختیار کرتا ہے،اور اکثر اوقات یہ الفاظ اس کو اندوہناک اور دکھی کرتے ہیں لیکن وہ چیز جو قبیح اور تکلیف دِہ ہے،ان دونوں الفاظ کا عملی پہلو ہے نہ کہ خود یہ الفاظ۔

اگر کسی موقعہ پر کوئی لفظ قباحت اور برائی کو ظاہر کرتا ہے تو وہ کسی ایسی حقیقت کے اظہار کی بناء پر ہوتا ہے جو قبیح ہوتی ہے۔گویا اس لفظ کے معنی کی قباحت اور برائی اس لفظ میں سرایت کر چکی ہوتی ہے۔لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ لوگ زیادہ تر جس چیز سے گریز کرتے ہیں وہ وہی جھوٹ،اور دورُوئی، کے الفاظ ہیں۔لیکن جس چیز سے بہت کم پرہیز کرتے ہیں،وہ ان کی عملی حقیقت واقعیت ہے بلکہ تاریخ بشر گواہ ہے کہ ''کذب، ونفاق، بہت سے لوگوں کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہے اور ان کی زندگی میں یہ دونوں چیزیں ملی ہوئی ہیں۔دیکھنا یہ ہے کہ ''جھوٹ'' اور ''نفاق'' میں کیا فرق ہے؟ ہم اس بارے میں کسی قدر وضاحت سے گفت گو،کریں گے۔

نفاق اور جھوٹ میں فرق:

قبل اس کے کہ ہم صدرِ اسلام کے منافقین کی تفصیل پیش کریں،نفاق' اور کذب، کے بارے میں وضاحت کے لیے ایک لغوی بحث پیش کرتے ہیں۔

یہاں ہم مختصراً اس قدر یاد دلاتے چلیں کہ نفاق دراصل زبان کے دل سے اختلاف اور زبان کی دل سے دوئی کا نتیجہ ہوتا ہے،منافق وہ ہوتا ہے جو ایسی بات کرتا ہے۔جس پر وہ خود ایمان نہیں رکھتا۔اس مکتب کا دم بھرتا ہے جس کا وہ خود معتقد نہیں ہوتا۔زبان ودل کے اس اختلاف کے نتیجہ میں ہونے والی بات کو نفاق اور ایسی بات کرنے والے شخص کو منافق کہتے ہیں چاہے وہ بات اپنی جگہ سچی ہو یا نہ ہو نفاق میں واقعیت کا دخل نہیں، بلکہ جو چیز مدِنظر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ زبان کی دل اور عقیدہ سے مخالفت ہوتی ہے پس ایسے شخص کو دورُو اور دو چہرہ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

جھوٹ میں بحث کا محور بات کا واقع کے خلاف ہونا ہوتا ہے۔یعنی گفتگو اگر واقع کے مطابق نہ ہو تو اسے جھوٹ کہتے ہیں،خود کہنے والا خواہ اس بات (کہ اس کی بات فاقد حقیقت ہے اور واقعہ کے مطابق نہیں) کی طرف توجہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔

دوسرے لفظوں میں نفاق وکذب دونوں اس جہت میں مشترک ہیں کہ ان دونوں میں ایک قسم کی دوگانگی اور اختلاف موجود ہوتا ہے لیکن نفاق کا اختلاف خالصتاً انسان کے ظاہر کا اس کے باطن سے یا اس کے باہر کا اس کے اندر سے ہوتا ہے جبکہ کذب گفتگو کے حقیقت وواقعہ کے ساتھ تضاد کو کہتے ہیں۔یعنی جھوٹ میں گفتگو واقعہ کے مطابق نہیں ہوتی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم گفتگو کے ماحول سے خارج میں

رجوع کرتے ہیں تو ہمیں بات کرنے والے کی بات کا کوئی مصداق اور حقیقت نہیں ملتی۔

''نفاق'' اور کذب' کے درمیان یہ ایک اجمالی فرق ہے۔ اگر ہم بیان کو فنی سانچے میں ڈھالنا چاہیں تو ہم اس طرح کہیں گے کہ نفاق وکذب میں چار مشہور نسبتوں میں سے عموم وخصوص من وجہ کی نسبت ہے، یعنی کبھی تو یہ دونوں صفات ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں اور کبھی یہ دونوں کسی مقام پر متفق ہو جاتی ہے۔

مثلاً جب ایک مادی شخص خدا اور آخرت کا دم بھرنے لگے جس پر اس کا ہرگز ایمان نہیں ہوتا تو ہمارے نظریہ کے مطابق اس کی گفتگو نفاق ہوگی اور وہ خود ریاکار اور منافق ہوگا۔ اس کا ظاہر باطن ایک دوسرے کے مطابق نہیں ہوگا۔ اگرچہ اس کی بات عین حقیقت وواقعیت کیوں نہ ہو۔

اس کے برعکس اگر کوئی کسی باطل مفروضے کی، جیسا کہ بطلیموس کا مفروضہ ہے۔ سختی کے ساتھ طرفداری کرے تو اس شخص کی بات ہمارے نظریہ کے مطابق جھوٹ تو ہوگی لیکن ہم اسے منافق نہیں کہیں گے، کیونکہ وہ جو بات کر رہا ہے اسی کا عقیدہ رکھتا ہے۔

لہٰذا پہلی صورت میں نفاق کا لفظ صادق آتا ہے۔ جھوٹ صادق نہیں آتا جبکہ دوسری صورت میں ہم اس کو جھوٹ کہیں گے، نفاق نہیں۔ بعض اوقات یہ دونوں صورتیں ایک ہی کلام اور ایک ہی شخص پر منطبق ہو جاتی ہیں۔ وہ اس صورت میں ہوتا ہے جب کہنے والا کوئی ایسی باطل بات کرے، جس پر وہ خود بھی عقیدہ نہ رکھتا ہو۔ ایسے موقع پر، اس لحاظ سے کہ وہ خود اپنی بات کا معتقد نہیں ہے۔ نفاق ومنافق کا عنوان اس پر منطبق ہوگا۔ لہٰذا اس صورت میں جبکہ بات میں خود کوئی واقعیت وحقیقت نہ ہو تو جھوٹ اور جھوٹے کا مسئلہ سامنے آتا ہے اور یہاں یہ بات صحیح ہوگی کہ ہم اس قسم کی گفتگو کو جھوٹ کا عنوان بھی دیں اور نفاق بھی قرار دیں، اور بات کرنے والے کو جھوٹا بھی کہیں اور منافق بھی [1]

آیاتِ قرآنی میں اس قسم کے فرق کی طرف اشارہ ہوا ہے اب ہم اس کا کچھ ذکر کرتے ہیں۔

قرآن جہاں بھی نفاق اور مُنافق کے بارے میں ذکر کرتا ہے۔ اس مسئلہ پر زبان کی دل سے دورُوئی یا زبان کے دل کے خلاف ہونے کی بناء پر گفتگو کرتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ ....يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿١٦٧﴾ (آلِ عمران:۱۶۷)

تاکہ منافق لوگ یہ جان لیں......وہ زبان سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو اُن کے دلوں میں نہیں ہوتیں، اور خدا اس بات سے جسے وہ چھپاتے ہیں، اچھی طرح واقف ہے۔''

پھر فرماتا ہے:

---

[1] ان دونوں الفاظ کے اس فرق کو موجودہ زمانہ کی اصطلاح کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے لیکن قرآن نفاق کے بارے میں ایک خاص اصطلاح رکھتا ہے جو بعد میں بیان ہوگی۔

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ (مائدہ:۴۱)

''اے پیغمبر! ان لوگوں کی باتوں سے غمگین نہ ہو جو تیزی کے ساتھ کفر میں بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ وہ زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں مگر ان کے دلوں نے ایمان کو قبول نہیں کیا۔''

یہ دونوں آیات جو منافق کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں۔ مسئلہ کو دل اور زبان کی دورُخی کی بناء پر پیش کرتی ہیں اور اسی لحاظ سے انہیں منافق کہتی ہیں درآنحالیکہ قرآن جب بھی جھوٹ اور سچ کے بارے میں بات کرتا ہے تو مسئلہ کو حقیقت کے مطابق یا حقیقت کی مخالفت کی بناء پر دیکھتا ہے۔ مثلاً نجران کے سرداروں سے پیغمبرؐ کے مباہلہ کے واقعہ میں اس طرح آیا ہے۔

ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝۶۱

ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝۶۱ (آل عمران:۶۱)

''اس کے بعد ہم ایک دوسرے پر نفرین کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت طلب کریں۔''

نجران کے لوگوں کے واقعہ میں طرفین کی گفت گو کی صحت مدِ نظر ہے، اور یہ کہ آیا پیغمبرؐ کی بات حق اور عین حقیقت ہے یا نجران کے سرداروں کی بات، جو حضرت مسیحؑ کے لیے الوہیت جیسے مقام کا عقیدہ رکھتے تھے واقعیت رکھتی ہے؟ اس میں دورُوئی کا مسئلہ یا یہ کہ طرفین میں سے ایک یا دونوں اپنی بات کا عقیدہ نہ رکھتے ہوں ہرگز درپیش نہیں تھا، قرآن میں ایسے تمام موارد کے لیے لفظ ''کذب'' استعمال ہوا ہے۔

اس طرح نفاق اور جھوٹ کا فرق واضح ہو گیا۔ اب ہم ایک دوسرے مطلب، یعنی تقیہ'' اور نفاق'' کے فرق کی، جو خود ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کچھ وضاحت کرتے ہیں۔

تقیہّ اور نِفاق میں بُنیادی فرق:

یہاں ایک دوسرا سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ ''تقیہ'' اور نفاق'' میں کیا فرق ہے، یعنی یہ کہ دونوں میں آپس میں کس طرح مختلف ہیں، کیونکہ تقیہ کرنے والے شخص کا کام بھی منافق کی طرح ہی، اس کے ظاہر و باطن میں فرق کا مظہر ہوتا ہے، اس بناء پر کیا یہ صحیح ہوگا کہ ہم تقیہ کو بھی نفاق ہی کی ایک شاخ تصوّر کریں؟ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نفاق حرام ہے اور تقیہ جائز و صحیح، بلکہ بعض اوقات واجب ہو جاتا ہے۔

اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ تقیہ اور نفاق میں ایک بنیادی فرق ہے۔ یہ ہرگز ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے، ایسا نہیں ہے کہ صرف ''(جائز اور حرام ہونے کے) حکم میں ہی یہ ایک دُوسرے سے مختلف ہوں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ لفظ 'نفاق' عربی زبان میں ایک خاص معنی رکھتا ہے۔

اور قرآن نے پہلی مرتبہ اس لفظ کو اس کے اصلی معنی [1] یعنی ''دوروئی'' کے طور پر استعمال کیا ہے قرآن کے نزول سے پہلے اس قسم کی کوئی اصطلاح موجود نہیں تھی۔

ابنِ منظور مصری جو ۶۳۰ میں پیدا ہوا اور ۷۱۱ میں مرگیا، اپنی قابلِ قدر کتاب لسان العرب ج ۱۰ ص ۳۵۹ میں لکھتا ہے۔

''احادیث میں لفظ نفاق اسم و فعل کے اپنے دُوسرے مشتقات کے ساتھ بہت زیادہ وارد ہوا ہے یہ ایک اِسلامی اصطلاح ہے جس سے قبلِ اسلام عرب بالکل آشنا نہ تھے، اگرچہ یہ لفظ ان کے درمیان موجود تو تھا تاہم اس اصطلاح سے ایسا شخص مُراد ہوتا تھا جو کفر کو چھپائے ہوئے ہو اور اس کے برعکس ظاہر کرتا ہو۔

اس بناء پر لفظ ''منافق'' کو دورُو، افراد کے لیے استعمال کرنا ایک قرآنی اِصطلاح ہے۔ یہ عمومی اِصطلاح نہیں ہے کیونکہ قرآن اس لفظ کو خصوصیت کے ساتھ استعمال کرتا ہے جو باطن میں کفر رکھنے کے باوجود ایمان کا اظہار کرتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾ (منافقون:۱)

جب منُافق تیرے پاس آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ: ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو خدا کا پیغمبر ہے، اور خدا جانتا ہے، کہ (واقعاً) تو اس کا پیغمبرؐ ہے (لیکن) خدا گواہی دیتا ہے، کہ منافقین جھوٹ بول رہے ہیں۔''

قرآن اِس آیت میں منافق کا لفظ اس دورُخے گروہ کے بارے میں استعمال کررہا ہے جو ایمان کا دعوٰے تو کرتے ہیں لیکن ان کے دل میں ایمان بالکل نہیں ہوتا۔

اس بناء پر ہر قسم کی دوروئی اور باطن کے خلاف اظہار کو نفاق نہیں کہتے بلکہ وہ اس قسم کا اظہار مخالفت ہے کہ جس میں کوئی شخص اپنے کفر کو چھپا تا ہو اور اس کے بجائے ایمان کو ظاہر کرتا ہو۔

تقیہ میں مُعاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ تقیہّ کرنے والا شخص کفر کو ظاہر کرتا ہے۔ اور ایمان کو چھپاتا ہے جیسا کہ قرآن مومنِ آلِ فرعون کے بارے میں فرماتا ہے۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ (مؤمن:۲۸)

---

[1] ابن منظور کہتا ہے کہ جنگلی چوہا اپنے بل میں دو سوراخ بناتا ہے جن میں سے ایک کو نافقا' اور دوسرے کو'' قاصعا'' کہتے ہیں۔ وہ ایک سے داخل ہوتا ہے اور دوسرے سے نکل جاتا ہے منافق بھی اسی طرح ایک دروازے سے داخل ہوتا ہے اور دوسرے سے نکل جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ دوسروں سے نقل کرتا ہے کہ جنگلی چوہا دو بلِ بناتا ہے ایک ظاہری جسے ''قاصعا'' کہتے ہیں اور دوسرے کو نافقا'' یہ پہلے کو ظاہر اور دوُسرے کو پوشیدہ رکھتا ہے جب ظاہری بل سے اس پر حملہ ہوتا ہے۔ تو وہ فوراً ہی جاکر دوسرے بل میں پناہ لے لیتا ہے۔

''فرعون کے خاندان کے ایک مرد نے جو اپنے ایمان کو چھپاتا تھا، اس طرح کہا۔۔۔''

یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جو تقیہ سے متعلق ہیں، اور اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ تقیہّ نفاق کے قطعی طور پر برعکس ہے کیونکہ تقیہ کرنے والا شخص ایمان کو چھپانے اور کفر کو ظاہر کرنے والا ہوتا ہے جبکہ منافق اس کے بالکل برعکس عمل کرتا ہے۔

اس سے بنیادی طور پر واضح ہوجاتا ہے کہ تقیہّ ہدف کے اعتبار سے بھی نفاق سے بالکل مختلف ہے نفاق کا مقصد معاشرے میں فساد برپا کرنا اور نظام اِسلام کو دگرگوں کرنا ہے جبکہ تقیہّ کا ہدف اِصلاح یا کم از کم جان و مال اور مشروع اور جائز حیثیت و مقام کی حفاظت ہوتا ہے۔

مومنِ آلِ فرعون حضرت موسیٰؑ کی جان کی حفاظت کے لیے تقیہّ کررہا تھا، یعنی فرعونیوں کے ساتھ ہم آہنگی سے اس کا مقصد یہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ جیسے افراد کی جان کی حفاظت کرے اسی لیے ان کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا:۔

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَیِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاِنْ یَّكُ كَاذِبًا فَعَلَیْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ یَّكُ صَادِقًا یُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُكُمْ ؕ

(مؤمن:۲۸)

''کیا تم ایک شخص کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ یہ کہتا ہے کہ خدا میرا پروردگار ہے، حالانکہ وہ واضح دلائل کے ساتھ تمہاری طرف آیا ہے۔ اگر وہ جھوٹ بول رہا ہے تو اس کا ضرر خود اسی کو ہوگا، اور اگر وہ سچ کہہ رہا ہے تو جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس سے تمہیں ہی فائدہ پہنچے گا۔''

تقیہّ کرنے والا آدمی اصلاح اور جان کی حفاظت کے لیے کفر کا اظہار کرتا ہے اور ایمان کو پنہاں رکھتا ہے جبکہ منافق فساد برپا کرنے کے لیے باایمان افراد کے ساتھ ہم آہنگی کا اظہار کرتا ہے حالانکہ وہ دراصل ایمان کا مخالف ہوتا ہے۔ قرآن اس بارے میں فرماتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝۸
.........وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱

(بقرہ۸و۱۱)

''لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، حالانکہ وہ ہرگز مومن نہیں ہیں۔۔۔۔ جب بھی ان سے کہا جاتا ہے کہ رُوئے زمین پر فساد نہ کرو، تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کے خواہاں ہیں۔''

اس تفصیلی بیان سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ دونوں حالتیں (نفاق و تقیہ) ماہیت و ہدف کے لحاظ سے باہم دیگر واضح فرق رکھتی ہیں۔

ماہیت کے لحاظ سے ''نفاق'' ایمان کو ظاہر کرنا اور کفر کو چھپانا ہے، جبکہ تقیہ اس کے برعکس ہے۔ منافق کے نفاق کا مقصد فساد برپا کرنا اور تباہی مچانا ہوتا ہے۔ جبکہ تقیہ کا مقصد اصلاح اور جان و مال اور ناموس کی حفاظت کرنا ہے۔

یہاں میں درج ذیل آیت کی طرف آپ کو متوجہ کرتا ہوں کہ وہ منافق کے غلبہ اور اقتدار کے موقع پر اس کے ہدف اور مقصد کی کس طرح سے تشریح کرتی ہے۔ جہاں وہ یہ کہتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ (بقرہ ۲۰۴، ۲۰۵)

لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کی باتیں اس دنیاوی زندگی میں تجھے بھلی معلوم ہوتی ہیں جو کچھ ان کے دل میں ہے اس کے لیے وہ خدا کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ بدترین دشمنِ (خدا) ہیں اور اگر وہ برسرِ اقتدار آ جائیں تو وہ کوشش کریں گے کہ روئے زمین پر فساد برپا کریں، کھیتوں، زراعت اور نسل و اولاد کو فساد سے ہلاک کر دیں، حالانکہ خُدا فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

یہاں چند نکات پیش کئے جاتے ہیں۔

۱: تقیہ کے بارے میں حضرت صادقؑ سے کچھ احادیث وارد ہوئی ہیں۔ جو اُسے ماہیت اور اہداف کے لحاظ سے واضح صورت میں بیان کرتی ہیں، تقیہ، امام صادقؑ کی نظر میں مومن کی ڈھال ہے جس کے ذریعے وہ شر و فساد کو اپنے سے دفع کرتا ہے۔ جیسا کہ آپ فرماتے ہیں۔

"اَلتَّقِيَّةُ جُنَّةُ الْمُؤْمِنِ"[1]

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں:۔

''اصحابِ کہف نے ایمان کو چھپایا اور شرک کو ظاہر کیا۔ اس طرح انہیں دو ثواب حاصل ہوئے۔

یہ دونوں حدیثیں تقیہ کی ماہیت و حقیقت کی وضاحت کرتی ہیں جو یہ ہے کہ با ایمان آدمی بعض مقاصد کی خاطر اپنے ایمان کو چھپاتا اور کفر کا اظہار کرتا ہے۔ ایسے میں وہ درحقیقت تقیہ سے ڈھال کا کام لیتا ہے۔

اسی طرح امام صادقؑ کی ایک اور حدیث میں تقیہ کے ایک اور ہدف کو بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرماتے ہیں۔

---

[1] وسائل الشعیہ ج ۱۱ ص ۴۶۰، ۴۶۷، ۴۸۲۔

''تقیہ کو اس بناء پر مشروع قرار دیا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے خون محفوظ رہیں۔''[1]

۲۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ کچھ روایات میں ایک موضوع ذالسانین، (دوزبانوں والا) کے نام سے پیش ہوا ہے جس کی مذمت کی گئی ہے کیونکہ اس کا ہدف یہ ہے کہ ظاہری زبان، باطنی زبان کے خلاف ہو۔ اس صورت میں تقیہ کی کس طرح سے توجیہ کی جاسکتی ہے جبکہ تقیہ کرنے والا شخص بھی ایک معنی میں 'ذولسانین' (دوزبانوں والا) ہوتا ہے اس سوال کا جواب واضح ہے۔ اس قسم کی ''دوروئی'' بُری اور قابلِ مذمت ہے جس کا مقصد اپنے لیے فائدہ اٹھانا اور کسب مقام ہو جبکہ کسی دوسرے کو آسیب و تکالیف پہنچانا ہو۔ اگر کوئی شخص اس ''دوروئی'' سے اپنی جان، ناموس اور مقام کی حفاظت کے لیے فائدہ اٹھائے، تو وہ نہ صرف یہ کہ قابلِ مذمت نہیں ہے۔ بلکہ بعض موارد میں عقلی اعتبار سے لازم واجب ہے۔

۳۔ عام طور پر قرآن میں منافق اس گروہ کو کہا جاتا ہے جو ایمان کو ظاہر کرتے ہوں، لیکن باطن میں کافر ہوں لیکن بعض اوقات ایک اور گروہ کو بھی منافق کہا جاتا ہے جو دل سے تو اسلام اور اس کے لانے والوں کی حقانیت کو مان گئے ہوں لیکن خواہشات کے حصول اور جاملانہ تعصب ان کے ظاہری طور پر اس کا اعتراف کرنے میں مانع ہوں۔ ایسے لوگ بھی ایک طرح سے منافق ہی ہوتے ہیں کیونکہ ان کا ظاہر ان کے باطن کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ قرآن ایسے لوگوں کے بارے میں کہتا ہے۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ (نمل:۱۴)

''انہوں نے ہمارے پیغمبرؐ کی نبوت کے دلائل کا اپنی خواہشات نفسانی اور ستم جوئیوں کی بناء پر انکار کیا جبکہ دراصل وہ اس کی صحت کا یقین رکھتے ہیں۔

مدینہ میں نفاق کا مخفی جال

اور اس کا طرِیق کار

شہر مدینہ اور اس کے اطراف میں اسلام پھیلنے کے بعد، اس گروہ نے، جن کے مادی منافع لوگوں کے دین توحید کی طرف مائل ہوجانے کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گئے تھے، اور ان میں دین کے سامنے آکر مقابلہ کی طاقت نہیں تھی زیرزمین جال بچھا کر مناسب وقت پر نئے دین کے پیکر پر ضرب لگانے اور ماحول کو اس کی گذشتہ حالت کی طرف پلٹا دینے کی سازش کی اس گروہ کے راس ورئیس عبداللہ بن ابی اور ابوعامر نامی دو اشخاص تھے موخرالذکر مدینہ میں اسلام کے غلبہ کے تھوڑی مدت بعد پر اسرار طریقہ سے مکہ کی طرف بھاگ گیا اور فتحِ مکہ کے بعد طائف کی طرف اور وہاں سے شام چلا گیا۔ جب تک وہ زندہ رہا دُور سے ہی منافقین کی اس جماعت کی رہنمائی کرتا رہا۔

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۱ ص ۴۶۰-۴۷۶-۴۸۶۔

ان دونوں افراد کی اسلام دشمنی کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ ہر مادی انسان، بالخصوص اخلاقی طور پر مادی شخص، معنویت کا دشمن ہوتا ہے اور آزادی کے تصوّر سے پریشان ہوجاتا ہے۔ تعجب تو ان دونوں منافقوں کی اولاد کے دین اسلام کی طرف مائل ہونے پر ہے، جو اسلام پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ انہوں نے جسم وجان کی پروا کیے بغیر اسلام کی راہ میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ جان کی بازی لگا دی۔ وہ راہِ حق وحقیقت کے جانبازوں اور سب سے پہلے مرٹنے والوں میں شمار ہوتے تھے اور حق تو یہ ہے کہ انہیں۔

يُخۡرِجُ الۡحَيَّ مِنَ الۡمَيِّتِ [1]

(زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے) کا واضح مصداق شمار کیا جا سکتا ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے۔

۱: ''حنظلہ'' موخر الذکر منافق کے بیٹے کی جنگ اُحد میں عجیب وغریب حالت تھی۔ اس کا باپ ابو عامر مشرکین کے ساتھ مکہّ سے معرکہ اُحد میں آیا ہوا تھا لیکن اس کا بیٹا ''حنظلہ'' مجاہدین اسلام کی صف میں شمشیر زنی کر رہا تھا۔ عواطفِ پدری وفرزندی نے اُسے حق کی طرف جھکنے اور منافق کے سامنے تلوار نکالنے سے باز نہ رکھا۔

اُس نے منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی کی بیٹی سے شادی کی۔ اس کی شبِ زفاف مسلمانوں کے مدینہ سے اُحد کی طرف مراجعت سے ٹکرا رہی تھی۔ اس نے پیغمبر اکرمؐ سے اجازت لے کر رات مدینہ میں توقف کیا اور اس سے اگلے دن بستر شہادت کو حجلہ عروسی پر ترجیح دیتے ہوئے صبح سویرے اپنی نئی نویلی دلہن کو الوادع کہا۔

لقاء اللہ'' کے عاشقوں کی وعدہ گاہ یعنی سرزمین اُحد کی طرف عجلت کی بڑی شجاعت اور بہادری سے لڑتے ہوئے زمین پر گرا اور اس کی روح جہانِ ابد کی طرف انتقال کر گئی۔ چونکہ وغسل جنابت سے پہلے ہی میدان کی طرف آیا تھا لہٰذا شہادت کے بعد آسمان کے فرشتوں نے اس کو غسل دیا اور اسی سبب سے اس کو ''غسیل الملائکہ'' کہتے ہیں [2]

۲: جمیلہ اور عبداللہ، عبداللہ بن ابی (سردار منافقین) کی اولاد تھے۔ ان کا باپ جس قدر کینہ پرور تھا۔ اتنا ہی یہ دونوں بہن بھائی اِسلام اور رسولِ اسلامؐ سے عشق ومحبت رکھتے تھے۔

''جمیلہ'' اسی ''حنظلہ'' کی بیوی تھی، جو جنگ اُحد میں شہید ہوا۔ جب ''حنظلہ، اپنی دلہن سے وداع ہونے لگا تو جمیلہ نے فوری طور پر چار افراد کو گھر میں بُلا کو انہیں گواہ بنایا کہ گذشتہ شب مراسم عروسی انجام پا گئے۔ اور راہِ خدا کے دونوں عاشقوں میں جنسی ملاپ ہو چکا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ: گذشتہ رات میں نے عالم خواب میں دیکھا کہ آسمان شگافتہ ہو گیا ہے اور حنظلہ اوپر چلا گیا اور پھر آسمان مل گیا ہے۔،

---

[1] سورۂ رُوم۔ ۱۹

[2] اسد الغابہ ج ۲ ص ۵۹ بحار ج ۲۰ ص ۵۷۔

میں اس خواب سے یہ سمجھی ہوں کہ کل میرا شوہر بسترِ شہادت پر سوئے گا، اس کی رُوح عالمِ بالا کی طرف چلی جائے گی، اور وہ شربتِ شہادت نوش کرے گا۔"

۳: عبداللہ بن ابی کا بیٹا اِسلام کا شیدائی اور رسول اکرمؐ کا عاشق تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اس کا باپ ایمان لے آئے اور نفاق سے دستبردار ہو جائے۔ ایک دن اس نے رسولِ اکرمؐ سے اس بات کی اجازت چاہی کہ وہ آپ کے وضو کا پانی جمع کر کے اپنے باپ کو پلائے شاید اس طریقہ سے اس میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

۴: عبداللہ بن ابی انصار کی مجالس میں بارہا پیغمبر اکرمؐ کے پسِ پشت سخت اور تیز باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "ابو کبشہ [1] کے بیٹے (پیغمبرؐ کی طرف اشارہ ہے) نے ہماری حیثیت کو خراب کیا اور ہمیں بہت دُکھ پہنچایا ہے۔" بیٹے کو باپ کی باتیں سن سن کر سخت غصہ آتا اور اُس نے پیغمبرؐ سے اجازت چاہی کہ وہ اپنے باپ کو قتل کر دے۔ لیکن آنحضرتؐ نے اسے اس کی اجازت نہ دی اور فرمایا: "تو اُس کے حق میں ہمیشہ نیکی کیا کر۔"

زمینِ شور

عبداللہ کے بیٹے کی کوششوں نے باپ کی ہدایت کے سلسلہ میں کوئی اثر نہ کیا۔ یہ شخص ہمیشہ حصولِ سلطنت کے خیال میں رہتا تھا اور یہ تصور کرتا تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ شاہانِ خروج کے ہنرمندوں کے ہاتھوں کا بنا ہوا تھا دیکھتا تو اس کی حالت اور بھی زیادہ برہم ہو جاتی اور اس کا کینہ کئی گنا بڑھ جاتا تھا۔

بیج کا صحیح سالم ہونا یا باغبان کی کوششیں بیج کو نشوونما کے لیے کافی نہیں ہوتیں بلکہ زمین کی کیفیت وشائستگی اس کی بنیادی شرط ہے۔ قرآن مجید اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾ (اعراف: ۵۸)

"نباتات اپنے پروردگار کے حکم سے پاکیزہ سرزمین میں ہی اگتی ہے۔ لیکن خراب اور شورزدہ زمینوں میں بیکار اور ناچیز نباتات کے سوا اور کچھ نہیں اُگتا۔ ہم شکر کرنے والے لوگوں کے لیے اسی طرح آیات کو کھول کھول کر بیان کیا کرتے ہیں۔"

اس سردارِ منافقین کی فاسد نفسیات کو جاننے کے لیے بہتر ہے کہ تاریخ کی طرف رجوع کریں۔

---

[1] ابی کبشہ" پیغمبرؐ کے اجداد میں سے کسی ایک کی کنیت ہے۔

عزت وناموس کی تجارت

جن دنوں زنا حرام ہوا عبداللہ بن ابی کا مشغلہ ایسی کنیزوں سے نفع کمانا تھا جنہیں اس نے خریدا ہوا ہوتا تھا۔ وہ انہیں جوانوں کے اختیار میں دے کر ان سے دولت کمایا کرتا تھا۔ جب تحریم زنا کی آیات نازل ہوئیں اور یہ قبیح فعلِ کلی طور پر ممنوع قرار پا گیا۔ پھر بھی اپنے اس مشغلہ سے دستبردار نہ ہوا اور اس نے اپنے اس ذلیل پیشے کو اسی طرح جاری رکھا۔

اس کی کنیزیں، جو عظیم روحانی اذیت اور تکلیف میں زندگی بسر کر رہی تھیں، رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپؐ کو اس واقعہ سے آگاہ کیا اور کہا کہ ابی کا بیٹا انہیں اس قبیح فعل پر مجبور کرتا ہے۔ حالانکہ وہ عفت پاکدامنی اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں۔'' اس موقع پر درج ذیل آیت نازل ہوئی۔

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ (نور:۳۳)

''اپنی جوان لڑکیوں کو، جبکہ وہ پاک دامنی کی خواہاں ہوں مالِ دنیا کی خاطر زنا پر آمادہ نہ کرو۔''[1]

کیا آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس شخص کا نفس جو بدقسمت عورتوں کے ناموس کی تجارت کرتا تھا اور اس طریقہ سے دولت وثروت کماتا تھا۔ پیغمبرؐ کے وضو کا پانی پی کر بدل سکتا ہے۔ اور آیت الٰہی اس کے خانہ دل میں روشنی پیدا کر سکیں گی؟

قرآن اس شخص اور اس کے پیروکاروں کے بارے میں کہتا ہے:

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ (منافقون:۴)

''جب تو انہیں دیکھے گا تو ان کی شکل وصورت تجھے بھلی معلوم دے گی، اور اگر وہ کریں گے تو (اظہارِ حق کے خیال سے جو وہ اپنی طرف سے ظاہر کرتے ہیں) تمہیں اپنی باتوں کی طرف متوجہ کر لیں گے، گویا وہ ایسی خشک لکڑیاں ہیں جنہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا کیا گیا ہو۔''

''خشب مسنّدۃ'' کا جملہ عبداللہ بن ابی جیسے لوگوں کی حالت کو بیان کرتا ہے، جو قرآنی منطق کے مقابلہ میں ان خشک لکڑیوں کی مانند ہیں جنہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا کیا گیا ہو، اور معمولی سے معمولی حرکت وانفعال بھی ان میں دکھائی نہیں دیتا۔

---

[1] مجمع لبیان ج ۴ ص ۱۴۱، الدر المنثور ج ۵ ص، آخری مدرک میں مذکور ہے کہ اس کی کنیزوں کے نام مسیکہ 'امیۂ' اور معاذہ' تھے۔

نفاق کا خفیہ جال اور منافقوں کی تعداد

عبداللہ بن ابی اپنے شرک اور بُت پرستی پر قائم تھا۔ یہاں تک کہ جنگِ بدر رُونما ہوئی اور معرکہ میں مجاہدین اسلام کی طاقت وقدرت منافق جماعت پر قطعی ویقینی ہوگئی۔ اب اسے اس کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ ''نفاق'' کے طریق سے اسلامی معاشرے میں شامل ہوجائے اور اسلام کا اظہار کرکے، اس مخفی جال کو، جس کے اعضاء وارکان ظاہری مسلمان، مشرکین اور یہودی تھے۔ گردش میں لائے۔

تاریخ نے اس مخفی جماعت کے ارکان میں سے ایک گروہ کے نام ظاہر کیے ہیں، جنگِ اُحد کے واقعہ سے، جس میں عبداللہ بن ابی تین سو افراد کے ساتھ آدھے راستے سے پلٹ آیا تھا۔ اس نے جنگ میں شرکت سے منہ موڑ کر مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ پورے طور پر واضح ہوجاتا ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کے اندر تین سو منافقین کا خفیہ جال بچھانے میں کامیاب ہوگیا۔ جن سے وہ مسلمانوں کے کاموں میں تجسس، مداخلت اوران کے اُمور میں خراب کاری کا کام لیتا تھا۔

ابنِ ابی کی ہدایت کے لیے ایک اور کوشش

آیات کے شانِ نزول میں غوروفکر سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ رُسولِ اکرمؐ کے اصحاب عبداللہ بن ابی کو ایمان کی طرف مائل کرنے کی بہت کوشش کرتے تھے۔ ایک دن پیغمبرؐ کے اصحاب کی ایک جماعت نے آپؐ سے درخواست کہ آپؐ اس سے ملنے کے لیے تشریف لے جائیں۔ اس عمل سے شاید اس کی توجہ اسلام کی طرف مائل ہوجائے۔ چنانچہ رسولِ اکرم ایک سواری پر سوار ہوکر جبکہ مسلمان آپؐ کو ہرطرف سے گھیرے ہوئے تھے، اس کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

جب آنحضرتؐ اس کے پاس پہنچے تو اُس نے نہ صرف یہ کہ مہمان نوازی کے عام آداب پر عمل نہ کیا، بلکہ وہ آنحضرتؐ سے اپنے کینہ وعداوت کو بھی نہ چھپا سکا۔ وہ فوراً رُسولِ خداؐ کی سواری کی لید کی بدبو کو بہانہ بنا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس موقع پر انصار میں سے ایک شخص اس کے سامنے آیا اور کہا: اس جانور کا فُضلہ تجھ سے زیادہ خوشبو والا ہے۔ اس جملہ پر دونوں گروہ ایک دُوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہوگئے اور اسی موقع پر مذکورہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

وَإِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ (حجرات:۹)

اگر مسلمانوں میں سے دو گروہ آپس میں ایک دوسرے سے جنگ کرنے اور لڑنے لگ جائیں تو ان کے درمیان صُلح کرادو۔''[۱]

اس کا ایمان نہ صرف ایک مصلحتی ایمان تھا بلکہ اس جال کا وہ گروہ بھی جو اس سے پہلے سے ایمان کا اظہار کرتا تھا، نفاقی ایمان رکھتا

---

[۱] مجمع البنیان ج ۵ ص ۱۳۲، الدّر المنثور ج ٦ ص ۹۰۔

تھا۔ اور بعید نہیں ہے کہ اس کے ساتھیوں کی طرف سے یہ ظاہر، اسلامی معاشرے کی سرگرمیوں کے اسرار و رموز کی جاسوسی کے مقصد سے ہو، تا کہ جاسوسوں کی طرح وہ عین موقع پر پیکر اسلام پر ضرب لگا سکیں۔

آیئے! اب یہ دیکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں اسلام کی سیاسی زندگی میں منافقین کا یہ جال مُسلمانوں کے منافع و مفاد کے خلاف کس طرح سرگرم رہا اور آنحضرتؐ کس طرح ان کے منصوبوں کو درہم برہم کیا کرتے تھے۔

(۲)

غزوہ بدر کے موقعہ پر قینقاع کے یہودیوں کے ساتھ منافقین کی سازباز

پیغمبر اکرمؐ، ہجرت کے دوسرے سال ماہِ رمضان میں سرزمین ’بدر‘ میں تین سو تیرہ افراد کے ساتھ جن کا اسلحہ صرف ایمان اور دین حق کی کامیابی کا عشق یا راہِ خدا میں شہادت تھا، قریش کے تیار لشکر کے مقابلہ میں، جو تعداد کے لحاظ سے سپاہِ اسلام سے کئی گنا تھا، اور ان میں ایک سو زِرہ پوش سپاہی اور آٹھ سو افراد پیادہ کا لشکر، جو ہتھیاروں سے لیس تھا۔ صف آرا ہوئے۔ یہ جنگ اسلحہِ ایمان کی برتری کی بناء پر اسلام کے حق میں تمام ہوئی اور قریش کا لشکر ستر ہ مقتول اور جنگ میں ’’ضربِ نفاق‘‘ کا منصوبہ اور بنی قینقاع کے یہودیوں کی سازش کیا تھی؟

۱: لشکرِ اسلام کے جذبہ کو کمزور کرنا:

حزبِ نفاق کا منصوبہ، جنگ شروع ہونے سے پہلے مسلمانوں کے دلوں میں رعب اور خوف پیدا کرنا اور جنگ کے جذبہ کو کمزور کرنا تھا۔ قرآن ایک آیت میں اس قسم کے مکروفریب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَاۤءِ دِيْنُهُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۴۹ (انفال:۴۹)

جب منافقین اور بیمار دل لوگ یہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کے دین نے انہیں دھوکہ دیا ہے (اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ قریش کے طاقتور لشکر سے ٹکرا کر ان پر کامیابی حاصل کر سکتے ہیں) پس جو شخص خدا پر توکل کرتا ہے تو خدا صاحبِ قدرت وحکمت ہے۔‘‘

تاریخ صحیح طور پر ان کی اس گفتگو کے موقع کو جنگِ بدر میں تعین نہیں کرتی، لیکن اس بارے میں کہ اس گروہ نے کس وقت ان کے جذبات کو کمزور کرنے کی کوشش کی، اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اس سرنوشت ساز جنگ میں ان کا یہ پہلا تخریبی کام تھا اور وہ چاہتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ کمزور کردیں[1]

---

[1] سیوطی، الدرالمنثور ج ص ۱۹۱ میں کہتا ہے: اس سے مراد مدینہ کے لوگوں کا وہ گروہ ہے جنہوں نے بغیر کسی معقول عذر کے جنگ نہ کی اور یہ بات مسلمانوں کے جذبات کے کمزور کرنے کا محل ومقام، مسلمانوں کے مدینہ سے چلنے کے وقت کو بتاتی ہے۔

مسلمانوں کی ہمت کو کمزور کرنا، منافقین کا ہمیشہ کا کام تھا۔ جنگِ احزاب میں بھی انہوں نے اس پر عمل کیا جیسا کہ قرآن ان سے نقل کرتا ہے۔

وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾

(احزاب:۱۲)

''جب منافقین اور بیمار دل لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ خدا اور اس کے پیغمبرؐ نے ہمیں دھوکہ دیا ہے (کامیابی کی یہ خوش خبری فریب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔)

۲: پیغمبرؐ کے خلاف پروپیگنڈا

جب جنگ مسلمانوں کی فتح پر ختم ہوگئی تو آنحضرتؐ نے عبداللہ بن رواحہ اور زید بن حارثہ کو مامور کیا کہ وہ آپؐ کے مخصوص اونٹ پر سوار ہوکر تیزی کے ساتھ مدینہ پہنچیں اور مسلمانوں کو اسلام کی کفر پر کامیابی سے آگاہ کریں۔ جب عبداللہ مدینہ کے بالائی حصہ میں اور زید، اس کے زیریں حصہ میں اِسلام کی کامیابی، پیغمبر کے صحیح وسالم ہونے، مشرکین کے ایک گروہ کے قتل ہونے اور دوسرے کے قید ہونے کی خبر مسلمانوں کو سنا رہے تھے تو کعب بن اشرف جو باپ کی طرف سے عرب اور ماں کی طرف سے یہودی تھا اور حزبِ نفاق کے ساتھ راز و نیاز رکھتا تھا، کہنے لگا: اگر یہ خبر درست ہے تو پھر زمین کا نیچے والا حصہ اوپر والے سے بہتر رہے گا۔''

فتح کی خبر پھیل جانے نے منافقین کو ہلا کر رکھ دیا، لیکن پھر بھی وہ اپنی شیطنت سے دستبردار نہ ہوئے۔ اور رسول اکرمؐ کے مخلص صحابی ابولبابہ، سے کہنے لگے: معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مسلمان میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے ہیں اور محمدؐ مارے گئے ہیں اور محمدؐ کے قتل کا ثبوت ان کا اونٹ ہے جس پر زید سوار ہے اور خوف کے مارے نہیں جانتا کہ کیا کہہ رہا ہے۔''

زید کا بیٹا اسامہ، کہتا ہے کہ جب میں نے اس منافق کی ''ابولبابہ'' سے گفتگو سنی تو میں فوراً اپنے باپ کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا۔ کیا واقعاً معاملہ اسی طرح ہے جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں؟'' تو زید نے کہا: خدا کی قسم ایسا ہی ہے اس وقت میں نے قوی ہمت اور طاقتور دل کے ساتھ اس منافق کا راستہ روک لیا اور اس سے کہا: تو اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کیوں کر رہا ہے میں عنقریب ہی تجھے ظاہر کروں گا کہ تو اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائے: ''اُس منافق نے وحشت میں کھوئی ہوئی حالت میں کہا: ''میں نے جو کچھ کہا ہے وہ میں نے کسی سے سُنا ہے۔''[1]

۳: مسلمانوں کو معمولی امداد کے ذریعہ غافِل کرنا

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۴۲، ۶۴۳، سیرتِ حلبی ج ۲ ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

جنگِ بدر میں مسلمانوں کی نمایاں کامیابی اس بات کا سبب بنی کو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ظاہری طور پر اسلام لاکر اِسلام کے لباس میں اپنے نفاق سے خود کو آسیب اور تکلیف سے محفوظ کرلے اور انجامِ کار پوشیدہ اور خفیہ جماعت کی بہتر طریقہ پر رہبری کر سکے۔

وہ پیغمبر اکرم کو دھوکہ دینے کے لیے مادی خدمت کا مظاہرہ کرنے لگا۔ جنگِ بدر میں جب آنحضرتؐ کے چچا عباس قید ہوئے اور کچھ رقم فدیہ کے طور پر دے کر آزاد ہو گئے اور اسلام لے آئے تو آنحضرتؐ نے انہیں ایک پیراہن پہنانا چاہا۔ چونکہ ان کا قد بلند تھا لہٰذا کوئی ایسا پیراہن اُن کے قد کے لیے مناسب ہو، نہ مل سکا۔ اس موقع پر عبداللہ بن ابی نے جو خود بھی انھی کی طرح بلند قامت تھا، اپنا پراہن آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کر دیا کہ آپ اسے اپنے چچا کو پہنچا دیں[1] تا کہ اس طرح اپنے گذشتہ کردار پر پردہ ڈال سکے، اور مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کر سکے۔

۴: غزوہ قینقاع میں دشمنوں کی حمایت

قینقاع یہودیوں کے تین قبیلوں میں سے ایک تھا جو مدینہ میں رہتے تھے، میدان جنگ میں قریش کی شکست کی خبر نے انہیں سخت دہشت زدہ کر دیا اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف سرد جنگ شروع کر دی۔

آنحضرتؐ نے پہلے تو انہیں پند و نصیحت کرنا چاہی کہ وہ اسلام کے خلاف سرد جنگ سے دستبردار ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے آپ نے ان سب کو ان کے اپنے مخصوص بازار میں اکٹھا کیا، اور ان سے کہا: اس مصیبت سے جس نے سرزمین بدر میں قریش کو گھیر لیا تھا ڈرو، تم خوب جانتے ہو کہ میں خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں اور تم اس چیز کو اپنی کتابوں میں پڑھتے ہو، لیکن غرور نے تمہیں سختی کے ساتھ گھیر رکھا ہے۔

یہود اپنے غرور کی وجہ سے اور اسلامی معاشرے کی شناخت نہ کر سکنے کی بناء پر پیغمبرؐ سے کہنے لگے: تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم تمہاری قومِ قریش کی مانند ہیں۔ دھوکہ میں نہ رہنا تم نے ایسے گروہ کے ساتھ جنگ کی ہے جو رموزِ جنگ سے آشنا نہیں تھے۔ اگر تم ہمارے مقابلہ میں آئے تو پھر تمہیں بہادروں کا پتہ چل جائے گا[2]

یہ گستاخی تو پھر بھی آنحضرتؐ اور ان کے اصحاب کیلئے قابل برداشت تھی لیکن انہوں نے ایک ایسا کام کیا جس سے ان کی عہد شکنی واضح ہو گئی۔ یہ اس طرح ہوا کہ انصار کی ایک عورت ''بنی قینقاع'' کے بازار میں اپنا سامان بیچنے کیلئے لائی، اور ایک یہودی سنار کی دکان کے سامنے بیٹھ گئی۔ بازار کے یہودیوں نے اس کا چہرہ کھلوانے کے بہت جتن کیے۔ لیکن اس عورت نے چہرہ سے پردہ نہ ہٹایا۔ سنار نے اس عورت کے کُرتے کے نچلے حصہ کی اس پست کے ساتھ گرہ لگا دی۔ جب وہ عورت اپنی جگہ سے اُٹھی تو اس کے جسم کا کچھ حصہ ظاہر ہو گیا اور یہودی جوان اس

---

[1] سیرتِ حلبی ج ۲ ص ۲۰۹۔

[2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۷ اور سیرۃ حلبی ج ۲ ص ۲۲۰، آخری مدرک میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے یہ باتیں ان کے قلعہ کے محاصرہ کے موقع پر کہی تھیں۔ لیکن جو کچھ ابن ہشام نے تحریر کیا ہے وہ زیادہ صحیح ہے کیونکہ بعید ہے کہ محاصرہ شدہ افراد اس قسم کی گستاخی کریں۔

عورت کا مذاق اڑانے لگے۔ اس عورت نے فریاد بلند کی۔ ایک مسلمان مرد نے اچانک سنار پر حملہ کر کے اس قتل کر دیا، یہودی فوراً اس مسلمان مرد پر پل پڑے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ اس مقتول کے وارثوں نے مسلمانوں کو فریادرسی کیلئے بلایا تو یہ معاملہ کچھ زیادہ ہی طول پکڑ گیا۔

بطور مسلمان ہتک ناموس کا مسئلہ اکیلا ہی اس بات کیلئے کافی ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر ٹوٹ پڑے۔ چہ جائیکہ اس کے ساتھ ایک انسان کے قتل کا ضمیمہ بھی شامل ہو جائے۔ لہٰذا بنی قینقاع کے یہودیوں نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اپنی دکانیں بند کر دیں اور اپنے گھروں میں جو بلند اور محکم قلعہ میں تھے پناہ گزین ہو گئے ان کا اس طرح قلعہ بن ہو جانا، ان کی رسول خداؐ کے ساتھ دشمنی اور براہ راست مخالفت کی علامت تھا۔

اس موقعہ پر قبیلہ خزرج کے دو سردار، جن کا زمانہ جاہلیت میں ''بنی قینقاع'' کے ساتھ عہد و پیمان تھا۔ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مندرجہ ذیل باتیں کیں:۔

''عبادہ بن صامت نے رسولِ خدا کی طرف رخ کر کے کہا۔ اے اللہ کے رسولؐ میں نے جو عہد و پیمان ان کے ساتھ باندھا، اس سے خدا اور اس کے پیغمبر کی بارگاہ میں پناہ مانگتا ہوں میں خدا اور اس کے پیغمبرؐ اور مومنین کو دوست رکھتا ہوں''

لیکن اسلام سے عداوت کا ہاتھ عبداللہ بن ابی کی آستینِ نفاق سے، اسلام کا اظہار کرنے کے باوجود باہر نکل آیا، اور اس نے کہا: میں تو اس عہد و پیمان کو جو میں نے یہودیوں کے ساتھ باندھا تھا نہیں چھوڑوں گا، مجھے تو آئندہ کے حوادث سے ڈر لگتا ہے۔

آنحضرتؐ نے اس سے فرمایا: تو بھی ''عبادہ'' کی طرح اپنا عہد و پیمان اُن سے واپس لے لے۔'' لیکن عبداللہ نے منت کرتے ہوئے اس بات پر بہت ہی زیادہ اصرار کیا کہ آنحضرتؐ اس گروہ سے اُس کے عہد پیمان کا احترام کریں اور انہیں کیفر کردار تک پہنچانے سے صرفِ نظر کریں۔

مسلمانوں نے آنحضرتؐ کے حکم سے ہجرت کے دوسرے سال نصف شوال سے لے کر ذیقعد کے آغاز تک پندرہ شب و روز ان کے قلعہ کا محاصرہ کیے رکھا۔ اس جنگ میں آنحضرتؐ نے علم حمزہ بن عبدالمطلب کے سپرد فرمایا تھا۔

اس موقع پر منافقین کا سرداران کے دفاع کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور انتہائی تکلیف وہ صورت میں ان کی شفاعت کرتا رہا۔ اس کے اور آنحضرتؐ کے درمیان حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

عبداللہ: میرے ہم پیمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ (یہ کہتے ہوئے) اس نے پیچھے سے رسُول خداؐ کی زرہ کے گریباں میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔

رسول اکرمؐ (اس بے ادبانہ فعل سے غضبناک ہوئے اور کہا) وائے ہو تجھ پر مجھے چھوڑ دے۔''

عبداللہ: جب تک آپ ان کے حق میں نیکی نہ کریں گے میں نہیں چھوڑوں گا میں تو آئندہ کے حوادث سے ڈرتا ہوں کہ کسی دن آپ ان سب کا قلع قمع کر دیں گے۔

پیغمبرؐ: خدا بنی قینقاع کے یہودیوں اور عبداللہ کو اپنی رحمت سے دُور رکھے۔"

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:۔

"انہیں لے جاؤ۔ خدا اس کام کو تیرے لیے مُبارک نہ کرے۔" اس کے بعد حکم دیا کہ بنی قینقاع کے یہودی عبادہ بن صامت کی کمان میں تین دن کے اندر اندر مدینہ چھوڑ دیں۔

اس مرتبہ بھی عبداللہ سفارش کے لیے کھڑا ہوگیا اور رُسول خُداؐ تک پہنچنے کا قصد کیا لیکن آنحضرتؐ کے صحابہ نے اُسے روک دیا اور معمولی سے جھگڑے کے بعد، جس میں ابن ابی کا چہرہ مجروح ہوگیا، وہ مایوس ہوکر واپس پلٹ گیا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہودیوں نے مدینہ سے نکلتے وقت عبداللہ بن ابی کی کوششوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا: ہم ایسے شہر میں جہاں "ابوحباب" کے ساتھ اس قسم کا سلوک ہو رہنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔[1]

اس موقع پر ایک آیت عبادہ بن صامت کی شان میں اور کئی آیات منافقین کی مذمت میں نازل ہوئی۔ قرآن عبادہ کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے:

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۝۵۶

(مائدہ:۵۲)

"جو شخص خدا اور اس کے رسول اور مومنین کو دوست رکھے گا، تو اللہ کا گروہ ہی کامیاب ہونے والا ہے۔

وہ آیات جو منافقین کی مذمت میں نازل ہوئیں اس طرح ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۝۵۱ (مائدہ:۵۱)

"اے ایمان لانے والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ ان میں کے بعض دوسرے بعض کے دوست ہیں۔ اور جو شخص تم میں سے انہیں دوست رکھے گا، تو حقیقت میں وہ انہیں میں سے ہوگا۔ بیشک خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۴۸-۴۹۔ سیرۃ حلبی ج ۲ ص ۲۲۲۔

تُصِيۡبَنَا دَآٮِٕرَةٌ ‌ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّاۡتِىَ بِالۡفَتۡحِ اَوۡ اَمۡرٍ مِّنۡ عِنۡدِهٖ فَيُصۡبِحُوۡا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ نٰدِمِيۡنَ ۞

(مائدہ:۵۲)

''مسلمانوں کا وہ گروہ جن کے دلوں میں مرض ہے (منافقین) ان سے دوستی کرنے میں جلدی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں گردشِ روزگار میں کوئی تکلیف ہمیں بھی نہ پہنچ جائے۔ امید ہے کہ خدا مسلمانوں کو فتحیاب کردے یا کوئی اور امر (جو مسلمانوں کی عزت بڑھائے) صورت پذیر ہو تو منافقین اس چیز سے جسے وہ دل میں چھپائے ہوئے ہیں پشیمان ہوں گے۔''

وَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَهٰٓؤُلَۤاءِ الَّذِيۡنَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ‌ۙ اِنَّهُمۡ لَمَعَكُمۡ‌ؕ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَاَصۡبَحُوۡا خٰسِرِيۡنَ ۞ (مائدہ:۵۳)

اور اہل ایمان یہ کہیں گے کہ منافقین کا یہ گروہ جو بڑی سختی اور مبالغہ کے ساتھ قسم کھا کر کہا کرتا تھا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں (ان کے ریاء کا پردہ کس طرح سے چاک ہو گیا ہے) ان کے تو سارے کے سارے اعمال اکارت گئے۔ اور وہ سخت خسارے میں آ گئے۔''

۵: دِکھاوے کا ایمان

ایمان کا تظاہر اور دکھاوا کرنا نفاق کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ یہ ایسا دکھاوا ہے جس کی کوئی مسلمان نمائش نہیں کر سکتا۔

مفسرین کہتے ہیں۔

رئیس المنافقین اپنے ساتھیوں کو ہمیشہ یہ تعلیم دیتا تھا کہ وہ مسلمانوں کے سامنے اسلام کو ظاہر کیا کریں۔ ایک دن خود عبداللہ نے بھی اس طریقہ پر عمل کیا۔ جب وہ رُسولِ خداؐ کے اصحاب میں سے ایک گروہ کے سامنے آیا۔ جبکہ اس کی جماعت کے ارکان نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، تو اس نے رسولِ خداؐ کے ایک صحابی کی طرف رُخ کر کے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ ایک طرح سے تعریف کی۔ حضرت ابوبکر کو آنحضرت کا یارِ غار کہا حضرت عمر کو قبیلہ عدی کا بزرگ بتایا جب حضرت علیؑ کے پاس پہنچا تو کہا: رسول خداؐ کے چچازاد بھائی، ان کے داماد اور ان کے بعد قبیلہ بنی ہاشم کے سردار پر آفرین ہو۔[1]

---

[1] الدر المنثور ج ۱ ص ۳۱۔ اس سلسلہ میں حضرت علی کا عبداللہ کو جواب مذکور نہیں لیکن ''النفاق والمنافقون'' کے مؤلف نے اسے نقل کیا ہے۔

حضرت امام علیؑ نے جو کبھی بھی نفاق کے مقابلہ میں خاموش نہیں رہتے تھے، عبداللہ کی طرف رُخ کر کے فرمایا۔

''خدا سے ڈر، اور منافق نہ بن، منافقین روئے زمین پر بدترین لوگ ہیں۔''

اس سردار منافقین نے انتہائی منت وسماجت سے حضرت علیؑ سے کہا: ''آپ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ ہمارا اسلام پر عقیدہ اور ایمان ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ کا اِسلام پر عقیدہ و ایمان ہے۔''

جب آنحضرتؐ کے اصحاب ان سے کچھ دُور چلے گئے تو اس نے اپنی جماعت کے ارکان کی طرف رُخ کر کے کہا: تم نے دیکھا میں نے جس طرح کا ان کے ساتھ برتاؤ کیا ہے۔ تم بھی اسی طرح سے کیا کرو۔ ظاہر میں تو ان کی تعریف کرتے رہو۔ لیکن باطن میں ان سے الگ تھلگ رہو۔''

اس موقع پر ذیل کی دو آیات نازل ہوئیں۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَوْا إِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا إِنَّا مَعَكُمْ ۙ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾ (بقرہ: ۱۴)

''جب وہ مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لائے ہیں۔ لیکن جب اپنے شیطانوں سے خلوت کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں اور تمہارے دین پر ہیں اور ایمان لانے والوں سے تو ہم مذاق کر رہے تھے۔

(۳)

جنگ اُحد میں
مُنافقین کی خیانتیں

''نفاق'' ایک ایسا پردہ ہے جو منافق کی نیت اور دل کی باتوں کو چھپائے رکھتا ہے۔ پھر جب تک کوئی شدید حادثہ رُونما نہیں ہوتا۔ نفاق کا پردہ نہیں ہٹتا۔ نہ منافق کا اصل چہرہ پہنچانا جاتا ہے اور نہ ہی مومن اور منافق میں امتیاز ہو پاتا ہے۔

منافق گروہ کے ارکان مدینہ اور اس کے اطراف میں ہجرت کے تیسرے سال کے ماہِ شوال تک ''دوروئی'' اور دو چہروں کے پردہ میں زندگی بسر کرتے رہے۔'' حتیٰ کہ اس گروہ کے افراد صحیح طور پر پہنچانے نہیں جاتے تھے۔ لیکن غزوہ احد کے واقعہ نے اس پردہ کو ہٹادیا۔ اور منافقین سے اتفاق رکھنے والوں کی اکثریت کو مسلمانوں نے پہنچان لیا۔ اس طرح وحی الٰہی کی حقیقت سامنے آ گئی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جنگِ اُحد کے واقعہ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿١٧٩﴾

(آل عمران:۱۷۹)

''خدا تعالیٰ مومنین کی جماعت اور معاشرے کو ہرگز اس حالت میں یہ نہیں رہنے دے گا جس حالت میں کہ وہ اب ہیں حتیٰ کہ پاک کو ناپاک سے جُدا کردے گا۔ خدا ہرگز تمہیں غیب کی باتوں پر مطلع نہیں کرتا۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے پس تم خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور پرہیز گاری اختیار کرو۔ اور اگر تم ایمان لے آؤ گے اور پرہیز گاری اختیار کرو گے تو تمہیں عظیم اجر ملے گا۔''

یہ درست ہے کہ بنی قینقاع کے واقعہ میں اس جماعت کے رئیس عبداللہ ابن ابی پوری طرح بے نقاب ہو گیا تاہم اس طرح صرف یہ سردار مُنافقین کے سامنے ہی آسکا۔ جبکہ اس گروہ کے ارکان ہرگز پہچانے نہ جاسکے۔ لیکن اُحد کے حادثہ میں ان کی قلعی کھل گئی اور ان کی خیانت اور کارشکنی کے سوا اور کوئی ہدف نہیں۔ اس طرح قرآن کی آیتِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ نے عملی جامہ پہن لیا۔

اس روہداد کی تفصیل اِس طرح ہے:

قُریش کوہِ اُحد کے پاس

مجاہدین اسلام نے بدر کی جنگ میں قریش کے لشکر پر کمر توڑ ضرب لگائی تھی جس کے نتیجہ میں ان کا لشکر ستر مقتول اور ستر قیدی چھوڑ کر نا قابلِ تلافی رسوائی کے ساتھ مکہ کی طرف واپس بھا گا تھا۔

ابوسفیان نے جو ''فرعون مکہ'' تھا جذبہ انتقام میں شدت پیدا کرنے کے لیے ہر قسم کی گریہ وزاری کو ممنوع قرار دے دیا تھا تا کہ مناسب موقع پر مدینہ جا کر بدر کے مقتولین کے خون کا بدلہ لے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے قریش کا لشکر ابوسفیان کی سرکردگی میں بہت زیادہ تیاری کے ساتھ ہجرت کے تیسرے سال [1] بارہ ماہ شوال، بدُھ کے دن، مدینہ کے شمال میں، وادی عتیق میں کوہِ اُحد کے دامن میں وارد ہوا۔ یہ مقام کسی نخلستان کے قریب نہ ہونے اور زمین کے ہموار ہونے کی وجہ سے فوجی کاروائی کے لیے زیادہ مناسب تھی۔ اسی وجہ سے شہر مدینہ کو اس جانب سے زیادہ خطرہ لاحق تھا۔

اگرچہ آنحضرتؐ کو اپنے چچا عباس کے ذریعے قریش کے ارادہ اطلاع مل چکی تھی [2] تاہم آپ نے مزید تحقیق کے لیے فضالہ کے بیٹوں 'اُنس، اور مونس، کو مدینہ سے باہر روانہ کیا۔ اس طرح جمعرات کے دن عصر کے وقت دشمن کے لشکر کی مدینہ کی طرف پیشقدمی آنحضرتؐ کے لیے مسلم ہوگئی۔ لشکر اسلام کو دشمن کے شب خون مارنے کا خطرہ تھا۔ اس لیے ایک جماعت نے آنحضرتؐ کے خانہ اقدس، مسجد نبوی اور شہر کے دروازوں کی حفاظت اپنے ذمہ لے لی، یہاںتک کہ دن نکل آیا۔ اور آنحضرتؐ کے حکم سے ایک فوجی مجلس مشاورت تشکیل دی گئی۔

طریقہ دِفاع میں مختلف آراء

دفاعی مجلسِ مشاورت میں دفاع پر دو رائیں پائی گئیں۔

۱: قلعہ بند ہونا

مسلمان مدینہ سے باہر نہ جائیں۔ مرد کوچہ و بازار میں دست بدست لڑیں اور عورتیں چھتوں اور بُرجوں سے دشمن پر سنگ باری کریں۔ یہ نظریہ رئیس المنافقین ''عبداللہ بن ابی'' نے پیش کیا۔ اس نے اس ترکیب پر حد سے زیادہ زور دیا۔ وہ باصرار کہتا تھا۔ مدینہ آج تک کسی سے فتح نہیں ہوا۔ جب بھی کسی دشمن نے ہمارا رُخ کیا ہم نے اسی طریقہ سے اس پر کامیابی حاصل کی۔

۲: شہر سے باہر نکل کر دفاع کرنا

---

[1] تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۴۳۱ بمطابق نقل سیرۃ ابن اسحٰق

[2] تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۴۳۰ وغیرہ

جنگجو اور شجاعان مدینہ سے باہر جا کر شہر کا دفاع کریں۔ ان کے نزدیک شہر کے اندر رہ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اور دشمن کے حملہ کا انتظار کرنا باعثِ ننگ و عار تھا۔

انصار اور ان کے نوجوان اسی نظریہ کے موید تھے اور سب سے زیادہ اسلام کے شجاع بزرگ حضرت حمزہ کا اس طریقِ جنگ پر اصرار تھا اس سلسلہ میں اختلاف رائے کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے حضرت پیغمبرؐ سے عرض کی:

''اس خدا کی قسم جس نے اپنے پر قرآن نازل کیا ہے، جب تک میں مدینہ کے باہر دشمن سے جنگ نہ کرلوں گا کھانا نہیں کھاؤں گا۔''

آخر کار دوسرا طریقہ جنگ اختیار کرلیا گیا اور پیغمبر اکرمؐ نے اس سے موافقت کی آپؐ گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ زِرہ زیب تن کی شمشیر حمائل کی، ڈھال پشت پر ڈالی، کمان کو شانہ اقدس پر لٹکایا اور نیزہ ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر تشریف لائے۔

پہلے نظریہ کی قباحت

اس میں شک نہیں ہے کہ قلعہ بندی والا نظریہ چاہے بعض مواقع پر نتیجہ خیز بھی رہا ہو لیکن موجود حالات میں نہ صرف مصلحت کے خلاف تھا بلکہ درج ذیل وجوہات کی بناء پر خطرناک بھی تھا۔

اوّل: مسلمان جنگ بدر میں اپنی نمایاں کامیابی سے ایسے افتخارات اور اعزازات حاصل کر چکے تھے جس پر دوست اور دشمن سب کو تعجب تھا۔ بدر میں دشمن کئی جانیں تلف کرا کے بھاگ کھڑا ہوا تھا، اور اس نے بری طرح شکست کھائی تھی۔ اب وہی شکست خوردہ دشمن، تازہ دم فوج کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ ان حالات میں اگر مسلمان اپنے گھروں میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے اور دفاع کے لیے مستورات سے مدد حاصل کرتے تو یہ بات اُس روح شجاعت کے خلاف ہوتی جسے وہ جنگ بدر میں دکھا چکے ہیں۔

دوئم: مدینہ کے اندر رہ کر جنگ کرنا جہاں کچھ گھر دشمن کے لیے پناہ گاہ کا کام دے سکتے تھے بہت ہی خطرناک تھا۔ بعید نہ تھا کہ منافقین جنگ کی گرم بازاری میں دشمن کو شہر پر قبضہ کرنے کے موقع پر فراہم کر دیتے جو اس داخلی دشمن کی رہنمائی اور مدد سے شہر کے حساس علاقوں پر مسلط ہو جاتے۔ اس طرح مسلمانوں کا بہت بھاری نقصان ہوتا اسی پیش بینی کی خاطر آنحضرتؐ کے چچا حضرت حمزہ نے طریقہ دفاع کی بحث کو قسم کھا کر ختم کر دیا۔

اس تحلیل و تجزیہ کا تقاضا یہی ہے کہ آنحضرتؐ بھی اس طرح مدینہ کا دفاع چاہتے تھے۔ لیکن ابن ہشام کا خیال ہے کہ آنحضرتؐ مدینہ سے باہر نکل کر شہر کا دفاع کرنے کے حق میں نہ تھے [1] حلبی اپنی سیرت میں کہتا ہے: مدینہ میں ٹھہر کر اور خود شہر میں رہ کر دفاع کرنا مہاجر و انصار میں سے بزرگ صحابہ کا نظریہ تھا۔ لیکن ان نوجوانوں کا اصرار، جو جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے اور دشمن سے جنگ کرنے کے لیے بے چین تھے اس بات کا سبب بنا کر رسول اکرمؐ نظریہ اول پر نوجوانوں کے نظریہ کو مقدم رکھیں، لیکن یہی حلبی چند سطور کے بعد لکھتا ہے کہ ''انصار

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۱۳۔

حضرت حمزہ کے نظریہ سے پوری طرح متفق تھے۔''[1]

گذشتہ تجزیہ پر غور کرنے سے اس قسم کی منقولات کی اصالت میں شک اور تردّد ہو سکتا ہے خصوصاً اس حالت میں کہ آنحضرتؐ کبھی عمومی مصالح کو نظرانداز نہیں کرتے تھے، نہ ہی چند نو جوانوں کے اصراء پر مصلحت وقت کو ٹھکرا سکتے تھے۔

اس قسم کے منقولات پر اعتماد آنحضرتؐ سے عدمِ معرفت کی ترجمانی کرتا ہے۔ رسُولِ اکرمؐ عام قسم کے دُنیوی رئیس وسردار نہیں تھے۔ کہ افکار ونظریاتِ عمومی کی بناء پر مصالح کو نظرانداز کرکے خلافِ مصلحت بات پر مہر تصدیق ثبت کردیتے۔

امیر المومنین فرماتے ہیں۔

فَوَ اللهِ مَا غُزِیَ قَوْمٌ فِیْ عُقْرِ دَارِهِمْ اِلَّا وَقَدْ ذَلُّوْا۔[2]

''خدا کی قسم جو گروہ گھر میں بیٹھ جائے کہ دشمن ان کے سر پر ٹوٹ پڑے۔ وہ یقینی طور پر ہمیشہ ذلیل وخوار ہوئے ہیں۔''

عبداللہ بن ابی کا مشورہ حضرت علیؑ کی گفتگو کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ وہ یہ جانتا تھا کہ دشمن مسلمانوں کے سر پر ٹوٹ پڑے، اور وہ دشمن کے گھر میں داخل ہوجانے کے بعد اُن سے جنگ کریں کچھ بعید نہیں تھا کہ منافقین جو ظاہری طور پر مسلمان کہلاتے تھے۔ اپنے یہودی اتحادیوں کے ساتھ سازش کرکے داخلی انقلاب کے عنوان سے دشمن کی حمایت پر اُتر آتے۔

رئیسُ المنافقین کی ایک اور سازش

اُحد کی طرف جاتے ہوئے پیغمبر اکرم کی نگاہ ایک جماعت پر پڑی جو مُسلمانوں سے الگ ایک فوجی دستہ کی صورت میں اُحد کی طرف جارہے تھے۔ جب ان کی پہچان کی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ سب کے سب یہودی تھے اور منافقین کے رئیس عبداللہ بن ابی کے ہم پیمان تھے وہ مدینہ کے دفاع کے بہانے مسلح ہوکر میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئے تھے آنحضرتؐ نے پوچھا: کیا یہ اسلام لا چکے ہیں؟ لوگوں نے کہا: جی ہاں! آپؐ نے فرمایا: ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہرگز کافر ومشرک سے مدد لینا نہیں چاہتا انہیں کہہ دو کہ وہ سب مدینہ کی طرف لوٹ جائیں۔

یہاں ایک سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مدینہ کے یہودی جانتے تھے کہ قریش کو مدینہ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں سے بدر کی شکست کا انتقام لیں اور اس کے بعد مکہ کی طرف پلٹ جائیں۔ اس صورت میں مدینہ کے یہودیوں کا شہر کے دفاع کی خاطرِ آنحضرتؐ کی اجازت کے بغیر ہی مسلح ہوکر لشکرِ اسلام کے ساتھ ساتھ جانے کا کیا مطلب ہوسکتا تھا، بالخصوص جبکہ وہ لوگ عبداللہ

---

[1] سیرۃ حلبی ج ۲ ص ۲۳۱۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۶

بن ابی کے ہم پیمان تھے؟ یہ وہ منزل ہے جہاں تاریخ کا تجزیہ کرنے والا مورخ ایک بہت ہی حساس نقطہ پر انگلی رکھ سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے کہ ان کی میدانِ جنگ میں موجودگی رئیس المنافقین کی طرف سے میدانِ جنگ میں مسلمانوں کے خلاف ایک خطرناک سازش ہوسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا ارادہ یہ تھا کہ ایک جچے تلے لائحہ عمل کے تحت کسی خاص موقعہ پر وہ قریش سے مل جائیں اور مسلمانوں کی ہزیمت کا باعث بنیں، لیکن آنحضرتؐ اپنی جنگی وسیاسی بصیرت کے ذریعہ اس سازش کو سمجھ گئے اور ان سب کو اس اصول کی بناء پر کہ ''میں کافر ومشرک سے ہرگز مدد نہیں لوں گا''، شہر کی طرف واپس بھیج دیا۔

منصوبے کا واضح گواہ

اس سے قطع نظر کہ گذشتہ قرائن مذکورہ تجزیہ کی تائید کرتے ہیں۔ متن تاریخ میں ایک اور شہادت بھی موجود ہے جو اس سازش کی گواہی دے سکتی ہے یہ اس طرح ہے کہ عبداللہ بن ابی منافقین کی ایک جماعت کے ہمراہ آنحضرتؐ کے ہمرکاب ہوکر میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن جب اس نے اپنے ہم پیمان یہودیوں کے ساتھ آنحضرت کا سلوک قریب سے دیکھا تو تھوڑی ہی دیر کے بعد ''بواط'' نامی مقام سے، جو مدینہ اور اُحد کے درمیان ایک باغ تھا تین سو منافقین کو ساتھ لے کر رسولِ اکرمؐ کے لشکر سے الگ ہوگیا اور مدینہ کی طرف چل دیا۔ جابر کے باپ عبداللہ نے جو خود اس کی طرح قبیلہ خزرج کے سرداروں میں سے تھے، اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی، لیکن اس نے قبول نہ کیا اور اس بہانہ سے کہ آنحضرتؐ نے نوجوانوں کی رائے کو اس کے مشورہ پر ترجیح دی، جہاد میں شرکت سے رُوگردانی اختیار کی۔[1]

یہودیوں کے فوجی دستہ کو واپس بھیج دینے کے بعد اس قسم کے ردِ عمل کے کیا معنی ہو۔ سکتے ہیں سوائے اس کے کہ منافقین کے رئیس نے یہودیوں کو جنگ میں شرکت کرنے سے روکنے کی بناء پر اپنی سازش کو ناکام ہوتے دیکھا۔ اور اپنی شکست کا اُسے یقین ہوگیا۔ اس نے یہ سمجھ لیا کہ باقی ماندہ گروہ منافقین میں اس کے منصوبہ اور سازش کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت نہیں لہٰذا وہ جوانوں کے مشورہ کو ترجیح دینے کا بہانہ بنا کر آدھے راستہ سے ہی پلٹ آیا۔ جابر کے باپ عبداللہ کے اس اصرار کے جواب میں کہ وہ لشکرِ اسلام سے جدا نہ ہو۔ اس نے کہا: میں جانتا ہوں کہ کوئی جنگ نہیں ہوگی اور اگر اس قسم کا واقعہ پیش آیا بھی تو میں تم سے آن ملوں گا۔

یہ طریقِ کار اور اس طرح پانسہ بدلنا ایک گہری سازش کا پتہ دیتا ہے۔ جو مسلمانوں کی خوش قسمتی سے عملی جامہ نہ پہن سکی۔

قرآن جماعتِ منافقین کے اس قبیح طرزِ عمل اور اس میں جابر کے والد سے منافقین کی گفتگو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّااتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ (آل

[1] سیرۃ حلبی ج ۲ ص ۲۲۳ تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۲۲۳۔

عمران:۱۶۷)

''منافقین سے کہا گیا کہ آ ؤ راہِ خدا میں جہاد کرو، یا ہمارے ہمراہ دفاع ہی کرو تو انہوں نے کہا۔ اگر ہم نے دیکھا کہ جنگ ہورہی ہے تو ہم بھی تمہارے ساتھ آ ملیں گے۔ یہ لوگ اس دن ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ زبان سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتیں۔ اور خدا اس چیز سے جسے وہ دل میں چھپائے ہوئے ہیں آ گاہ ہے۔''

عبداللہ کے گروہِ منافقین کے ساتھ واپس پلٹتے وقت لشکرِ اسلام میں خطرناک قسم کا اختلاف پیدا ہوگیا۔ ''اوس'' کے قبیلہ ''بنو حارثہ'' کے ''بنوسلمہ'' ایک دوسرے سے الجھ پڑے۔ اوّل الذکر گروہ نے کہا: اس داخلی دشمن کے ساتھ جنگ کرنا چاہیئے۔'' دوسرا گروہ عبداللہ بن ابی کا ہم قبیلہ ہونے کی بناء پر اس کی حمایت میں کھڑا ہوگیا۔ ظاہر ہے کسی لشکر کے لیے اختلاف اور پھوٹ سے خطرناک چیز اور کوئی نہیں ہوتی۔ اور وہ بھی ایسے وقت میں جب دشمن گھر کی دیواروں کے قریب پہنچا ہوا ہو۔

قرآنِ مجید اسی سلسلہ میں فرماتا ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ (نساء:۸۸)

تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ منافقین کے بارے میں دو گروہ ہو گئے ہو خدا نے ان کے افکار کو ان کے اعمال کی وجہ سے اُلٹا کر دیا ہے (وہ حق کی تمیز نہیں کر سکتے) کیا تم اس شخص کو ہدایت کرنا چاہتے ہو جسے خدا نے گمراہ کر دیا ہے حالانکہ جسے خدا گمراہ کر دے اس کے لیے نجات کی کوئی راہ باقی نہیں۔''

منافقین کے رئیس کی اپنے ساتھیوں اور ہم خیال لوگوں کے ساتھ واپسی نے لشکرِ اسلام میں بہت ہی برا اثر چھوڑا، کیونکہ وہ ان کے ساتھ اکیلا ہی آدھے راستے سے واپس نہ آیا، بلکہ اس نے ایک اور جماعت کو بھی واپس لوٹ جانے کی دعوت دی۔ قریب تھا کہ لشکر میں سے دو گروہ آدھے راستے ہی سے پلٹ آئیں۔[1] قرآن اس بارے میں کہتا ہے۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

[1] مجمع البیان ج ۱ ص ۴۹۵۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آیت بنو حارثہ اور بنو سلمہ کے قبائل کے اختلافت سے متعلق ہے۔ یہ نظریات صحیح نہیں، بلکہ صحیح بات وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے کیونکہ اس وقت ان دو گروہوں میں سے صرف ایک گروہ نے سستی اور کمزوری دکھائی نہ کہ دونوں نے جبکہ آیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ دونوں ہی گروہوں نے سستی دکھائی تھی۔

الْمُؤْمِنُوْنَ﴿۱۲۲﴾

(آلِ عمران:۱۲۲)

اس وقت کو یاد کرو جب تم میں سے دو گروہوں نے سستی اور کمزوری دکھانے کا ارادہ کیا (اور آدھے راستے سے ہی واپس) لوٹ آنے کی تدبیر سوچی) خدا ان کا ناصر و مددگار ہے، اور ایمان والے خدا ہی پر توکل کرتے ہیں۔''

آخر کار آنحضرت سات سو افراد کے ساتھ مقام [۱] احد کی طرف روانہ ہوئے اور سخت ترین جنگ کی خاطر حساس ترین مواقع کے مقابل ڈٹ گئے لیکن لشکر اسلام تین سو منافقین کے عبداللہ کے ہمراہ پلٹ جانے کے باوجود منافقین کے وجود سے ہرگز پاک نہ ہوا۔

یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے جنگ اُحد میں مسلمانوں کی شکست کے اسباب پیدا کیے جنگ کے اس حصہ کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

واقعہ اُحد میں منافقین کا کردار

ہجرت کے تیسرے سال سات شوال کو صبح کو ''احد'' کی سرزمین پر حق کا لشکر شرک کے لشکر کے مقابل ہوا۔ لشکرِ اسلام نے ایسی جگہ کو اپنی لشکر گاہ کے لیے منتخب کیا جو پشت کی طرف سے ایک قدرتی رکاوٹ کے ذریعہ محفوظ تھی۔ لیکن کوہ اُحد کے وسط میں ایک شگاف یا درہ تھا احتمال یہ تھا کہ دشمن کا لشکر کوہِ احد کا چکر کاٹ کر اس شگاف سے اسلامی لشکر کے پڑاؤ کے عقب سے مسلمانوں پر حملہ کر سکتا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے اس خطرے کے پیش نظر تیراندازوں کا ایک دستہ ایک ٹیلہ پر متعین کر دیا۔ آپؐ نے ان کے سردار عبداللہ بن جبیر سے فرمایا: تمہیں تیراندازی سے دشمن کو دور رکھنا ہوگا تاکہ وہ پہاڑ کا چکر کاٹ کر پیچھے سے ہم پر غفلت میں حملہ آور نہ ہو سکے۔ ہرگز اس مقام کو نہ چھوڑنا خواہ ہم اس جنگ میں غالب ہوں یا مغلوب۔

بخاری لکھتا ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: اگر تم دیکھو کہ ہوا کے پرندے ہمیں اچک کر لے جا رہے ہیں پھر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلنا جب تک کہ میں تمہیں اجازت نہ دوں۔ اور اگر تم یہ دیکھو کہ ہم نے دشمن کو مغلوب کر لیا ہے پھر بھی اسی جگہ ڈٹے رہنا، یہاں تک کہ میرا فرمان تم تک پہنچے۔'' [۲]

رسول اکرم کے اس تاکیدی فرمان کے باوجود تیراندازوں نے آنحضرتؐ کے اس حکم کی پروا نہ کی۔ جنگ کے ابتدائی لمحات میں ہی، جب مسلمانوں کی فتح ہوتے دیکھی تو ٹیلہ کے تیراندازوں نے یہ سوچ کر کہ اب اس جگہ کی حفاظت کی ضرورت نہیں رہی۔ مورچہ کو خالی چھوڑ دیا۔ شکست خوردہ دشمن نے موقع پا کر بڑی تیز رفتاری کے ساتھ چکر کاٹ کر پہاڑ کے اس درہ سے مسلمانوں پر عقب سے حملہ کر دیا اس طرح وہ ہوا جو نہ ہونا چاہیے تھا۔ لہٰذا جس قدر نقصان مسلمانوں کو اس جنگ میں پہنچا وہ اور کسی بھی جنگ میں نہیں ہوا۔

---

[۱] تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۴۲۲ وغیرہ

[۲] تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۴۲۳۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لشکر اسلام عبداللہ بن ابی کے نصف راستے سے پلٹ جانے کے باوجود منافقوں کے وجود سے پاک نہیں ہوا تھا۔ یہ بھی بعید نہیں کہ اس درہ کے نگہبانوں کے درمیان منافقین کی فتنہ انگیزی ہی شکست کا سبب بنی ہو ممکن ہے۔ کہ ان کے درمیان منافقین ہوں جن کے گمراہ کرنے سے ہی مجاہدین کے سردار نے دس افراد کے ساتھ آخری سانس تک استقامت دکھائی اور مورچہ کو نہ چھوڑا۔ حتیٰ کہ دشمن کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ اسی طرح مجاہدین اسلام کے قتل ہونے کی راہ، جو سب کے سب اس طرف سے مطمئن تھے'' کھل گئی۔

میدانِ جنگ میں کچھ منافقین کے وجود کی گواہی ذیل کی آیت سے ملتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ (آل عمران: ۱۵۴)

''خدا نے (اس حادثہ کے بعد کی رات میں) اس غم واندوہ کے بعد نیند اور آرام بخش سکون نازل فرمایا۔ جس نے تم میں سے ایک گروہ کو تو سکون بخشا، جبکہ تم میں سے ایک اور گروہ کو نیند نہ آئی اور وہ اپنی جان کی فکر میں پڑ کر زمانہ جاہلیت کی طرح خدا کے بارے میں گمانِ باطل کرتے رہے وہ کہہ رہے تھے کیا اب بھی کسی کامیابی کی توقع ہو سکتی ہے۔ آپ کہہ دیں کہ کامیابیاں تو خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ لوگ جو کچھ دل میں چھپائے ہوئے ہیں اسے آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اگر کامیابی میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی بیٹھے رہتے تو جن کے لیے قتل ہونا مقدر ہو چکا تھا وہ گھروں سے نکل کر خود ہی اپنی قتل گاہ کی طرف آ جاتے۔ یہ تو سب اس لیے ہوا ہے کہ خدا اس چیز کو آزمائے جو تمہارے دلوں میں ہے اسے خالص کر دے، اور خدا اس چیز سے جو تم اپنے دلوں میں رکھتے ہو آگاہ ہے۔''

اس آیت کے مطالب پر غور کرنے سے آنحضرتؐ کے اصحاب میں سے ایک گروہ کی قلبی کیفیت کا واضح طور پر پتہ

چلتا ہے۔اب ہم اس آیت کے نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

منافقین کی ایک جماعت کی قلبی کیفیت

مفسرین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ پُرسکون نیند اُحد کے واقعہ کے بعد رات کے وقت وارد ہوئی۔جبکہ ایک اور جماعت اسے حادثہ کے دن کے ساتھ مربوط سمجھتی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ جب مجاہدین اسلام زخموں کی وجہ سے پریشان تھے تو ان پر اس قسم کی پُرسکون نیند وارد ہوئی۔لیکن زیادہ اہم بات جاننا چاہیے وہ یہ ہے کہ یہ نیند منکم کے لفظ کی گواہی کے مطابق ایک خاص جماعت پر وارد ہوئی تھی نہ کہ سب پر۔

پہلی جماعت اہل ایمان کی جماعت تھی۔جنہوں نے قلبی سکون و آرام کو ہرگز چھوڑا تھا نہ کسی قسم کے خوف و ہراس نے ان کے قلب پر اثر کیا تھا۔لہٰذا طبعاً انہوں نے اس مختصر سی نیند (نعاس) سے سکون حاصل کیا۔

دوسرا گروہ ایمان کے فقدان یا ضعفِ ایمان کے باعث خوفزدہ تھا لہٰذا نیند ان کی آنکھوں کے قریب تک بھی نہ پھٹکی تھی، کیونکہ خوف وہراس نیند نہ آنے کے عوامل ہوتے ہیں۔آیت مذکورہ اس دوسرے گروہ کی کیفیت کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے۔جو اس طرح سے ہے۔

الف: قَدۡ اَهَمَّتۡهُمۡ اَنۡفُسُهُمۡ۔انہیں اپنی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی تاکہ اپنے آپ کو موت سے جو ان کی گھات میں لگی ہوئی تھی، محفوظ کریں،انہیں ہرگز اسلام اور مسلمانوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔

ب: یَظُنُّوۡنَ بِاللّٰهِ غَیۡرَ الۡحَقِّ ظَنَّ الۡجَاهِلِیَّةِ۔وہ اللہ کے بارے میں وہی زمانہ جاہلیت والے گمان رکھتے تھے۔''اس جملہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ وہ خداوند تعالیٰ ہی کے لیے بُرا گمان رکھتے تھے۔چنانچہ ان کے کردار کے پیشِ نظر یہی خیال سب سے پہلے انسان کے ذہن میں اُبھرتا ہے۔مثلاً وہ وجودِ خدا کے بارے میں ہی شک رکھتے تھے۔لیکن مسلمہ طور پر یہ معنی مقصود نہیں ہوسکتے، کیونکہ زمانہ جالیت کے عربوں کو وجود باری تعالیٰ کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا۔زمانہ جاہلیت کی طرف توجہ ہرگز اصلِ وجودِ خدا میں شک کا موجب نہیں بنتی، بلکہ ذیل میں مذکور دواحتمالوں میں سے ایک کی طرف راجع ہے۔

ا: اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے فتح کا وعدہ کیا تھا اور یہ کہ دینِ اسلام تمام دینوں پر غالب آجائے گا[1] لیکن میدانِ جنگ میں شکست کا مشاہدہ کرکے اس جماعت نے خیال کیا کہ یہ خوشخبری بے بنیاد اور جھوٹ تھی۔

صرف غزوۂ اُحد ہی وہ جنگ نہیں جس میں دشمن کے دل میں اس قسم کا اندیشہ پیدا ہوا، بلکہ جنگِ حدیبیہ میں بھی جب آنحضرتؐ خانہ خدا کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے اور جہاں قریش کے ساتھ جنگ چھڑ جانے کا احتمال تھا۔منافقین نے یہ گمان کرلیا تھا کہ پیغمبر اس جنگ میں قتل ہوجائیں گے اور شریعت اِسلام ختم ہوجائے گی۔چنانچہ سورۃ فتح کی چھٹی اور بارھویں آیت میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے۔

وَّیُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتِ وَالۡمُشۡرِکِیۡنَ وَالۡمُشۡرِکٰتِ الظَّآنِّیۡنَ بِاللّٰهِ

---

[1] لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ۠ (صف۔۹)

ظَنَّ السَّوْءِ ؕ

''تا کہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب کرے جو خدا کے بارے میں بُرے گمان رکھتے ہیں۔''

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰۤى اَهْلِیْهِمْ اَبَدًا وَّزُیِّنَ ذٰلِكَ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖۚ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۲﴾ (فتح)

''بلکہ تم نے یہ گمان کرلیا تھا کہ اب پیغمبرؐ اور اہل ایمان دوبارہ اپنے گھروں کو واپس نہیں آئیں گے اس مطلب نے تمہارے قلوب کو زینت دے رکھی تھی۔ یہ تمہارا بُرا گمان تھا اور تم ایک فاسد گروہ تھے۔''

خلاصہ یہ ہے کہ ان کا گمان تھا عنقریب اسلام کی تبلیغ ختم ہوجائے گی اور مسلمانوں کے سرکردہ افراد قتل ہوجائیں گے۔ پس مسلمانوں کی فتح کے سلسلہ میں خدا کے سب وعدے بے بنیاد ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی بدگمانی کا محور خدا کا اپنے وعدوں سے تخلف ہے نہ کہ پیغمبرؐ اور ان کے دین کی حقانیت۔

۲: ان کا خیال یہ تھا کہ دینِ حق کو ہمیشہ نصرتِ الٰہی اور کامیابی سے توام ہونا چاہیے اور فتح کا سہرا پیغمبرؐ برحق کے سر ہونا چاہیے۔ لیکن جنگ میں شک کرنے اور اسے باطل اور بے بنیاد سمجھنے لگے۔

خدا اس موقع پر اور دوسرے مواقع پر بھی اس نظریہ کو باطل قرار دیتے ہوئے یاد دلا رہا ہے کہ کامیابی تو خدا کے اختیار میں ہے نہ کہ پیغمبرؐ کے ہاتھ میں جیسا کہ حصہ 'د' میں آئندہ بیان ہوگا۔

ج: یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ کیا اس شکست کے بعد بھی ہمارے لیے کوئی کامیابی ہے؟ اس احتمال کی بناء پر ''الامر'' سے مراد کامیابی ہے۔ جیسا کہ بعد والے جملہ میں بھی امر سے یہی مراد ہے۔[1]

د: قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ: کہہ دیجئے کہ غلبہ اور کامیابی خدا کے ہاتھ میں ہے نہ کہ پیغمبرؐ کے اور خدا نے فتح کے لیے کچھ اسباب اور مسببات معیّن فرمائے ہیں۔ جو شخص ان پر عمل کرے گا وہ فتح سے ہمکنار ہوگا، اور جو ان اسباب کو نظر انداز کردے گا، شکست اس کی گھات میں ہوگی۔ تم نے کامیابی کے اسباب کو نظر انداز کردیا۔ اور اپنے سردار کا حکم نہ مانتے ہوئے دشمن کے حملہ کے لیے راستہ کھول دیا۔ کیا

---

[1] یہ احتمال بھی ہے کہ امر سے مراد آنحضرتؐ کے دین کی حقانیت اور استواری ہی ہو۔ یعنی کیا اس کی شکست کے بعد بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ پیغمبر بھی حق پر ہیں اور ان کا دین و آئین صحیح و استوار ہے؟ کیونکہ اگر ہم حق پر ہوتے تو شکست نہ کھاتے۔ نیز اگر پیغمبر حق پر ہوتے تو وہ شکست نہ کھاتے۔ اس احتمال کے تحت امر سے مراد حقانیت ہی ہے

پھر بھی تم فتح کے خواہاں ہو۔

اگر خدا اپنے پیغمبروں کی بعض موارد میں غیب سے مدد کرتا ہے تو یہ ایک واقعہ استثنائی ہوتا ہے ورنہ پیغمبروں کی کامیابیاں اور ناکامیاں اللہ تعالیٰ کے ان اصولوں کے تابع ہوتی ہیں جو اس نے دنیا میں مقرر فرمائے ہیں:۔

يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ

اس جملہ میں دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱: ''امر'' سے مراد دینِ اسلام کی حقانیت واستواری ہو سکتی ہے۔یعنی یہ خیال کہ اگر ہم حق پر ہوتے تو اس طرح قتل نہ ہوتے نیز اس معرکہ میں شکست کھا جانا آنحضرتؐ کی نبوت اور ان کے دین کے بطلان کی علامت ہے۔

۲: یہ جملہ خود منافقین کے نظریہ کی طرف اشارہ ہو، جوانہوں نے فوجی مجلسِ مشاورت میں پیش کیا تھا اور شہر سے باہر جنگ کرنے کی بجائے شہر میں رہ کر اس کا دفاع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔اب اپنے اسی مشورہ کی حمایت میں کہ رہے ہیں کہ اگر ہمارا اختیار ہوتا اور پیغمبرؐ ہماری بات پر کان دھرتے تو ہم اس طرح مارے نہ جاتے۔

وہ اپنی اس گفتگو میں موت کے عوامل سے واقفیت کا دعویٰ کر رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ ان کی بات مان لینے سے لوگوں کو موت سے نجات ملتی ہے۔

و: اللہ تعالیٰ اس نظریہ کا بطلان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ

''کہہ دیجئے اگر تم اپنے گھروں کے اندر بھی بیٹھے رہتے تو جن کی موت کا وقت آ گیا تھا وہ اپنے گھروں سے باہر نکل آتے، اور اپنے قتل ہونے کے مقام پر پہنچ جاتے۔

یہ بات ان کے اسی خیال کا جواب ہے اور اس اصول کو بیان کرتی ہے کہ موت کا تعلق تقدیر اور حکم خدا سے ہے لہٰذا اُحد میں تمہارا قتل ہونا نہ تو آنحضرت کی نبوت کے باطل ہونے کی علامت ہے اور نہ ہی آنحضرتؐ کے ارادہ کے غلط ہونے کی دلیل۔

اس کے بعد اس جنگ میں شکست، ایک جماعت کے ثابت قدم رہنے اور دوسری جماعت کے فرار کر جانے کے بارے میں ایک دوسرے نتیجہ کی یاد دھانی کراتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ

''اس شکست کا ایک اور نتیجہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس جنگ سے جو کچھ سینوں میں تھا وہ ظاہر ہو گیا اور پاک کی ناپاک سے اور مومن کی منافقین سے متعلق ہے اور بعض دُوسرے مفسرین کے مطابق پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب میں سے ضیعف الایمان افراد سے تعلق رکھتی ہے۔ تاہم ہر صورت میں اس آیت کی تفصیلات میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ عبداللہ بن ابی کے نصف راستہ سے ہی لوٹ جانے کے باوجود آنحضرتؐ کا لشکر منافقین سے پاک نہیں ہوا تھا بلکہ لشکر میں منافق اور ضعیف الایمان لوگ کافی تعداد میں موجود تھے۔ ہمارے نزدیک یہ بات بعید نہیں ہے کہ یہ آیت باقی ماندہ منافقین کے متعلق ہو۔ جنھوں نے رُسولِ اکرمؐ کے لشکر میں شرکت کر رکھی تھی۔

دُوسری آیات اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ آنحضرتؐ کے اصحاب میں اس جماعت کے علاوہ دو اور گروہ بھی تھے۔ جو خطرے کے اعتبار سے منافقین کی نسبت کچھ کم خطرناک نہیں تھے۔ وہ دو گروہ یہ ہیں:۔

۱: وہ لوگ جن کے دِل مریض تھے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ غَرَّ ہٰۤؤُلَآءِ دِیۡنُہُمۡ ؕ (انفال ۴۹)

''جب منافقین، اور وہ لوگ جن کے دل میں شرک کی بیماری ہے، کہہ رہے تھے ''اہل ایمان کو ان کے دین نے مغرور کر دیا ہے۔

۲: لوگوں کے منہ کی طرف دیکھنے والے، جنہیں قرآن ''سماعون'' کے نام سے پکارتا ہے اور فرماتا ہے۔

وَفِیۡکُمۡ سَمّٰعُوۡنَ لَہُمۡ ؕ (توبہ:۴۷)

''تمہارے درمیان ایسے منہ تکتے رہنے والے لوگ بھی موجود ہیں، جو ہمیشہ منافقین اور کفار کی باتوں پر کان دھرتے ہیں۔''

لشکرِ اسلام میں جھوٹی افوائیں

جنگ اُحد کی گرما گرمی میں قریش کے ایک مشرک ابن قمیئہ نے میدان میں شور دیا کہ محمدؐ قتل ہو گئے تو منافقین نے فوراً لشکر اسلام میں اس افواہ کو پھیلانا شروع کر دیا اور اس کے ذریعہ انہوں نے چاہا کہ مسلمانوں کے ارادہ کو کمزور کر دیں۔

ایک نے کہا: اگر یہ پیغمبر ہوتا تو قتل نہ ہوتا، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اپنے دین کی طرف پلٹ جاؤ۔''

دوسرے نے کہا: کسی کو عبداللہ بن ابی کی طرف بھیجو کو وہ ابوسفیان سے ہمارے لیے امان طلب کرے۔

کچھ دوسروں نے کہا: محمدؐ تو قتل ہو گئے لہٰذا تم قریش کے ہاتھوں قتل ہونے سے پہلے مدینہ کی طرف پلٹ جاؤ۔''

حتیٰ کہ ایک گروہ مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا جب وہ ''اُم ایمن'' کے پاس پہنچے، جو زخمیوں کی تیمارداری کر رہی تھیں تو انہوں نے مٹھی بھر خاک ان لوگوں کے مُنہ پر ماری اور کہا، ''اپنی تلواریں مجھے دے دو، اور تم عورتوں کی طرح بیٹھ کو چرخہ کاتو۔''

مندرجہ ذیل آیت اسی حادثہ اور ان کے ارادہ کی مذمت میں وارد ہوئی ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔـا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

(آلِ عمران ۱۴۴)

''محمدؐ ایک رسول ہی تو ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر آئے اور چلے گئے اگر وہ مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم (دینِ شرک) کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ اور جو شخص اس طرح پلٹ جائے گا وہ خدا کا کچھ بھی تو نہیں بگاڑے گا اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو اجر و ثواب مرحمت فرمائے گا۔''

شماتت اور زبان کا زخم

منافقین کو آنحضرت کے قتل کی خبر پھیلانے سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا، کیونکہ انجام کار آنحضرت ایک گروہ کی مدد سے جان کی سلامتی کے ساتھ ظاہر ہوئے اور مسلمانوں کو نئے سرے سے فتح نصیب ہوئی۔ لیکن اب منافقین نے زبان کے تیر چلانے شروع کر دیئے اور ظاہر ہمدردی کے طور پر کہنے لگے:۔

''اگر مسلمان جنگ اور جہاد کے لیے باہر نہ نکلتے اور مدینہ میں رہتے، تو اس طرح قتل نہ ہوتے۔''

اس طرح یہ منافق مسلمانوں کے ایمان و ایقان کو کمزور کرنے کی کوشش کرنے لگے قرآن ان کی شماتت اور چرکہ ہائے زبان کو ان آیات میں بیان کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِى الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ (آل عمران : ۱۵۶)

اے ایمان لانے والو! تم کافروں کی طرح نہ ہوجاؤ جو اپنے بھائیوں کے بارے میں، جب کبھی وہ مسافرت یا جہاد میں شرکت کے لیے جاتے تھے، یہ کہتے تھے: اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ ہی قتل ہوتے۔ (تم ایسی باتیں نہ کرو) اوران کے دلوں میں ہی یہ حسرت رہنے دو (یادرکھو) خدا ہی زندہ کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔''

ان باتوں کا تخریبی اثر اور وہ بھی ہمدردی کی صورت میں، قابل تعریف نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن بڑی سختی سے ان کا بطلان کرتا ہے کہ کہیں ایسا ہو کہ یہ خیال مجاہدین کے دل پر بھی اثر انداز نہ ہوجائے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ (آل عمران : ۱۶۸)

یہ وہ لوگ جنہوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا تھا (درآنحالیکہ) وہ خود گھروں میں بیٹھے رہے) اگر وہ ہماری پیروی کرتے تو قتل نہ ہوتے۔ کہہ دیجئے (اگر تم موت کے بارے میں پیشین گوئی کر سکتے ہو تو پھر موت کو خود اپنے آپ سے ٹال کر دکھاؤ اگر تم سچ کہتے ہو۔''

منافقین ویسے تو مجاہدین کے بھائی ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ لیکن حساس لمحوں میں اپنے ان بھائیوں کو تنہا چھوڑ دیتے تھے۔ جیسا کہ ''وقعدوا'' کا جملہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے۔

دوسری طرف وہ غیب سے آگاہی کا دعویٰ کرتے تھے اور موت کے علل واسباب کی پیش بینی کرتے ہوئے یہ کہتے تھے کہ موت کا باعث سفر کرنا اور جہاد میں شرکت ہے قرآن ان کا بطلان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''اُٹھو! اور موت کو اپنے سے دُور ہی کر کے دکھاؤ اور موت کے چُنگل میں نہ پھنسو۔ کیا تم میں یہ طاقت ہے۔؟''

رافت ومہربانی

اس تخریب کاری اور سازش کے باوجود، خُدا نے ان تمام افراد کے بارے میں جنہوں نے جنگِ اُحد میں فرار کیا تھا، خواہ وہ منافق تھے یا کمزور ایمان والے، آنحضرتؐ کو رحمت ورافت وعاطفت سے پیش آنے کا حکم فرمایا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۪ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ؁ (آل عمران:۱۵۹)

آپؐ اللہ کی رحمت سے ان کے ساتھ نرمی اور مہربانی سے پیش آئے اور اگر آپ سخت گیر اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب کے سب آپ کو چھوڑ کر چلتے بنتے، پس آپ ان سے درگزر کریں، ان کو معاف کر دیں، ان کے بارے میں خدا سے بخشش طلب کریں، مختلف اُمور میں ان سے مشورہ کرتے رہیں اور جب آپ کسی کام کے کرنے کا مصمم ارادہ کر لیں تو پھر خدا پر توکل کیا کریں بیشک خدا تعالیٰ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔‘‘

اس آیت میں کتنا عظیم لائحہ عمل پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ پہلے تو آنحضرتؐ کی اخلاقی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، اس کے بعد خطا کاروں کی طرف اشارہ کرتا ہے درگذر کرنے کا حکم دیتا ہے کہ خود اپنی طرف سے خدا سے ان کے لیے بخشش طلب کرو اور ان کی شخصیت کو زندہ رکھنے کے لیے مختلف اُمور میں ان سے مشورہ کرتے رہا کرو، اور انجام کار خود پختہ ارادہ کر کے خدا پر توکل کیا کرو۔ اسی عظمت اور بزرگی کی مدد سے اس قسم کی خراب کاریوں اور سازشوں کے باوجود دس سال کے قلیل عرصہ میں آنحضرتؐ تمام مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔

رئیس مُنافقین کی بے شرمی

اُحد کی جنگ ختم ہوگئی۔ دشمن اپنے علاقہ کی طرف پلٹ گیا۔ لشکرِ اسلام کی طاقت وقوت ظاہر ہوگئی اور ذلیل داخلی دشمن اپنے مواقع کی تجدید کی فکر میں مصروف ہوگیا۔ جنگ کے بعد جب ایک جمعہ کے روز آنحضرتؐ چاہتے تھے کہ خطبہ دیں تو عبداللہ بن ابی انتہائی بے شرمی کے ساتھ اپنی جگہ سے اُٹھا اور لوگوں کی طرف رُخ کرکے کہنے لگا:۔

اے لوگو! پیغمبر خُدا تمہارے درمیان ہیں خُدا نے ان کے وسیلہ سے تمہیں عزت بخشی ہے۔ ان کی مدد کرو اور ان کی باتوں کو غور سے سنو۔''

اس تمام تخریب کاری کے بعد ایسی باتیں کرنا منافقین کے رئیس کی بے شرمی، خوشامد اور چاپلوسی کی انتہا ہے اسی لیے جب ایک جمعہ کے روز وہ یہ باتیں بار بار کررہا تھا تو رسولِ خداؐ کے ایک صحابی نے اس کا دامن کھینچ کر کہا: بیٹھ جا! تو اپنے گذشتہ کردار کے باعث اس قسم کی نصیحت کرنے کے لائق نہیں ہے۔ لیکن وہ ایک عام شخص کے اس اعتراض پر سیخ پا ہوگیا اور مسجد سے باہر نکل گیا۔ مسجد کے دروازے پر ایک انصاری سے اس کا سامنا ہوا۔ اس انصاری نے بے موقع مسجد سے باہر نکلنے کی وجہ پوچھی تو اس نے اس کے جواب میں کہا:

''میں تو اس شخص (پیغمبر اکرمؐ) کی تائید میں بات کررہا تھا کہ اس کے اصحاب میں سے ایک شخص مجھ پر کود پڑا، گویا میں کوئی بُری بات کہہ رہا تھا۔'' اس انصاری نے اُسے نصیحت کی اور کہا:

''واپس آجا تا کہ آنحضرتؐ تیرے بارے میں طلبِ مغفرت کریں۔''

لیکن وہ اپنی منافقت کا انکار نہ کرسکا اور بولا:

''مجھے اس کے استغفار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ [1]

---

[1] تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نماز جمعہ میں ایک خاص جگہ بیٹھا کرتا تھا لوگ اس کی تالیفِ قلب یا اس کے شر سے بچنے کے لیے اس سے مزاحم نہیں ہوتے تھے اور کوئی شخص اس کی جگہ پر نہیں بیٹھتا تھا۔ (سیرۃ ابن ہشام ۲ ص ۱۰۵)

(۴)

منافقین اور بنی نضیر کا واقعہ

دشمنوں کو تحریک کرنا اور بھڑکانا، انہیں خوشخبری دینا۔ خطرہ کے موقع سے فرار، ذمہ داری سے احتراز و بیزاری منافقین کی واضح صفات ہیں۔

ہجرت کے چوتھے سال ماہ صفر میں ایک مسلمان عمرو بن اُمیہ نے بنی عامر قبیلہ کے دو افراد کو قتل کر دیا۔ ان دونوں افراد کے قتل کا سبب بنی عامر سے انتقام تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بنی عامر نے ''بئر معونہ'' کے علاقہ میں چالیس معلمین قرآن کا خون بہایا ہے۔ لیکن اُسے اس بارے میں غلط فہمی ہوئی تھی کیونکہ ان چالیس معلمین کا خون قبیلہ بنی سلیم کی تین شاخوں نے بہایا تھا۔ اور اس سلسلہ میں قبیلہ بنی عامر نے اس امان کی وجہ سے جو ان کے بزرگ ''ابو براء'' نے آنحضرتؐ کے حضور معلمین قرآن کو دی تھی، کسی قسم کی کوئی کاروائی نہیں کی تھی۔

جب ''عمرو'' آنحضرتؐ کے حضورؐ حاضر ہوا اور اس واقعہ کی اطلاع دی تو آپؐ نے فرمایا: مجھے ان دو افراد کا خوں بہا دینا پڑے گا۔ تو نے ایسے لوگوں کو قتل کیا ہے جن کا خون محترم تھا؟'' [1]

قبیلہ بنی نضیر یہودیوں کے ان تین قبیلوں میں سے ایک تھا جو مدینہ میں رہتے تھے اور وہ آنحضرت کے ساتھ ہم پیمان تھے اس معاہدہ میں انہوں نے قبول کیا ہوا تھا کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے خون بہا کے حصول میں مدد کریں گے [2]

پیغمبر اکرمؐ اسی بناء پر کسی اور وجہ سے جس کا ذکر تاریخ میں آ چکا ہے اپنے دس صحابیوں کے ہمراہ بنی نضیر کے قلعہ کی طرف تشریف لے گئے تا کہ ان سے اس سلسلہ میں مدد لیں۔

انہوں نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور اپنی مخصوص کشادہ رُوئی کے ساتھ اصرار کیا کہ آنحضرتؐ قلعہ کے اندر تشریف لے چلیں۔ لیکن آپ قلعہ کے باہر ہی دیوار کے پاس بیٹھ گئے اور اپنے اصحاب کے ساتھ باتیں کرنے اور نتیجہ کا انتظار کرنے لگے۔ اس موقع پر بنی نضیر کے سرداروں نے رسُول اکرمؐ کو جو دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے ایک بہت بڑا پتھر اوپر سے پھینک کر قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ عمرو بن حجاش نے اس کام کو انجام دینے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ لیکن اس سے پہلے ہی وحی کے فرشتے نے آنحضرت کو ان کی سازش سے آگاہ کر دیا اور رسول خُدا یہ کہہ کر کہ وہ ایک ضروری کام کر کے واپس آ جائیں گے، وہاں سے اٹھ کر مدینہ روانہ ہو گئے۔ اصحابِ پیغمبر کو تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ مدینہ لوٹ آئے ہیں۔ لہٰذا وہ بھی مدینہ کی طرف پلٹ آئے۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۵۹۰۔

[2] سیرۃ حلبی ج ۲ ص ۲۷۷

رسُول خدا نے مدینہ تشریف آوری کے وقت یہودیوں کے تینوں گروہوں کے ساتھ حسبِ ذیل پیمان باندھا تھا۔

''یہ تینوں گروہ اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اوران کے اصحاب کو کوئی ضرر نہیں پہنچائیں گے مسلمان ان کے ہاتھ اور زبان سے امان میں رہیں گے ان کے دشمنوں کو ہرگز ہتھیار اور سواری مہیا نہیں کریں گے اور اگر انہوں نے اپنے عہد و پیمان کے خلاف کام کیا تو پیغمبر اکرمؐ ان کو قتل کرنے، ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنانے اور ان کا مال ضبط کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔''

بنی نضیر کی طرف سے حی ابن اخطب نے قبیلہ بنی قینقاع کی طرف سے ''مخریق'' نے اس معاہدہ پر دستخط کیے۔[1]

اب جبکہ بنی نضیر نے یہ معاہدہ توڑ ڈالا اور آنحضرتؐ کو قتل کرنے کی سازش کی تو وہ وقت آن پہنچا کہ آپ معاہدہ کی شرائط کے مطابق عمل کریں۔

چنانچہ پیغمبر رحمت نے کم سے کم سزا جوان کے لیے تجویز کی یہ تھی کہ یہ قبیلہ مدینہ چھوڑ دے کیونکہ انہوں نے عملاً یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ سب کے سب حالات کے منتظر ہیں اور مناسب موقع ملتے ہی وہ اپنی ضرب لگانے سے نہ چوکیں گے۔ لہٰذا رسول خدا کے حکم سے بنی نضیر، کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا اور انہیں حکم دے دیا گیا کہ دس دن کے اندر اندر شہر چھوڑ دیں۔

منافقین کا منصوبہ

آپ کو یاد ہوگا کہ رئیس منافقین عبداللہ بن ابی نے یہودیوں کے ایک جرائم پیشہ گروہ قینقاع کے واقعہ میں جب آنحضرتؐ نے انہیں سرزمین مدینہ کو چھوڑ دینے کا حکم دیا تھا کتنی ہٹ دھرمی دکھائی تھی۔

عبداللہ بن ابی کا اس گروہ کے بارے میں اصرار تو ظاہراً قابلِ توجیہ ہوسکتا ہے، کیونکہ یہ گروہ خزرجیوں کے ساتھ خود عبداللہ بھی جن میں سے تھا زمانہ جاہلیت میں ہم عہد تھا۔

لیکن عبداللہ بن ابی کی طرف سے بنی نضیر کا دفاع کرنا، جو اوسیوں کا ہم پیمان اور خزرجیوں کا سخت مخالف قبیلہ تھا، بڑے تعجب کی بات ہے۔

اس کام کے لیے اس کے اصرار کا سبب یہ تھا کہ وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ مخالف قوتوں سے مدینہ کے ماحول کے خالی ہوجانے سے منافقین کے چار آدمی جن کے نام ''ابن ہشام'' نے نقل کیے ہیں، پوشیدہ طور پر بنی نضیر کے سرداروں سے جا کر ملے، اوران سے کہا کہ وہ ڈٹ جائیں اور اپنے گھر چھوڑ کر نہ جائیں۔ ان سے وعدہ کیا کہ وہ انہیں ہرگز محمدؐ کے حوالے نہیں کریں گے۔ یہاں تک کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو وہ ان کے ساتھ مل کر جنگ کریں گے۔ اور اگر انہیں زبردستی مدینہ سے نکلنا پڑا تو وہ لوگ (منافقین) ان کے ساتھ ہی مدینہ چھوڑ دیں گے۔

بنی نضیر منافقین کے سرداروں کے کھوکھلے وعدوں کے فریب میں آ گئے۔ انہوں نے بہت ہی انتظار کیا مگر منافقین کی طرف سے کوئی

---

[1] بحار الانوار ج۱۹ ص ۱۱۰۔۱۱۱

خبر نہ آئی۔ پس خوف وہراس نے ان کو گھیر لیا، اور انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں [1]

حلبی اپنی سیرۃ میں لکھتا ہے کہ عبداللہ بن ابی نے بنی نضیر کے سرداروں کو ایک پیغام بھیجا اور ان سے کہا: اپنے علاقہ سے ہرگز باہر نہ جانا، اور اپنے قلعوں میں ہی ٹھہرے رہنا۔ میرے قبیلہ کے علاوہ دو ہزار جنگجو میرے حکم کے منتظر ہیں۔ وہ مناسب موقع پر تمہارے قلعہ میں پہنچ جائیں گے، اور آخری فرد تک بنی قریضہ یا تمہارے ہم عہد غطفان کے پہنچنے تک تمہارا دفاع کریں گے۔ بنی نضیر میں اس پیغام سے جسارت پیدا ہوگئی اور انہوں نے آنحضرتؐ کو یہ پیغام بھیج دیا کہ ہم اپنے گھروں کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ تم سے جو ہو سکتا ہے کرلو۔

گروہ بنی نضیر میں ایک عاقل، سمجھدار اور منافق شناس آدمی تھا جس کا نام سلان بن مشکم تھا۔ اُس نے قبیلہ کے رئیس اخطب کے بیٹے کی طرف رُخ کر کے کہا۔ اپنی جان کی قدر و قیمت پہچان اور عبداللہ بن ابی کے وعدوں کے دھوکہ میں نہ آ۔ وہ تو چاہتا ہے کہ تجھے میدانِ جنگ کی طرف کھینچ کر لے جائے تاکہ تو محمدؐ کے ساتھ جنگ کرے۔ پھر وہ خود گھر میں بیٹھ جائے اور تجھے تنہا چھوڑ دے۔

''تیری قوم اور تیرے دفاع کے سلسلہ میں عبداللہ بن ابی کی کمزوری خوب واضح ہے۔ کیونکہ اس نے تو خود کسی کو کعب بن اسد (یہودیوں کے مدینہ میں مقیم تیسرے قبیلہ کے سردار) کے پاس بھیجا تھا کہ ہمارا دفاع کرو۔ جس کے جواب میں رئیس قبیلہ نے یہ پیغام دیا کہ ہم میں سے کوئی شخص پیمان شکنی نہیں کرے گا لہٰذا وہ بنی قریظہ سے مایوس ہو چکا ہے۔

''اس نے بنی قینقاع کے واقعہ میں بھی اس قسم کے بہت سے کھوکھلے وعدے کیے تھے۔ وہ بھی اس قسم کے وعدے تھے جو وہ اب تم سے کر رہا ہے۔ انہوں نے اس کے وعدوں کے دھوکہ میں آ کر اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ آخرکار مسلمانوں نے ان کے قلعوں کا محاصرہ کرلیا، اور کافی انتظار کے باوجود عبداللہ بن ابی کی طرف سے کوئی کمک انہیں نہ پہنچی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ بڑے آرام کے ساتھ اپنے گھر میں بیٹھا رہا۔ اور ان کے قلعوں پر قبضہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ اور آخرکار انہوں نے آنحضرتؐ کے فرمان کے سامنے سر جھکا دیا۔''

''وہ ایسا شخص ہے جس نے اپنے ہم پیمانوں (قنیقاع) کی کبھی مدد نہ کی تو کیا وہ ہماری مدد کرے گا۔''

''میں حیران ہوں کہ تم اس کی مدد پر کیسے اُمید لگائے بیٹھے ہو، حالانکہ ہم ماضی میں ''اوسیوں'' کی دوستی میں انہیں اپنی تلواروں سے کاٹتے رہے ہیں۔ [2]

رئیس قبیلہ نے اس منافق شناس آدمی کی بات کو قبول نہ کیا اور قلعہ کے اندر ہی رہنے پر اصرار کیا یہاں تک کہ قلعہ کا مجاہدین اسلام نے محاصرہ کرلیا۔ محاصرہ کے دوران بھی رئیس منافقین بنی نضیر کے سرداروں کو کھوکھلے پیغام بھیجتا رہا۔ آخر معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، کہ بنی نضیر میں سے ایک جماعت نے رئیس قبیلہ کے سامنے داد و فریاد کی اور کہا:

''ابی کے بیٹے کے وہ وعدے کہاں گئے؟'' رئیس نے اپنی کیفیت کی حمایت میں تقدیر و سرنوشت کا سہارا لیا اور کہا: ''ہم یہودیوں

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۹۲

[2] سیرۃ حلبی ج ۲ ص ۲۷۸۔

کے لیے ذلت مقدر ہو چکی ہے۔"

قرآن اور منافقین کا وعدہ:

قرآن سورہ حشر میں بنی نضیر کے واقعہ کو بیان کرتا ہے اور ضمنی طور پر اس واقعہ میں منافقین کے کردار کی بہت سی خوبصورت انداز میں ایک مثلث کے ضمن میں تشریح کرتا ہے۔ ان آیات کا متن ترجمہ اور ان میں سے کچھ نکات کی وضاحت پیش کی جاتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿١١﴾ (حشر: ۱۱)

"کیا تم نے منافقین کو نہیں دیکھا کہ انہوں نے اپنے کافر بھائیوں اھل کتاب (بنی نضیر) سے یہ کہا تھا کہ اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہی نکلیں گے اور تمہاری حمایت میں کسی کی بات نہیں مانیں گے۔ نیز اگر بات جنگ تک پہنچی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اور خدا گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔"

لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿١٢﴾ (حشر: ۱۲)

"اگر ان (یہودیوں) کو نکالا گیا تو وہ منافقین ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے، اور مدینہ کو نہیں چھوڑیں گے۔ اگر ان کے ساتھ جنگ چھڑ گئی تو منافق ان کی مدد نہیں کریں گے۔ اگر انہوں نے مدد کی بھی تو جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوں گے، اور پھر یہودیوں کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔"

لَاَانْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿١٣﴾

(حشر: ۱۳)

"منافقین کے دلوں میں خدا کی نسبت تمہارا ڈر زیادہ بیٹھا ہوا ہے۔
یہ اس لیے ہے کہ وہ نادان لوگ ہیں۔"

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْۗءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦﴾ (حشر: ۱۶)

''ان منافقین کی مثال شیطان جیسی ہے کہ جب اُس نے انسان سے یہ کہا ''تو کافر ہو جا'' اور جب وہ کافر ہو گیا تو شیطان نے کہا: میں تو تجھ سے بری و بیزار ہوں۔ میں تو عالمین کے خدا سے ڈرتا ہوں۔''

فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۷﴾

(حشر: ۱۷)

(شیطان اور کافر انسان) دونوں ہی کا انجام یہ ہے کہ دونوں ہمیشہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔[1]

ان آیات میں قرآن منافقین کی روش کو بیان کر رہا ہے۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ نفاق کی فطرت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خوشخبری دے اور پھر خلاف ورزی کرے اور اگر کبھی مدد کرنے کا مظاہرہ کرنا بھی چاہے تو حساس لمحات میں بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

وہ شیطان کی طرح انسانیت اور انسانوں کا دشمن ہے وہ انسان کو بدبخت بنانے کے بعد خود اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے ایک طرف ہو جاتا ہے۔ لیکن منافق کو خوب اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ اس قسم کی چالاکیاں اور دھوکہ بازیاں اسے نجات نہیں دلائیں گی اور وہ شیطان کی طرح ہمیشہ جہنم میں ہی رہے گا۔

یہ آیات، نفاق کی ماہیت کی تشریح سے قطع نظر، غیب کی خبروں کے ایک سلسلہ کو بیان کر رہی ہیں جو بذاتِ خود قرآن کے طریقہ ہائے اعجاز میں سے ایک ہے۔

قرآن منافقین کے جھوٹے وعدوں کو نقل کرنے کے بعد گیارھویں آیت میں ان کے وعدوں کو جھٹلاتے ہوئے قطعی اور دوٹوک انداز میں غیب کی تین اہم چیزیں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

۱: اگر بنی نضیر مدینہ کو چھوڑ دیں گے تو منافقین ان کی خاطر مدینہ کو نہیں چھوڑیں گے۔

لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ

۲: اگر بنی نضیر پر حملہ ہو گیا تو منافقین ہرگز ان کی مدد نہیں کریں گے۔

وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ

۳۔ اگر کچھ دیر کیلئے ان کی مدد کریں گے بھی تو آخر بھاگ کھڑے ہوں گے۔

وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۫

---

[1] سورہ حشر ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۶، ۱۷۔

اس کے بعد سترہویں آیت میں منافق کے چہرے کو شیطان کے کام سے تشبیہہ دیتے ہوئے ایسی عمدہ اور خوبصورت تصویر کشی سے واضح کرتا ہے کہ منافقین، جب تک انسان خطرے میں نہیں پڑتا، اس کا ساتھ دیتے ہیں لیکن حساس مواقع پر اسے دوسرا چہرہ دکھاتے ہوئے اپنے ہم عہد وحلیف سے بیزاری اختیار کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ شیطان بھی اسی خصوصیت کا حامل ہے۔

(۵)

جنگِ احزاب میں منافقین کا کِردار

(۱) مسلمانوں کی قوتِ ایمانی کو کمزور کرنے کی کوششیں

(۲) میدانِ جنگ سے اپنا فرار اور مسلمانوں کو فرار کی دعوت دینا

منافقین کی کوششیں یہودیوں کو جلاوطن ہونے سے روکنے، اور مدینہ میں ہی ٹھہرے رہنے کے سلسلہ میں کامیاب نہ ہوئیں۔ آخر کار بنی قینقاع اور بنی نضیر کے دونوں قبیلے اپنی عہد شکنی کی وجہ سے شام اور خیبر کے ارادہ سے مدینہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ جس کے نتیجہ میں منافقین نے اپنے زورِ بازو اور مدینہ کے تیسرے گروہ بنی قریظ کے ساتھ اپنی امیدیں وابستہ کرلیں۔ ان حالات میں ہجرت کے پانچویں سال، خیبر کی طرف جلاوطن ہونے والے یہودیوں کی تحریک سے جنگِ احزاب رُونما ہوئی بنی نضیر کے سرداروں نے ایک نئی سازش کا آغاز کیا۔ وہ مکہ کی طرف گئے اور قریش کو حضور اکرمؐ سے جنگ کرنے پر اکسایا۔ قریش میں جنگ کی آگ بھڑکانے کے بعد وہ غطفان کے علاقہ کی طرف روانہ ہوئے اور اس قبیلہ کی کچھ شاخوں کو مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے تیار کیا۔ ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ اس جنگ میں قریش کا ساتھ دیں تو خیبر کی ایک سال کی آمدنی ان کی ہوگی۔ یہ معاملہ یہیں پر ختم نہ ہوا۔ قریش نے اپنے ہم عہد "بنی سلیم" کو اور عطفان نے اپنے ہم عہد بنی اسد کو بھی جنگ میں شریک ہونے کے لیے آمادہ کرلیا۔ چنانچہ روانگی کی تاریخ مقرر ہوگئی لہٰذا عرب کے مختلف قبائل کے انبوہ کثیر نے سیلاب کی طرح عرب کے مختلف علاقوں سے آ کر مدینہ کا محاصرہ کرلیا۔[1]

پیغمبرؐ نے دشمن کے لشکر کو مدینہ کے اندر داخل ہونے سے روکنے کے لیے ایک پانچ کلومیٹر لمبی اور پانچ میٹر چوڑی اور گہری خندق کھودنے کا حکم دیا۔ اس طرح آپؐ نے مدینہ کے قابلِ دفاع کمزور علاقوں کو، خندق کھود کر اور اس کے ساتھ ساتھ شجاع اور طاقتور مجاہدین کو مقرر کر کے محفوظ کرلیا۔ مدینہ کے باقی حصہ کو طبعی اور فطری رُکاوٹوں ۔ مثلاً پہاڑ، باغات اور گنجان درختوں کی موجودگی میں انتظامات حفاظت کی چنداں ضرورت نہ تھی ان قدرتی رکاوٹوں کو عبور کرنا طاقت فرسا اور نہایت دشوار تھا۔

ان تمام حفاظتی تدابیر کے باوجود مسلمانوں کا دو طاقتور دشمنوں سے مقابلہ تھا۔ عربوں کے اس لشکر کے آگے آگے مشرکین مکہ تھے، جو خندق کی دوسری جانب پڑاوَ ڈالے ہوئے تھے۔ اور پشت پر مدینہ کے اندر ساکن بنی قریظ کے یہودی تھے، وہ ظاہری طور پر تو غیر جانبداری کا اظہار کرتے تھے۔ لیکن اندر ہی اندر موقع کے منتظر تھے کہ خارجی طاقتوں کی مدد سے اسلام اور مسلمانوں کو بالکل ختم کر ڈالیں۔

---

[1] سیرت بن ہشام ج ۱ ص ۲۱۴، ۲۱۵ جنگ احزاب شروع ہونے کی تاریخ ماہ شوال ہجرت کا پانچواں سال ہے۔

مسلمانوں نے محاصرہ کے دوران، جس نے تقریباً ایک مہینہ تک طول کھینچا، مکمل ہوشیاری سے دونوں دشمنوں کے حملہ سے مدینہ کو بچائے رکھا۔ اس عرصہ میں نہ تو خارجی دشمن ہی خندق عبور کر سکا اور نہ ہی داخلی دشمن کوئی نقصان پہنچا سکا۔ اگر چہ وہ اپنی اندرونی دشمنی کے باعث کسی عہد و پیمان کے پابند نہ ہونے کے بارے میں شور وغوغا کرتے رہے آخر کار وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ ہی گئے۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اس دار و گیر، اور ان خطرناک لمحات میں اس پانچویں دشمن یعنی منافقین کا کردار کیا رہا؟

منافقین کی ریشہ دوانیاں

اس جنگ کے حالات کی طرف تھوڑی توجہ کرنے سے سب پر واضح و آشکار ہو جاتے ہیں۔ دس ہزار مسلح فوج جزیرہ کے اطراف و اکناف سے ٹڈی دل کی طرح خندق کے کنارے آن اتری ہے یہ فوج مصمم ارادہ کیے ہوئے ہے کہ جب تک اسلام کا مکمل خاتمہ نہ کر ڈالے واپس نہیں جائے گی۔

یہ جنگ ایسے موقع پر رُونما ہوئی تھی جب مدینہ میں رسد کی شدید کمی تھی۔ اور آنحضرتؐ کے اصحاب بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے خندق کھودنے میں مشغول تھے۔ جبکہ منافقین کی جماعت کے ارکان نہ صرف یہ کہ خندق کھودنے میں مسلمانوں کی کچھ مدد نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کے جذبہ ایمانی اور حوصلہ کو پست کرنے اور میدانِ جنگ سے فرار ہو جانے کی ترغیب دے رہے تھے۔

خندق کھودتے وقت مسلمانوں کے آگے ایک بہت بڑا پتھر آ گیا۔ جسے وہ توڑ سکنے کے قابل نہ تھے۔ انہوں نے آنحضرتؐ سے مدد کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ نے خدائی قوت کی مدد سے تین ضربیں لگا کر پتھر کو توڑ دیا اور فرمایا۔

”مجھے یہاں سے شاہانِ حیرہ، مدائن و کسریٰ کے محلات اور رومیوں کے قصر نظر آ رہے ہیں وحی کے فرشتے نے مجھے خبر دی ہے کہ میری امت ان پر فتح حاصل کر لے گی، اور ان کے تمام قصور و محلات کو اپنے تصرف میں لائے گی۔“

اس کے بعد فرمایا:

”مسلمانو! تمہیں بشارت ہو اس قطعی خوشخبری پر، خدا کا شکر ہے کہ اس محاصرہ میں ہمیں فتح ہوگئی۔

اس موقع پر ایک منافق نے جس کا نام ”معتب“ تھا۔ مسلمانوں کی طرف رُخ کر کے کہا: کیا تم محمدؐ پر تعجب نہیں کرتے کہ وہ کس طرح تمہیں آرزوئیں اور امیدیں دلا رہا ہے۔ اور بے بنیاد خوشخبریاں دے رہا ہے کہ یہیں سے حیرہ، مدائن اور روم کے قصور و محلات دیکھ رہا ہے جو عنقریب فتح ہو جائیں گے۔ وہ ایسے موقع پر تمہیں یہ خوشخبری دے رہا ہے جو عنقریب فتح ہو جائیں گے وہ ایسے موقع پر تمہیں یہ خوشخبری دے رہا ہے جب تم دشمن سے خوف و ہراس میں مبتلا ہو۔“[1]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۹۔ ابنِ ہشام اپنی سیرۃ میں ج ۲ ص ۲۲۲ میں کہتا ہے کہ یہ بات کرنے والا کوئی شخص تھا کیونکہ معتب بدری اور صاحبِ ایمان شخص تھا۔

بے شک سردارِلشکر کی ذمہ داری سپاہیوں کی ہمت بڑھانا اور انہیں جنگ میں فتح کی اُمید دلانا ہوتی ہے۔ پھر سردارِلشکر بھی وہ جس کے اقوال وارشادات کا سرچشمہ مبدءِ وحی ہو، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی صداقت بھی ثابت ہو چکی ہو، تاہم اس منافق کا کردار آنحضرتؐ کے کردار کے بالکل برعکس تھا۔

چنانچہ اس منافق کی زہرافشانی کے جواب میں ذیل کی آیات نازل ہوئی

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾ (آل عمران:۲۶)

''کہہ دیجئے کہ اے خدا تو ہی مالک وفرمانروا ہے تو جسے چاہے فرمانروائی عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہیے چھین لیتا ہے تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کرتا ہے سب خیر وبرکت تیرے ہاتھ میں ہے تو یقینا ہر چیز پر قادر وتوانا ہے۔''[1]

وحی الٰہی نے صرف اتنی بات پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس آیت کے ذریعہ ہمت بڑھانے سے قطع نظر ایک اور آیت کے ذریعہ منافقین کے مکروہ چہرے سے بھی پردہ ہٹا دیا۔ چنانچہ درج ذیل آیت نے نازل ہو کر منافقین کے دل عقیدہ اور نظریہ کو ظاہر کر دیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾

(احزاب:۱۲)

''اور جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے، کہتے ہیں۔ خُدا اور اس کے رُسول نے ہمیں دھوکہ دیا ہے۔''

خندق کی حفاظت

یہ عظیم خندق چھ دن کی صعوبت وسختی سے کھودی گئی تھی۔ اس کی حفاظت ونگہبانی کہ کہیں دشمن اسے پھاند کر نہ آ جائے اور بھی زیادہ

[1] تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۴۸۳، ۴۸۴۔

مشکل اور سخت تھی کیونکہ سپاہ شرک مسلسل اس کو عبور کرنے کا ارادہ رکھتی تھی مسلمان تیروں اور سنگ باری کے ذریعہ ان کو خندق پھیلا نگنے سے روکے ہوئے تھے خندق کا دفاع اور کفار کا یہ مقابلہ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا اس خندق کے دفاع کا مسئلہ جو ایک فرسخ (تقریباً) طویل تھی۔ دشمن کے سیلاب کے مقابلہ میں ایک ماہ کے طویل عرصہ تک کوئی آسان کام نہ تھا[1] اگر آنحضرتؐ کی معاملہ فہمی اور مسلمانوں کی جانبازی راس نہ آئی۔ تو لشکر شرک خندق کے کسی چھوٹے سے حصے کو پر کر کے اُسے عبور کر لیتے اور اسلام اور مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچاتے۔

مشرکین کے بہادر مسلسل باری باری حملہ آور ہوتے اور نا اُمید ہو کر پلٹ جاتے تھے مسلمان بھی باری باری خندق کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھالتے تھے، لیکن ان پر خطر لمحات میں منافقین رُسول خداؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور بہانہ کرتے کہ ان کے گھر مدینہ سے باہر غیر محفوظ ہیں۔ یہ لوگ پھر میدانِ جنگ سے واپس جانے کی اجازت مانگتے۔ ان کے اس رویہ کے بارے میں ذیل کی آیت ان کی نیت کو ظاہر کر رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾ (احزاب:۱۳)

''اور منافقین کے ایک گروہ نے کہا: اے یثرب والو! یہاں خندق کے کنارے) پڑے رہنے کا کوئی موقع نہیں اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ پھر ان میں سے ایک جماعت پیغمبرؐ سے اجازت طلب کرتی تھی کہ اپنے گھروں کی طرف پلٹ جائیں۔ (وہ یہ عذر پیش کرتے تھے) کہ ان کے گھروں کی دیواریں اونچی نہیں ہیں اور غیر محفوظ ہیں۔ (لیکن وہ جھوٹ بولتے ہیں) ان کے گھروں کی دیواریں کافی بلند اور محفوظ ہیں وہ تو بہانہ کر رہے ہیں کہ میدانِ جنگ سے فرار کر جائیں۔

اس کے بعد والی آیت ان کے ایمان کے فقدان سے پردہ اُٹھاتی ہے۔ کہتی ہے۔

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿۱۴﴾

(احزاب: ۱۴)

[1] مورخین نے محاصرے کی مدت بیس سے ستائیس دن تک اور تقریباً ایک ماہ لکھی ہے۔ تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۳۸۴ سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۳ کی طرف رجوع کریں۔

''اگر عرب کی فوج مدینہ کے مختلف اطراف سے شہر میں وارد ہو جائے، اور ان سے شرک کی طرف پلٹ جانے کے لیے کہے تو سوائے انگلیوں پر گنے جا سکنے والے چند افراد کے سب ہی اُن کی بات قبول کر لیں گے۔

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ﴿۱۵﴾

(احزاب:۱۵)

''انہوں نے خدا کے ساتھ یہ عہد کر رکھا تھا کہ میدان جنگ سے فرار اختیار نہ کریں گے اور اللہ سے باندھے ہوئے عہد و پیمان کے بارے میں تو باز پرس ہوگی۔''

ان آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اجازت لینے والا گروہ منافقین ہی کا تھا، جو اس بات کی کوشش میں تھا کہ بظاہر تو شہر کے دفاع کا ذکر کریں لیکن اس بہانہ سے اجازت لے کر میدانِ جنگ سے فرار ہو جائیں۔

ان کے درمیان ایک ایسا گروہ بھی تھا کہ جب آنحضرتؐ مسلمانوں کے ہمراہ تیزی سے مدینہ کے گرد خندق کھودنے میں مشغول تھے تو وہ مسلمانوں کو غافل پا کر آنحضرتؐ سے اجازت لیے بغیر ہی آہستہ سے اپنے گھروں کو کھسک جاتے۔

قرآن اس جماعت کو سختی سے ملامت کرتا ہے ان کے مقابلہ میں اہلِ ایمان کی تعریف کرتا ہے اور فرماتا ہے۔

''وہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر انہیں کوئی ضروری کام درپیش ہو بھی جائے تو وہ آنحضرتؐ سے اجازت لیتے ہیں اور جونہی اپنے کام کو انجام دے لیتے ہیں، فوراً میدانِ جنگ یا خندق کھودنے کے لیے پلٹ آتے ہیں تا کہ اس کارِ خیر سے پیچھے نہ رہ جائیں۔

ان دونوں جماعتوں کی تعریف میں دو آیات ملاحظہ ہوں، ایک تو با ایمان افراد کے بارے میں ہے اور دوسری منافقین سے متعلق ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾ (نور:۶۲)

''واقعی مومن وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں۔ جب وہ کسی اہم کام میں اس (اللہ کے رسولؐ) کے ہمراہ ہوتے ہیں تو اس کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جاتے۔ بس جو لوگ آپؐ سے اجازت مانگ رہے ہیں وہ واقعاً خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں لہٰذا جب وہ اپنے بعض اہم کاموں کے لیے اجازت مانگیں تو جسے آپ چاہیں (اور مصلحت دیکھیں) اجازت دے دیں اور ان کے لیے استغفار کریں کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ صاحبِ ایمان لوگوں کا اجازت طلب کرنا ضروری اُمور کے انجام دینے کے لیے ہوتا ہے نہ کہ میدانِ جنگ سے فرار کرنے کے لیے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ فارغ ہو کر واپس لوٹ آتے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس وہ منافقین تھے جو بنیادی طور پر فرصت کے منتظر تھے تاکہ چھپ کر میدانِ جنگ سے فرار کر جائیں۔ یہاں تک کہ ظاہری طور پر اجازت لیے بغیر ہی چلے جاتے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَيۡنَكُمۡ كَدُعَآءِ بَعۡضِكُمۡ بَعۡضًا ؕ قَدۡ يَعۡلَمُ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ يَتَسَلَّلُوۡنَ[۱] مِنۡكُمۡ لِوَاذًا ۚ [۲] فَلۡيَحۡذَرِ الَّذِيۡنَ يُخَالِفُوۡنَ عَنۡ اَمۡرِهٖۤ اَنۡ تُصِيۡبَهُمۡ فِتۡنَةٌ اَوۡ يُصِيۡبَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۝۶۳ (نور:۶۳)

''اپنے لیے پیغمبرؐ کے پکارنے کو اس طرح نہ سمجھو جیسے تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو (ادب کو ملحوظ رکھو) خدا تعالیٰ ان لوگوں کو جانتا ہے۔ جو چھپ چھپا کر یکے بعد دیگرے فرار کر رہے ہیں۔ پس جو لوگ اس (رسول) کے فرمان کے خلاف کرتے ہیں اس چیز سے ڈریں کہ کہیں فتنہ انہیں دامن گیر نہ ہو جائے، یا دردناک عذاب اُن تک آ پہنچے۔''

ان آیات کے پیشِ نظر تاریخ اسلام کے اس حصہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مومنین کی تو بس ایک ہی حالت ہوتی تھی اور وہ یہ کہ وہ پوری پامردی کے ساتھ میدانِ جنگ میں دشمن کے مقابل ڈٹے رہیں۔ اگر کوئی استثنائی صورت پیش آ بھی جائے، تو آنحضرتؐ سے اجازت لیے بغیر میدان نہیں چھوڑتے تھے پھر اپنا کام انجام دینے کے بعد فوراً دوبارہ میدانِ جنگ کی طرف پلٹ آتے تھے۔ پھر اپنا کام انجام دینے کے بعد فوراً دوبارہ میدانِ جنگ کی طرف پلٹ آتے تھے۔ (آیت ۶۲ سورہ نور)

اس کے برعکس منافقوں کے دو گروہ تھے۔ یا تو وہ اجازت کو فرار کر ڈھال بنا کر میدان سے چلے جاتے تھے اور پھر

---

[۱] تسلسل عربی زبان میں جدا ہونے کی معنی میں ہے

[۲] لواذ مخفی طریقے سے، کے معنی میں ہے

پلٹ کر نہ آتے۔(احزاب:۱۳)

یا وہ بہانہ کی تلاش میں رہتے اور مسلمانوں کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوتے۔(نور:۶۳)

ان دونوں گروہوں میں صرف ایک ہی فرق ہے۔وہ یہ کہ مومنین کی جماعت تو مقصد پر ایمان رکھتی ہے لہٰذا اس کے حصول میں جانبازی کرتی ہے۔اور منافق ایمان کو اپنی زندگی کی ڈھال بنائے ہوئے ہوتا ہے کیونکہ وہ مقصد پر عقیدہ نہیں رکھتا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ جنگ احزاب میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کا نام کہیں نظر نہیں آتا، گویا اس نے خود کو پست رکھا ہوا تھا، اور ہاتھ پردہ کے پیچھے کام کر رہا تھا۔وہ آئندہ کے حوادث کا منتظر تھا تاکہ خود کو عین موقع پر ظاہر کرے۔مومنین کی خوش قسمتی کو آئندہ کے حوادث کا منتظر تھا تاکہ خود کو عین موقع پر ظاہر کر لے۔مومنین کی خوش قسمتی کہ آئندہ کے حالات اس کے لیے انتہائی تلخ ہو گئے اور لشکرِ شرک ایک مہینہ کے محاصرہ کے بعد یاس و نا اُمیدی کے عالم میں کئی جانیں تلف کروانے کے بعد مدینہ کے علاقہ کو چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ گیا۔

(٦)
مُنافقین اور غزوہ بنی المصطلق

جنگِ احزاب کا فتنہ اسلام کی لشکرِ شرک پر فتح کی صورت میں ختم ہوا۔ منافقین اس جنگ میں لشکرِ اسلام کے خلاف کوئی سازش نہ کر سکے۔ یہودیوں کے تینوں قبائل کی مدینہ کی سرزمین سے جلاوطنی نے منافقین کو وحشت زدہ کر دیا۔ اب انہیں یقین ہو گیا کہ اس علاقہ میں اسلام کی کامیابی قطعی ویقینی ہوگئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سازش، جوڑتوڑ، فتنہ انگیزی اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنے سے باز نہ آئے۔

ہجرت کے چھٹے سال ماہِ رجب میں آنحضرتؐ کو اطلاع ملی کہ قبیلہء بنی مصطلق جو قبیلہء خزاعہ کی شاخ تھی۔ ہتھیار اور لشکر جمع کرنے میں مصروف ہے۔

رسُول اکرم نے حقیقت معلوم کرنے کے لیے ایک صحابی ''بریدہ'' کو دشمن کی سرزمین کی طرف بھیجا، تا کہ صحیح حالات معلوم کر کے آئیں۔ آنحضرتؐ کا فرستادہ کسی طرح رئیس قبیلہ تک پہنچ کر ان کی بُری نیت سے آگاہ ہوا اور واپس آکر اطلاع دی کہ مذکورہ قبیلہ آہستہ آہستہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ لہٰذا جتنا جلدی ہو سکے فتنہ کا اس کی ابتدا ہی میں سد باب کیا جائے۔

آنحضرتؐ نے اسی سال نیمۂ شعبان میں ابوذر غفاری کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا اور ایک بہت بڑا لشکر دشمن کی طرف یلغار کر کے ''مریسیع' کے مقام پر غفلت کی حالت میں دشمن کو جا پکڑا، دشمن نے دس آدمیوں کے قتل ہو جانے کے بعد لشکر اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنا سب مال ومتاع مسلمانوں کے حوالے کر دیا[1]

اس جنگ میں منافقین کا رئیس اور اس کے اکثر ساتھی بھی شریک تھے۔ اس جنگ میں ان کے شامل ہونے کا مقصد مالِ غنیمت حاصل کرنا تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اسلام پر قربان ہونے والے فداکار مجاہدین سو فی صد کامیاب ہوں گے اور دشمن کو تہ و بالا کر کے رکھ دیں گے۔

اس کے علاوہ موقعہ جنگ مدینہ سے کچھ زیادہ دور اور زحمت طلب بھی نہ تھا۔ جنگ ختم ہوگئی اور لشکرِ اسلام آرام کرنے لگا مگر رئیس المنافقین اور اس کے ساتھی اس بات کے درپے تھے کہ جہاں تک ہو سکے کسی قسم کے حادثہ کی مدد سے مسلمانوں کے خلاف فائدہ اٹھائیں۔ وہ اسی فکر میں تھے کہ درجِ ذیل حادثہ رونما ہو گیا:۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام جد ۲ ص ۲۸۱۔

مہاجر وانصار کی نزاع

کوئی چیز تفرقہ بازی اور پھوٹ سے بڑھ کر کسی لشکر کے لیے نقصان دہ نہیں ہوتی اور وہ بھی دشمن کی سرزمین پر۔لیکن افسوس کی بات ہے کہ اس قسم کا واقعہ رونما ہو ہی گیا۔لشکر اسلام کے دو افراد کی کم ظرفی کی بناء پر ایک حادثہ پیش آ گیا جس نے مہاجر و انصار کو ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ایسا ہوا کہ کنوئیں سے پانی نکالتے وقت دو افراد، مہاجرین میں سے جہجاہ، اور انصار کے منہ پر مارا۔پس ہر ایک نے زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق اپنی قوم اور رشتہ داروں کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔اچانک ایک جماعت، انصار اور ایک جماعت مہاجرین سے شمشیر ہائے برہنہ لے کر لڑنے کے لیے پہنچ گئیں۔قریب تھا کہ آپس میں ہی ایک خونی جنگ دشمن کی سرزمین پر ہی چھڑ جاتی اگر اس وقت رسولِ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کی تدبیر کارفرما ہوتی تو دشمن کے بجائے جنگ کا میدان مہاجرین و انصار کی جنگ میں تبدیل ہو جاتا۔

رسول اکرم خود اس جمعیت کے اندر تشریف لائے اور فرمایا۔

''یہ جھگڑا اور اس طرح سے مدد کے لیے پکارنا بہت بری نفرت انگیز بات ہے۔''[1]

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آنحضرتؐ نے اس طرح سے مدد کے لیے پکارنا بہت بُری اور نفرت انگیز بات ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آنحضرتؐ نے اس طرح سے مدد طلب کرنے کو نفرت انگیز کیوں کہا۔اس میں نکتہ یہ ہے کہ یہ جھگڑا زمانہ جاہلیت کے جھگڑے سے مشابہ تھا۔زمانہ جاہلیت میں اگر کوئی شخص اپنی قوم سے مدد طلب کرتا تھا تو اس کی قوم فوراً اس کی مدد کرتی تھی۔ان کو اس بات سے سروکار نہیں ہوتا تھا کہ بلانے والا مدد کا مستحق ہے۔بھی یا نہیں ان کا نعرہ یہ ہوتا تھا: اَنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا اپنا بھائی کی مدد کر چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔[2]

منافقین کا کردار

منافقین کے رئیس نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ انصار کے دل میں مہاجرین کے خلاف دشمنی کا بیج بونے کے لیے حالات پورے طور پر سازگار ہیں، کیونکہ اس واقعہ میں انصاری نے اپنے علاقہ میں اور اپنے بزرگوں کے سامنے ایک مہاجر سے تھپڑ کھایا تھا اور اس کی ہتک ہوئی تھی۔ اس نے ان حالات میں انصار کی ایک جماعت کے سامنے تقریر شروع کر دی اور کہا:

ہاں ہاں! مہاجرین نے ہماری سرزمین میں ہم پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ہم محمدؐ کے یار و انصار بنے تا کہ ہم تھپڑ کھائیں۔گویا نیکی اور

---

[1] حاشیہ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۹۰ ملاحظہ فرمائیں

[2] یہ جملہ حدیثِ رسولؐ میں بھی ایک اسلامی اصل کے عنوان سے آیا ہے۔لیکن اس سے دوسرے معنی مُراد لیے گئے ہیں۔آنحضرتؐ نے جب اس بات کو بیان فرمایا تو فوراً اس کی وضاحت فرمائی۔ظالم بھائی کی مدد سے مراد یہ ہے کہ اس کو نصیحت کریں اُسے ظلم سے باز رکھیں اور اس کے دین اور معنویت اور روحانیت کی حفاظت کریں۔

احسان کا بدلہ برائی ہے۔ خدا کی قسم! اب یہ حالت نہیں رہے گی۔ اگر ہم واپس گئے تو عزت والا (مراد عبداللہ ہے) ذلیل کو (مراد پیغمبر ہیں) نکال باہر کرے گا۔[1]

اس کے بعد اُس نے اپنے حاشیہ نشینوں سے کہا:

''یہ مصیبت جو تم خود ہی اپنے سر پر لائے ہو۔ تم نے باہر کے لوگوں کو اپنی سرزمین میں جگہ دے دی اور انہیں اپنے مالوں میں شریک کیا۔ خدا کی قسم! اگر تم ان پر خرچ کرنے سے رک جاؤ تو وہ سب کے سب محمدؐ کے پاس سے منتشر ہو جائیں گے، اور ان میں سے کوئی بھی مدینہ میں نہیں رہے گا۔''

اُس نے جس ماہرانہ انداز میں ایسی بات کی جو خدمت گذار لیکن ستم دیدہ انصار کو مسلمانوں اور خود آنحضرتؐ کے خلاف برانگیختہ کر سکتی تھی۔

اس مجلس میں ایک نوخیز نوجوان جس کا نام ''زید بن ارقم'' تھا موجود تھا، جو منافقین کے رئیس کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہا تھا، اس جوان کی دینی غیرت نے اُسے یہ اجازت نہ دی کہ وہ عبداللہ کی فتنہ جوئی کے مقابلہ میں خاموش رہے۔ اس لیے اس نے پیر نفاق کی طرف منہ کر کے کہا۔

''اپنی قوم میں ذلیل وحقیر اور قابلِ نفرت تو خود ہے، اور محمدؐ کو تو خدا کی طرف سے عزت اور مسلمانوں کی قوت وطاقت حاصلِ ہے۔'' عبداللہ بن ابی نے اس جوان سے چلا کر کہا: تو تو ابھی کھیل کود کے لائق ہے اور بس۔ تجھے ان امور میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

زید بارگاہِ پیغمبرؐ میں

اس نوجوان نے اپنی اس مختصر سی گفتگو پر اکتفا نہ کی بلکہ وہ پیغمبر اکرمؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آپؐ کو مسلمانوں کے خلاف عبداللہ کی فتنہ انگیزی سے آگاہ کرتے ہوئے اس کی باتوں کو بعینہٖ نقل کر دیا۔ رسولِ اکرمؐ نے کچھ مصالح کی بناء پر ''زید'' کی تصدیق نہ کی اور فرمایا: شاید تمہیں اس پر غصہ آ گیا اور تم نے اچھی طرح اس کی بات کو نہیں سُنا۔ یا تم پر مطالب مشتبہ ہو گئے ہیں؟''

زید نے آنحضرتؐ کے ہر سوال کے جواب میں عرض کیا: ''نہیں حضور! ایسا ہرگز نہیں ہے۔[2]

خلیفہ دوم نے آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ عبداللہ کے شر کو مسلمانوں کے سروں سے ایک انصاری کے ذریعہ برطرف کر دیں، لیکن دوراندیش پیغمبر اکرمؐ نے اس عرضداشت کو قبول نہ فرمایا۔ اور جواب دیا کہ اس موقع پر شر پسند لوگ مشہور کریں گے کہ محمدؐ اپنے ہی

---

[1] اس نے اس بارے میں ایک ضرب المثل بیان کی جو چبھنے والی ہونے کی وجہ سے مندرجہ بالا صورت میں بیان ہوئی۔

[2] کشاف ج ۳ ص ۳۳۴۔

اصحاب کو قتل کرا دیتا ہے۔[1]

مستقبل کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ حق آنحضرتؐ کے ساتھ تھا، اور ان تمام شرارتوں کے باوجود جو عبداللہ بن ابی کرتا تھا اس کا قتل کرنا ان حالات میں مصلحت کے خلاف تھا۔ آنحضرتؐ نے کسی کو بھیج کر عبداللہ بن ابی کو بلوایا، اور اس سے واقعہ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے انتہائی منت کے ساتھ زید کی بات کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔ اس خدا کی قسم جس نے آپ پر قرآن نازل کیا ہے، میں نے ہرگز یہ بات نہیں کی۔ یہ لڑکا غلط بیانی کر رہا ہے۔ انصار میں سے بھی کچھ لوگ عبداللہ مذکور کی مدد کے لیے کھڑے ہو گئے اور کہا کہ عبداللہ قبیلہ خزرج کا بزرگ ہے اس کی ایک نوجوان کے کہنے پر ہرگز تکذیب نہیں کی جا سکتی۔ شاید اس نوجوان کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

اگرچہ قرائن زید کی صداقت اور عبداللہ کے جھوٹ کی نشاندہی کر رہے تھے کیونکہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ آنحضرتؐ بظاہر عبداللہ کی تکذیب نہ کریں اور اس بارے میں وحی الٰہی کا انتظار کریں۔

سازش کا اثر ختم کرنے کے لیے روانگی کا حکم

یہ ٹھیک ہے کہ طرفین ایک دوسرے سے الگ تو ہو گئے لیکن ابھی تک سب کے سب خاص طور پر ''مظلوم انصار'' جھگڑے کی تلخی کو محسوس کر رہے تھے اور پیرِ نفاق کی فتنہ جوئی اس میں شدت پیدا کر رہی تھی۔ سادہ لوح انصار غالباً خیال کر رہے تھے کہ آنحضرتؐ کی مدد کرنا ان پر ظلم کا سبب بنا ہے لہٰذا اب کوئی ایسا کام کرنے کی ضرورت تھی کہ جھگڑا دلوں سے محو ہو جائے۔ گویا کوئی جھگڑا ہوا ہی نہ ہوا اور نہ ہی کوئی مدد طلب کی گئی ہو۔ پس حکم ہوا کہ لشکر جلد سے جلد اپنی سواریوں پر سوار ہو جائے اور مدینہ کی راہ لے۔

اسید بن حضیر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: آپ نے کبھی بھی اس قدر شدید گرم موسم میں روانگی کا حکم صادر نہیں فرمایا:''

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ''کیا عبداللہ کی بات تم نے نہیں سنی۔ اس نے کہا ہے کہ مدینہ پہنچ کر عزت دار' ذلیل'' کو باہر نکال دے گا۔''

اسید نے عرض کیا: ''یارسول اللہؐ! اس کے ساتھ نرمی و مدارات سے پیش آئیں کیونکہ آپ مدینہ میں اس وقت تشریف لائے تھے جب عبداللہ کی تاجپوشی ہونے والی تھی آپ کی آمد نے اس کی خیالی سلطنت کا دفتر لپیٹ دیا۔ اب وہ خیال کرتا ہے کہ آپ کی تشریف آوری نے اس کو اس منصب و مرتبہ سے محروم کر دیا۔ وہ اسی لیے ایسی باتیں کرتا ہے۔

لیکن آنحضرتؐ نے پھر بھی ایسے نامناسب وقت میں سب کو روانگی کا حکم دے دیا۔ تاکہ سب کے سب مدینہ کی طرف چل پڑیں اور اس حادثہ کے بارے میں بالکل گفتگو نہ کر سکیں۔ لشکرِ اسلام نے اس دن کا باقی حصہ پوری رات اور دوسرے دن کا کچھ حصہ راستے طے کرنے

---

[1] تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۴۷۱ سیرۃ حلبی ج ۲ ص ۳۰۲۔

میں صرف کیا اور اس قدر تھک گئے کہ جب انہیں سواریوں سے اترنے کا حکم دیا گیا، تو وہ قیام کرتے ہی سب کے سب گہری نیند سو گئے۔ اس طرح جب وہ کافی دیر کے بعد بیدار ہوئے تو اس تلخ واقعہ کا اتنا تند و تیز اثر باقی نہ رہا۔

رُسوائی منافق

ابھی پیغمبر اکرمؐ مدینہ نہیں پہنچے تھے [1] کہ زید کی تصدیق اور منافق کی تکذیب میں وحی الٰہی نازل ہوئی اور ذلیل منافق کو مزید رُسوا و ذلیل کیا۔

زید بن ارقم کہتے ہیں:

''میں نے دیکھا کہ آنحضرتؐ تکلیف محسوس کر رہے ہیں اور آپ کی پیشانی سے پسینہ بہ رہا ہے میں نے سمجھ لیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے اس وقت میری یہ آرزو تھی کہ وحی میری تصدیق اور منافق کی تکذیب کرے کچھ دیر کے بعد آنحضرتؐ نے مجھے طلب فرمایا اور کہا: اللہ تعالیٰ نے تیری تصدیق اور منافقین کی تکذیب کر دی ہے۔

وہ آیات جو اس بارے میں نازل ہوئیں سورۂ منافقین کا وہی حصہ جس سے ہم سب لوگ آشنا ہیں۔

ان آیات میں سے چند ایک یہ ہیں۔

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ①

''جب منافقین آپ کے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں، اور خدا جانتا ہے کہ آپ یقیناً خدا کے پیغمبر ہیں لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹ بول رہے ہیں۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ②

انہوں نے اپنی قسموں کو اپنی جان کی ڈھال بنا رکھا ہے اور انہوں نے خود کو بھی اور دوسروں کو بھی راہِ خدا کی پیروی سے روک دیا ہے۔ انہوں نے کتنا بڑا کام انجام دیا ہے۔

قرآن اس سورہ میں منافقین کے رئیس کی گفتگو کا متن تنقید کے ساتھ نقل کرتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ

---

[1] مجمع البیان ج ۵ ص ۱۹۴ کی نقل کے مطابق یہ آیات حضورؐ کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئیں۔

خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلٰكِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ لَا يَفۡقَهُوۡنَ ۝

''وہ ایسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ کے اصحاب پر خرچ نہ کرو تا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلے جائیں (لیکن انہوں نے یہ بے سوچے سمجھے کہا ہے) آسمانوں اور زمین کے خزانے تو خدا ہی کے ہیں۔ لیکن منافقین نہیں سمجھتے۔''

يَقُوۡلُوۡنَ لَئِنۡ رَّجَعۡنَاۤ اِلَى الۡمَدِيۡنَةِ لَيُخۡرِجَنَّ الۡاَعَزُّ مِنۡهَا الۡاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ وَلِرَسُوۡلِهٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَلٰكِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝

''وہ کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ واپس جائیں گے تو عزیز ذلیل کو مدینہ سے باہر نکال دے گا۔ حالانکہ منافقین نہیں جانتے کہ عزت تو صرف خدا اور اس کے رسولؐ اور مومنین ہی کے لیے ہے۔

ان آیات کے نزول نے رسوا و ذلیل منافق کو اور بھی زیادہ رُسوا اور ذلیل کر کے رکھ دیا اس کے باوجود کچھ لوگوں کا ارادہ تھا کہ ''عبداللہ'' کو آنحضرتؐ کے پاس لے جائیں تا کہ آپ اس کے حق میں ''طلبِ مغفرت'' کریں۔ جب انہوں نے یہ ارادہ اس کے سامنے ظاہر کیا تو اس نے عدم ایمان کی وجہ سے آنحضرتؐ کے مغفرت طلب کرنے کو، جس کا مقصد اس کے حق میں صرف دعا کرنا تھا، آنحضرتؐ کو سجدہ کرنا قرار دیا اور کہنے لگا۔ تم نے مجھے مشورہ دیا کہ اس پر ایمان لے آؤں۔ میں نے تمہارا کہا مانا اور ایمان لے آیا۔ پھر تم نے کہا کہ اپنے مال میں سے زکوٰۃ دوں۔ میں نے وہ بھی دی۔ اب تم کہتے ہو کہ میں اسے سجدہ کروں۔''

اس سلسلہ میں اور کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جس طرح شور زمین ہر قسم کے پاک اور باصلاحیت بیج کو ضائع کر دیتی ہے۔ اسی طرح نصیحت کرنے والوں کی اچھی باتیں بداندیش لوگوں کو کڑوی اور بری معلوم ہوتی ہیں۔

قرآن اس بارے میں فرماتا ہے۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا يَسۡتَغۡفِرۡ لَكُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ لَوَّوۡا رُءُوۡسَهُمۡ وَرَاَيۡتَهُمۡ يَصُدُّوۡنَ وَهُمۡ مُّسۡتَكۡبِرُوۡنَ ۝

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ پیغمبر خداؐ کے پاس چلیں، تا کہ وہ تمہارے لیے خدا سے بخشش طلب کریں تو وہ اپنے سروں کو موڑ لیتے ہیں (اعتراض کے عنوان سے دوسری طرف کر لیتے ہیں) اور تکبر سے اپنے آپ کو حق کی پیروی سے روک لیتے ہیں''

عبداللہ کو نصیحت کرنے والے لوگ ایک نکتہ سے تغافل برت رہے تھے وہ یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی دعا بھی موافق اور آمادہ و تیار ذہنوں کے لیے ہی مقامِ استجابت تک پہنچتی ہے اندھے دلوں اور بہرے کانوں کو کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ اولیائے خداوند تعالیٰ کی دعائیں اچھے اور

باصلاحیت بیج کی طرح ہوتی ہیں جس کو اگر ناپاک زمین میں بکھیر دیا جائے تو وہ ہرگز نشو ونما نہیں پاتا۔ اسی لیے قرآن اس بارے میں فرماتا ہے۔

سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ اَسۡتَغۡفَرۡتَ لَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ لَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ۝۶ (منافقون)

''تم ان کے بارے میں طلبِ مغفرت کرد یا نہ کرو۔ خدا انہیں ہرگز نہیں بخشے گا (کیونکہ) خدا بدکار لوگوں کو ہرگز نہیں بخشتا۔

ایمان وشفقت کی کش مکش میں مبتلا ایک نوجوان

منافقین کے رئیس کے ساتھ رسولِ اکرمؐ کا سلوک اس بات کا سبب بن گیا کہ خود اس کا نزدیک ترین عزیز اس کے خلاف ہو جائے۔ تاریخ کہتی ہے کہ رئیس منافقین کا ایک بیٹا جس کا نام عبداللہ تھا۔ قبیلہ بنوخزرج میں ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے والا اس سے بڑھ کر اور کوئی شخص نہ تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ اپنے باپ کی منافقت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اس نے رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

''اگر میرے باپ کو قتل کر دینا ضروری ہو تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کام کو کسی دوسرے شخص کے ذمہ لگا یا جائے۔ اس صورت میں ممکن ہے کہ میرے ہاتھ اپنے باپ کے قاتل کے خون سے رنگین ہو جائیں۔ کیونکہ میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ میرے باپ کا قاتل زندہ رہے۔ اس صورت میں ایک مسلمان ایک کافر کی وجہ سے قتل ہو جائے گا۔ لہٰذا اگر حضورؐ کا اس قسم کا کوئی ارادہ ہو تو بہتر یہی ہوگا کہ اس کام کی انجام دہی میرے ہی ذمہ لگادی جائے تا کہ میں خُود ہی اُسے قتل کر دوں۔''

آنحضرتؐ نے فرمایا:

''جاؤ اور اس کے ساتھ نیکی اور مدارات سے پیش آؤ۔ ہم بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہیں گے۔''

بعض تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ جب مدینہ تشریف لائے تو عبداللہ بن ابی کی تکذیب میں چند آیات نازل ہو چکی تھیں جو مسلمانوں میں پھیل بھی چکی تھیں۔ لیکن ابھی عبداللہ مدینہ میں وارد نہیں ہوا تھا لہٰذا جب منافقین کے اس رئیس نے مدینہ میں داخل ہونا چاہا تو اس کے بیٹے نے اس کا راستہ روک لیا اور کہا: جب تک پیغمبرؐ تجھے مدینہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دے دیں اس وقت تک تو اس شہر میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ ایک روایت کے مطابق اس نے کہا: جب تک تو اپنے عجز اور رسولؐ کی بزرگی کا اعتراض نہیں کرے گا شہر کے اندر داخل نہیں ہو سکتا۔

عبداللہ نے انے بیٹے کی آنحضرتؐ سے شکایت کی تو آپؐ نے ایک بار پھر اس کو ہدایت فرمائی۔ اُسکے ساتھ نرمی اور مدارات کر اور ہم بھی اس کے ساتھ مدارات کریں گے''[1]

''بنی مصطلق'' کے حادثہ کے بعد عبداللہ بُری طرح پریشان ہو گیا۔ ہر طرف سے اعتراض کی لہر اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی جس

---

[1] تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۴۷۲ و مجمع البیان ۵ ص ۲۹۵۔

سے وہ لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل وخوار ہو کر رہ گیا اور پھر اپنے وقار کو بحال نہ کر سکا۔

پیغمبرؐ نے عمر سے فرمایا: تم نے یہ مشورہ دیا تھا کہ میں اس کے قتل کا حکم دے دوں اگر میں اس دن ایسا کر دیتا، تو ایک گروہ اس کی حمایت کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ لیکن آج وہی لوگ جو اس دن اس کی حمایت کرتے، اس سے اتنے متنفر ہو چکے ہیں کہ اگر میں اس کے قتل کا حکم دوں تو وہ بغیر کسی چون و چرا کے اس کو قتل کر دیں گے۔[1]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۹۳

(۷)

منافقین اور افک کی داستان

منافقین کا رئیس عبداللہ بن ابی زمانہ جاہلیت میں اور مدینہ میں اسلام رائج ہونے کے بعد لوگوں کی عزت و ناموس کے سودے کرتا اور ان کنیزوں کی تجارت کرتا تھا۔ کنیزیں لوگوں کے تصرف میں دے کر ان سے منفعت حاصل کرنا اس کا کاروبار تھا۔ حتیٰ کہ حرمتِ زنا کی آیات کے نزول کے بعد بھی اُس نے اسی طرح اپنے اس گھناؤنے پیشہ کو جاری رکھا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس کی کنیزوں نے، جو عظیم رنج و اندوہ میں زندگی بسر کر رہی تھیں، عبداللہ کی آنحضرتؐ کے حضور شکایت کی اور عرض کیا: ہم پاک و پاکیزہ زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن یہ شخص ہمیں اس ذلیل کام پر مجبور کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے ذلیل کاروبار کی مذمت میں ذیل میں ذکر شدہ آیت نازل ہوئی جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ (نور: ۳۳)

اپنی بیٹیوں کو جو پاک دامنی کی خواہاں ہیں، مالِ دنیا کی خاطر بدکاری پر مجبور نہ کرو۔"[1]

لوگوں کو عورتوں اور لڑکیوں کی عزت و ناموس کی تجارت کرنے والا اس قسم کا ایک شخص چاہتا ہے کہ ایک ایسی عورت کو جو اس معاشرے میں ایک باحیثیت مقام رکھتی تھی اور اسلامی معاشرے میں عظمت و شخصیت کی مالک تھی بدنام کر دے، اور اس پر ایسے قبیح فعل کی تہمت لگائے[2]

ایمان کے ساتھ نفاق کی دشمنی سب سے بڑی دشمنی ہے۔ مشرک اور منافق میں یہ فرق ہے کہ مشرک تو کھلم کھلا دشمنی کر کے اپنے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کر لیتا ہے، لیکن منافق جس نے ایمان کو ڈھال بنایا ہوا ہوتا ہے، دشمنی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ البتہ بعض اوقات اس کی باطنی دشمنی پھٹ پڑتی ہے اور وہ دیوانوں کی طرح بغیر کسی دلیل کے باتیں کرنے اور تہمت لگانے پر اُتر آتا ہے۔

بنی مصطلق کی سرگذشت میں منافقین کے رئیس کی ذلت واضح آشکار ہو چکی تھی اور خود اس کے بیٹے نے اسے مدینہ میں داخل ہونے

---

[1] مجمع البیان ج ۴ ص ۱۴۱، الدر المنثور ج ۵ ص ۴۶۔

[2] یہ تشریح اس لئے کی گئی ہے کہ واقعہ افک سے متعلق آیات کے بارے میں جو قسم کی شان نزول نقل ہوئی ہیں۔ وہ مولف کے نزدیک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتیں۔ اس کے ثبوت کے دلائل اسی بحث میں بیان کیے جائیں گے۔ جو کچھ مجموعہ آیات و روایات سے ظاہر ہوتا ہے وہی ہے جو اوپر لکھا جا چکا ہے اور وہ مختصراً یہ ہے کہ ایک خاتون پر جو اسلامی معاشرے میں باحیثیت تھی منافقین نے تہمت لگائی۔ لیکن وہ معزز خاتون کون تھی، اس بارے میں کوئی قطعی و یقینی بات نہیں کہی جا سکتی۔

سے روک دیا تھا۔ آخرکار وہ آنحضرتؐ ہی کی وساطت سے مدینہ میں داخل ہوا نتیجہ کے طور پر اس شخص کا معاملہ جو سلطنت وحکومت کے حصول کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اس مقام تک جا پہنچا کہ اس کا قریب ترین عزیز اسے اس کے مقام پیدائش میں داخل ہونے سے روک رہا تھا۔ لہٰذا اس نے آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ اس کے بیٹے کے شر کو اس سے دور کریں۔

اس قسم کا آدمی ہمیشہ دیوانوں کی طرح ہر خشک وتر چیز پر ہاتھ مارا کرتا ہے اور اس قسم کا شور وغوغا کرتا ہے کہ اسلامی معاشرے سے اپنا انتقام لے۔

جب دشمن سامنے آ کر کوئی صدمہ پہنچانے کی طاقت نہ رکھتا ہو، تو پھر وہ ہمیشہ اسی قسم کے پروپیگنڈے کا سہارا لیتا ہے تاکہ عام لوگوں کے افکار کو پریشاں کر کے انہیں اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ اس طرح وہ عوام کو ضروری اور حساس مسائل سے منحرف کرتا ہے۔

پروپیگنڈا پاک اور نیک لوگوں کی حیثیت کو مجروح کرنے کے لیے ایک تباہ کن ہتھیار رہوتا ہے۔ اور لوگوں کو ان کی طرف سے پراگندہ کرنے کا سبب بنتا ہے۔

پاک دامن ہستی پر تہمت

وہ آیات جو ''اُفک'' کے واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں یہ بتاتی ہیں کہ منافقین نے کسی بے گناہ پر پاک دامنی کے منافی عمل کا اتہام لگایا تھا۔ انہوں نے ایک ایسی ہستی پر تہمت لگائی جو اس وقت معاشرے میں ایک خاص اہمیت وخصوصیت کی حامل تھی۔ منافقین اس تہمت کے ہتھیار کو اپنے نفع اور اسلامی معاشرے کو نقصان پہنچانے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ لیکن قرآن کی آیات نے بے نظیر قاطعیت کے ساتھ ان کا جواب دیا اور انہیں خاموش کر دیا۔

یہ بے گناہ کون تھی؟ مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے۔ عام طور پر اس سے مُراد حضرت عائشہؓ، زوجہ پیغمبرؐ لی جاتی ہیں۔ لیکن دوسرے مفسرین اس سے ناریہ، ابراہیم (فرزند رسول) کی والدہ مراد لیتے ہیں۔ اس بارے میں جو شانہائے نزول نقل کی گئی ہیں وہ اشکال سے خالی نہیں ہیں۔ لہٰذا پہلے ہم اس شانِ نزول کو نقل کرتے ہیں جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ آیاتِ ''افک'' رسول خداؐ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہؓ سے متعلق ہیں۔ ہم اس نظریہ کے مثبت ومنفی دونوں نکات کی وضاحت کریں گے۔

شانِ نزول اوّل

اہل سنت کے محدثین ومفسرین آیاتِ اُفک کی شانِ نزول کو ام المومنین حضرت عائشہؓ سے متعلق سمجھتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں ایک مفصل داستان نقل کرتے ہیں جس کا ایک حصہ خود حضورؐ کی عصمت کے منافی ہے۔ اس لیے اس شانِ نزول کو اسی صورت بعینہٖ قبول نہیں کیا جا سکتا۔

بس ہم یہاں شانِ نزول کے اس حصہ کی طرف جو مقام نبوت کے مطابق ہے۔ اشارہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد آیاتِ افک کو نقل کر کے ان کا ترجمہ پیش کریں گے۔ اس بحث کے آخر میں شانِ نزول کا وہ حصہ بیان کریں گے جو آنحضرتؐ کی عصمت کے منافی ہے۔

داستان افک کی سند خود ام المومنین حضرت عائشہؓ تک منتہی ہوتی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ آنحضرتؐ اپنی ازواج میں سے کسی ایک کو قرعہ کے مطابق سفر میں اپنے ہمراہ لے جاتے تھے۔ جنگ بنی مصطلق میں قرعہ فال میرے نام پر نکلا۔ لہٰذا میں نے اس سفر میں آنحضرت کی ہمراہی کے اعزاز کا شرف پایا۔ دشمن کی سرکوبی کے بعد لشکرِ اسلام مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ مدینہ کے قریب رات کے وقت لشکر آرام کر رہا تھا کہ اچانک ندائے کوچ (الرحیل) سارے لشکرِ اسلام میں سنائی گئی۔ میں اپنے کجاوہ سے نکلی اور قضائے حاجت کے لیے دور چلی گئی جب میں اپنے کجاوہ میں واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ میرا یمنی مہروں کا ہار کہیں گر گیا ہے۔ میں دوبارہ اس کی تلاش میں گئی ہار کی تلاش میں مجھے کچھ دیر لگ گئی۔ جب میں اپنی جگہ پر واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ لشکرِ اسلام جا چکا ہے اس طرح میں وہاں یکہ وتنہا رہ گئی۔ میں جانتی تھی کہ جب وہ منزل پر پہنچیں گے اور مجھے محمل میں نہ پائیں گے تو میری تلاش میں ادھر ضرور آئیں گے۔

اتفاق سے لشکرِ اسلام کا ایک شخص، جس کا نام صفوان تھا، لشکر سے پیچھے رہ گیا تھا صبح کے وقت اس نے مجھے دیکھا۔ وہ قریب آیا اور اس نے مجھے پہچان لیا اور مجھ سے کوئی بات کیے بغیر انا اللہ وانا الیہ راجعون کلمہ اپنی زبان سے ادا کیا، اپنے اونٹ کو بٹھا دیا اور میں اس پر سوار ہو گئی ناقہ کی مہار اس کے ہاتھ میں تھی۔ جب اس نے مجھے لشکرِ اسلام تک پہنچایا۔ جب منافقین خصوصاً ان کے رئیس کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو انہوں نے میرے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا اور یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ حتیٰ کہ مجالس میں اس کے تذکرے ہونے لگے۔

نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مسلمانوں کی ایک جماعت نے میرے بارے میں بدگمانی کو ہوا دی کچھ عرصہ بعد آیاتِ افک نازل ہوئیں اور مجھے منافقین کی تہمت سے نجات ملی۔ شانِ نزول کا یہ حصہ جسے ہم نے مفصل داستان کے خلاصہ کے طور پر پیش کیا ہے، آیاتِ قرآنی کے بالکل مطابق ہے اس میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو آنحضرتؐ کی عصمت کے منافی ہو۔

وہ آیات جو اس واقعہ کے بارے میں نازل ہوئیں یہ ہیں:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِیْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱﴾

(نور:۱۱)

”وہ لوگ جنہوں نے اتنا بڑا جھوٹ بولا تم ہی میں سے ایک گروہ تھا، تم یہ خیال نہ کر لینا کہ یہ بات تمہارے لیے بُری ہے بلکہ اس میں تمہارے لیے بہتری اور بھلائی ہے۔ ان میں سے ہر شخص کے لیے گناہ کا اتنا ہی حصہ ہے جتنے کا وہ مرتکب ہوا ہے البتہ اس شخص کے لیے جو اس گناہ کے بڑے حصہ کا ذمہ دار ہے بڑا عذاب ہے۔“

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۲﴾

(نور:۱۲)

''صاحبِ ایمان لوگوں نے جب یہ قصہ سنا تو انہوں نے اپنی نسبت (اور اس کی نسبت جوان کے نفس کی مانند ہے) اچھا گمان کیوں نہ کیا اور انہوں نے یہ کیوں نہ کہا کہ یہ تو بہتان اور بہت بڑا گناہ ہے۔

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾ (نور:۱۳)

وہ اس کیلئے چار گواہ کیوں نہ لائے۔ چونکہ وہ گواہ لے کر نہیں آئے اس لئے اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِىْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۴﴾ (نور۔۱۴)

''اگر دنیا و آخرت میں خدا کا فضل اور رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتے تو اس گناہ کی وجہ سے جو انہوں نے کیا ہے بہت بڑا عذاب پہنچتا۔

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾ (نور:۱۵)

''تم اس بات کو ایک دوسرے کی زبان میں شہرت دے رہے تھے اور ایسی بات کرتے تھے جس کا تمہیں علم نہیں تھا اور تم اُسے آسان خیال کرتے تھے، حالانکہ وہ خدا کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا۔''

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾

(نور:۱۶)

''جب تم نے اسے سنا تھا تو تم نے یہ کیوں نہ کہا کہ ہمیں اس بارے میں کوئی بات کرنا مناسب نہیں ہے خداوندا تو

منزہ ہے۔ یہ پروپیگنڈا گناہِ عظیم ہے۔''

آیات۔۔کے نکات

قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تہمت کی ابتداء منافقین نے کی تھی وہ قرآئن یہ ہیں:

۱۔ کہتے ہیں کہ والذی تولی کبرہ (وہ شخص جو اس کے بڑے حصے کا ذمہ دار تھا) کے جملہ سے مراد منافقین کا رئیس عبداللہ بن ابی ہی ہے۔

۲۔ گیارھویں آیت میں تہمت لگانے والی جماعت کو ''عصبۃ'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ لفظ متحد، ہمکارا اور ہم فکر گروہ کے لیے اِستعمال ہوتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سازش کرنے والے ایک دوسرے کے ساتھ قریبی اور مستحکم رابطہ رکھتے تھے۔لیکن اس قسم کا گروہ مسلمانوں میں منافقین کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

۳۔ اس مخالفت کے پیش نظر جو اس کے مدینہ میں داخل ہونے کے لیے ہو رہی تھی وہ شہر کے دروازے پر ہی رُکا ہوا تھا کہ اُس نے زوجہ رسولؐ کو صفوان کے اونٹ پر سوار آتے ہوئے دیکھا۔ اسے پہچانتے ہی اس نے فوراً یہ تہمت لگادی کہ زوجہء رُسول نے ایک غیر شخص کے ساتھ رات گذاری ہے اور خدا کی قسم! کوئی بھی گناہ کرنے سے بچا ہوا نہیں ہے۔

۴۔ پھر اسی گیارھویں آیت میں فرماتا ہے: لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ ۔ (تم اس واقعہ کو برا نہ سمجھو، بلکہ یہ تمہارے لیے اچھا ہے)۔

دیکھنا ہوگا کہ ایک پاک شخص کو متہم کرنا مومنین کے لیے کِس طرح برا نہیں ہے۔ وہ یوں کہ اس واقعہ نے منافقین کی ناپاک سرشت کو بے نقاب کر دیا وہ سب کے سب رُسوا ہوگئے جبکہ مسلمانوں نے اس واقعہ سے پاکیزہ و عمدہ سبق سیکھے۔

واقعہ کی تفصیلات

واقعہ یہاں تک قرآن سے مطابقت رکھتا ہے اور آنحضرتؐ کے مقامِ عصمت کے کسی طرح منافی نہیں۔لیکن اس کی شانِ نزول جس طرح بخاری نے نقل کی ہے اور دیگر حضرات نے غالباً اسی سے حاصل کی ہے اس پر دو اشکال وارد ہوتے ہیں جنہیں ہم یہاں بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

۱: مقام نبوت و عصمت کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

بخاری خود حضرت ام المومنین عائشہؓ سے نقل کرتا ہے: فرماتی ہیں:۔

''میں بیمار ہوکر سفر سے واپس آئی آنحضرتؐ مجھے دیکھنے کے لیے تو آیا کرتے تھے۔لیکن میں ان میں وہ پہلی سی مہر و محبت نہ پاتی نہ ہی مجھے اس کی کوئی وجہ معلوم تھی آہستہ آہستہ میری حالت اچھی ہوگئی۔ میں باہر آئی تو یہ شور و غل میرے کانوں تک پہنچا جس سے میں دوبارہ بیمار

ہو گئی میری بیماری شدت اختیار کر گئی تو میں نے آنحضرتؐ سے اپنے پدرِ بزرگوار کے گھر جانے کی اجازت مانگی۔ وہاں میں نے اپنی والدہ محترمہ سے پوچھا کہ لوگ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ جو خواتین صاحبِ امتیاز ہوتی ہیں۔ لوگ ان کے پس پُشت بہت سی باتیں بنایا کرتے ہیں۔

آنحضرتؐ نے اس سلسلہ میں اُسامہ سے مشورہ فرمایا۔ اسامہ نے میری عصمت کی گواہی دی۔ علیؑ سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا: اس کی کنیز سے تحقیق فرمائیے۔ آنحضرتؐ نے میری کنیز کو طلب فرمایا اور اس سے پوچھا کنیز نے جواب دیا:

''اُس خدا کی قسم! جس نے آپ کو نبوت کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے میں نے کوئی غلط بات ان میں نہیں پائی۔[1]

تاریخ کا یہ بیان آنحضرتؐ کے مقامِ عصمت سے سازگار نہیں کیونکہ یہ بیان اس بات کی ترجمانی کرتا ہے کہ آنحضرتؐ کے مقامِ عصمت کے ساتھ سازگار نہیں بلکہ ایک عام صاحبِ ایمان شخص کو بھی زیب نہیں دیتا، کیونکہ اس سطح کی شہرتِ عام کے باعث کسی متہم فرد کے ساتھ ہرگز کسی مسلمان کو اپنے رویہ اور سلوک میں تبدیلی کرنا مناسب نہیں بلکہ ایسی شہرت اگر اس کی سوچ پر اثر انداز ہو بھی جائے، تب بھی اس کے طرزِ عمل اور سلوک میں تبدیلی نہیں آنی چاہیے۔

قرآن بارھویں اور چودھویں آیت میں، ان لوگوں کی، جن پر اس افواہ کا غلط اثر ہو گیا تھا، سخت مذمت کرتا ہے اور فرماتا ہے: جب تم نے یہ تہمت سنی تھی تو تم میں صاحبِ ایمان مردوں اور صاحبِ ایمان خواتین نے متہم کے بارے میں اچھا گمان کیوں قائم نہ کیا اور یہ کیوں نہ کہا کہ یہ سفید جھوٹ ہے پس اگر دنیا و آخرت میں خدا کی رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی تو اپنے اس گناہ کے ارتکاب کے باعث تم پر ایک عظیم عذاب نازل ہو جاتا۔

اگر شانِ نزول کا یہ حصہ صحیح مان لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ خود آنحضرتؐ بھی اس عتاب اور عذاب میں شامل ہوتے لیکن مقامِ نبوت جو عصمت کے ساتھ توأم ہے ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اس خطاب عتاب میں آپؐ کی ذاتِ اقدس واکمل کو بھی شامل جانیں۔

لہٰذا ضروری ہے کہ اس شانِ نزول کو، جس کا ایک حصہ مقامِ نبوت وعصمت کے منافی ہے، بالکل رد کر دیا جائے اور صحیح تجزیہ کے بعد پہلے حصہ کو، جو نبوت وعصمت سے منافات نہیں رکھتا قبول کیا جائے۔

۲: سعد بن معاذ واقعہ افک سے پہلے وفات پا چکے تھے۔

بخاری اپنی صحیح میں ان آیات کے شانِ نزول کے ذیل میں خود حضرت عائشہؓ سے نقل کرتا ہے کہ آنحضرتؐ میری بریرہ، نامی کنیز سے تحقیق کرنے کے بعد منبر پر تشریف لے گئے۔ اور مسلمانوں کی طرف رُخ کر کے آپ نے فرمایا؛:-

''کون ہے جو مجھے اس شخص کو سزا دینے میں معذور سمجھتا ہے جس نے میرے اہل خانہ کو پریشان کیا، جبکہ میں نے اپنے اہل خانہ میں

---

[1] صحیح بخاری جزو ششم تفسیر سورۃ نور ص ۱۰۲، ۱۰۳ جزو پنجم ص ۱۱۸۔

نیکی کے سوا اور کچھ نہیں پایا۔ اس طرح وہ ایک اپنی ہستی پر اتہام لگا رہے ہیں جس میں مجھے سوائے خوبی کے اور کوئی بات نہیں ملی۔

اس موقع پر سعد بن معاذ کھڑے ہو گئے اور عرض کی۔

''اے اللہ کے رُسول میں آپؐ کے لیے کوئی عذر پیش نہیں کرتا۔[1]

اگر وہ شخص قبیلہ اوس میں سے ہے تو ہم اس کی گردن اڑا دیں گے اور اگر وہ ہمارے خزرجی بھائیوں میں سے ہوا تو بھی ہم آپ کے حکم کو اس کے بارے میں جاری کریں گے۔''

یہ بات سعد بن عبادہ رئیس بنوخزرج پر گراں گذری۔ اس نے کھڑے ہو کر اظہار ناراضگی کرتے ہوئے کہا۔ خدا کی قسم! تو جھوٹ بولتا ہے تو اس کے قتل پر قادر نہیں ہے۔'' ''اسید بن حضیر'' جو سعد بن معاذ کا چچازاد بھائی تھا کھڑا ہو گیا اور سعد بن عبادہ کو غصہّ سے کہا: خدا کی قسم ہم اس کو ضرور قتل کر دیں گے اور تو منافق ہے جو منافقین کی حمایت کر رہا ہے۔''

ابھی آنحضرتؐ منبر پر ہی تشریف فرما تھے کہ دونوں قبیلوں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ انجام کار آنحضرتؐ کے حکم سے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

آیت کی یہ شانِ نزول صحیح تاریخ کے مطابق نہیں سعد بن معاذ ''بنی قریظہ'' کے بارے میں اپنا فیصلہ سنانے کے بعد اس زخم کے باعث جو انہیں جنگ احزاب میں لگا تھا فوت ہو چکے تھے۔ یہ واقعہ اسی تفصیل کے ساتھ خود امام بخاری نے اپنی صحیح کے پانچویں جزء کے باب ''جنگ احزاب و بنی قریظہ'' میں نقل کیا ہے لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ سعد بن معاذ افک کے واقعہ میں، جو بنی قریظہ کے حادثہ کے کئی ماہ بعد رُونما ہوا آنحضرتؐ کے منبر کے نیچے بیٹھا ہو، اور اس لیے سعد بن عبادہ سے اس بارے میں بحث ونزاع کی ہو۔

سیرت نگار کہتے ہیں ہو۔ کہ جنگِ خندق اور اس بعد کے بعد جنگِ بنی قریظہ ہجرت کے پانچویں سال ماہِ شوال میں واقعہ ہوئے اور بنی قریظہ کا واقعہ ۱۹ ذی الحجہ کو ختم ہوا۔ سعد بن معاذ اس واقعہ میں زخم کے پھٹ جانے اور بہت زیادہ خون بہہ جانے کے باعث اسی زمانہ میں انتقال کر گئے جبکہ غزوہ بنی مصطلق ہجرت کے چھٹے سال ماہِ شعبان میں رونما ہوا۔[2]

ہاں! جو بات اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں جاننا چاہیے کہ منافقین اس کوشش میں مصروف تھے کہ ایک باعزت خاتون کو، جو اس وقت کے معاشرے میں ایک برگزیدہ مقام اور حیثیت رکھتی تھی، بدنام کریں اور اس طرح مسلمانوں میں اختلاف پیدا کر کے انہیں کمزور کریں۔

---

[1] سعد بن معاذ قبیلہ اوس کے رئیس اور سعد بن عبادہ قبیلہ خزرج کے سردار تھے۔ ان دونوں قبیلوں کے درمیان ہمیشہ جنگ ورقابت رہتی تھی۔ اور عبداللہ بن ابی بھی خزرجی تھا۔

[2] گذشتہ مدرک ص ۱۱، ابن ہشام اپنی سیرۃ میں سعد بن معاذ کا نام نہیں لیتا۔ صرف سعد بن عبادہ کے ''اسید'' کا سے مناقشہ کا ذکر کرتا ہے۔ سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۳۰۰ کی طرف رجوع کریں۔

مفسرین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ الذی تولیٰ کبرہ کا جملہ عبداللہ بن ابی کے بارے میں نازل ہوا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہی اس کو شہرت دے رہا تھا۔

دُوسری شانِ نزول

اس شانِ نزول میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت ماریہ، رسولِ اکرم کی زوجہ محترمہ اور حضرت ابراہیم کی والدہ گرامی کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جب حضرت ابراہیم فوت ہو گئے اور حضورؐ ان کے غم میں نڈھال ہوئے تو آپ کی ازواج میں سے ایک نے کہا! آپ کیوں غمگین ہوتے ہیں ابراہیم تو آپ کا بیٹا ہی نہ تھا وہ تو ابن جریح کا بیٹا تھا۔'' آنحضرت نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ جا کر ابن جریح کو قتل کر دیں حضرت علیؑ تلوار لے کر اس باغ کے دروازے پر آئے جس میں ابن جریح مزدوری کرتا تھا۔ جب اس نے حضرت علیؑ کو غصہ کی حالت میں دیکھا تو اس نے باغ کا دروازہ نہ کھولا حضرت علیؑ کسی طرح باغ میں داخل ہو گئے اور اس کا تعاقب کیا وہ حضرت علیؑ کے خوف سے کھجور کے درخت پر چڑھ گیا۔ علیؑ بھی اسی درخت پر چڑھ گئے۔ ابن جریح نے ڈر کے مارے خود کو درخت سے نیچے گرا دیا۔ اچانک اس کا زیر جامہ کھل گیا اور معلوم ہوا کہ آلۂ جنسی اس کے پاس ہے ہی نہیں حضرت علیؑ آنحضرتؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور یہ سارا واقعہ بیان کیا۔

یہ شانِ نزول جسے محدث بحرینی نے تفسیر برہان ج ۲ ص ۱۲۶، ۱۲۷ پر اور جونیری نے تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۸۲، ۵۸۱ پر نقل کیا ہے اپنے مضمون کے اعتبار سے نہ صرف ضعیف اور غیر ثقہ ہے بلکہ بیان کرنے کے قابل نہیں یہ واقعہ اِسلام کے اصولِ قضاوت سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ پیغمبر خداؐ بغیر تحقیق کیے کسی شخص کے قتل کا حکم صادر فرما دیں۔ اور اگر اس قسم کے فرمان کا صدور آپ کے علم کی بناء پر تھا نہ کہ بینہ و شہود کی بناء پر، تو پھر رُسول خداؐ کا علم خلاف واقع کیوں نکلا۔

اس بناء پر دونوں ہی شان ہائے نزول کو قبول نہیں کیا جا سکتا، البتہ جو بات اہم ہے وہ اصل واقعہ ہے، جبکہ اتہام زدہ فرد کوئی بھی ہو، اس سے فرق نہیں پڑتا۔

(۸)

یہودیوں کے لیے جاسُوسی

معجزات کے مقابلہ کوردلی:

'بنی مصطلق' کی سرگذشت اور 'افک' کی داستان نے منافقین اور سرکردہ رئیس کو ذلیل وخوار کردیا۔نتیجہ کے طور پر رسولِ اکرم سے وہ اپنے نفاق اور عداوت کو چھپا نہ سکے۔ اب انہوں نے ارادہ کیا کہ منافقت کی سرگرمیوں کو چھپانے کے لیے زیادہ سے زیادہ خلوص وایمان کا مظاہرہ کریں تاکہ کسی مناسب موقع پر پھر ضرب لگا سکیں۔

حدیبیہ میں شرکت

پیغمبرؐ اکرم نے قبیلہ بنی مصطلق کی سرکوبی کے بعد ہجرت کے چھٹے سال کا ماہ رمضان اور شوال مدینہ ہی میں گذارا۔ اس اثناء میں آپؐ نے ارادہ کیا کہ اسی سال کے ماہ ذیقعدہ میں اپنے اصحاب کی ایک جماعت کے ہمراہ عمرہ، کا فریضہ بجالائیں۔ جب آنحضرتؐ کے اس ارادہ کی خبر مسلمانوں کو ہوئی تو تقریباً ایک ہزار آٹھ سو افراد کی جماعت ان رسوم میں آپؐ کے ساتھ شرکت کے لیے تیار ہوگئی۔ آنحضرتؐ نے اپنی صلح جو فطرت کے پیش نظر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ آپ کا مقصد خانہ خدا کی زیارت اور رسومِ عمرہ کی بجا آوری کے سوا اور کچھ نہیں، سامان سفر کے علاوہ کوئی ہتھیار ساتھ نہ لیا۔

آپؐ نے ذوالحلیفہ کے مقام پر اپنے اصحاب کی معیت میں احرام باندھا اور ستر اونٹ قربانی کے لیے معین کرکے سب صاحبان آگے بڑھے۔ حرم کے قریب 'حدیبیۂ کے مقام پر قریش کی سخت رکاوٹ کا آپ کو سامنا کرنا پڑا۔ جس کے نتیجے میں ایک صلحنامہ لکھا گیا کہ آنحضرتؐ اسی جگہ سے مدینہ کی طرف پلٹ جائیں اور عمرہ کی بجا آوری کو اگلے سال تک ملتوی کردیں۔ آنحضرتؐ نے بعض علل ومصالح کی بناء پر، جو واقعہ حدیبیہ میں مذکور ہیں اس بات کو قبول فرمایا۔

انہی دنوں جب مسلمان سرزمین حدیبیہ میں آگے بڑھنے سے روک دیئے گئے تھے، اور انہیں حرم شریف میں داخل ہونے کی اجازت نہیں مل رہی تھی اچانک قریش کے نمائندوں نے منافقین کے رئیس عبداللہ ابن ابی کو جو آنحضرتؐ کے ہمرکاب تھا اجازت دے دی کہ وہ حرم شریف میں داخل ہوکر خانہ خدا کا طواف کرے اور جب چاہیے واپس چلا جائے۔

عبداللہ بن ابی کے بیٹے کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے باپ کو حرم میں داخل ہونے اور مسلمانوں کی صفوں سے الگ ہونے

سے منع کیا اور کہا: بابا تجھے خدا کی قسم ہے ہمیں رسوا نہ کر۔'' [۱]

وہ حرم میں داخل ہونے سے تو رک گیا۔ لیکن اپنے منافقانہ طرزِ عمل کو نہ چھپا سکا۔ ایک روز حدیبیہ میں خوب بارش ہوئی اور پانی ہر طرف بہنے لگا۔ تو آنحضرتؐ نے فرمایا: ''ہم خدا کے رحم و کرم سے بارانِ رحمت سے مستفید ہوئے ہیں۔ [۲]

لیکن عبداللہ بن ابی نے زمانہ جاہلیت کے عربوں کی طرح بارش کے نزول کی شعری ستارے کی طرف نسبت دی اور کہا۔ یہ بارش شعری ستارے کے اثر سے ہوئی ہے۔ [۳]

قرآن اس باطل عقیدہ پر جو زمانہ جاہلیت کے عربوں میں راسخ تھا، تنقید کرتے ہوئے خدا کا تعارف ستارہ شعری کے رب کے عنوان سے کراتا اور فرماتا ہے:۔

وَاَنَّهٗ هُوَرَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾ (نجم۔۴۹)

اس بناء پر ''شعری'' خود ''رب'' کا ''مربوب'' ہے۔

منافقین کی کوردلی

حدیبیہ کے مقام پر مسلمانوں کو پانی کی قلت کا سامنا ہوا، اور اس اکیلے کنوئیں کا پانی، جس سے اصحابِ رسول حصُولِ آب کرتے تھے نیچے چلا گیا۔

آنحضرتؐ نے اپنے ایک صحابی کو جس کا نام ناجیہ تھا بلایا۔ اُسے اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر دیا اور فرمایا:

''تم اس ڈول اور تیر سمیت کنوئیں کی تہ میں اتر جاؤ اور اس تیر کے ذریعہ پانی نکالو۔''

انہوں نے آنحضرتؐ کے حکم پر عمل کیا۔ کنوئیں کا پانی بلند ہونا شروع ہوا۔ حتیٰ کہ کنوئیں کے کنارے تک پہنچ گیا، اور سب لوگ کنوئیں کے پانی سے سیراب ہوئے قحط آب کے ان لمحات میں آنحضرت کی یہ کرامت مسلمانوں کے لیے تقویتِ ایمانی کا سبب بنی۔ دِل کے اندھے منافقین کے گروہ نے جن میں خود عبداللہ بن ابی شامل تھا اور کنوئیں کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا اس کرامت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا: اوس بن خولی'' نے عبداللہ کی طرف رُخ کر کے کہا: کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تو بیدار اور بینا ہو جائے۔ کیا کوئی کرامت اس سے بڑھ کر بھی ہوسکتی ہے؟'' [۴]

---

[۱] سیرۃ حلبی ج ۳ ص ۲۰۔

[۲] مُطِرنا۔ برحمۃ اللہ وفضلہٖ۔

[۳] مطرنا بالشعری سیرۃ حلبی ج ۳ ص ۲۹۔

[۴] سیرۃ حلبی ج ۲ ص ۱۳، ۱۴۔

بیعت سے فرار

''محاصرے'' کے دنوں میں جب آنحضرتؐ اور قریش کے نمائندے آمدورفت میں مصروف تھے کہ شاید اس مشکل کو مذاکرات کے ذریعے حل کرسکیں، اچانک اطلاع ملی کہ قریش نے آنحضرتؐ کے نمائندے کو قتل کردیا ہے آپؐ نے فرمایا:

''اگر یہ خبر درست ثابت ہوئی تو میں قریش سے جنگ کیے بغیر یہاں سے نہیں ہٹوں گا۔''

اس موقع پر وقفہء انتظار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آنحضرتؐ ایک درخت کے سائے میں جس کا نام سمرہ تھا بیٹھ گئے اور اپنے اصحاب سے اس بات پر بیعت لی کہ وہ زندگی کے آخری سانس تک دشمن کے مقابلہ میں ڈٹے رہیں گے۔ یہ بیعت تاریخ میں ''بیعتِ رضواں'' کے نام سے مشہور ہے۔

خداوند تعالیٰ سورۃ فتح کی آیت ۱۸ میں اس بیعت کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے۔

خدا مومنین سے، جب وہ درخت کے نیچے تجھ سے عہد کررہے تھے خوش ہوا اور ان کے دل میں جس قدر وفا و خلوص ہے، اس سے آگاہ ہوا۔ لہٰذا اللہ نے ان پر رُوحانی سکون و آرام نازل فرمایا۔ اور انہیں مستقبل قریب میں فتح کی خوشخبری دی۔''

اس دوران جب مسلمان بیعت کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں تھے، سلمہ بن اکوع کہتا ہے:۔ میں نے دیکھا کہ چند ایک منافقین مثلاً جد بن قیس نے اپنے آپ کو اونٹ کے پیچھے چھپالیا اور میدانِ بیعت سے دُور رہنے کی کوشش کی۔''[1]

خیبر میں منافقین کا کردار

پیغمبر اکرمؐ ۷ھ کے ماہِ محرم میں خیبر کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ نے ایک ہزار چھ سو مجاہدین کے ساتھ، جن میں دوسو سوار تھے، خیبر کے قلعوں کا محاصرہ کرنے کا ارادہ کیا، تاکہ فساد، جاسوسی اور اشتعال کے آخری مرکز کا قلع قمع کردیں۔

آنحضرتؐ کا دشمن سے جنگ کرنے کا طریقہ کار یہ ہوا کرتا تھا کہ آپ ہمیشہ اپنی روش کو مخفی رکھتے کہ کوئی شخص آپؐ کے ارادہ سے آگاہ نہ ہو پائے اس لیے آپ نے شمال کی راہ اختیار کی اور لوگوں نے خیال کیا کہ آپؐ قبیلہ غطفان کی سرکوبی کا ارادہ رکھتے ہیں جو جنگِ احزاب میں یہودانِ خیبر اور قریشِ مکہ کے ساتھ شریک تھے۔ جب آپؐ مقامِ رجیع پر پہنچے جو خیبر اور غطفان کے درمیان واقع ہے تو لشکر کا رُخ خیبر کی جانب موڑ دیا۔ تاکہ خیبر میں دشمن کو غفلت کی حالت میں جا پکڑیں اور ساتھ ہی خیبر اور غطفان دونوں کا ایک دوسرے سے رابطہ بھی منقطع ہوجائے۔

اس تمام راز وارانہ مراجعت کے باوجود منافقین کے رئیس (عبداللہ بن ابی) کو کسی نامعلوم طریقے سے آنحضرتؐ کے ارادہ کا علم

---

[1] تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۲۰۔

ہوگیا۔ اس نے خیبر والوں کو مجاہدین اسلام کی نہضت سے آگاہ کر دیا۔ بلکہ اس نے خیبر والوں کو مطلع کیا کہ ''محمد تمہاری طرف آرہا ہے۔ اسلحہ سنبھالو، اپنے مال و متاع کو قلعہ کے اندر محفوظ کرلو اور ان سے جنگ کرنے کے لیے قلعہ سے باہر نکل آؤ۔ کسی طرح کا خوف نہ کھاؤ کیونکہ ان کے ہمراہ بہت تھوڑی فوج ہے جبکہ تمہارے جنگجوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔''

اتفاق کی بات کہ خیبر والے خود اسی طرح اپنے قلعوں کا دفاع کیا کرتے تھے جس طرح رئیس منافقین نے انہیں ہدایت کی تھی۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہر روز قلعہ سے باہر نکل جنگی مشقیں کیا کرتے تھے۔ اتفاق سے لشکرِ اسلام کا ہراول دستہ مقررہ وقت سے کچھ دیر بعد پہنچا۔ اس اثنا میں خیبر والوں نے خیال کیا کہ آنحضرتؐ نے اُن سے جنگ کا اِرادہ ترک کر دیا ہے۔ لہٰذا جب آپؐ نے خیبر کا محاصرہ کیا اور باہر سے ہر طرح کے رابطے پوری طرح منقطع کر دیئے اس وقت وہ سب اطمینان سے خواب خرگوش میں مگن تھے صبح کے وقت جب انہوں نے قلعوں کے دروازے کھولے، تو لشکرِ اسلام کو اپنا محاصرہ کیے ہوئے پایا۔ لہٰذا انہوں نے فوراً قلعوں کے اندر پناہ لی اور ہر طرف سے محمدؐ آ گیا، محمدؐ آ گیا کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔[1]

مسلمانوں کی ان نمایاں فتوحات کو دیکھ کر منافقین ایک اور ہی راگ الاپنے لگے اور کہنے لگے کہ اگر چہ قبائل عرب محمدؐ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکے ہیں تاہم محمدؐ ایران و روم کے دو عظیم بادشاہوں سے جنگ کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس موقع پر متذکرہ ذیل آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۶ (آل عمران۔ ۲۶)

کہہ دیجئے: خدایا تمام ملک کا مالک تو ہی ہے۔ تو جسے چاہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جس چاہے ذلیل کرتا ہے۔ خیر اور بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور تو ہر چیز پر قادر و توانا ہے۔

منافقین کی سب سے بڑی سازش غزوۂ تبوک میں ظاہر ہوئی۔ جب انہوں نے آنحضرتؐ کے قتل کا منصوبہ بنایا اور مسجد قبا کے مقابلہ میں مسجد ضرار تعمیر کی۔ ان دونوں سازشوں کی تفصیل آئندہ بحث میں آئے گی۔

[1] تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۶۳۔

(۹)

غزوہ تبوک

زمانہ رسالت میں مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے منافقین کی آخری بھرپور کوشش

ہجرت کے نویں سال کے وسط میں ایک تجارتی قافلہ کے ذریعہ مدینہ میں یہ خبر پہنچی۔ کہ قیصرِ روم شام اور اس کے اطراف میں اپنے حلیفوں کے ہمراہ مدینہ کی تسخیر اور نوزائیدہ اسلامی سلطنت کا تختہ اُلٹنے کی تیاری کر رہا ہے۔

رسُولِ اکرمؐ نے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ، اسی سال ماہِ رجب میں شام کی طرف مراجعت کا ارادہ فرمایا۔ تاکہ دشمن کے اِسلامی علاقہ میں داخل ہو کر حملہ کرنے سے قبل ہی بے خبری کی حالت میں خود دشمن پر حملہ کر کے فتنہ کو راستے ہی میں کچل دیں اس مقصد کے لیے آپؐ نے اطراف کے قبائل سے جو سب مُسلمان ہو چکے تھے مدد مانگی اور مکہّ کے گورنر عتاب بن اُسید کو اطلاع بھیجی کہ وہ اس جنگ میں شرکت کے لیے فوج روانہ کرے۔ انجام کار رسولِ اکرمؐ تیس ہزار سپاہ کے ہمراہ مدینہ سے تبوک کے لیے روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں اس قسم کے لشکر کی قیادت ور ہبری اس قسم کی سرزمین میں بہت ہی تعجب خیز تھی۔ آنحضرتؐ اس معرکہ میں دشمن کے مقابل نہیں ہوئے کیونکہ دشمن لشکرِ اسلام کی روانگی سے آگاہ ہو جانے کے باعث اس شجاع اور فدا کار لشکر کا مقابلہ کرنے سے رُک گیا اور ایک خاص طریقہ سے منتشر ہو کر یہ ظاہر کیا کہ اس کا اس قسم کا کوئی منصوبہ نہ تھا۔ لیکن آنحضرتؐ کے اس گرم موسم میں لشکر کشی اور شام اس اطراف تک تیس ہزار کے لشکر کی رہبری و کمان اور سرحدوں پر رہنے والے قبائل کے سرداروں کے ساتھ عہد و پیمان باندھنے سے دشمن پر رعب بیٹھ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک آنحضرت حیات رہے دشمن کے دماغ میں کبھی حملہ کا خیال ہی نہ آیا اور پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد سب سے پہلا علاقہ جو فتح ہوا وہ سرزمین شام تھی۔

اس بحث کا مقصد اس جنگ کے اسباب و نتائج کی تشریح کرنا نہیں ہے ہمارا مقصد اس گفتگو میں ان نقصان دہ اور مضر تحریکات کو بیان کرنا ہے جو منافقین نے اس جنگ میں سب سے زیادہ دکھائیں۔ اس بارے میں کافی آیات نازل ہوئی ہیں اور سورۂ برات جو آنحضرتؐ پر نازل ہونے والا آخری سورہ ہے ایسی ہی آیات پر مشتمل ہے اور چونکہ یہ گروہِ منافقین اس سورہ کی وجہ سے رسوا اور ذلیل ہوا اس لیے اس کو سورہ فاضحہ، یا مخزیۂ بھی کہتے ہیں حقیقتاً اس سورہ نے منافقین کو رسوا کیا اور لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا۔ اب ہم اس حصہ میں ان کی سازشوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ا۔ ہمیں فتنہ میں نہ ڈالیے

رسول خداؐ نے اس جنگ میں مدینہ سے تبوک تک فاصلہ کی طوالت کے باعثِ کسی قسم کی رازداری سے کام نہ لیا۔ مجاہدین اسلام کے لیے، طویل سفر کی بناء پر خاص قسم کا زادِ راہ اور سامان رسد مہیا کرنا ضروری تھا۔ مسلمان خلیفوں سے موقع کی اہمیت کے مطابق کمک کی ضرورت

تھی۔ کیونکہ اتنے بڑے لشکرِ اسلام کے مصارف وسیع امداد سے ہی پورے ہوسکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ رسولِ اکرمؐ نے سفر اور مقصدِ سفر کا صاف صاف اظہار کر دیا۔

لہٰذا اس موقع پر منافقین تو رہے ایک طرف صاحبِ ایمان گروہ کے افراد میں بھی لیت ولعل اور گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ انہیں سرزنش کی اور فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِیْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ ؕ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ ۝۳۸

(توبہ:۳۸)

''اے ایمان والو! جب تم سے یہ کہا جاتا ہے کہ راہِ خدا میں کوچ کرو تو تساہل کیوں برتنے لگتے ہو کیا تم دنیا کی زندگی پر آخرت کی زندگی کے مقابلہ میں راضی ہو گئے ہو۔ دنیا کا مال واسباب تو (آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں) بہت ہی حقیر چیز ہے۔''

اس آیت نے اہل ایمان کے دلوں میں شوقِ جہاد کو از سرِ نو بیدار کر دیا۔ مالی امداد بھی بیت المال میں پہنچنے لگی۔ اور لوگ جوق در جوق مدینہ کی ''جرف'' نامی لشکر گاہ میں اکٹھے ہونے لگے۔ اسی اثناء میں پیغمبر اکرمؐ نے منافقین کے ایک سردار جد بن قیس سے فرمایا۔ کیا تو رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے میں ہمارے ساتھ شریک نہیں ہوگا؟'' اس نے جواب دیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے تو مدینہ میں ہی رہنے دیجئے اور امتحان میں ڈالیے۔ سب کو معلوم ہے کہ مجھے عورت سے خاص لگاؤ ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں رومیوں کی عورتوں کو دیکھ کر میں ڈگمگا نہ جاؤں۔''

اس موقع پر ذیل کی آیت نازل ہوئی:۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّیْ وَلَا تَفْتِنِّیْ ؕ اَلَا فِی الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ ۝۴۹ (توبہ:۴۹)

''ان میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں مدینہ ہی میں رہنے دیں اور امتحان میں نہ ڈالیں۔ ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ کے رسول کی مخالفت کی وجہ سے تم بہت ہی بڑے فتنہ اور آزمائش میں پھنس گئے ہو اور دوزخ کافروں کا احاطہ کرنے والی ہے۔''

جدّ بن قیس خود کو جنسی امور کی وجہ سے مجبور ظاہر کرتا ہے حالانکہ سن کے اعتبار سے وہ اس دور سے نکل چکا تھا۔ نہ ہی انسان کو اس دورِ

عمر میں مذکورہ بات کی طرف کوئی خاص رغبت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی زندگی میں ہم کسی جنسی واقعہ کا وجود بھی نہیں پاتے۔ لیکن اس نے منافقت کے پیشِ نظر حکم خدا سے سرتابی کر کے اپنی حیثیت کو داغدار بنانے کو ترجیح دی تا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد شدہ ذمہ داری سے بچ جائے۔ یہ منافقت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

جب اس نے آنحضرتؐ سے یہ بات کہی تو اس کے بیٹے نے، جو اس کی نیت سے واقف تھا۔ اسے مخاطب کر کے کہا: جہاد میں عدم شرکت کے لیے تیرا بہانہ منافقت کے سوا اور کچھ نہیں۔ خدا تیرے نفاق کو ضرور فاش کر دے گا۔''

وہ اپنے بیٹے کی اس بات سے آگ بگولا ہو گیا اور اس کے منہ پر جوتا دے مارا۔ جب مذکورہ آیت نازل ہوئی تو بیٹے نے باپ سے کہا: میں نہ کہتا تھا کہ خدا تجھے آیت کے ذریعہ ذلیل کرے گا'' لیکن وہ پھر بھی متنبہ نہ ہوا اور بیٹے سے چلا کر کہنے لگا۔ تو مجھ پر محمدؐ سے بھی زیادہ ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔''

۲: شدید ترین گرمی کے موسم میں جہاد

آنحضرتؐ مسلمانوں کو آیاتِ جہاد کے نزول سے جنگ میں شریک ہونے کی دعوت دے رہے تھے۔ ایک جماعت آپ کی پکار پر جان و مال خرچ کرنے کے لیے لبیک کہہ رہی تھی، لیکن منافقین بہانہ بازی کر رہے تھے تا کہ مدینہ میں ہی رہ جائیں۔ ان کی ایک جماعت سفر کی طوالت کے بہانے جہاد سے واقعی الگ ہو چکی تھی، حالانکہ یہی لوگ اگر سفر طویل نہ ہوتا اور حصولِ غنیمت کا مقصد بھی کچھ زیادہ دور نہ ہوتا۔ (غنائم جنگی ایسی چیز تھی جس سے عام طور پر لشکرِ اسلام بارآور ہوتا تھا) تو وہ ضرور شرکت کرتے قرآن اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۭ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

(توبہ: ۴۲)

''اگر مالِ غنیمت نزدیک اور سفر سہل و آسان ہوتا، تو وہ (اے رسول) تیرے ساتھ ضرور جاتے، لیکن اب چونکہ سفر طویل اور پر مشقت ہے لہٰذا وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ہم چل سکتے تو ضرور تمہارے ساتھ روانہ ہو جاتے (اس طرح) وہ خود اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں اور خدا تو جانتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔''

اس طرح بعض لوگ گرم موسم کا بہانہ کر کے اہل ایمان کو بھی جہاد میں شرکت سے روک رہے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾

(توبہ:۸۱)

وہ کہتے تھے: اس قدر گرم موسم میں سفر نہ کرو۔ کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ اس سے بہت زیادہ گرم اور جھلسا دینے والی ہے، اگر وہ سمجھیں۔''

۳: منافقین کی خفیہ کانفرنس

منافقین کے پیچھے رہ جانے سے دلاور اِن اسلام کے ارادہ پر کوئی خاص اثر نہ پڑا، کیونکہ مدینہ اور اس کے اطراف سے بہت سے لوگ جہاد میں شریک ہونے کے لیے مدینہ کی چھاؤنی میں اکٹھے ہو رہے تھے تاکہ لشکرِ اسلام بارعب کیفیت حاصل کرلے۔ یہ دیکھ کر منافقین کے کچھ سردار ایک یہودی ''سویلم'' کے گھر میں یہ سوچنے کے لیے اکٹھے ہوئے کہ مسلمانوں کو جہاد میں شریک ہونے سے روکنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ انجام کار انہون نے یہ تجویز کیا کہ لشکرِ اسلام میں رعب اور خوف وہراس پیدا کردیں، اور ان سے کہیں کہ رومیوں سے جنگ کرنا شیر کی دم سے کھیلنا ہے رومیوں سے لڑائی عربوں کی عربوں سے جنگ کی مانند نہیں ہے اور اس طرح انہیں جہاد سے منحرف کریں۔

مخبروں نے رسول خداؐ کو منافقین کے سرداروں کے ایک یہودی کے گھر میں اکٹھا ہونے کی اطلاع دی۔

منافقین کو سازش تیار کرنے کے لیے ایک یہودی کے گھر سے مناسب تر جگہ نہ ملنے پر ہمیں کوئی تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ یہ حقیقت اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ منافقین ہمیشہ یہودیوں کے ساتھ ارتباط اور میل جول رکھے ہوئے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے اس غرض سے کہ اس قسم کی سازش دہرائی نہ جائے۔ طلحہ کو بھیجا کہ مذکورہ گھر کو، جو فساد کی آماجگاہ اور اسلام کے خلاف سازشوں کا مرکز تھا نذرِ آتش کرکے انہیں وہاں سے پراگندہ کردے۔ وہ لوگ گرما گرم بحث میں مصروف تھے کہ اچانک اس مکان کو آگ نے گھیر لیا ان میں سے ایک شخص ضحاک بن خلیفہ نے گھر کی پشت کی طرف کود کر اپنے آپ کو نجات دی جبکہ اس کا پاؤں ٹوٹ گیا، اور باقی افراد بھی کسی نہ کسی طرح گھر سے باہر نکل کر ادھر ادھر بکھر گئے[۱]

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾

''اگر تم ان سے پوچھو گے کہ تم یہ سازش کیوں کر رہے تھے۔ تو وہ کہیں گے کہ ہم تو کھیل کود میں مصروف تھے کہہ دیجئے کہ کیا تم خدا، اس کی آیت اور اس کے پیغمبر کا مذاق اڑاتے ہو[۲]

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۱۷

[۲] اس آیت کے متعلق ایک اور شانِ نزول بھی نقل ہوئی ہے۔

۴: مُنافقین اور خانہ بدوش بدو

اگرچہ منافقین کی اس تحریک کا مدینہ میں تو کم ہی اثر ہوا لیکن صحرائی بدوؤں اور دیہات کے لوگوں کے لوگوں میں ان کی سازشیں اور شور وغل کافی موثر ثابت ہوا۔ مدینہ سے باہر کے قبائل مثلاً ''غفار'' ''اشجع'' اور ''اسلم'' پایہ ایمان کے لحاظ سے اس مقام پر نہیں تھے کہ آیات قرآنی یا رسولِ اکرمؐ کے ارشادات ان پر اثر کرتے اور وہ گرمی کے موسم میں سفر کی تلخی یا راستہ کی دشواری کو برداشت کر سکتے۔ لہٰذا بادیہ نشینوں کی ایک جماعت آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور جنگ میں شریک ہونے سے معذرت طلب کی، جیسا کہ قرآن مجید ان کی ترجمانی کرتا ہے۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾ (توبہ:۹۰)

''بادیہ نشینوں کا ایک گروہ جہاد میں شرکت کرنے سے معذرت طلب کرنے کے لیے آپ کے پاس آیا تا کہ انہیں اجازت دے دی جائے اور اللہ اور رسول پر جھوٹ باندھنے والے (گھروں میں بیٹھ گئے۔ اس کا فر گروہ کو جلد دردناک عذاب آلے گا۔''

۵: لشکرِ مُنافقین کی مدینہ واپسی

اس میں شک نہیں کہ یہ تمام شیطانی تحریکات منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی کی سرکردگی میں جنم لے رہی تھیں یہی شخص محورِ نفاق، منافقین کو ہدایت دینے والا اور منافقانہ منصوبوں کی تصویر کشی کرنے والا تھا۔ اس نے بارہا اپنے کارکنوں کی مدد سے ذیل کے مطالب کو اصحاب رسول کے درمیان نشر کیا تھا:۔

محمد چاہتا ہے کہ وسائل کی کمی، گرمی کے موسم اور سفر کی طوالت کے باوجود، زرد بالوں والی قوم (رومیوں) کے ساتھ جنگ کر لے یہ کام ایک جوئے سے زیادہ نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کے صحابی رسیوں میں جکڑے ہوئے مدینہ کی طرف پلٹائے جا رہے ہیں۔ [1]

''وہ مسلمانوں کے قلوب میں اس فکر کو منتشر کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کر رہا تھا کہ لوگوں کے ارادوں کو کمزور ان کے عزائم اور ہمتوں کو متزلزل کر دے۔ مگر وحی الٰہی اور لوگوں کے ایمان نے اپنا کام دکھلایا۔ اور مسلمان سفر کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اس مرتبہ بھی عبداللہ نے وہی طریقہ اختیار کیا جس پر اس نے جنگِ احد میں عمل کیا تھا اس نے ثنیۃ الوداع کے نچلے حصے کو اپنی چھاؤنی بنایا اپنے ہم خیال ساتھیوں، اپنے کردار سے متاثر ہونے والے لوگوں کو اپنے پرچم تلے جمع ہونے کی دعوت دی، اور ایک جماعت کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کو اس طرح اکٹھا کرنے سے اس کا مقصد جہاد میں شرکت کرنا نہیں تھا۔ بلکہ اس کی سازش یہ تھی کہ

---

[1] سیرت ابنِ ہشام ج ص ۵۲۰، ۵۳۱۔

جب لشکرِ اسلام روانہ ہوگا تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت مدینہ کی طرف واپس پلٹ جائیے گا اس طرح وہ اپنی سرداری اور حکومت کی خواہش کو پورا کرنے کے علاوہ آنحضرتؐ کے لشکر میں انتشار پیدا کر کے ایک جماعت کو مدینہ کی طرف پلٹانے میں کامیاب ہوجائے گا۔

چنانچہ لشکرِ اسلام کی روانگی پر وہ اپنی جماعت کو لے کر مدینہ کی طرف واپس روانہ ہوگیا۔لیکن اس طرح نہ صرف یہ کہ وہ مجاہدین کے ارادے میں کوئی خلل نہ ڈال سکا۔ بلکہ اس نے لاشعوری طور پر لشکرِ اسلام کی خدمت کی کیونکہ اب لشکرِ اسلام منافقین سے پاک ہوگیا اور مسلمانوں کے ذہن ان کے شر سے مامون ہوگئے قرآن ذیل میں ذکر شدہ آیت میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ؀ (توبہ:۴۷)

''اگر وہ مدینہ سے تمہارے ساتھ چل پڑتے تو سوائے اضطراب اور شک پیدا کرنے کے کچھ نہ کرتے وہ تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کی بحث میں لگے رہتے جبکہ تمہارے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کے اثر کو قبول کر لیتے ہیں اور خدا ظالموں سے باخبر ہے۔

تاہم منافقین کا یہ وسیع پروپیگنڈا چار اہل ایمان کو روکنے میں کامیاب ہوگیا۔لیکن ان میں سے ایک جس کا نام ابوخیثمہ تھا، تھوڑی دیر کے بعد آنحضرتؐ سے جاملا۔ باقی صرف تین آدمی ایمان کی کمزوری اور محصولات کو جمع کرنے کے بہانے مدینہ میں ہی رہ گئے۔ رسولِ اکرمؐ تبوک سے واپسی پر ان تینوں سے کسی قدر ناراضی سے پیش آئے اور اس طرح آپؐ نے اِسلام کے دفاع اور اس کی مخالفت کی سوچ کو ختم کر دیا چنانچہ آیت وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ ۔(توبہ:۱۱۸) ان کی حالت کو بیان کر رہی ہے۔[1]

۶: مدینہ میں پروپگینڈا

رسول اکرمؐ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوئے۔ مدینہ میں محمد بن مُسلمہ کو عامل قرار دیا اور حضرت علیؑ کو اپنے خاندان کا سرپرست مقرر فرمایا اب منافقین کا مقصد یہ بن گیا کہ لشکرِ اسلام کے چلے جانے کے بعد ان پسماندگان کو جو عذرِ شرعی کی وجہ سے مدینہ میں رہ گئے تھے جھوٹی باتیں مشہور کر کے تکلیف اور نقصان پہنچائیں۔ آنحضرتؐ نے اس قسم کی سازشوں اور شرارتوں کے پیشِ نظر حضرت علیؑ کو شام کی طرف روانہ ہونے سے پہلے اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا۔ منافقین نے محسوس کیا کہ علی ابن ابی طالبؑ کی مدینہ میں موجودگی اس سازش پر عملدرآمد میں مانع ہوگئی۔اور علی جیسے شجاع کی موجودگی میں کوئی سازش کارگر نہ ہوگی لہٰذا انہوں نے فوراً پروپیگنڈا شروع کر دیا تاکہ کسی طرح علیؑ سے نجات پالیں اور وہ آنحضرتؐ سے جاملیں اور مدینہ کی فضا ان منافقین کے لیے ہر قسم کی مزاحمت سے خالی ہو جائے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۲۰ وغیرہ۔

لہٰذا مدینہ میں یہ خبر مشہور کی گئی کہ علیؑ کے تعلقات پیغمبر اکرمؐ سے خراب ہو گئے ہیں۔ اسی لیے علیؑ کو اپنے ساتھ جہاد پر نہیں لے گئے۔
اس خبر کی مدینہ میں شہرت اس بات کا باعث بنی کہ علیؑ اپنے ہتھیار لے کر رسُول اکرم سے جو مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر تھے جا ملے اور آپ کو تمام واقعہ کی اطلاع دی آنحضرتؐ نے اس پروپیگنڈے کو جھٹلاتے ہوئے ایک جملہ ادا فرمایا جس کا مضمون یہ ہے: میں نے تمہیں اپنا جانشین بنایا ہے کیونکہ میں اپنے پیچھے ایسے لوگوں کو چھوڑ رہا ہوں جن کے شر سے میں اپنے اہل بیت کے بارے میں مطمئن نہیں ہوں۔ لہٰذا تم واپس چلے جاؤ اور میرے گھر والوں اور اپنے اہل بیت پر میرے جانشین بنو۔ کیا تم راضی نہیں ہو کر تمہاری منزلت میرے ساتھ وہی ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ [1]

پس حضرت علیؑ مدینہ کی طرف پلٹ گئے اور مدینہ ہی میں رہے یہاں تک کہ حضورؐ اپنے سفر سے واپس لوٹے۔

۷: آدھے راستہ میں حقائق کی تحریف

آنحضرتؐ کی لشکر گاہ سے عبداللہ بن ابی کے مدینہ کی طرف لوٹ جانے سے اگرچہ لشکرِ اسلام نفاق کے عناصر سے پاک صاف ہو گیا لیکن پھر بھی اس زمانہ میں اسلامی معاشرے کے تار و پود میں نفاق نے نفوذ کیا ہوا تھا اور منافقین سے نجات اتنی جلدی ممکن نہ تھی اسی وجہ سے لشکرِ اسلام میں موجود ارکان نے غیر مرئی صورت میں حقائق میں تحریف کر کے کئی واقعات پیدا کیے۔

وسطِ راہ میں لشکرِ اسلام کے پانی کے ذخیرہ ختم ہو گئے۔ لشکر والوں پر پیاس کا غلبہ ہوا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات پیاس کو دور کرنے کے لیے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے پیٹ میں جمع شدہ پانی سے کام چلایا گیا۔ مجاہدین اسلام نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ نزولِ باراں کے لیے خداوند تعالیٰ سے دعا فرمائیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے پانی منگوا کر وضو کیا اور نمازِ حاجت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ کچھ ہی دیر گذری تھی کہ ہوا چلی بادل گھر کر آئے اور موسلا دھار بارش ہونے لگی کہ تمام بیابان آبِ باراں سے جل تھل ہو گیا۔

منافقین نے کہ کرامت اور معجزہ دیکھنے کے باوجود اپنے دل سے نفاق کو دُور نہ کیا بلکہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق بارش کے نزول کو ستاروں کی گردش سے منسوب کیا۔

۸: تکذیب نبوت

راستے میں پیغمبر اکرمؐ کا اونٹ گم ہو گیا، آنحضرتؐ کے اصحاب اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اسی اثناء میں ایک منافق یا کچھ منافقین آپ کی نبوت کی تکذیب کے لیے اونٹ کے گُم ہونے کو بہانہ بنا کر کہنے لگے: ''یہ خود پیغمبر سمجھتا ہے، اور خدا کے حکم سے تمہیں پوشیدہ مطالب سے آگاہ کرتا ہے جبکہ اپنے اونٹ کے متعلق نہیں جانتا کہ کہاں ہے۔''

جب آنحضرتؐ کو یہ خبر پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: ''خدا کی قسم! میں سوائے اس چیز کے جس کی خُدا نے مجھے خبر دی ہے اور کچھ نہیں جانتا۔

---

[1] صحیح بخاری جزء سوم ص ۵۸:

میرے خدا نے مجھے بتایا ہے کہ میرا اونٹ فلاں درّہ میں ہے۔اس کی مہار ایک درخت میں الجھی ہوئی ہے جو اس کے چلنے میں رکاوٹ ہے، جاؤ اور اس کو لے آؤ۔''

۹: دورانِ راہ پیغمبرؐ کو قتل کرنے کی سازش:

اس جنگ میں شریک ہونے والے منافقوں کی تعداد پندرہ افراد سے زیادہ نہ تھی۔لیکن یہ لوگ بھی اپنا زہر پھیلانے، حقائق میں تحریف کرنے اور لوگوں کے جذباتِ ایمانی کو کمزور بنانے میں مصروف رہتے تھے۔ جب تبوک کی طرف جاتے ہوئے اُنہوں نے اپنی سازشوں کو ناکام ہوتے پایا، تو واپسی پر پیغمبرؐ کو قتل کرنے کی سازش تیار کی۔ موقع یہ تھا کہ جب آنحضرتؐ آدھی رات کے وقت وادی مشفق کو گھاٹی کے راستے عبور کرنے لگیں تو منافقین آپ کے اونٹ کو ڈرا کر بھڑکا دیں تاکہ آپؐ گھاٹی کے اوپر سے درّہ میں گر پڑیں۔

رسُولِ خدا رات کی تاریکی میں اس گھاٹی کے دامن میں پہنچے تو ایک شخص نے بلند آواز سے کہا آپؐ اس وادی کو گھاٹی کے راوستہ سے عبور کریں گے۔لہٰذا لشکر والے اپنا راستہ وادی کے اندر سے اختیار کریں اور کوئی شخص اس گھاٹی کے اوپر نہ آئے۔لہٰذا تمام مسلمان صحرا کے راستہ سے روانہ ہو گئے اور آنحضرتؐ نے گھاٹی والا راستہ اختیار کیا۔

آنحضرتؐ نے عمار کو حکم دیا کہ اونٹ کی مہار پکڑ کر آگے چلیں اور حذیفہ کو حکم دیا کہ وہ اُسے پیچھے سے ہانکیں۔آنحضرتؐ کے گھاٹی کے راستے سے سفر نے منافقین کو اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے پر آمادہ کیا۔لہٰذا انہوں نے اپنے چہروں کو لپیٹ کر گھاٹی کی راہ لی۔حضورؐ نے ان کی کھسر پھُسر سن لی اور فوراً حذیفہ سے فرمایا:''انہیں آگے بڑھنے سے روک دو۔'' یہی نہیں بلکہ اپنی چھڑی کو ان کے اونٹوں کے مُنہ پر مار کر کہا: اے دشمنانِ رسول! واپس پلٹ جاؤ۔''

منافقین سمجھ گئے کہ ان کا بھید کھل گیا ہے اور آنحضرتؐ ان کی نیت سے آگاہ ہو گئے ہیں۔فوراً گھاٹی سے نیچے اتر آئے اور اپنے آپ کو لشکر والوں میں چھپا لیا۔

آنحضرتؐ نے حذیفہ سے فرمایا:

''کیا تم نے انہیں پہنچانا ہے۔اور ان کے مقصد سے آگاہ ہو گئے ہو۔''

حذیفہ نے عرض کیا:''رات کی تاریکی اور نقاب پوشی کی وجہ سے میں انہیں نہیں پہچان سکا۔'' آنحضرتؐ نے ان کے نام بتائے ان کی بُری نیت کو بے نقاب کیا اور فرمایا:

''انہوں نے سازش کی تھی کہ میرے اونٹ کو بھڑکا کر مجھے درۃ میں گرا دیں۔لیکن میرے اللہ نے مجھے ان کے منصوبہ سے آگاہ کر دیا۔میں تمہیں ان کا تعارف کراتا ہوں لیکن تم ان کے نام (چھپائے رکھنا''۔ (اور کسی کو نہ بتانا۔''))

صبح کے وقت اُسید بن حضیر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: صحرا کا راستہ عقبہ (گھاٹی) کو عبور کرنے کی نسبت آسان تھا۔آپؐ نے اس راستہ کو کیوں اختیار فرمایا؟ آنحضرتؐ نے گذشتہ رات کا واقعہ اس سے بیان فرمایا۔تو اس نے آنحضرتؐ سے ان کے

نام جاننے کی درخواست کی تا کہ وہ لوگ اپنے قبیلہ کے ہاتھوں قتل کر دیئے جائیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔

''اس کام میں مصلحت نہیں ہے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ لوگ یہ کہیں کہ جس وقت محمدؐ نے طاقت پیدا کر لی تو اپنے اصحاب کو قتل کرنا شروع کر دیا۔''

اُسید نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! وہ آپ کے دوست نہیں ہیں۔''

آنحضرت نے فرمایا:''

''انہوں نے ظاہر میں تو شہادتین کا اعتراف کیا ہے۔''[1]

یہ مسئلہ یہیں پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد آنحضرت نے انہیں ایک خصوصی نشست میں بُلا کر ان کے منصوبے کے بارے میں اپنی اطلاع سے آگاہ کیا۔ وہ سب کے سب قسمیں کھانے لگے کہ اس قسم کا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اس قسم کا کوئی ارادہ رکھتے تھے۔

اس موقع پر ذیل کی آیات ان کے بارے میں نازل ہوئیں۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ (توبہ:۷۴)

وہ خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے کوئی بُری بات نہیں کی، حالانکہ انہوں نے کفر آمیز باتیں کیں اور اِسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے اور وہ اس بُرے کام میں جس کا انہوں نے ارادہ کیا کامیاب نہ ہوئے۔

منافقین کی طرف سے معذرت:

منافقین میں سے پندرہ افراد کے علاوہ باقی سب کے سب مدینہ میں ہی رہ گئے تھے، وہ لشکرِ اسلام کے متعلق جھوٹی خبریں پھیلانے لگے، کہ محمدؐ اس جنگ میں اپنے اصحاب سمیت قتل ہو گئے ہیں اور اصحاب میں سے کچھ لوگ دشمن کی قید میں ہیں۔

منافقین یہ افواہیں پھیلانے میں مصروف تھے کہ لشکر اسلام کا ہراول دستہ (طلایہ) شہر مدینہ میں وارد ہوا، اور عملاً ان جھوٹی خبروں کی تردید کی۔

اس بارے میں مندرجہ ذیل آیات نازل ہوئیں۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى

---

[1] مجمع البیان جلد ۳ ص ۴۶ آیہ ولئن سالتھم کی تفسیر کے ذیل میں۔ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۱۶۱ اسد الغابہ ج ۱ ص ۳۹۱۔ الاستیعاب ج ۱ ص ۲۷۷

عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝٩٤ (توبہ:۹۴)

''جب آپ جہاد سے تخلف کرنے والوں کے پاس لوٹ کر جاتے ہو تو وہ آپ سے عذر خواہی کرتے ہیں کہہ دیجئے عذر خواہی نہ کرو۔ ہم ہرگز تمہاری بات نہیں مانیں گے خدا نے ہمیں تمہارے کاموں سے آگاہ کر دیا ہے، اور عنقریب خدا اور اس کا رسول تمہارے کاموں کو دیکھ لیں گے، اس کے بعد تم اس کی بارگاہ میں لوٹائے جاؤ گے جو پنہاں و آشکار سب باتوں سے آگاہ ہے، پھر وہ تمہیں جو کچھ تم کیا کرتے تھے آگاہ کر دے گا۔''

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۫ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝٩٥

(توبہ:۹۵)

''جب آپ ان کی طرف لوٹ کر جاتے ہیں تو وہ آپؐ کے سامنے قسمیں کھاتے ہیں، کہ آپ ان سے صرف نظر کر لیں، پس ان سے اعراض ہی کریں۔ یہ ناپاک لوگ ہیں ان کا ٹھکانہ جہنم ہے جو ان اعمال کی سزا ہے جنہیں وہ انجام دیتے ہیں۔''

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ۝٩٦ (توبہ:۹۶)

''وہ آپ کے سامنے قسمیں کھاتے ہیں کہ آپ ان سے راضی ہو جائیں لیکن خدا تو فاسقوں کی جماعت سے کبھی راضی نہیں ہوگا۔''

لشکرِ اسلام کے مدینہ میں ورود، غزوہ کی خبروں کے پھیلنے اور اس میں نمایاں کامیابیوں کے بعد منافقین کا زور ٹوٹ گیا۔ ان کی حیثیت کو اِس قدر نقصان پہنچا کہ ان کی کوئی عزت و آبرو باقی نہ رہی۔ وہ منظرِ عام پر آنے کے قابل نہ رہے۔ نہ ہی کوئی اور سازش یا شورش پیدا کر سکے۔ خصوصاً رئیس منافقین عبداللہ بن ابی دو ماہ کے بعد مر گیا، اور منافقین کی جماعت بظاہر بکھر کر رہ گئی، اور ان کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہا۔ تاہم ان کی ایک جماعت آنحضرتؐ کی وفات کے وقت تک اپنے کفر پر باقی رہی، اور کچھ لوگ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد بھی اپنے کام میں مصروف رہے۔

(۱۰) مسجد ضرار یا سازشوں کا مرکز

جس سال آنحضرتؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو مدینہ میں وردو سے قبل آپ نے سرزمین قباء میں قیام فرمایا اور وہاں حضرت علیؑ کا اِنتظار فرماتے رہے۔ قبا میں قیام کے دوران، جو یثرب سے بارہ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ آپؐ نے قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے لیے جو بنی غنم بن عوف کے چچازاد تھے، ایک مسجد تعمیر فرمائی۔ یہ مسجد 'عوف' کی اولاد کے لیے عبادت کا مرکز تھی اور وہ لوگ مدینہ سے دُوری کی وجہ سے وہیں عبادت اور فرائضِ دینی بجالاتے تھے۔

منافقین نے اس جگہ کو سکون و آرام اور مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے خفیہ کاروائیوں کے لیے امن کا مقام سمجھا۔ چنانچہ دیگر منافقین کو ان کے ایک سرغنہ کی طرف سے جس کا نام ''ابوعامر'' تھا اور جو باہر سے منافقین کی رہبری کیا کرتا تھا، ایک خط ملا۔ اس نے اس خط میں اپنے حلیفوں کو سازشوں کی تیاری کے لیے ایک جگہ مسجد بنانے کی دعوت دی۔ تاکہ منافقین وہاں جمع ہوکر اپنے افکار وخیالات کا تبادلہ کیا کریں۔ اطلاعات حاصل کریں اور پھر مسلمانوں کی جاسوسی کیا کریں نیز ہتھیار جمع کر کے اس دن کے انتظار میں تیار رہیں۔ جب وہ روم کے فرمانروا کے ساتھ مدینہ کو فتح کر کے اسلام کی نوزائیدہ حکومت کا تختہ الٹ سکیں۔

منافقین جو 'قبا' کے دُورافتادہ محلہ میں رہتے تھے چاہتے تھے کہ اس کام کو آنحضرتؐ کی طرف سے قرار دیں۔ لہٰذا انہوں نے حضورؐ کی اجازت کے بغیر ہی ایک مسقّف چار دیواری بنائی اور اس غرض سے کہ اس عمارت کو رسمی اور قانونی شکل حاصل ہوجائے اور کسی کے لیے قابلِ اعتراض نہ رہے۔ آنحضرتؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر عرض کیا: بارشوں کے زمانہ میں بیمار اور ضعیف لوگوں کو مسجد قبا میں نماز کے لیے جانے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ لہٰذا ہم نے ان لوگوں کے لیے ایک مسجد بنائی ہے اور چاہتے ہیں کہ اس کا افتتاح آپ خود اس میں نماز پڑھ کر کریں۔''

آنحضرتؐ نے ان کی درخواست کو رد نہ کیا اور فرمایا۔ ابھی تو میں سفر میں ہوں۔ سفر کے اختتام پر اگر خدا نے چاہا تو یہ کام انجام دوں گا۔ تاریخِ اسلام بارہ افراد کے نام لیتی ہے جو اس مرکزِ جاسوسی کے جو بظاہر مسجد تھی۔ بانی تھے۔ ان میں نبتل بن حارث جیسے لوگ بھی تھے جن کا کام ہی کافروں کے لیے خبریں اکٹھا کرنے کے ساتھ ساتھ جاسوسی کرنا تھا۔ یا ودیعہ بن ثابت جیسے لوگ تھے جو منافقین کے سرغنوں میں شمار شمار ہوتا تھا اور مسلمان اس کی منافقت سے پوری طرح آشنا تھے۔

انہوں نے شکوک کو دور کرنے کی خاطر ایک جوان صالح کو جس کا نام مجمع بن حارث تھا، امامت کے لیے دعوت دی اور اس طرح اپنی بدنیتی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد مسجدِ قبا کو لوگوں کی نظروں میں حقیر اور بے قدر بنانے کے لیے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ قبا کی زمین کا تعلق ایک ایسی عورت سے ہے جو اپنا گدھا وہاں باندھا کرتی تھی۔ لہٰذا اس طرح کی جگہ نماز قائم کرنے اور خدا کی عبادت کے لیے درست نہیں ہے۔

شام کی طرف سفر میں رسُول اکرمؐ کو چار مہینے کا عرصہ لگ گیا۔ اس اثناء میں بانیانِ مسجد نے اس کی تعمیر وتکمیل کی پوری پوری کوشش کی۔

نیز اس جوان صالح کی امامت سے ایک جماعت کو اس مسجد کی طرف متوجہ کرلیا۔ لہٰذا جو لوگ پہلے مسجد قباء میں جایا کرتے، اب اس مرکز میں آنے لگے اور اس طرح ان کے درمیان تفرقہ اور پھوٹ پڑ گئی۔

رسُولِ اکرم تبوک کے سفر سے واپس آئے تو منافقین کے سربراہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ حضورؐ اس مسجد میں تبرک کے طور پر نماز پڑھائیں۔ آنحضرتؐ نے لباس زیبِ تن فرمایا اور جانے کے لیے تیار ہوئے ہی تھے کہ وحی الٰہی نازل ہوئی اور ان کے قبیح فعل کو بے نقاب کرتے ہوئے بتایا کہ یہ عمارت ایسے مقاصد کے لیے بنائی گئی ہے جن میں سے زیادہ اہم درج ذیل دو اہداف ہیں۔

۱: صاحب ایمان لوگوں کے درمیان تفرقہ ڈالنا۔

۲: دشمنِ خدا اُبو عامر کے لیے جاسوسی۔

لہٰذا آنحضرتؐ نے کچھ لوگوں کو حکم دے کر بھیجا کہ اس کی چھت کو جو کھجوروں کی شاخوں اور پتوں سے بنائی گئی تھی آگ لگا دیں اور اس کی دیواروں کو بیلچوں اور کدالوں سے مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیں۔

آنحضرتؐ نے صرف اسی پر اکتفانہ کی بلکہ حکم دیا کہ اس علاقہ کے لوگ اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ بھی وہیں ڈالا کریں اور یوں اس مقام کو ذلیل کر دیں۔

قرآن مجید میں اس حادثہ کے ذکر نے اسے ابدیت عطا کر دی ہے اور مُسلمانوں کو اس سے کئی درس دیئے گئے ہیں اب ہم اس روشداد کے سلسلہ میں وارد ہونے والی آیات کو بیان کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں قرآنی آیات اس طرح ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًاۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴿۱۰۷﴾

(توبہ:۱۰۷)

''جن لوگوں نے یہ مسجد بنائی ہے ان کا مقصد مسلمانوں کو ضرر پہنچانا کفر کو تقویت دینا۔ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنا اور ایسے شخص کے لیے، جس نے پہلے سے ہی خدا اور اس کے رُسولؐ سے جنگ شروع کر رکھی ہے کمین گاہ بنانا ہے۔ وہ قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ان کا مقصد نیکی کے علاوہ اور کچھ نہیں اور خدا گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔''

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ

تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۝۱۰۸

(توبہ:۱۰۸)

''آپ ہرگز وہاں نماز نہ پڑھیں، وہ مسجد جس کی پہلے دن سے تقویٰ اور پرہیز گاری پر بنا رکھی گئی ہے زیادہ حق رکھتی ہے کہ آپ وہاں نماز پڑھیں۔ وہاں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا چاہتے ہیں اور خدا پاک لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۝۱۰۹ (توبہ:۱۰۹)

''کیا وہ شخص جو اپنی عمارت اللہ سے تقویٰ اور اس کی رضا کی خاطر بنائے، بہتر ہے، یا وہ شخص جو اپنی عمارت کمزور بنیاد گرنے کی جگہ تعمیر کرے، جو اچانک (خود اپنی بنیاد سمیت) جہنم کی آگ میں گر جائے اور خدا ظالموں کو کبھی ہدایت نہیں کرتا۔''

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝۱۱۰ (توبہ:۱۱۰)

''یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ان کے دلوں میں شک وشبہ کے وسیلہ کی صورت میں رہے گی مگر یہ کہ ان کے دل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ (وہ مر جائیں اور ختم ہو جائیں) اور خدا حکیم و دانا ہے۔''

ایسا ملک جس میں دین ومذہب کی عملداری ہو اور دین اس میں خاص اہمیت رکھتا ہو۔ زہر عامل سے زیادہ خود مذہب ہی کے روپ میں اس کے خلاف فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے پس مسلمانوں کی وحدت کو توڑنے، اور ان کے درمیان تفرقہ ڈالنے کے لیے بہترین ذریعہ مسجد کے نام سے ایک مذہبی عمل ہی ہو سکتا ہے اور دشمن اس طریقہ سے ہی اپنی فاسد نیتوں کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔

آتشِ نِفاق کا خاتمہ

ہجرت کے نویں سال ماہ ذی القعدہ الحرام میں منافقین کا رئیس وسردار عبداللہ بن ابی مر گیا۔ چونکہ آنحضرتؐ جماعتِ منافقین کے ساتھ بھی ایک مسلمان کی طرح معاملہ کرتے تھے اور ان کے اندرونی کُفر کا کوئی اثر نہیں لیتے تھے۔ اس لیے عبداللہ کی بیماری کے دوران آپؐ نے

اس کی عیادت فرمائی۔ عبداللہ بن ابی جس نے جنگِ بدر میں اپنا کرتہ آنحضرتؐ کے چچا عباس کو دیا تھا۔ آپؐ سے درخواست کی کہ اپنا ایک پیراہن اس کو دے دیں اس کو اس پیراہین کا کفن نہ کیا اور درخواست کی کہ اپنا نچلا کرتہ جو آپؐ کے بدن کو مس کرتا ہے، عطا فرمادیں۔ آنحضرتؐ نے اپنا وہ کرُتہ بھی بھیج دیا، لیکن یہ بھی جتلا دیا کہ اس سے اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

عبداللہ کا گھر منافقین کی سازشوں کا مرکز تھا اور وہ ہمیشہ وہاں آمدورفت رکھتے تھے۔ لہٰذا عبداللہ کی پیراہن کی اس درخواست نے منافقین کے بعض افراد میں ایک خاص قسم کی پریشانی پیدا کردی۔ لہٰذا ان میں سے بعض نے توبہ کرلی اور اسلام لے آئے اور باقی لوگ اسی حالتِ نفاق پر قائم رہے۔

عبداللہ کو پیراہن نبوی دینے میں حکمت

عبداللہ کو اس حق کی تلافی کے لیے پیراہن بخشا گیا جو اس نے آنحضرتؐ پر قائم کیا تھا۔

جنگ بدر میں آنحضرتؐ کے چچا عباس قید ہوگئے تھے۔ عباس بلند قامت آدمی تھے اور انہیں لباس کی ضرورت تھی۔ عبداللہ بن ابی کے پیراہن کے علاوہ، جو انہیں کی طرح بلندِ قامت تھا ان کے قد کے مطابق، اور کوئی پیراہن دستیاب نہ ہوسکا، لہٰذا عبداللہ نے اپنا ایک پیراہن آنحضرتؐ کی خدمت میں بھیج دیا کہ وہ عباس کو دے دیں۔ اس طرح سے اُس نے آنحضرتؐ پر ایک طرح کا حق پیدا کرلیا تھا۔ اسی بناء پر آپ نے چاہا کہ اس کی درخواست کا مثبت جواب دیں۔

نتیجہ کے طور پر پیراہن بھیجنے سے ایک جماعت کے دل اسلام کی طرف مائل ہوگئے اور اس طریقہ سے خزرجی منافقین کا ایک گروہ، عبداللہ جن کا رئیس تھا۔ سچے دل سے مسلمان ہوگیا۔

پھر عبداللہ کا ایک نیک صالح بیٹا بھی تھا جو حقیقتاً یخرج الحیی من المیت کا مصداق تھا اس کے باپ کی درخواست کو رد کرنا ایک طرح سے اس قسم کے نیک اور صالح شخص کی دل شکستگی کا باعث ہوتا جس نے کئی موقعوں پر اپنے خلوص کا عملی ثبوت دیا تھا۔

آنحضرتؐ نے عبداللہ کی نمازِ جنازہ پڑھی؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ منافق کے جنازہ پر نماز پڑھنا ذیل کی صریح آیت کی بناء پر حرام قرار دی گئی ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم [1] (توبہ:۸۴)

یہاں دو نظریئے ہیں، کچھ لوگ اس آیت کا نزول رئیس منافقین کی وفات کے بعد سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ اس سے پہلے چونکہ اس کے

---

[1] کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس آیت کے نزول کے بعد بھی منافقین کے جنازوں پر نماز پڑھی لیکن چار تکبیر کے ساتھ اور پانچویں تکبیر جس میں میت کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ ان کے لیے آپ نہیں پڑھتے تھے یہ لوگ لفظ ''ولا تصل'' کی دعا نہ کرکے معنی میں تفسیر کرتے ہیں، نماز نہ پڑھ کے معنی میں تفسیر کرتے ہیں نماز نہ پڑھ کے معنی میں نہیں مسلمہ طور سے اس قسم کا تصور ظاہر آیت کے خلاف ہے۔

نزول کی تاریخ ہمارے سامنے واضح نہیں ہے۔ لہٰذا ہم اس کے لیے کوئی قطعی نظریہ پیش نہیں کر سکتے۔

ظہور نِفاق کی ایک اور شکل

'عبداللہ' کی موت سے جماعتِ منافقین کی کمر ٹوٹ گئی کچھ لوگوں نے تو کسی حد تک ندامت کا اظہار کیا۔ لیکن ایک جماعت اسی حالتِ نفاق پر باقی رہی۔ مگر اب ان کی وہ سرگرمیاں نہ رہیں۔ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد تو ان کی کوئی آواز بھی سننے میں نہ آئی اور وہ سب کے سب اس مُعاشرے اور حکومت میں جذب ہو گئے۔ یہ بذاتِ خود تاریخ کا ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ کیونکہ اسلامی معاشرے کے اندر منافقین کی کثرت کے بارے میں بہت سی آیات نازل ہوئی ہیں جو ان کی طرف سے خطرے کی شدت کی نشان وہی کرتی ہیں۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ان کی کوئی معمولی سی سرگرمی بھی دکھائی نہیں دیتی۔ آیا کہ واقعتاً وہ سب کے سب نابود اور ختم ہو گئے یا ان کی فکری و نظریاتی سمت بدل گئی یا انہوں نے حکومت کو اپنے تصور اور خواہش کے مطابق پایا۔ اس بارے میں فیصلہ کرنا دُوسرے وقت پر چھوڑا جاتا ہے۔

البتہ یہ بات قطعی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ منافقت نے اِسلامی معاشرے میں ایک نئی صورت میں ظہور کیا۔ اسلامی فتوحات کے بعد علمائے یہود، عیسائی راہبوں اور دوسرے مذاہب کے دانشمندوں نے اسلام کا لباس پہن کر مسلمانوں کی صورت میں بہت سے مکاتبِ فکر کی بنیاد رکھی۔ یہود و نصارٰی کے عقائد و نظریات اور مجوس و مزدک کی خرافات مسلمانوں میں پھیل گئے اور اس طرح فرقہ بازی، گروہ بندی اور مختلف مکاتب کی پیدائش کی خاطر خواہ مدد ملی۔ نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کے لیے بہت سے مصائب و آلام نے جنم لیا۔

اس سلسلے میں کعب اخبارؒ اور وہب بن منبہؒ کا خلفاء کے زمانہ میں، اور مانویوں کا عباسیوں کے دور میں نام لیا جاسکتا ہے۔ یہ بہت طویل بحث ہے۔ لیکن ہم اپنے دامنِ سخن کو سمیٹتے ہیں اور منافقین سے مربُوط آیات کی تفسیر میں اسی مقدار پر اکتفا کرتے ہیں۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم منافقین کی صفات و خصوصیات سے آیاتِ قرآن کی روشنی میں واقفیت حاصل کریں۔

(۱۱)

صِفاتِ منافقین بزبانِ قرآن

۱: حیرانی واضطراب

۲: تذبذب اور فرصت طلبی

۳: خوف کے تحت زندگی

منافقین کے گروہ کی مدینہ میں تشکیل، اور رئیس المنافقین کے مرنے تک، ان کی سازشوں اور خفیہ سرگرمیوں کی تاریخ سے ہم بخوبی واقف ہو چکے۔ ہیں کہ عبداللہ بن ابی کے مرنے سے گروہِ منافقین کی قوت وطاقت ختم ہوگئی اور ان کی قسمت کا ستارہ غروب ہو گیا۔ پھر آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد باقی ماندہ ارکان نے مکمل طور پر اپنا رنگ بدل لیا اور ان میں سے ایک جماعت مقام ومنصب کی مالک بن گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ منافقت کا وہ انداز جو آنحضرتؐ کے زمانہ میں تھا۔ ختم ہو گیا۔ لیکن منافقت مسلمانوں کی صفوں میں ایک اور صورت میں ظاہر ہوئی جو بہت سے فرقوں کی پیدائش کا سبب بنی۔

اب ضروری بات یہ ہے کہ قران میں وارد شدہ منافقین کی صفات وخصوصیات کی اس طرح تشریح کی جائے، کہ منافقت کے صحیح خدوخال سے جو قرآن نے بیان کیے ہیں۔ ہمارے معاصرین واقف ہو جائیں۔

قرآن نے منافقین کی خصوصیات کی تشریح کے سلسلہ میں دو مثالیں پیش کی ہیں جو منافقین کے روحانی اور نفسیات حالات کو بیان کرتی ہیں۔ ہم ان دونوں مثالوں کا ذکر کرتے ہوئے دونوں کے نکات کی وضاحت کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ منافقت کی بیماری تمام بیماریوں سے بدتر ہے اور انواع واقسام کی پلیدگیوں اور مذموم اخلاق کی حامل ہے۔ منافقت کی نفسیاتی علامتوں میں گھبراہٹ اور اضطراب دوسری صفات کی نسبت سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ منافقوں کے افعال وحرکات سے ہمیشہ ان دونوں کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منافقوں کے افعال وحرکات سے ہمیشہ ان دونوں کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منافق کے دورُخ اور دو چہرے ہوتے ہیں۔ اس کی مستقل کوشش ہوتی ہے کہ کوئی اس کی اندرونی حالت سے واقف نہ ہونے پائے لہٰذا ظاہر اور باطن کے اس تضاد اور تناقص کی بناء پر منافق ہمیشہ گھبراہت و پریشانی اور اضطراب و بے چینی میں گھرِا ہوا ہوتا ہے۔ قرآن دو مثالوں کے ذریعہ ان دونوں کیفیات کی، جن میں دوسری پہلی کی پیداوار ہے نشان دہی کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

پہلی مثال:

مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ الَّذِى اسۡتَوۡقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ

بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ﴿۱۷﴾ (بقرة:۱۷)

''منافق'' کی مثال اس شخص جیسی ہے کہ جس نے (تاریک بیابان میں) آگ روشن کی ہوئی ہو۔ جب آگ اس کے اطراف کو روشن کر دیتی ہے تو خدا (کوئی طوفان بھیج کر) اسے بجھا دیتا ہے اور اسے وحشت ناک تاریکی میں جہاں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ چھوڑ دیتا ہے۔

فرض کیجئے، کوئی شخص ایسے بیابان میں ہے، جو سانپوں، بچھوؤں اور درندوں سے پُر ہے رات کی تاریکی نے اُسے گھیر رکھا ہے وہ شخص اپنے اطراف کا جائزہ لینے کے لیے آگ روشن کر لیتا ہے۔ تاکہ آگ کی روشنی میں ہر قسم کے آسیب اور خطرے کو اپنے سے دُور کر سکے۔ اچانک آندھی آجاتی ہے اور اس کی آگ کو بجھا دیتی ہے۔ ایسی صورت میں اس شخص کی کیا حالت ہوگی؟ اس کے لیے سوائے گھبراہٹ و پریشانی اور اضطراب و بے چینی کے اور کچھ نہ ہوگا۔

منافق کی حالت بالکل اس طوفان زدہ شخص جیسی ہوتی ہے۔ گھبراہٹ و پریشانی اور اضطراب بے چینی اس شخص کو گھیر لیتی ہے ایسے شخص کی پریشانی اس شخص کے اضطراب سے بھی زیادہ ہوتی ہے جس کے پاس کوئی روشنی نہ ہو اور وہ ہمیشہ سے ہی ظلمت و تاریکی میں بسر کر رہا ہو۔ یہی حالت منافق کی ہوتی ہے کیونکہ نورِ اسلام و ایمان پہلے منافقین کی زندگی کے ماحول کو، اسے قبول کرنے کی وجہ سے روشن کرتا ہے۔ جب وہ ذلک بانھم امنوا کے مطابق وہ ایمان لے آئے ہوں۔ لیکن منافقت و دورُوئی کو اختیار کرنے اور ایمان کو کفر میں بدل ڈالنے کی وجہ سے وہ نور خاموش ہونے لگتا ہے اور آخر کار بجھ جاتا ہے اور ان سب کو گھپ اندھیرے میں چھوڑ دیتا ہے اس لحاظ سے اس طوفان زدہ شخص کی حالت، ان نفاق زدہ افراد جیسی ہی ہوتی ہے۔

اس تفسیر میں اسلام و ایمان کی طرف مائل ہونا اس آگ کی طرح ہے جو تاریکی دور کرنے کے لیے روشن کی گئی ہو، اور بعد کی منافقت اور دورخی وہ طوفان ہے جس نے اس آگ کو بجھا دیا ہو۔ آگ دنیا و آخرت دونوں میں انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی۔

اسی لیے قرآن منافقین کے بارے میں فرماتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ﴿۳﴾

(منافقون:۳)

پہلے وہ ایمان لے آئے پھر وہ کافر ہو گئے۔ ان کے دلوں پر مہر لگ گئی ہے۔ اب وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

اس تشبیہہ کی تفسیر کا ایک اور پہلو

منافقین کی زندگی میں اس تشبیہہ کو ایک اور طرح سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے وہ اس طرح کہ اسلام و ایمان کی طرف ظاہری جھکاؤ نے

کسی حد تک ان کے ماحول اور گردوپیش کو روشن کیا ہوا تھا۔ لیکن جب پردہ ایمان اُٹھ گیا اور ان کا باطن ظاہر ہو گیا تو یہ نورِ ایمان ان کی زندگی سے رخصت ہو گیا۔ اس تفسیر میں خود اسلام و ایمان کا تظاہر وہ نور ہے جس نے ان کے اطراف کو روشن کیا ہوا تھا۔ منافقت کا ظاہر ہو جانا، ان کے ظاہر و باطن کا تضاد، اس طوفان کی مانند ہے جس نے ان کی زندگی کے خرمن کو بادِفنا کے سپرد کر کے اسے نیست و نابود کر دیا ہو۔

اب ہم چاہیے آیت کی پہلے طریقہ سے تفسیر کریں یا دوسرے طریقہ سے منافقین کی زندگی اسلامی ماحول میں (ایک اکثریت کے اندر اس اقلیت کی طرح ہوتی ہے جو ظاہری طور پر محبت کا اظہار کرتی ہو لیکن باطن میں اس کے خلاف ہو) ہمیشہ گھبراہٹ اور پریشانی (اصطلاح کے مطابق کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟ کہ کسی مشکل میں نہ پھنس جاؤں) سے دوچار رہتی ہے۔

بہر حال انسان ہمیشہ منافقت کی حالت میں زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے ایک طرف تو اکثریت کی مخالفت ہوتی ہے۔ جس کے باوجود وہ اجتماعی مفادات سے بہرہ مند بھی ہونا چاہتا ہے۔ دوسری طرف سے وہ چاہتا ہے کہ کوئی گردوغبار بھی اس کے دامن کو آلودہ نہ کرے نہ کوئی کانٹا اُس کے پاؤں میں چبھنے پائے۔ لیکن اس کے افعال پر سے پردہ اٹھ ہی جاتا ہے جس سے اس کی عزت و آبرو خاک میں مل جاتی ہے، اس کے جان و مال خطرے میں پڑ جاتے ہیں اور اس خیالی چراغ سے جسے اس نے نفاق کے نام سے روشن کیا تھا ہے۔ تھوڑا ہی فائدہ اور وہ بھی تھوڑی سی مدت کے لیے اٹھاتا ہے نہ کہ ہمیشہ کے لیے۔

دوسری مثال

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ⑲ (بقرہ:۱۹)

منافقین کی مثال ان مسافروں کی سی ہے جن پر اندھیری رات میں رعد و برق و صاعقہ کے ساتھ شدید بارش برسنے لگے تو وہ موت کے خوف سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں رکھ لیتے ہیں تا کہ صاعقہ (بجلی) کی کڑک کو نہ سنیں۔ لیکن خدا کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔"

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڎ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَھَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑳ (بقرہ:۲۰)

"بجلی کی چندھیا دینے والی روشنی قریب ہے کہ ان کی آنکھوں کی بصارت کو ختم کر کے رکھ دے۔ جونہی کہ بیابان میں بجلی کوندتی ہے وہ اپنے سامنے کی ہر چیز کو دیکھ لیتے ہیں) اور راستہ چلنے لگتے ہیں اور جب وہ خاموش ہو جاتی

ہے تو رک جاتے ہیں خدا جب چاہتا ہے ان کے کانوں اور آنکھوں کو ختم کر دیتا ہے۔ بے شک خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''۔

پہلی مثال میں منافقین کو ایسے افراد کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو بیابان میں رکے ہوئے ہوں اور انہوں نے اپنے گردونواح اور اطراف کو دیکھنے کے لیے آگ روشن کی ہوئی ہو۔ اس جگہ انہیں بیابان میں گذرنے والوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جن پر موسلا دھار بارش برس رہی ہو اور قریب ہو کہ وحشتناک بجلی کی کڑک ان کے کانون کے پردوں کو پھاڑ دے یا بجلی انہیں بھسم کر ڈالے۔

اس قسم کی ہلاکت خیزی سے نجات حاصل کرنے کے لیے چاہتے ہیں کہ کوئی راستہ اور پناہ گاہ انہیں مل جائے جب افق کے کنارے سے نورانی بجلی چمکتی ہے تو فوراً چند قدم اٹھاتے ہیں اور جب وہ بجھ جاتی ہے تو فوراً ٹھہر جاتے ہیں پھر گھبراہٹ و پریشانی اور اضطراب و بے چینی سے اپنے آپ میں گم ہو جاتے ہیں۔

رعد کی ہیبت ناک اور وحشت خیز کڑک سے انگلیاں اپنے کانوں میں رکھ لیتے ہیں تا کہ ان کے کان کے پردہ نہ پھٹ جائیں لیکن دوسری طرف بجلی کی روشنی اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ قریب ہوتا ہے ان کی آنکھ کی بصارت ہی کو ختم کر کے رکھ دے۔

تیسری طرف بجلی کی آگ کے خوف نے انہیں اس طرح حیران و سرگردان اور مضطرب و پریشان کر رکھا ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ کیا کریں۔

یہ ان راستہ چلنے والے مسافروں کی حالت ہوتی ہے جو اس قسم کے حالات سے دوچار ہوتے ہیں اور قرآن یاد دلاتا ہے کہ منافقین کی حالت بھی بالکل ایسی ہی ہوتی ہے۔

جیسی ان مسافروں کی جو اندھیرے، موسلا دھار بارش اور رعد و برق و صاعقہ کے خطرے میں گھرے ہوئے ہوں۔

یہ تشبیہ منافقین کی زندگی پر کس طرح صادق آتی ہے۔ اور ان کی زندگی میں تاریکی اور بارش یا رعد و برق و صاعقہ سے کیا مراد ہے اب ہم اسی کی تفسیر پیش کرتے ہیں۔

اِسلامی مفسرین نے اس مثال کی تفسیر اور تشریح کے لیے دو راستے اختیار کیے ہیں۔ کبھی تو اس کا متعدد تشبیہوں کی صورت میں تجزیہ کیا ہے، اور مثال کی ہر اکائی اور جزو کے لیے منافقین کے مجموعی حالات کو بارش میں پھنسے ہوئے آدمی کے مشابہ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ مثال کے ہر جزو کا مشابہ منافقین میں موجود نہ بھی ہو۔

دوسرا راستہ زیادہ صحیح اور محکم نظر آتا ہے مقصد منافقین کی گھبراہٹ و پریشانی کی ایک ایسے شخص کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے جو بارش، بادل اور رات کی تاریکیوں میں گرفتار ہو۔ جبکہ پہلی صورت میں ضروری ہے کہ منافقین کے لیے مثال کی اکائیوں میں سے ہر ایک مثال کے لیے اسی جیسی چیز کا تعین کیا جائے۔ مثلاً ہم کہیں:۔

'بارش' سے مراد دینِ اسلام ہے جو پانی کی طرح حیاتِ قلوب کا سبب ہے۔ ظلمات سے مراد منافقین کے شیطانی افکار ہیں جو ان کے

دلوں کو گھیرے ہوئے ہیں۔علی ہذا القیاس رعد اور برق سے مراد خدا کے وعدے اور عذاب کی دھمکیاں ہیں جبکہ صواعق سے ان کے اعمال کا عکس العمل مراد ہے۔بہر حال یہ دونوں مثالیں قرآن مجید کی بہت ہی خوبصورت مثالیں ہیں جو منافقین کے حالات کی تصویر کشی کرتی ہیں۔

قرآن نے منافقین کے بارے میں دو مثالوں کی تصویر کشی کر کے، جن کی ہم نے ابھی تشریح کی ہے۔اس بات کی یاددہانی کرائی ہے کہ گھبراہٹ اور پریشانی نفاق کا براہِ راست نتیجہ ہے ایک ایسی اقلیت، جو اپنے عقائد و کردار پر پردہ پوشی کرتے ہوئے یہ چاہے کہ ظاہری طور پر اکثریت کے نفع میں ہاں میں ہاں ملا کر یہ ظاہر کرے کہ وہ انہیں میں سے ہے، جبکہ دراصل وہ اکثریت کے بالکل برعکس ہو تو وہ ہمیشہ دادی حیرت میں سرگرداں رہتی ہے اور (کیا کرے اور کیا نہ کرے) کہ اس کے راز کا پردہ فاش نہ ہو، کی حالت میں بسر کرتی ہے۔اُن کی اس گھبراہٹ اور پریشانی کی حالت کو مذکورہ مثالوں نے مکمل طور پر واضح کر دیا ہے۔

منافقین کی یہ حالت بذاتِ خود بہت سے حالات کا پیشِ خیمہ بنتی ہے اور دوسرے بہت سے حالات کو اپنے ساتھ شامل کر لیتی ہے۔ جنہیں قرآن نے مختلف سورتوں میں مختلف مناسبتوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ہم ان کی تشریح و تفصیل پیش کرتے ہیں۔

۲: تذبذب اور فرصت طلبی

آنحضرتؐ نے، اپنے گرانبہا ارشادات میں منافق کو اس بکری کے بچہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے، جو دو بکریوں کے درمیان چل رہا ہو۔کبھی ایک کے ساتھ ہو جاتا ہو اور کبھی دوسری کے ساتھ، اور اسی طرح آگے بڑھتا جاتا ہو۔[1]

رسُولِ خداؐ کے زمانہ کے منافقین کی بالکل یہی حالت تھی۔وہ ہمیشہ انتظار میں رہتے کہ دیکھیں اسلامی معاشرہ سہولت پاتا ہے یا تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔مثلاً جب وہ مسلمانوں کو یہودیوں یا مشرکین پر کامیاب ہوتا دیکھتے تو فوراً اسلامی معاشرے کے افراد ہونے کا دعویٰ کرنے لگتے اور کہتے کہ ہم بھی تمہارے ہی ساتھ تھے۔لہٰذا جنگی غنائم میں سے ہمارا حصہ ہمیں دو۔لیکن جب کبھی مسلمان شکست سے دو چار ہوتے تو منافقین فوراً یہود و مشرکین کی اس جماعت سے، جو اسلام کی طرف مائل ہوتی، لیکن منافقین کے پروپیگنڈے کی وجہ سے تذبذب میں ہوتی، کہتے کہ کیا ہم نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ اسلامی حکومت بہت جلد زوال پذیر ہونے والی ہے۔اور یہ جماعت دن بدن کمزور ہوتی جارہی ہے۔اسی لیے ہم نے تمہیں اسلام لانے سے باز رکھا تھا۔اب تم ان کی کمزوری اور زوال کی نشانیاں خود دیکھ رہے ہو۔

قرآن اس حقیقت کو ''تذبذب'' یا فرصت طلبی کا نام دیتا ہے چنانچہ قرآن درج ذیل آیت میں اس حقیقت کو بے نقاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ

---

[1] مَثَلُ المنافقِ مثلُ الشاۃِ عایِرۃ بین الغنمین تعبر اِلیٰ ھٰذِہٖ وَّاِلیٰ اُخرٰے مَرَّۃً (مسند احمد بن حنبل ج ۲ ص ۳۲)

وَنَمۡنَعۡكُمۡ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ وَلَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۱﴾ (نساء:۱۴۱)

''وہ لوگ جو انتظار میں رہتے ہیں، اور تمہیں کوئی کامیابی نصیب ہوتی ہے، تو کہتے ہیں: ''کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے۔ پھر اگر کافر کامیاب ہوتے ہیں تو فوراً ان سے کہتے ہیں۔ ''کیا ہم نے تمہیں اسلام لانے سے روکا نہیں تھا؟'' پس اللہ تعالیٰ قیامت کے دِن ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا۔ اور اللہ کافروں کا اہل ایمان پر ہرگز غلبہ نہیں ہونے دے گا۔''

مُّذَبۡذَبِيۡنَ بَيۡنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۳﴾

(نساء:۱۴۳)

''حیرت زدہ اور سرگرداں ہیں۔ نہ اس گروہ سے تعلق جوڑتے ہیں اور نہ اس گروہ سے۔ جس کو خدا گمراہی میں چھوڑ دے اس کے لیے کوئی راہِ نجات نہیں ہوتی۔''

یہ آیت اشارتاً یہ بتاتی ہے کہ منافقین، مشرکین کے درمیان اپنے جاسوس رکھتے تھے۔ جب کبھی اُن مُس سے کوئی اسلام کی طرف مائل ہوتا اور مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہونا چاہتا تھا تو وہ فوراً اس سے ملاقات کرتے اور اُسے ایمان لانے، اور مسلمانوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے روکتے۔ انہیں مشورہ دیتے کہ اپنے ہی دین پر قائم رہو۔ مسلمانوں کی حکومت تو بس ختم ہونے ہی والی ہے۔ الم نستحوذ علیکم ونمنعکم من المومنین۔ کا جملہ اسی بات کی گواہی دیتا ہے۔

ایک اور آیت میں اس ''تذبذب'' کی ایک اور پہلو سے بھی تشریح کی گئی ہے جو اس طرح ہے۔

ایک جماعت رُک رُک اور پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی۔ وہ لوگ واقعات کے رُخ کا اندازہ لگاتے اور پھر اس میں اپنی منفعت کے پہلو نکالتے۔ اگر مسلمانوں کو کوئی مصیبت پیش آ جاتی تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ نہیں تھے۔ اور اس طرح وہ مصیبت سے محفوظ رہے۔ اس کے برعکس اگر مسلمان کامیاب ہو جائیں تو انہیں حسرت ہوتی ہے کہ وہ ان کے ساتھ کیوں نہ ہوئے کہ وہ بھی جنگ کے غنائم میں حصہ دار، اور کامیابی میں شریک ہوتے۔

جیسا کہ ارشاد فرماتا ہے۔

وَاِنَّ مِنۡكُمۡ لَمَنۡ لَّيُبَطِّئَنَّ‌ ۚ فَاِنۡ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَالَ قَدۡ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَىَّ اِذۡ لَمۡ اَكُنۡ مَّعَهُمۡ شَهِيۡدًا ۝۷۲ (نساء:۷۲)

''تم میں ایسے دورُخے افراد بھی ہیں جو پھونک پھونک کر قدم، رکھتے ہیں۔ اگر تم پر کوئی مصیبت نازل ہو جائے تو وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ہم پر احسان کیا، کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ معرکہ، جنگ میں موجود نہ تھے۔

وَلَـئِنۡ اَصَابَكُمۡ فَضۡلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوۡلَنَّ كَاَنۡ لَّمۡ تَكُنۡۢ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيۡتَنِىۡ كُنۡتُ مَعَهُمۡ فَاَفُوۡزَ فَوۡزًا عَظِيۡمًا ۝۷۳ (نساء:۷۳)

اور اگر تمہیں مال غنیمت حاصل ہو جائے تو بالکل اس طرح سے جیسے تمہارے اور ان کے درمیان کوئی رابطہ ہی نہ رہا ہو (اور تمہیں پہچانتے ہی نہ ہوں) کہنے لگتے ہیں: اے کاش! ہم بھی ان کے ساتھ ہوتے تو عظیم کامیابی میں حصہ دار ہوتے۔''

خلاصہ یہ ہے کہ عمر بھر ان کا ''تذبذب'' دونوں صورتوں میں رُونما ہوتا رہتا۔ یعنی جب مومنین کو کامیابی ہوتی تو مومنین سے طلبگاری کی صورت میں، اور جب مومنین کو کافروں کے مقابلہ میں ناکامی ہوتی تو کافروں سے طلبگاری کی صورت میں، جب مومنین پر کوئی مصیبت وارد ہوتی تو خوش ہوتے اور جب مومنین کو کامیابی حاصل ہوتی تو ان کو حسرت ہوتی۔

۳: خوف کی حالت میں زندگی

خوف و ہراس منافق کی زندگی کو گھیرے رکھتے ہیں۔ اور وہ آنِ واحد کے لیے بھی اس سے باہر نہیں نکل سکتا۔ صدرِ اسلام کے منافقین کے خوف کا سبب یہ تھا کہ وہ روزانہ اسلام کی عظمت اور وسعت کا مشاہدہ کر رہے تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ لشکرِ اسلام جزیرہ نمائے عرب کے صحرا میں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور جزیرہ کی ساری سرزمین کو اپنے زیرِ تسلط لا رہا ہے۔ لہٰذا وہ خوفزدہ رہتے کہ ان کے راز بے نقاب نہ ہو جائیں۔ اس طرح ان کی اولاد اور مال و دولت ان کی منافقانہ زندگی کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔

قرآن اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے:۔

وَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمۡ لَمِنۡكُمۡ ؕ وَمَا هُمۡ مِّنۡكُمۡ وَلٰـكِنَّهُمۡ قَوۡمٌ يَّفۡرَقُوۡنَ ۝۵۶

(توبہ:۵۶)

وہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم ہی میں سے ہیں۔ حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں۔ لیکن وہ خوفزدہ لوگ ہیں۔''

(خوف کی وجہ سے جھوٹ بولتے ہیں)

لَوۡ يَجِدُوۡنَ مَلۡجَاً اَوۡ مَغٰرٰتٍ اَوۡ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوۡا اِلَيۡهِ وَهُمۡ يَجۡمَحُوۡنَ﴿۵۷﴾ (توبہ: ۵۷)

''اگر انہیں کوئی پناہ گاہ یا غار یا زمین میں راستہ مل جائے تو وہ تیزی سے دوڑ کر اس کی طرف چلے جائیں گے۔''

قرآن ایک اور آیت میں عامل وحشت کی ایک اور طرح بھی تشریح کرتا اور بتاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دو خدشات کے درمیان پاتے ہیں۔ اگر وہ واقعتاً ایمان لے آئیں تو انہیں اپنی مشرک قوم اور قبیلہ کے اعتراض کا خوف ہوتا ہے اور اگر اپنے شرک پر باقی رہیں تو اسلام اور قرآن کی دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم آخرِ کار وہ اپنی قوم و قبیلہ کی مخالفت سے بچنے کو عذابِ الٰہی پر ترجیح دیتے ہیں، تاکہ منافقانہ زندگی بسر کرتے ہوئے اسلام کی خوبیوں سے بھی فائدہ اٹھاتے رہیں۔

قرآن اس بارے میں کہتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوۡذِىَ فِى اللّٰهِ جَعَلَ فِتۡنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكَ لَيَقُوۡلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمۡ ؕ اَوَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَعۡلَمَ بِمَا فِىۡ صُدُوۡرِ الۡعٰلَمِيۡنَ﴿۱۰﴾ (عنکبوت: ۱۰)

لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان لے آئے۔ لیکن جب انہیں خدا کی راہ میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے۔ تو لوگوں کی طرف سے آنے والی تکلیف کو عذابِ الٰہی کے مانند شمار کرنے لگتے ہیں※ (اپنے اسلام کی طرف جھکاؤ کے برعکس سوچنے لگتے ہیں) اور جب تیرے پروردگار کی طرف سے کامیابی آجاتی ہے۔ تو یہی سست گروہ کہتا ہے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے۔ کیا خدا اس چیز سے جو ان لوگوں کے دلوں میں ہے، سب سے زیادہ آگاہ نہیں ہے۔''

وَلَيَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَيَعۡلَمَنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ﴿۱۱﴾ (عنکبوت: ۱۱)

''یقیناً خدا ایمان لانے والے لوگوں کو بھی پہچانتا ہے اور اسی طرح منافقین کو بھی خوب پہچانتا ہے۔''

اب ہم منافقین کی تین خصوصیات سے، جو سب کی سب ان کے نفاق کا باعث ہیں، آشنا ہو چکے ہیں۔ اب ضروری ہے کہ تین اور موضوعات پر بھی بحث کریں۔

(۱۲)

مُنافقین اور خُدائی فرائض

منافقین اور مالی فرائض

منافقین اور پیغمبر کا فیصلہ

منافقین اور میدانِ جنگ

خدا کی عبادت و پرستش خود خدا کی کسی ضرورت اور حاجت کو پورا کرنے کے لیے نہیں کی جاتی۔ خدا ایسی بے نیاز ہستی ہے جسے کسی فرد کی عبادت اور اس کی طرف سے ستائش کی کوئی ضرورت اور احتیاج نہیں۔ وہ ذات ''واجب الوجود'' ہے غناو بے نیازی اس کی عین ذات ہے جو ہرگز اس سے جدا نہیں ہوتی۔ ہر مخلوق کے پاس جو کچھ بھی ہے۔ سب اسی کی طرف سے ہے۔ اس صورت میں وہ کسی کا کیسے محتاج ہوسکتا ہے۔

جب کسی جامع کمالات ہستی کی طرف سے کوئی فرمان صادر ہوتا ہے۔ مثلاً جب وہ اپنے بندوں کو عبادت اور اپنی ذاتِ اقدس کی حمد وثنا بجالانے کا حکم دیتا ہے تو یقیناً اس میں کوئی ایسی مصلحت ہوتی ہے جو خود حمد وثنا بجالانے والے کی طرف لوٹتی ہے۔

اس بات کی وضاحت اس طرح ہے:

ہر انسان کی فطری خود پسندی اپنی ذاتی اہمیت اور خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کا میلان کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اور انسان کی شخصیت کی تکمیل انہی میلانات کی صحت میں مضمر ہے۔ یہ میلانات انسان کی زندگی کے ستون اور اس کی بقاء کے رُموز شمار ہوتے ہیں۔ اگر ان میلانات میں اعتدال قائم نہ رہے اور ان کی صحیح سمت میں رہبری نہ کی جائے تو انسان ایک ایسے درندے کی صورت اختیار کرلیتا ہے، جو ہر درندے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان خواہشات نفسانی اور اپنی اہمیت ذاتی کو کم کرے، اور حدِ اعتدال میں رہے۔

انسان کی خواہشات نفسانی میں کمی کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کے جذبات محبت تعلق کو خود اس سے کسی کامل تر اور برتر ہستی کی طرف متوجہ کیا جائے، اس کے دل میں اس کامل تر اور برتر ہستی کا عشق اور کشش پیدا کی جائے تاکہ وہ اس کامل و برتر ہستی کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بھول کر اور ہستی برتر کی خواہش اور رضا کا اپنی خواہشات کے بجائے گرویدہ ہوجائے۔

انسان کو اس حد تک مہذب اور شائستہ بنانا آسان کام نہیں۔ تمام انسانوں میں اس قسم کی استعداد اور شائستگی موجود بھی نہیں ہوتی۔ بالفرض اگر یہ استعداد موجود ہو بھی تب بھی اسے ایسے: زبردست قسم کے مربی کی ضرورت ہوگی جو اس کے قلب میں عشق خدا کی آگ کو روشن کر سکے۔ لیکن اس قسم کے مربیوں تک دسترس حاصل کرنا کسی زمان ومکان میں آسان نہیں۔

آسان اور کھلا راستہ ہے کہ ہم خدا کے فرامین کی رُوحِ اطاعت کو انسان کے دل میں پیدا کریں فرمانبردار کی جزا اور اس کے احکام سے روگردانی کی سزا سے خبردار کریں جو انسان کی خواہشات نفسانی کے سمندر میں غرق ہونے سے محفوظ رہے اور اعتدال کا راستہ اختیار کرلے۔ اس حیثیت کا حصول اللہ تعالیٰ کی رحمت یا اس کے غضب کی طرف توجہ کیے بغیر جو حق تعالیٰ کی عبادت پرستش کے لیے ناگریز ہے۔ ممکن نہیں۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ ﴿١٤﴾

(طٰهٰ: ۱۴)

میری یاد کے لیے نماز کو قائم کر۔"

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ (عنکبوت: ۴۵)

یقینا نماز انسان کو قبیح اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔"

نماز کے تربیتی آثار اسی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جب عبادتِ خدا کا سبب کمال خدا سے عشقِ و محبت قرار پائے۔ یا اس کی رحمت کی اُمید اور اس کے غضب کا خوف دل میں جاگزیں ہو۔ یہی وہ محرکات واسباب ہیں جو انسان کے لیے نماز کو شیریں اور بعض اوقات اس کو عشقِ خدا کا خوگر بنا دیتے ہیں۔

اگر اس قسم کا کوئی محرک نہ ہو اور کوئی شخص صرف ریا کارانہ یا حالات کے خوف یا لوگوں کے ڈر سے نماز کے لیے کھڑا ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اس کا کوئی تربیتی اثر اس پر نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے دو رکعت نماز کا پڑھنا پہاڑ کو ہموار کرنے سے بھی زیادہ سخت اور گراں معلوم ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کچھ لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ مادی منافع کے حصول کی خاطر سخت ترین کام کر گزرتے ہیں، لیکن نماز کے لیے جس میں چند منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگتا۔ ہرگز تیار نہیں ہوتے۔

قرآن اُن مسلمان نما کافروں کی جو یادِ خدا سے منحرف ہیں۔ اس طرح تعریف کرتا ہے۔"

وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى (توبه: ۵۴)

"وہ نماز نہیں پڑھتے مگر تھکے ہارے سستی کے ساتھ"

دوسری آیت میں فرماتا ہے:۔

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ (نساء: ۱۴۲)

جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی اور کاہلی کے ساتھ"

کیونکہ نہ تو وہ خدا کے جمال و کمال کے شیفتہ ہیں کہ اس کی حمد و ثناء سے انہیں عشق ہو اور نہ ہی اس کی جزاء و ثواب اور (دوزخ و جنت)

پر ایمان رکھتے ہیں، کہ محبت اور خلوصِ دل کے ساتھ اس کے حضور کھڑے ہوں۔

منافقین اور مالی فرائض:

یہ جماعت جو فریضۃ الٰہی یعنی نماز ادا کرنے میں، جہاں کوئی پیسہ خرچ نہیں ہوتا تھا۔ اگر اس قدر گراں اور سخت تھے تو فرائض مالی کی ادائیگی جیسے زکات اور جنگی ساز و سامان کے اخراجات میں ان کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ ایک طرف تو دُنیا اور اس کی ثروت ان کے لیے کعبۂ اُمید تھی۔ بلکہ مال سے محبت تو ہر انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ دوسری طرف اپنے نفاق کی حفاظت کرنے اور کفر کو پوشیدہ رکھنے کے لیے وہ اس بات پر مجبور تھے کہ اپنے اموال کا ایک حصہ زکات کے عنوان سے یا مجاہدین اسلام کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پیش کریں۔ یہی وہ موقع تھا جب کہ غیض وغضب ان کے گلوگیر ہوجاتا، اور وہ نہیں جانتے تھے کہ کیا کریں۔ قرآن ان کی اس نفسیاتی کیفیت کو اس طرح بیان فرماتا ہے۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝۵۳ (توبہ:۵۳)

''ان سے کہہ دیجئے کہ انفاق مال اپنی مرضی سے کرو یا مجبوری سے، ہرگز قبول نہیں ہوگا۔ یقیناتم جماعتِ فاسقین سے ہو۔

وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝۵۴ (توبہ:۵۴)

''ان کی منافقت کو قبول کرنے میں اور کوئی چیز مانع نہیں۔ سوائے اس کے کہ انہوں نے خدا اور اس کے رُسولؐ سے کفر کیا۔ وہ نماز نہیں پڑھتے مگر سستی اور کاہلی کے ساتھ، اور منافقت نہیں کرتے مگر کراہیت سے۔''

اصولی طور پر ہر امرِ خیر اور کارِ نیک جس میں تصورِ باری نہ ہو کسی طرح تربیتی اثر نہیں رکھتا نہ ہی زحمتِ اطاعت کو راحت میں، اور اس زحمت کی تلخی کو شرینی میں بدل سکتا ہے۔

منافقین اور دُوسروں کی طرف سے استعانت:

منافقین کے لیے مشکل امر صرف ان کا اپنا مال خرچ کرنا نہ تھا۔ بلکہ وہ دوسروں کی طرف سے بذل و بخشش کرنے پر، چاہیے ایسا کرنے والے امیر ہوں یا غریب، اعتراض کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ہم اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جسے قرآن نے بھی بیان کیا ہے۔

سنہ ۹ھ آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو شام کے اطراف میں رومیوں کے خلاف، راہِ خدا میں جہاد کرنے کا حکم دیا۔ چونکہ راستہ دور دراز

کا تھا اور دشمن بھی قوی اور طاقتور تھا۔ لہٰذا آنحضرتؐ نے دیگر مواقع کے برعکس جنگ کے مقام اور ضرب مقابلِ کو ظاہر کر دیا۔ پس مدینہ کے مسلمان داخل وخارج میں سامانِ حرب اور رسد جمع کرنے میں مصروف ہو گئے۔ نتیجہ ایک بہت بڑا لشکر (تیس ہزار سوار و پیادہ) جس کی اس زمانہ کے حجاز کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی، تیار ہو گیا۔

اصحابِ پیغمبرؐ میں عبدالرحمن بن عوف جیسے حضرات نے لشکرِ اسلام کی چار ہزار درہم سے مدد کی اور عاصم بن عدی نے ستر وسق خرما بیت المال میں داخل کیا اور اسی طرح دیگر اصحاب نے بھی مدد کی[1]

منافقین نے، جو اسلام کی شکست کے خواہاں تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ اس قسم کا لشکر مالی وغذائی اعتبار سے کفیل ہو کر تیار ہو جائے۔ جب اس قسم کی قربانیوں اور تعاون کا مشاہدہ کیا تو مجاہدین کا مذاق اڑانے لگے اور کہنے لگے۔ ''ما اعظم ریأهم یہ لوگ کتنی بڑی ریا کاری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔''

جب ابوعقیل نامی ایک غریب مسلمان نے جورات بھر کسی انصاری کے باغ کو پانی دینے کے لیے دو من (ہر من تقریباً تین کلوگرام کے برابر ہوتا ہے) خرما کی مزدوری پر مقرر ہوا تھا۔ ایک من اپنے گھر والوں کے لیے رکھ کر باقی ایک من خرما آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کیں، اور جسے آنحضرتؐ نے پورے احترام کے ساتھ قبول کر لیا تو منافقین نے پھر زبانِ اعتراض کھولی اور کہا: خدا کو تمہارے ایک من خرمے کی ضرورت نہیں ہے۔''

خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو مالداران کی زبان کے شر سے مامون تھا اور نہ ہی غریب محفوظ تھا۔ لہٰذا منافقین کی بری نیت سے پردہ اٹھانے کے لیے ذیل کی آیت نازل ہوئی:۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾

(توبہ:۷۹)

''وہ لوگ جو فرماں بردار لوگوں کی عیب جوئی کرتے ہیں اور ان کا جو اپنی قوت سے زیادہ پر دسترس نہیں رکھتے، مذاق اڑاتے ہیں (خدا انہیں ان کے استہزاء کی سزا دے گا) ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

منافقین اور غنائم وزکات کی تقسیم

غنائم کی تقسیم، لوگوں کی روحانی اور نفسانی کیفیت کی آزمائش کا اچھا ذریعہ تھی۔ بلند ہمت افراد جو رضائے خدا کو ہر چیز سے بالاتر

[1] ہر وسق ۱۸۰ کلوگرام کے برابر ہوتا ہے۔

جانتے تھے۔ جو کچھ آنحضرتؐ انہیں دے دیتے اس سے راضی ہوجاتے اور زیادہ کا لالچ نہ کرتے۔لیکن منافقین جو محض دینا کے طالب تھے وہ غنائم کی تقسیم کے وقت، اپنی فطرت کی پستی اور شدید لالچ کا اظہار کیے بغیر نہ رہتے۔ اگر انہیں بہت سا مال مل جاتا تو خوش ہوجاتے اور اگر انہیں تھوڑا حصہ ملتا تو ناراض ہوجاتے اور اشاروں کنایوں میں یا صراحت کے ساتھ بھی آنحضرتؐ پر اعتراض کرتے اور کہتے۔ ''وہ اپنے قریبیوں کو دوسروں پر مقدم رکھتے ہیں اور غنائم کی تقسیم میں عدل سے کام نہیں لیتے۔'' تاریخ نے اس سلسلہ میں کچھ واقعات نقل کیے ہیں۔ جن میں سے ہم چند ایک کا ذکر کرتے ہیں:۔

۱: ابوالجواظ نامی ایک منافق اپنی اور دوسرے لوگوں کی بھیڑیں چرایا کرتا تھا اس نے رسُولِ اکرمؐ سے پوچھا: کیا خدا نے تجھے حکم دیا ہے کہ فقراء ومساکین کو تو زکات دو لیکن چرواہوں کو نہ دو؟

آنحضرتؐ نے جواب دیا۔ چرواہا ہونا کوئی عیب نہیں ہے۔ کیا موسیؑ اور داوٗدؑ چرواہے نہ تھے۔؟''

جب وہ مجلس سے نکلا تو آنحضرتؐ نے فرمایا: اس شخص اور اس کے ساتھیوں سے خبردار ہو، کیونکہ یہ سب منافق ہیں۔''

۲: ذوالخویصرہ تمیمی نے جو بعد میں فرقہ خوارج کا رئیس و سردار بنا، جنگِ طائف کے غنائم کی تقسیم میں آنحضرتؐ پر اعتراض کیا اور کہا: ''عدل اختیار کیجئے۔''

آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا: وائے ہو تجھ پر! اگر میں عدل نہ کروں تو پھر تجھے کس سے عدالت کی توقع ہوسکتی ہے؟''

آنحضرتؐ کے صحابہؓ میں سے ایک شخص تیار ہوگیا کہ اسے قتل کرے تو آنحضرتؐ نے فرمایا:

خدا کی پناہ! کہیں لوگ یہ نہ کہنے لگیں: اقتدار کے حصول کے بعد میں نے اپنے اصحاب کو قتل کرنا شروع کردیا۔ تاہم میں تمہیں اس آدمی کے خطرناک مستقبل کی خبر دیتا ہوں۔ یہ شخص اور اس کے ساتھی دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ یہ لوگ قرآن کو پڑھیں گے لیکن قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا۔''[1]

ذیل کی آیات انہیں مواقع پر نازل ہوئیں۔

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّلۡمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ‌ ۚ فَاِنۡ اُعۡطُوۡا مِنۡهَا رَضُوۡا وَاِنۡ لَّمۡ يُعۡطَوۡا مِنۡهَاۤ اِذَا هُمۡ يَسۡخَطُوۡنَ‏ ﴿۵۸﴾ (توبہ:۵۸)

اور منافقین میں سے بعض لوگ آپ پر اعتراض کرتے ہیں۔ اگر غنائم و صدقات میں سے انہیں کچھ دے دیا جائے تو وہ خوش ہوجاتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو فوراً ناراض ہوجاتے ہیں۔''

وَلَوۡ اَنَّهُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ ۙ وَقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ سَيُؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ

---

[1] التاج الجامع الاصول ج ۵ ص ۲۸۶، کتاب المتقین۔

مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ (توبہ:۵۹)

''اگر وہ اسی چیز پر جو خدا اور اس کے پیغمبرؐ نے انہیں دی، راضی ہو جاتے اور کہتے کہ خدا ہمارے لیے کافی ہے اللہ اور اس کا رسول اپنے فضل و کرم سے عنقریب ہمیں اور بھی عطا کریں گے، ہم تو خدا ہی کی طرف لو لگائے ہوئے ہیں۔'' (تو کیا یہ ان کے نفع کی بات نہ ہوتی؟)

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(توبہ:۶۰)

''زکات فقراء و مساکین اور ان کے لیے جو اس کے جمع کرنے کے لیے کام کرتے ہیں مخصوص ہے اور ان لوگوں کے لیے جن کی محبت کا حصول (اسلام کے لیے مفید ہے) اور غلاموں، قرضداروں، اور اللہ کی راہ میں اور راستہ میں راہ جانے والوں کے لیے خدا کی جانب سے ایک فریضہ ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔''

منافقین اور پیغمبر اکرمؐ کا فیصلہ

ایمان کی نشانیوں میں سے ایک خدا اور اس کے رسُول کے فیصلوں کو بلا چون و چرا قبول کرنا ہے۔ مومن عدل الٰہی اور آنحضرتؐ کی طرف سے کسی قسم کے ظلم نہ ہونے پر ایمان رکھتے ہوئے خدا اور رسُولؐ کے فیصلہ کے سامنے سرتسلیم خم کرتے ہوئے، ان کی طرف سے صادر ہونے والے ہر حکم کو قبول کر لیتا ہے۔ جبکہ منافق ایمان کے فقدان کے باعث خدا اور اس کے رسول کے فیصلوں سے گریزاں رہتا ہے اور ہمیشہ اپنے نفع کی بات سوچتا ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (نور:۵۱)

''جب بھی مومنین کو خدا اور اس کے رسول کے فیصلہ کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم نے سنا اور اطاعت کی...... اور یہی لوگ تو نجات پانے والے ہیں۔''

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ

(نور:۵۲)

جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، خدا کی نافرمانی سے ڈرتے ہیں اور پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں۔ وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

آنحضرتؐ کے زمانہ کے منافقین قضاوت میں آنحضرتؐ کے طریق کار کو جانتے ہوئے آپؐ کے فیصلوں سے گریزاں رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ یہ چاہتے کہ اپنے اختلافات، دوسرے حکموں مثلاً یہودیوں سے فیصلہ کروائیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرتؐ تو عدل وانصاف کے مطابق ہی فیصلہ کریں گے۔ چاہے آپؐ کا فیصلہ منافق کے حق میں ہو یا کسی اور حق میں اسی لیے قضاوت اور فیصلوں سے مربوط مسائل منافقین کی کمزوری بن گئے تھے کیونکہ عام طور پر ایسے مواقع پر ان کا راز کھُل جاتا تھا اور وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں ''شکایت لے جانے سے گریز کرتے تھے، تاریخ نے اس سلسلہ کے کئی واقعات کا ذکر کیا ہے۔

ا: مغیرہ بن وائل صدر اسلام کا ایک منافق آنحضرتؐ کے ایک صحابی کے ساتھ ایک قطعہء زمین میں شریک تھا۔ جب انہوں نے زمین تقسیم کی تو خراب حصہ مسلمان کے حصہ میں آ گیا۔ مغیرہ نے اس کا حصہ بھی خریدنے کی خواہش کی۔ صحابی نے اپنا حصہ مغیرہ کو فروخت کر کے قیمت لے لی اور معاملہ ختم ہو گیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد خریدار کو اپنے کام سے پشیمانی ہوئی۔ وہ کہنے لگا۔ میں اس زمین کی کیفیت سے آگاہ نہ تھا۔ لہذا جو قیمت تو نے لی ہے وہ مجھے واپس کر دے اور اپنی زمین لے لے۔ یقیناً اس قسم کے جھگڑے کا فیصلہ اسلامی عدالت میں چلنے کی دعوت دی لیکن اس نے قبول نہ کیا۔ اور کہا: ''محمدؐ کو میرے ساتھ دشمنی ہے لہذا مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ پر ظلم کریں گے۔'' اس موقع پر ذیل کی آیات نازل ہوئیں[1]

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

---

[1] بعض مفسرین مذکورہ آیات کو امیر المومنینؑ کے حضرت عثمانؓ کے ساتھ نزاع سے متعلق سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت علیؑ نے جھگڑا طے کرنے کے لیے خدمت میں چلنے کی پیش کش کی۔ لیکن عبدالرحمن بن عوف نے کہا کہ (یہودی) سے فیصلہ کروائیں۔ (نور الثقلین ج ۳ ص ۶۱۵) تعجب کی بات یہ ہے کہ ابن شیبہ یہودی نے حضرت عثمانؓ سے کہا: ''تم لوگ محمدؐ کو وحی خدا کے بارے میں تو امین جانتے ہو لیکن فیصلہ کرنے میں اُسے متہم کرتے ہو۔'

مجمع البیان ج ۴ ص ۱۵۰ میں اس آیت کو ایک منافق کی یہودی کے ساتھ ''نزاع سے متعلق سمجھا گیا ہے۔ لہذا انہوں نے بلخی سے نقل کیا ہے کہ آیت علیؑ اور عثمانؓ کے نزاع کے بارے میں ہے۔ حضرت علیؑ نے فیصلہ کرانے کے لیے آنحضرتؐ کے پاس چلنے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن حکم بن عاص نے جو حضرت عثمان کا رشتہ دار تھا۔ آنحضرتؐ پر یہ اتہام لگایا کہ وہ فیصلہ میں علیؑ کی طرفداری کریں گے۔

تفسیر طبری اور تفسیر درالمنثور، جو تفسیر قرآن کی بنیاد حدیث پر رکھتے ہیں اس مقام پر خاموش ہیں انہوں نے اجمالاً ذکر کیا ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے۔

ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝۴۷ (نور:۴۷)

''وہ کہتے تو یہ ہیں کہ ہم خدا اور اس کے پیغمبرؐ پر ایمان لائے اور اس کی اطاعت کو قبول کیا۔لیکن پھر ان میں سے ایک جماعت اسلام سے روگردان ہو جاتی ہے (فی الحقیقت وہ ایمان لائے ہی نہیں ہیں۔''

وَاِذَا دُعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ اِذَا فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ۝۴۸

(نور:۴۸)

''جب انہیں خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف بلایا جاتا ہے کہ ان کے مابین فیصلہ کریں تو ان میں سے ایک جماعت اس روگرداں ہو جاتی ہے۔''

وَاِنۡ يَّكُنۡ لَّهُمُ الۡحَـقُّ يَاۡتُوۡۤا اِلَيۡهِ مُذۡعِنِيۡنَ ۝۴۹ (نور:۴۹)

''اگر وہ یہ جانتے ہوں کہ حق ان کی طرف ہے تو پھر وہ اظہار ایمان کے ساتھ خدا اور رُسول کی طرف آتے ہیں۔''

اَفِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ اَمِ ارۡتَابُوۡۤا اَمۡ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يَّحِيۡفَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ وَرَسُوۡلُهٗ ؕ بَلۡ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝۵۰ (نور:۵۰)

کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا انہیں پیغمبرؐ کی حقانیت میں شک ہے یا وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا پیغمبرؐ ان پر ظلم کریں گے، (نہیں) بلکہ وہ خود ہی ظالم ہیں۔''

ان آیات واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے ذاتی مفاد کو عزیز رکھتے تھے اور حق اور باطل سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اگر انہیں اپنے حق میں فیصلہ ہوتا دکھائی دیتا تو اسلامی عدالت کو محترم سمجھتے اور اس کے حکم کو نافذ اور قطعی گردانتے۔ اس کے برعکس اگر انہیں فیصلہ میں نقصان دکھائی دیتا تو مختلف بہانوں سے اسے قبول نہ کرتے اور طاغوتی عدالت کے قیام کا مطالبہ کرتے جیسا کہ دوسری آیات میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۲: ایک منافق جس کا نام بشر تھا، ایک یہودی سے کسی مالی مسئلہ میں اُلجھ پڑا۔ یہودی نے یہ پیش کش کی مسئلہ حضرت ابوالقاسمؐ (پیغمبر اکرمؐ) کی خدمت میں پیش کریں۔ لیکن اس منافق نے (جو ظاہر میں مسلمان تھا) کہا ''کعب بن الاشرف کے پاس جو یہودیوں کے قاضیوں میں سے تھا۔ چلیں۔ منافق کے آنحضرتؐ کے حضور مقدمہ لے جانے سے انکار اور یہودی کی طرف توجہ کرنے کا سبب یہ تھا کہ اُسے معلوم تھا کہ آنحضرتؐ حق کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ اور آپؐ کے نزدیک حق کے علاوہ اور کوئی چیز اہمیت نہیں رکھتی۔ جبکہ کعب بن الاشرف ایک ایسا دنیا

پرست انسان تھا، جس کی رائے کو با آسانی خریدا جا سکتا تھا۔[1]

اس بارے میں مندرجہ ذیل آیات نازل ہوئیں۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ ؕ وَیُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّہُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿۶۰﴾ (نساء:۶۰)

''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جو کہتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل ہو چکا ہے۔ لیکن (آپ کے ہوتے ہوئے) اپنے مقدمات فیصلے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں، حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کا انکار کریں اور شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ انہیں بہت زیادہ گمراہ کرے۔''

وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوۡلِ رَاَیۡتَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡکَ صُدُوۡدًا ﴿ۚ۶۱﴾ (نساء:۶۱)

''جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کی طرف جسے خدا نے نازل کیا ہے اور اللہ کے رسول کی طرف لوٹ آؤ تو آپ منافقین کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ سے روگردانی کرتے ہیں۔'' (اور دوسری طرف متوجہ ہو جاتے ہیں)

ان آیات کے آخری حصہ سے واضح ہو رہا ہے۔ کہ اس جماعت کو مومنین نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک کہ وہ اپنے فیصلوں کے لیے پیغمبرؐ کو حکم اور منصف قرار نہ دیں۔ اور آپ کی رائے اور فیصلہ سے ناراض بھی نہ ہوں۔ بلکہ آپ کی رائے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:۔

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَہُمۡ ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ وَیُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ﴿۶۵﴾ (نساء:۶۵)

ایسا نہیں ہے خدا کی قسم وہ مومن شمار نہیں ہوں گے۔ جب تک کہ وہ آپ کو اپنے تنازعات میں حاکم و منصف قرار نہ دیں اور اپنے دل میں آپؐ کے فیصلہ سے رنجیدہ اور ناراض بھی نہ ہوں، اور آپ کے فیصلہ کو بھی صمیم قلب کے

---

[1] مجمع البیان ج ۲ ص ۲۵۔

ساتھ قبول کرلیں۔''

یہ وہ نمونے ہیں جنہیں تاریخ نے محفوظ کیا ہے۔ اور کچھ آیات کے شانِ نزول میں آنحضرتؐ کے فیصلہ کے مطابق اس سے ملتے جلتے مطالب نقل ہوئے ہیں۔[1]

منافقین اور میدان جنگ:

منافقین کی کمزوری کا سب سے بڑا موقع وہ ہوتا تھا۔ جب رسول اکرم جنگ کی عام تیاری فرماتے تھے جس میں مسلمانوں کی اکثریت کو میدان جنگ میں جانا پڑتا تھا۔

غزوۂ اُحد سے پہلے تک تو منافقین طرح طرح کے حیلے بہانوں سے جہاد میں شرکت سے رک جانے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ لیکن جنگِ احد اور مدینہ سے یہودیوں کے جلاوطن ہونے کے بعد ان کے منصوبوں اور سازشوں میں کوئی اثر باقی نہ رہا۔ ان کی حالت ''حنای آناں رنگ نداشت'' (ان کی مہندی کا رنگ نہ چڑھتا تھا) کا مصداق ہوگئی۔ اسی لیے جہاد کا اعلان گویا ان کے لیے موت کے فرشتہ کا نزول بن جاتا جو ان کی رُوح قبض کرنا چاہتا ہو۔ وہ آنحضرتؐ کی طرف اس طرح دیکھتے جیسے سکرات موت میں مبتلا ہوں۔ پھر بچوں کی طرح سے بہانے تراشنے لگتے اور کہتے کہ جنگ اور جہاد تو رُوئے زمین پر فساد برپا کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے رشتہ داروں اور ہم قبیلہ لوگوں کے ساتھ جنگ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سب باتیں اس خوف اور اضطراب کی ترجمانی کرتی ہیں جو ان کے ذہن پر چھا جاتا تھا۔ قرآن منافقین کی اس حالت کو، ذیل میں ذکر شدہ آیات میں بیان فرماتا ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۝۲۰ (محمد:۲۰)

''اہل ایمان کہتے ہیں کہ کوئی ایسی سورۃ، جس میں کفار سے جہاد کا حکم ہو، نازل کیوں نہیں ہوتی۔ جب محکم اور صریح آیت نازل ہوئی۔ اور اس میں جنگ کا حکم ہوا تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جن کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے۔ تمہارے طرف اس طرح سے دیکھ رہے ہوتے ہیں جیسے ان پر موت کی بے ہوشی طاری ہو۔ ان کے لیے یہی کیفیت مناسب ہے۔

---

[1] سورہ نساء کی آیت ۱۰۵، ۱۱۴ کے شانِ نزول کی طرف رجوع کریں۔

میدانِ جنگ سے فرار

جنگ احزاب میں مرکز اسلام کو مشرکوں اور یہودیوں کے مشترک لشکر کی طرف سے دھمکیاں ملنا شروع ہوئیں۔شہر مدینہ پورا ایک مہینہ دشمن کے محاصرے میں رہا۔مسلمانوں نے دشمن کے حملہ کو روکنے کے لیے خندق کھود لی۔اور باری باری اس کے کنارے رات دن پہرہ دینے لگے۔لیکن منافقین دفاعِ شہر میں شریک ہونے کی بجائے اپنے گھروں کے غیر محفوظ ہونے کا بہانہ کر کے میدانِ جنگ سے بھاگنے لگے۔ قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے۔

وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛؕ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾ (احزاب:۱۳)

''اس وقت (منافقین کی) ایک جماعت نے کہا:''اے مدینہ کے لوگو! اب تمہارے لیے میدانِ جنگ میں ٹھہرنے کی کوئی صورت نہیں (لہٰذا یہاں سے لوٹ چلو) پس ان کی ایک جماعت میدانِ جنگ کو چھوڑنے کے لیے آنحضرتؐ سے اجازت مانگنے لگی۔وہ کہتے تھے ہمارے گھر محفوظ نہیں ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔وہ جھوٹ بول رہے ہیں اور دراصل وہ میدان سے بھاگ جانا چاہتے ہیں۔''

اگر قرآن اس آیت میں ایسی جماعت کا ذکر کر رہا ہے جو کسی معقول عذر کے بغیر آنحضرتؐ سے میدان چھوڑنے کی اجازت مانگتے تھے تو اس کے مقابلہ میں دوسری آیت میں اسی جماعت کا ذکر بھی کرتا ہے جو مسلمانوں کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بغیر اجازت ہی میدانِ جنگ کو چھوڑ جاتے تھے۔جیسا کہ قرآن ایسی ہی ایک جماعت کا ذکر کرتا ہے جو عذر کے موقعوں پر آنحضرتؐ سے اجازت تو لیا کرتے تھے لیکن عذر کے دور ہو جانے کے بعد میدانِ جنگ میں واپس لوٹ آتے تھے۔ذیل میں ذکر شدہ دو آیات میں دونوں جماعتوں کی حالت کو بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾ (نور:۶۲)

سچے مومن تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رُسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جب کبھی کسی اہم کام میں اس کے ساتھ ہوتے ہیں تو اس سے اجازت لیے بغیر کہیں نہیں جاتے۔ جو لوگ آپؐ سے اجازت مانگتے ہیں وہی تو خدا اور اس کے رُسولؐ پر واقعی ایمان لانے والے ہیں۔ پس جب وہ اپنے بعض کاموں کے لیے اجازت مانگیں تو آپ جسے چاہیں اجازت دے دیا کریں، اور اس کے لیے طلب مغفرت کریں، کیونکہ خدا بخشنے والا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔''

لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَيۡنَكُمۡ كَدُعَآءِ بَعۡضِكُمۡ بَعۡضًا ؕ قَدۡ يَعۡلَمُ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ يَتَسَلَّلُوۡنَ مِنۡكُمۡ لِوَاذًا ۚ فَلۡيَحۡذَرِ الَّذِيۡنَ يُخَالِفُوۡنَ عَنۡ اَمۡرِهٖۤ اَنۡ تُصِيۡبَهُمۡ فِتۡنَةٌ اَوۡ يُصِيۡبَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۞ (نور:٦٣)

اپنے درمیان پیغمبرؐ کے پکارنے کو ایسا نہ سمجھو جیسے تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ خدا ان لوگوں کو جو پوشیدہ طریقے سے چھپ چھپا کر یکے بعد دیگرے فرار اختیار کرتے ہیں، پہچانتا ہے۔ وہ لوگ جو پیغمبرؐ کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں اس بات سے ڈریں کہ کہیں فتنہ انہیں دامن گیر نہ ہو جائے اور وہ دردناک عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔

(۱۳)

معاشرتی زندگی میں منافق کے ہتھیار

دو چہروں والے لوگوں کے لیے کسی دینی مکتب فکر کی اکثریت کے ساتھ زندگی بسر کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ ایک طرف تو وہ معاشرے میں روابط کو محفوظ رکھنے کی خواہش رکھتے ہیں اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس کے مخلص رُکن ہیں۔ یہاں تک کہ ان سے ایک قدم بھی پیچھے رہنا نہیں چاہتے۔ دوسری طرف وہ باطنی طور پر دین و مذہب پر ایمان نہیں رکھتے اور اکثریت سے تضاد، ٹکراؤ اور کش مکش میں مُبتلا رہتے ہیں۔

ایسی متضاد حیثیت کو بچا کر رکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ صحیح کام کر کے اس حیثیت کو کو محفوظ نہیں رکھا جا سکتا۔ لہٰذا زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ منافق کا راز فاش ہو جاتا ہے۔

اسی لیے منافق اپنی حفاظت کے لیے ایک خاص ہتھیار رکھتا ہے جس کے ذریعہ وہ ایک مدت تک اپنی منافقانہ زندگی کو جاری رکھ سکتا ہے قرآن اس ہتھیار کو دو طریقہ سے بیان کرتا ہے کبھی تو عمومی صورت میں ہتھیار کی نوعیت کی طرف اشارہ کیے بغیر، اور کبھی خاص طور پر اس ہتھیار کی نشان دہی کر کے اس کا تعارف کراتا ہے۔

پہلی قسم کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ۭ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۭ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ؀ (توبہ:٦٧)

”منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں (اور ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں) وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے روکتے ہیں۔ (راہ خدا میں) خرچ نہیں کرتے۔ انہوں نے خدا کو بھلا دیا ہے اور خدا نے بھی انہیں بھلا دیا ہے یقیناً منافق ہیں ہی فاسق۔“

يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ کا جملہ منافقین کی اخلاقی حدود کی ہماری نظر میں نشاندہی کرتا ہے۔ یعنی ان لوگوں سے، جن کی زندگی کا مقصد برائیوں کا حکم دینا اور نیکیوں سے روکنا ہو۔ کسی قسم کی خیر و بھلائی کی توقع رکھنا بے جا ہے۔

قرآن اِس نجاست کی وجہ سے، جس نے منافقین کی رُوح کو گھیرا ہوا تھا۔ انہیں سخت ترین لہجہ میں تہدید کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحَآدُّوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ کُبِتُوۡا کَمَا کُبِتَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ وَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ؕ وَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ۚ﴿۵﴾ (مجادلہ: ۵)

وہ لوگ جو خدا اور اس کے پیغمبرؐ کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں۔ کفارِ زمانہ ماضی کی طرح منہ کے بل (جہنم کی آگ) میں جھونک دیئے گئے ہیں ہم نے واضح آیات نازل کی ہیں اور کافروں کے لیے ذلیل وخوار کرنے والا عذاب ہے۔''

یَوۡمَ یَبۡعَثُہُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُہُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا ؕ اَحۡصٰہُ اللّٰہُ وَ نَسُوۡہُ ؕ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ٪﴿۶﴾ (مجادلہ۶)

''جس دن خدا ان سب کو زندہ کرکے) اُٹھا کھڑا کرے گا تو انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا۔ خدا نے تو منافقین کے اعمال کو شمار کر رکھا ہے، لیکن وہ خود انہیں فراموش کر چکے ہیں۔ اور خدا ہر چیز پر گواہ ہے۔''

یہ آیات تو ان کے اصلی کردار اور عمومی طریق کار کو بیان کر رہی ہیں لیکن دوسری آیات ان کی زندگی کی خصوصیات اور ان کے مخصوص ہتھیاروں کی طرف، جن سے وہ لیس رہتے تھے اشارہ کرتی ہیں۔ ہم ان آیات میں سے چند ایک بیان کرتے ہیں۔

۱: جھوٹی قسمیں

وہ لوگ آنحضرتؐ اور معاشرے میں اکثریت کی نگاہوں کو دھوکہ دینے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے تھے۔ مثلاً ''ہم مسلمان اور مومن ہیں'' جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَ یَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰہِ اِنَّہُمۡ لَمِنۡکُمۡ ؕ وَ مَا ہُمۡ مِّنۡکُمۡ وَ لٰکِنَّہُمۡ قَوۡمٌ یَّفۡرَقُوۡنَ ﴿۵۶﴾

(توبہ:۵۶)

''وہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہیں (مسلمانوں) میں سے ہیں۔ حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ایک مخالف گروہ ہیں۔''

قرآن سورہ منافقون میں ان کی جھوٹی قسموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ گروہ اپنی قسموں کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

اِتَّخَذُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ جُنَّۃً (منافقون:۲)

''انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے۔[۱]

۲: دھوکہ اور حیلہ سازی

قرآن دو مواقع پر ان کی دھوکہ بازی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

(بقرہ ۲:۹)

وہ (اپنے گمان میں) خدا اور اہل ایمان کو دھوکہ دیتے ہیں۔لیکن حقیقت میں وہ) اپنے سوا کسی کو بھی دھوکہ نہیں دیتے۔مگر وہ سمجھتے نہیں۔[۲]

منافقین کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ وہ دنیوی اغراض کی خاطر حیلے بہانے تراشتے تھے۔وہ اغراض یہ ہیں۔

الف: اِسلامی معاشرے میں، بالخصوص رسول اکرمؐ کے نزدیک محترم اور معزز سمجھے جائیں۔

ب: مسلمانوں کے رموز سے اچھی طرح آ گاہی حاصل کرکے ان کی گھات میں لگے رہیں۔اور مشرکین کو ان کی کمزوریوں سے آ گاہ کرتے رہیں۔

ج: جان و مال کی حفاظت کے بارے میں اطمینان کرنے کے علاوہ غنائم جنگی میں بھی شریک اور حصہ دار بن جائیں۔

قرآن اس قسم کے فریب کو خود منافقین کے لیے مُضر سمجھتا ہے اور یہ کہتا ہے: وہ خود اپنے آپ کو ہی دھوکہ دے رہے ہیں (وماوَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ) کیونکہ عذاب اُخروی ان کی گھات میں ہے۔نیز اس دنیا میں بھی دیر سے یا جلدی ان کی منافقت بے نقاب ہوجائے گی اور منافق کا چہرہ نمایاں ہوجائے گا۔''

قرآن کہتا ہے کہ بعض منافقین اس قدر شیریں زبان اور مکار ہیں کہ وہ اپنی گفتگو سے رسولِ اکرمؐ تک کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔حالانکہ وہ اسلام کے سخت ترین دشمن ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ (بقرہ ۲:۲۰۴)

---

[۱] قرآن نے مختلف سورتوں میں ان کی دیگر جھوٹی قسموں کی طرف اشارہ کیا ہے۔سورہ توبہ ۶۲۔۷۴ سورہ نور ۵۳ سورہ مجادلہ ۱۴،۱۹ کی طرف رجوع فرمائیں۔سورہ نور ۵۳ سورہ مجادلہ ۱۴،۱۹ کی طرف رجوع فرمائیں

[۲] سورہ نساء کی آیت ۱۴۲ کی طرف رجوع فرمائیں

''کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی باتیں اس حیاتِ دُنیوی میں آپ کو اچھی لگنے لگیں اور وہ خدا کو اس پر گواہ بناتے ہیں۔لیکن وہ بدترین دشمن ہیں۔''

منافقین کے ذلیل مزاج کی پستی اور کمینے پن کی دلیل یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رُسولؐ کے ساتھ دشمنی رکھتے تھے ہر قسم کے برے اعمال کا ارتکاب کرتے تھے اور کسی کارِخیر میں شرکت نہیں کرتے تھے لیکن پیغمبر اسلام سے کہتے تھے:۔

نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ

''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسُول ہیں۔''

۳: پیغمبرؐ کے خلاف خفیہ جلسے کرنا:

منافقین دن کے وقت تو آنحضرتؐ کی مجالس میں حاضر ہو کر آپ کے ارشادات سنا کرتے تھے۔لیکن آنحضرتؐ کے منصوبوں کی شکست کی خاطر سازش کرنے کے لیے رات کے وقت خفیہ جلسے کیا کرتے تھے۔تاکہ آپ کے لائحۂ عمل میں رکاوٹ پیدا کریں۔قرآن اس عمل کو تبییت کا نام دیتا ہے اور دو آیات میں اس کا ذکر کرتا ہے۔

يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾ (نساء:۱۰۸)

''اپنے کاموں کو لوگوں سے تو چھپاتے ہیں لیکن خُدا سے نہیں چھپا سکتے۔حالانکہ جب وہ رات کے وقت اپنے خفیہ جلسوں میں ناپسندیدہ باتیں کرتے ہیں تو خدا ان کے پاس ہی ہوتا ہے۔اور خدا ان کے کاموں پر احاطہ کیے ہوئے اور آگاہ ہے۔''

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِیْ تَقُوْلُ ؕ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾ (نساء:۸۱)

''وہ آپ کے سامنے تو اطاعت کا اقرار کرتے ہیں۔لیکن جب آپ کی محفِل سے باہر جاتے ہیں،تو ان میں سے ایک گروہ آپؐ کی باتوں کے خلاف رات کے وقت خفیہ جلسے کرتا ہے۔اور اپنے خفیہ جلسوں میں جو باتیں کرتے

ہیں خدا انہیں لکھ لیتا ہے۔ پس آپ ان سے منہ پھیر لیں (اور ان کی کوئی پروا نہ کریں) اللہ پر بھروسہ رکھیں اور خدا آپ کی مدافعت اور حمایت کے لیے کافی ہے۔"

منافقین ان قبیح اعمال کے باوجود بعض اوقات بڑی ڈھٹائی کے ساتھ رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اور اپنے خلاف اسلام افعال پر پردہ ڈالنے کے لیے آنحضرتؐ سے طلبِ مغفرت کی درخواست کرتے تھے۔ چونکہ ان کا مقصد طلب مغفرت نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ آنحضرت کو دھوکہ دینا چاہتے تھے لہٰذا خدا اپنے پیغمبر سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۸۰﴾ (توبہ:۸۰)

(اے پیغمبرؐ!) آپ ان کے لیے طلبِ مغفرت کریں یا نہ کریں۔ اگر آپؐ ان کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے تو خدا انہیں نہیں بخشے گا۔ کیونکہ انہوں نے خدا اور اس کے پیغمبر سے کفر کیا ہے۔ اور خدا فاسق جماعت کی ہدایت نہیں کرتا۔"

۴: مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا

منافقین مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے اہم کردار ادا کیا کرتے تھے۔ اس پھوٹ ڈالنے کا ایک نمونہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ قارئین "جنگِ احد" اور "جنگ" "بنی مصطلق" میں منافقین کے کردار کی تفصیل کی طرف رجوع فرمائیں۔

ذیل میں درج شدہ آیت اس بات کی ترجمانی کرتی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو ایسا فریب دیا تھا کہ آخرکار مسلمانوں کی ایک جماعت، منافقین کے بارے میں متحد نہ رہی، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے۔

فَمَا لَكُمۡ فِى الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِئَتَيۡنِ وَاللّٰهُ اَرۡكَسَهُمۡ بِمَا كَسَبُوۡا ؕ اَتُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَهۡدُوۡا مَنۡ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ سَبِيۡلًا ﴿۸۸﴾ (نساء:۸۸)

"تم منافقین کے بارے میں دو گروہ کیوں ہو گئے ہو؟ خدا نے انہیں ان کے قبیح اعمال کی بناء پر گمراہ کر دیا ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جس کو خدا نے گمراہ کیا ہے۔ انہیں ہدایت کرو۔؟ اور جسے خدا گمراہ کرو کر دے، اس کی ہدایت کے لیے تمہیں کوئی راہ نہیں ملے گی۔"

۵: اِسلامی شریعت میں شک ڈالنا:

منافقین کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ طرح طرح کے بہانوں سے شریعت اسلامی کی صحت میں شک پیدا کریں اور انجام کار قوانین اسلام کے بارے میں مسلمانوں کے پاک اعتقاد کو برباد کردیں۔ تاریخ نے اس سلسلہ میں کئی نمونے بیان کیے ہیں، جن میں سے ہم بعض کا ذکر کرتے ہیں۔

الف: زینب کے ازدواج کی داستان

زید بن حارثہ کو زمانہ جاہلیت میں آنحضرتؐ نے منہ بولا بیٹا کہا تھا۔ اس نے آنحضرتؐ کی ہدایت پر آپؐ کی پھوپھی کی لڑکی سے شادی کرلی۔ لیکن میاں بیوی میں اتفاق نہ ہوسکنے کی وجہ سے انجام کار علیحدگی ہوگئی۔ زمانہ جاہلیت کے عربوں میں رواج تھا کہ منہ بولے بیٹے کی بیوی، طلاق کے بعد، حقیقی بیٹے کی بیوی کی طرح منہ بولے باپ پر حرام سمجھی جاتی تھی۔ قرآن نے اس قسم کی جاہلانہ رسم کو باطل کرنے کے لیے پیغمبرؐ اکرم کو حکم دیا کہ وہ زینبؓ کے ساتھ شادی کرلیں، تاکہ یہ پرانی رسم آنحضرتؐ کے اس اقدام سے باطل ہوجائے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ (احزاب:۳۷)

جب زید نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو ہم نے اس کو آپؐ کے عقد میں لانے کا حکم دیا، تاکہ منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں طلاق کے بعد ہر قسم کی (جاہلانہ) رکاوٹ ختم کردی جائے۔''

ب: تحویل قبلہ کی داستان

مسلمان ہجرت کے بعد سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے رہے سترہ ماہ کے بعد حکمِ الٰہی نازل ہوا کہ مسلمان مسجد الحرام کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھا کریں۔

اب تحویل قبلہ کے بارے میں بھی ازدواج زینبؓ کی طرح منافقین نے سب سے زیادہ شور مچایا اور آنحضرتؐ کی شریعت کو تضادِ بیان کے ساتھ متہم کیا۔ قرآن تحویل قبلہ کے سلسلہ میں منافقین کی تنقید کی پیش بینی کے عنوان سے اس طرح فرماتا ہے۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَاۗءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۴۲

(بقرہ:۱۴۲)

لوگوں میں سے کچھ بے وقوف عنقریب یہ کہیں گے کہ مسلمانوں کو پہلے قبلہ سے کس چیز نے منحرف کیا ہے کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب خدا ہی کے ہیں اور وہ جسے چاہے صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔''

اور منہ بولے بیٹے کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے۔

وَمَا جَعَلَ اَدۡعِيَآءَكُمۡ اَبۡنَآءَكُمۡ‌ ؕ ذٰلِكُمۡ قَوۡلُكُمۡ بِاَفۡوَاهِكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوۡلُ الۡحَـقَّ وَهُوَ يَهۡدِى السَّبِيۡلَ ۝۴ (احزاب:۴)

''اور تمہارے منہ بولے بیٹے ہرگز تمہارے حقیقی نہیں ہیں۔ یہ تو تمہارے کہنے کی بات ہے۔ خدا تو حقیقت بیان کرتا ہے اور وہی راہِ راست کی ہدایت کرتا ہے۔

٦: مقدسات کا استہزاء

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ علمی طور پر کمزور لوگ جو منطق و دلیل سے عاری ہوتے ہیں ہمیشہ منطقِ قوی کے سامنے لاجواب ہو کر حقیقت کو تسلیم کرنے کے بجائے اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں اور اس طرح حق کو پامال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

صدرِ اسلام کے منافقین اسلام کے روزمرہ عروج و عظمت کا مشاہدہ کر رہے تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ قرآنی منطق کی شرینی اور استحکام کے باعث ہر روز کوئی نہ کوئی جماعت حلقہ بگوشِ اسلام ہو رہی ہے۔ ایسے ہی موقع پر لاجواب ہو کر وہ لوگ ٹھٹھہ کرنے اور مذاق اڑانے لگتے اور کہتے تھے۔

وَاِذَا مَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَةٌ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ اَيُّكُمۡ زَادَتۡهُ هٰذِهٖۤ اِيۡمَانًا‌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فَزَادَتۡهُمۡ اِيۡمَانًا وَّهُمۡ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ۝۱۲۴ (توبہ:۱۲۴)

''جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تو منافقین کی ایک جماعت پوچھتی کہ اس آیت نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا ہے؟ (آپ کہہ دیجئے) جو لوگ ایمان لائے ہیں۔ (آیت نے) ان کے ایمان میں اضافہ کیا ہے اور وہ خوش ہوئے ہیں۔''

آیاتِ الٰہی بارش کی طرح باصلاحیت زمینوں اور پاک دلوں میں اثر کرتی ہیں۔ لیکن جن دلوں میں منافقت بھری ہوتی ہے ان میں ان سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ منافقین ہمیشہ اس بات سے خوفزدہ رہتے تھے کہ کہیں کوئی ایسی آیت نازل نہ ہو جائے جو ان کے تمام فاسد ارادوں اور قبیح افعال کو بے نقاب کر دے اور وہ رسوا اور ذلیل ہو کر رہ جائیں۔

ارشاد ہوتا ہے:۔

يَحۡذَرُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ اَنۡ تُنَزَّلَ عَلَيۡهِمۡ سُوۡرَةٌ تُنَبِّئُهُمۡ بِمَا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ‌ؕ قُلِ اسۡتَهۡزِءُوۡا‌ ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخۡرِجٌ مَّا تَحۡذَرُوۡنَ۝۶۴ (توبہ:۶۴)

''منافقین اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی ایسی سورت نازل نہ ہوجائے جو ان کے دلوں کی پوشیدہ باتوں کی خبر دے۔ کہہ دیجئے تم تمسخر کرتے رہو اور مذاق اڑاتے رہو۔ خدا اس چیز کو جس سے تم ڈرتے ہو ضرور آشکار کرے گا۔''

۷: منفی پروپیگنڈا

ہر زمانے میں زہریلے پروپگنڈے کو مخالفین بطور ہتھیار استعمال کرتے رہے ہیں۔ اس زمانہ میں پروپیگنڈا ے کو موثر وعظیم حربہ کے طور پر، تمام حکومتیں استعمال کرتی ہیں۔ بلکہ عوام مخالف بعض طاقتوں اور صاحبانِ اقتدار کی بقاء تو صرف جھوٹے اور گمراہ کُن پروپیگنڈے کی ہی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر پروپیگنڈے کے ذرائع ان کے پاس نہ ہوتو ان کی مادی قوت ختم ہوکر تباہ و برباد ہوجائے۔

عصرِ رسالت کے منافقین بھی، موجودہ زمانہ کے سیاستدانوں کی طرح، اسی حربہ کو استعمال کرتے تھے۔ پھر بعض لوگوں کے اثر قبول کرلینے کی وجہ سے وہ اسلام کی طرف سے لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے اور قلوب کو کمزور کرنے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ اس طرح وہ پورے ماحول میں، اسلام اور شرک کی طاقت اور قوت میں توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ بالخصوص جبکہ بعض مسلمان بھی نفاق کے سرغنوں کے ساتھ وابستگی رکھتے تھے، اور انہیں بنظرِ احترام دیکھتے تھے۔

منافقین ایسی خبریں نشر کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے جو قلوب کو ہراساں کرنے والی ہوں اور لوگوں کو خوفزدہ کردیں۔ مثلاً کسی چھوٹی سی شکست کو بڑا کرکے بیان کرتے، اور اس طرح لوگوں کے دلوں کو کمزور کرتے۔ اگر مسلمانوں کو قوت اور کامیابی حاصل ہوتی اور وہ حالات پر قابو پالیتے۔ تو منافق فوراً دشمنوں کو مطلع کردیتے تاکہ وہ اسلام کی قوت کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ تیاری کریں۔

قرآن اس سلسلہ میں کہتا ہے:

وَاِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَـوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ‌ؕ وَلَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَى الرَّسُوۡلِ وَاِلٰٓى اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ‌ؕ (نساء:۸۳)

''جب ان کے پاس طاقت یا کمزوری کی کوئی خبر پہنچی تو وہ فوراً اسے مشہور کردیتے ہیں، اور اگر وہ اسے پیغمبرؐ یا اپنے میں سے صاحبِ فرمان لوگوں کے پاس پہنچادیتے تو ''نتائج اخذ کرنے والے'' اس کا اچھی طرح سے تجزیہ وتحلیل کرتے تھے۔''

۸: مسلمانوں کی سرزنش

دوسروں کی مصیبت پر خوشی منانا، عاجز و ناتواں لوگوں کا شعار ہوتا ہے جو لوگ مخالف سے مقابلہ کی طاقت اور ہمت نہیں رکھتے وہ ہمیشہ اپنے مخالف پر کسی مصیبت کے وارد ہونے کے منتظر رہتے ہیں تا کہ وہ اسی پر خوشی منائیں۔ عصرِ رسالت کے منافقین کی بھی یہی حالت تھی۔

قرآن ان کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے:

اِنۡ تُصِبۡكَ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡكَ مُصِيۡبَةٌ يَّقُوۡلُوۡا قَدۡ اَخَذۡنَاۤ اَمۡرَنَا مِنۡ قَبۡلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمۡ فَرِحُوۡنَ۝ (توبہ:۵۰)

''جب آپ کو کامیابی حاصل ہوتی ہے تو انہیں بُرا لگتا ہے، اور اگر آپ پر کوئی مصیبت (جنگ میں شکست) نازل ہوتی ہے تو کہتے ہیں: ہم نے تو پہلے سے ہی تدبیر اختیار کر لی تھی۔ (پیش بینی کی ہوئی تھی) پھر وہ مسلمانوں کی طرف سے پیٹھ پھیر لیتے ہیں درآنحالیکہ وہ خوش ہو رہے ہوتے ہیں۔''

اہل ایمان جانتے ہیں کہ حق کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ ہی کامیاب ہو، کیونکہ بعض اوقات ہوسکتا ہے کہ خاص حالات کے باعث مکتب حق شکست سے دوچار ہو جائے۔ یا مکتب باطل میں وقتی طور پر جوش و خروش پیدا ہو۔ اسی لیے قرآن اس بارے میں فرماتا ہے:۔

اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ۫ وَاِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٌ يَّفۡرَحُوۡا بِهَا ؕ وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا لَا يَضُرُّكُمۡ كَيۡدُهُمۡ شَيۡـئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطٌ۝ (آلِ عمران:۱۲۰)

''جب تمہیں کامیابی ہوتی ہے تو وہ غمگین ہو جاتے ہیں۔ اور اگر تمہیں کوئی ناگوار حادثہ پیش آ جائے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ پس اگر تم استقامت سے کام لو اور تقویٰ اختیار کرو، تو ان کے (منافقین کے) حیلے بہانے تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچائیں گے۔ خدا اس چیز پر، جسے وہ انجام دیتے ہیں محیط اور آگاہ ہے۔''

جن دنوں رُسولِ اکرمؐ مسجد مدینہ کی تعمیر فرما رہے تھے۔ آپ کا ایک مخلص صحابی جس کا نام ''اسعد بن زرارہ'' تھا اور جو قبیلہ ''بنی نجار'' کا سردار تھا۔ اچانک فوت ہو گیا۔ اس موقع پر مدینہ کے یہودی اور منافقین خوشی منانے لگے، اور بچوں کی طرح خوش ہو کر کہنے لگے کہ اگر اس شخص کی دعوت میں حقیقت ہوتی تو اس کا نزدیک ترین دوست نہ مرتا۔ گویا موت افرادِ انسانی کے لیے ایک حتمی قضا نہیں ہے۔

(۱۴)

عہدرسالت میں

منافقت کے بارے میں چند اہم سوالات

عہد رسالت میں منافقین کے حالات سے ہم واقف ہو چکے ہیں۔ یہ واضح ہو چکا کہ اگرچہ منافقین کے رئیس کی موت سے منافقین کا شیرازہ بکھر گیا۔ تاہم اصل نفاق مسلمانوں میں ختم نہیں ہوا، بلکہ اس نے اپنی شکل بدل لی۔

یہ ٹھیک ہے کہ مسلمانوں کی کشور کشائی اور فتوحات کے نتیجہ میں ماضی کے مذاہب اور شرائع کے پیروان مائل بہ اسلام ہوئے۔ یہود ونصارٰی، اہل ہنود وزرتشت ومزوک وغیرہ، اور دیگر مذاہب کے بہت سے پیرو کار اسلام لے آئے اور اپنے سابقہ عقائد کو خیر باد کہہ دیا اگرچہ ان لوگوں کی اکثریت نے مخلصانہ طور پر اسلام قبول کیا۔ تاہم ان کے درمیان ایسی اقلیتیں بھی موجود رہیں جو قلبی طور پر اپنے پہلے عقاید سے مکمل طور پر دستبردار نہ ہوئے بلکہ ظاہری طور پر اسلام کے معترف ہوئے۔ یہ لوگ حساس مواقع پر اپنے گذشتہ عقاید کی حمایت سے غافل نہیں رہتے۔ یہی وہ شبہات تھے جو علم کلام فلسفہ کے مکاتب کی پیدائش کا مبداء بنے، اور ملتِ واحدہ کے درمیان بہتر یا اس سے بھی زیادہ فرقے پیدا کرنے کے ذمہ دار ہوئے۔

مسلمانوں کی سیاسی یا علمی تاریخ کی ابھی ایک یا دو صدیاں بھی نہیں گذری تھیں کہ عراق، حجاز اور شام میں کئی مذاہب پیدا ہو گئے، فروع واصول میں مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ ان اختلافات کا بہت بڑا سبب مسلمانوں کی صفوں میں دنیا کی اقوام کا مختلف اور گونا گوں عقاید کے ساتھ داخل ہونا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے گذشتہ عقاید سے دستبردار نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ ابھی ان پر قائم تھے۔ لیکن ظاہری طور پر قرآن پڑھتے اور فرائض اِسلامی پر قائم رہنے کا مظاہرہ کرتے تھے۔

ملتِ اِسلامی کی تاریخ کا یہ حصہ بہت زیادہ تحقیق کا محتاج ہے۔ تاہم اس وقت ہمارے سامنے عہدِ رسالت کے منافقین کے بارے میں سوالات کا ایک سلسلہ ہے جن کا یہاں جواب دینا ضروری ہے۔

۱: منافق کی تعریف:

عربی لغت لکھنے والے اس سوال کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

''نفاق'' 'نافقا' کے مادہ سے ہے جو جنگلی چوہے کے بل کے دو سوراخوں میں سے ایک کو کہتے ہیں۔ یہ جانور اپنا بل بناتے ہوئے زمین میں سوراخ کرتا ہے اور اتنا آگے چلا جاتا ہے کہ پھرنئے سرے سے سطحِ زمین تک پہنچ جاتا ہے پھر اس کو نرم کرتا ہے لیکن ختم نہیں کرتا۔ جب اُسے بل میں کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے، تو وہ فوراً سطح زمین کے نرم حصہ کو ہٹا کر اس راستہ سے بھاگ جاتا ہے۔ پہلے سوراخ کو 'نافقا' اور دوسرے کو

'قاصعا' کہتے ہیں۔ بل کا دوسرا حصہ بظاہر تو مٹی ہی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے نیچے ایک گہرا گڑھا ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے منافق کا ظاہر ایمان اوراس کے اندر کفر ہوتا ہے۔[۱]

۲: مُنافقت۔ قرآن کی نظر میں

قرآن نے سورۂ بقرہ کے شروع میں لوگوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی مومن کافر اور منافق۔ پہلے گروہ یعنی منافقین کا چار آیات میں ذکر کیا ہے۔ دُوسرے گروہ کے لیے وہ آیات پر قناعت کی ہے۔ لیکن منافقین کی حالت کے بارے میں تیرہ آیات میں تشریح وتفصیل بیان کی ہے۔ جن میں ان کی صفات وحالات کو واضح کیا ہے۔ اس بارے میں دو بہت ہی عجیب مثالیں بیان کی ہیں۔[۲]

کچھ لوگوں نے مسئلہ میں اس قدر تحقیق کی ہے کہ ان کا دعوٰے ہے کہ منافقین سے متعلق تمام آیات مجموعی طور پر قرآن کا دسواں حصہ ہیں۔[۳] قرآن میں نفاق کی طرف اتنی توجہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ منافق کا خطرہ کافر کے خطرہ سے زیادہ ہے اوراس کی وجہ واضح ہے۔

اولاً: کافر مسلمان کو فریب نہیں دیتا۔ جبکہ منافق کا فریب کے سوا اور کوئی مقصد ہی نہیں ہوتا نتیجہ یہ ہے کہ پہلا دشمن تو جانا پہچانا ہوتا ہے اور وہ اپنی دشمنی کے باعث مسلمانوں سے جنگ کرتا ہے۔ لیکن دوسرا دشمن یعنی منافق کھلا ہوا دشمن نہیں ہوتا وہ ایک دوست نما دشمن ہوتا ہے جو دوستی کے مورچے سے پیچھے سے خنجر گھونپتا ہے، اور کوشش کرتا ہے کہ غفلت سے فائدہ اٹھا کر غالب آ جائے۔

ثانیاً: کافر میں اتنی جرات اور ہمت ہوتی ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کو پیش کرے، لیکن منافق میں کوئی جرات اور ہمت نہیں ہوتی، وہ خوف اور دہشت میں گھرے ہونے کی وجہ سے اپنے عقیدہ کو بیان نہیں کرسکتا۔ اگرچہ ذہنی خلفشار کی وجہ سے بعض اوقات اپنی ذہنی کیفیت کو ظاہر بھی کر دیتا ہے، جبکہ وہ خُدا اور آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے۔

قُلۡ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوۡلِهٖ كُنۡتُمۡ تَسۡتَهۡزِءُوۡنَ﴿۶۵﴾ (توبہ:۶۵)

کہہ دیجئے۔ کیا تم خدا، اس کی آیات اوراس کے پیغمبر کا مذاق اُڑاتے ہو۔"

۳: کیا منافقین کی پہچان ہوگئی تھی؟

عہدِ رسالت کے منافقین ایک یا دو قبیلوں کی ایک یا دو شاخوں سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ اوس وخزرج قبیلوں کی تمام شاخوں میں منافقین موجود تھے۔

جیسا کہ یہودیوں کے تینوں قبائل (بنی قینقاع۔ بنی نضیر اور بنی قریظہ) میں بھی منافق موجود تھے۔ جو اسلام کا اظہار کرتے تھے۔

---

[۱] لسان العرب، مادہ نفق

[۲] بقرہ ۸: ۲۰

[۳] النفاق والمنافقون ص ۱۹۱

منافقین کا بڑا اہم حصہ مدینہ کے اطراف میں بسنے والے عربوں اور بدوؤں پر مشتمل تھا۔ ان سب میں ایک ہی قدر مشترک تھی اور وہ پیغمبر کے خلاف ان کا اتحاد تھا۔ لیکن کسی متحدہ محرک (آئیڈیالوجی) ”نظریہ“ کے فقدان کی وجہ سے غیر منظم تھے۔ اسی وجہ سے قرآن کہتا ہے۔

تَحۡسَبُهُمۡ جَمِيۡعًا وَّقُلُوۡبُهُمۡ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡقِلُوۡنَ ۚ﴿۱۴﴾ (حشر: ۱۴)

”لوگ انہیں مُتحد خیال کرتے ہیں، حالانکہ ان کے دل پراگندہ ہیں کیونکہ وہ بے عقل لوگ ہیں۔“

اگرچہ منافقین کا رئیس اور سرغنہ مثلاً عبداللہ بن ابی جانا پہچانا منافق تھا۔ تاہم ان کے ارکان اور طرفدار منافقت کے پردے میں پنہاں تھے۔ یہ لوگ ناگوار وواقعات اور حوادث کے ذریعہ آہستہ آہستہ پہچانے جاتے تھے۔ ان میں بعض جنگِ بدر، اُحد احزاب اور تبوک میں بے نقاب ہوئے۔[1]

اس کے باوجود وہ اپنے نفاق کو چھپانے کی جتنی بھی کوشش کرتے ان کا طرز گفتگو ان کے نفاق کو ظاہر کر دیتا تھا۔ چنانچہ اس بارے میں قرآن کہتا ہے:۔

وَلَوۡ نَشَآءُ لَاَرَيۡنٰكَهُمۡ فَلَعَرَفۡتَهُمۡ بِسِيۡمٰهُمۡ ؕ وَلَتَعۡرِفَنَّهُمۡ فِىۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اَعۡمَالَكُمۡ ﴿۳۰﴾ (محمد: ۳۰)

”اگر ہم چاہیں، تو ہم تمہیں ان کی نشاندہی کر دیں اور تم ان سب کو ان کی (اصل) شکل وصورت میں پہچان لو، لیکن تم ان کے بات کرنے کے طریقہ سے ہی انہیں پہچان لو گے، اور خدا تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔“

قرآن یہ بھی فرماتا ہے:۔

وَمِمَّنۡ حَوۡلَكُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ مُنٰفِقُوۡنَ ۛؕ وَمِنۡ اَهۡلِ الۡمَدِيۡنَةِ ۛؔ مَرَدُوۡا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعۡلَمُهُمۡ ؕ نَحۡنُ نَعۡلَمُهُمۡ ؕ (توبہ: ۱۰۱)

اہل مدینہ میں کچھ لوگ اپنی منافقت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ تم تو انہیں نہیں پہچانتے مگر ہم انہیں پہچانتے ہیں۔“

لیکن آیت کا مفاد اس بات سے مانع نہیں ہے۔ کہ آنحضرتؐ انہیں کسی اور طریقہ سے نہ پہچان لیں۔

۴: کیا یہ تینوں حالتیں مُنافقت کی علامت نہیں ہیں؟

محدثین اسلام رسول اکرم سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

[1] آلِ عمران ۱۶۶، ۱۶۷،　توبہ ۱۶ کی طرف رجوع کریں۔

تین خصلتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں بھی پائی جائیں، وہ منافق ہے، خواہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزے رکھتا ہو، اور یہ سمجھتا ہو کہ وہ صاحبِ ایمان ہے۔

۱: وہ شخص جو پیغام رسانی میں جھوٹ بولے۔

۲: وعدہ کر کے ایفا نہ کرے۔

۳: اور جب اسے امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔[۱]

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:۔

اگر یہ تینوں خصائل نفاق کی علامت سمجھے جائیں گے اور ''واصل بن عطائ'' کی اس اس حدیث کی تعبیر کے مطابق حضرت یعقوبؑ کے تمام بیٹوں کو منافق کہا جائے گا۔ کیونکہ ان میں یہ تینوں خصلتیں موجود تھیں۔

۱: انہوں نے خبر دی اور جھوٹ بولا۔اَكَلَهُ الذِّئْبُ'' (یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا ہے)۔

۲: انہوں نے وعدہ کیا لیکن اس سے پھر گئے۔ کیونکہ انہوں نے کہا تھا:

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (ہم اس کی حفاظت کریں گے) لیکن نہ کی۔

۳: انہیں امین بنایا گیا، لیکن انہوں نے امانت میں خیانت کی اور یوسفؑ کو کنوئیں میں پھینک دیا۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ۔انہوں نے اُسے کنوئیں میں ڈال دینے پر اتفاق کرلیا۔

محدثین اسلام اس حدیث کی تفسیر میں شش و پنج میں مبتلا ہیں اور انہوں نے اس کی مختلف تعبیریں کی ہیں: مثلاً

صحیح بخاری کے مولف نے ظاہر حدیث کو لیا ہے اور ان تینوں خصائل کے حامل افراد کو منافق کہا ہے۔

بعض دیگر محدثین نے ان تینوں حالتوں کو عہدِ رسالت کے منافقین کی مخصوص علامات جانا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حدیث کا مفہوم مومن کی منافق سے تمیز کے لیے کوئی حرف آخر نہیں، بلکہ یہ وہ خالص حالت ہے جو عہد رسالت کے منافقین سے متعلق ہے، اس لیے کہ اس زمانہ کے منافقین میں یہ تینوں خصائل پائے جاتے تھے۔ جن سے انہیں پہچانا جا سکتا تھا۔ ایسا نہیں کہا جا سکتا کہ جو بھی ان صفات کا حامل ہو خواہ خدا اور سول پر ایمان رکھتا ہو وہ منافق ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ہر حدیث کی اسناد کو تلاش کیا ہے۔

بعض نے حدیث کے معنی میں تصرف کیا ہے اور کہا ہے کہ اس سے مراد خدا کی جانب سے خبر دینے میں جھوٹ کہنا ہے۔ درحقیقت اِذَا حَدَّثَ عَنِ اللهِ كَذَبَ[۲]

---

[۱] سفینۃ البحار ج ۲ ص ۵، ۶ (مادہ نفاق) سنن نسائی ج ۷ ص ۱۱۶۔ باب علامۃ المنافق ثلاثہ من کن فیہ فھو منافق وان صام وصلّٰی وزعم انہ مؤمن: اذا حدث کذب واذا وعد اخلف، واذا ائتمن خان۔

[۲] سیوطی کی شرحِ سنن ترمذی

یہاں ان تین توجیہات کے علاوہ دیگر توجیہات بھی ہیں جن کے بیان کرنے سے ہم صرفِ نظر کرتے ہیں۔

منافقت کے دوسرے مقامات بھی ہیں جن میں ایک دوسرے کے درمیان فرق واضح ہے۔مثلاً ریا کاری مراتب منافقت میں سے ہے جبکہ منافقت کی حقیقت اس میں منافق کی نسبت کمزور ہوتی ہے اس پہلو پر توجہ کرتے ہوئے اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے۔یعنی سوال واعتراض کی بنیاد صرف ایک ہی مطلب پر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ تصور کرلیا گیا ہے کہ منافقت کا صرف ایک ہی مطلب اور ایک قسم ہے جو یہ ہے کہ اسلام کا اظہار کرے جبکہ باطن میں کافر ہو۔

منافقت کے اقسام میں ایک یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے محبت کا دعویٰ کرتا ہو حالانکہ وہ دل میں اُسے دشمن رکھتا ہو۔ظاہر میں صلاح وفلاح کا اظہار کرتا ہو لیکن باطن میں فاسق وبدکار ہو۔

اس بناء پر منافقت کا لفظ وسیع معنی پر محیط ہے اب اس کی یہ سب اقسام بھی منافق میں پائی جاتی ہیں۔اس حدیث کے سلسلہ میں منافقت کا لفظ اس بناء پر صادق آتا ہے، کہ انسان اسلام وایمان کا مدعی ہو، جبکہ اس کا عمل اس کے خلاف گواہی دے۔

اس سے زیادہ واضح منافقت اور اس سے زیادہ روشن دورُخی اور کیا ہوگی۔کہ دعویٰ تو خدا پر ایمان اور مخالفتِ خُدا سے خوف رکھنے کا ہو، لیکن عملاً اس کے مخالف چلتا ہو۔

دوسرے لفظوں میں منافقت کبھی تو عقیدہ کے ساتھ مربوط ہوتی ہے۔اور کبھی عمل کے ساتھ۔ان تینوں صفات کے حامل اگرچہ عقیدہ اور نظریہ کے لحاظ سے منافقت نہ رکھتے ہوں۔تاہم عملی طور پر منافق ہی ہوتے ہیں۔اور ایک لحاظ سے دورُخے ہوتے ہیں۔کیونکہ اللہ پر ایمان اور خدا کے خوف کا دعویٰ کہاں اور دروغ گوئی اور مسلمانوں سے خیانت کہاں۔

۵: صحیح وسَالم اور مُردہ و بیمار قلُوب

قرآن انسانوں کے قلوب کو، جو ان کی مادی ومعنوی زندگی کے مظہر ہوتے ہیں، تین اقسام میں تقسیم کرتا ہے۔ اور ان کی ''سلیم''، ''میت'' اور ''بیمار'' کے الفاظ سے تعریف کرتا ہے۔

'قلب سلیم' سے مراد وہ قلب ہے جو خُدا کے امرونہی کی ہر قسم کی مخالفت سے پاک اور مبرّا ہو، جیسا کہ فرماتا ہے:۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾

(شعراء:۸۸،۸۹)

''اس دن مال واولاد کچھ فائدہ نہیں دیں گے سوائے اس شخص کے جو خدا کی طرف پاک اور مخالفت سے مبرّا دل لے کر جائے۔

قلبِ ''میت'' سے مُراد، جسے قرآن ''قلوبِ قاسیہ'' کے ساتھ تعبیر کرتا ہے یہ ہے کہ وہ اپنے خدا کو نہ پہچانے اور نہ اس کی پرستش

کرے، اور شہوات اور لذات دنیوی کے سامنے خدا کی رضا اور ناراضی اس کے پیش نظر نہ ہو۔

''قلب بیمار'' سے مراد وہ نیم زندہ دل ہے جو حق کی اطاعت کی کشش اور حق سے لگاؤ تو رکھتا ہے لیکن شہواتِ دنیوی کے مقابلہ میں اختیار کی مہار ہاتھ سے چھوڑ دے اور شیطان کے جال میں پھنس جائے۔

قرآن ذیل کی آیت میں ان دونوں قلوب کا بیان ایک ہی جگہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ (حج:۵۳)

''تاکہ اس چیز کو، جسے شیطان القاء کرتا ہے، ان لوگوں کے لیے امتحان کا سبب قرار دے، جن کے دلوں میں بیماری (گناہ) ہے اور ان لوگوں کے لیے بھی جو قسی القلب اور سنگدل ہیں۔ بے شک ظالم لوگ سخت عداوت رکھنے والے ہوتے ہیں۔''

القاسیہ قلوبھم سے مراد وہی مردہ قلوب ہیں جس میں خدا کی معرفت اور ذمہ داری کا احساس بالکل نہیں ہوتا اور پتھر کی طرح بے حس وحرکت ہوتے ہیں۔ یہاں ایک نکتہ کا ذکر کرنا انتہائی ضروری ہے وہ یہ کہ بعض اوقات قرآن ''منافقین'' کو ان لوگوں کے مطابق قرار دیتا ہے جن کے دلوں میں بیماری ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (انفال:۴۹)

''جب منافقین اور وہ لوگ کہ جن کے قلوب میں بیماری ہے، یہ کہیں گے۔ [1]

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ (بقرہ:۱۰)

''ان کے دلوں میں بیماری ہے، اور اللہ نے بھی ان کی بیماری میں اضافہ کر دیا ہے۔''

لیکن یہ اختلاف منافقت کے درجات ومراتب میں اختلاف کی وجہ سے ہے۔ جس دل میں معیارِ منافقت جس قدر شدید ہوگا۔ یقینا اتنا ہی دل مُردہ ہوگا، حتیٰ کہ وہ شخص سنگ دل کہلائے گا۔ لیکن جہاں معیار منافقت مقابلتاً کم تیز اور کم شدید ہو، تو اس کو مریض زندہ کہنا چاہیے، جس کا قلب ہر قسم کی کشش کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ خدا کی طرف کشش رکھتا ہے اور دوسرے جانب اس کی عقل وخرد شہوات کے وام میں اسیر ہوتی ہے۔

اختتام بحث نفاق ومنافقین بحوالہ قرآن

---

[1] توبہ:۵۲۱۔ نور۔۰۵۔ محمد ۲۹ کی طرف رجوع فرمائیں

دوسرا حصہ

شناختِ اِنسان
بہ نظرِ قرآن

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝٢٠ وَفِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝٢١

قرآن مجید۔سورہ ذاریات

''اہل ایمان وایقان کے لیے زمین میں اور خود تمہاری پیدائش میں نشانیاں موجود ہیں پھر تم غور وفکر کیوں نہیں کرتے۔''

معصومینؑ کے اِرشادات کے مُطابق

تعارفِ انسان

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:۔

اَعۡلَمُکُمۡ بِنَفۡسِہٖ اَعۡلَمُکُمۡ بِرَبِّہٖ

''تم میں اپنے نفس کے متعلق سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہی اپنے پروردگار کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھتا ہے۔''[۱]

امیر المومنین علیؑ فرماتے ہیں۔

اَمۡ ھٰذَا الَّذِیۡٓ اَنۡشَاَہٗ فِیۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡحَامِ، وَشُغُفِ الۡاَسۡتَارِ نُطۡفَۃً دِھَاقاً، وَعَلَقَۃً مُّحَاقاً، وَجَنِیۡناً وَّرَاضِعًا، وَوَلِیۡدًا وَّ یَافِعًا، ثُمَّ مَنَحَہٗ قلباً حَافِظاً وَّ لِسَاناً لَّافِظاً وَّ بصراً لَّاحِظًا لِیَفۡھَمَ مُعۡتَبِراً وَّ یُقۡصِرَ مُزۡدَجِراً۔[۲]

یہ وہی انسان ہے جسے رحم کی تاریکیوں میں اور شکم مادر کے تہ در تہ غلافوں میں گرائے ہوئے نطفہ اور نامکمل بستہ خُون سے جنین کی شکل میں لایا گیا تھا۔ پھر اُس نے نوزائیدہ شیر خوار کی صُورت اختیار کی۔ پھر آہستہ آہستہ بچپن اور جوانی تک پہنچا، اس کے بعد اسے ایک محفوظ اور اسرار کی نگہداری کرنے والا قلب، زبانِ گویا اور چشمِ بینا عطا کی گئی تا کہ وہ قوتِ ادراک سے کام لے۔ عبرت حاصل کرے۔ اور برائیوں سے دوری اختیار کرے، اس حال میں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی منہیات کو قبول کرے۔ یہاں تک کہ یہ حدِ کمال کو پہنچ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تو اُس نے تکبّر شروع کر دیا اور بے پروا ہو کر بے راہروی میں قدم رکھ دیا۔

---

[۱] امالی مرتضیٰ ج ۲ ص ۲۲۹

[۲] نہج البلاغہ خطبہ ۸۰

(۱۵)

اِنسان کی شناخت بحوالہ قرآن

زمانے کا گذرنا، اور علوم وافکار کا تکامل وارتقاء اور انسان کی نئے نئے علوم پر دسترس عموماً جہانِ انسانی کے بارے میں گذشتہ دانشوروں کے افکار ونظریات کو بھلا دیتے ہیں۔ یا کم از کم ان کی طرف توجہ اور ان کی قدر ومنزلت میں کمی کر دیتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو علم ودانش کا قافلہ تکامُل وارتقاء کی راہ کو طے نہ کرتا۔ تاہم اسی عرصہ میں بہت سے افکار نظریات ایسے بھی ملتے ہیں کہ زمانے کے گذرنے سے نہ صرف یہ کہ ان کی قدر وقیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ ان کی عظمت میں مزید اضافہ ہوا ہے نمونے کے طور پر ان میں سے معرفتِ نفس کے مسئلہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

کہتے ہیں ایک روز سُقراط نے یونان کے ایک عبادت خانہ کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا۔ ''خود پہچان'' اس جُملہ نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ اس فلسفہ کو آسمان سے زمین پر لے آیا، اُس نے کہا:۔

فائدہ مند علم یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ ہم کیا ہیں؟ ہمیں کس لیے پیدا کیا گیا ہے؟ ہم کیا کریں کہ خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی سُودمند بن جائیں؟

وہ ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا۔''

''سب سے افضل ترین دانش خودشناسی اور علم واخلاق کو کہتے ہیں۔''

انسان کی شناخت ایسا مسئلہ ہے جو تمام انسانوں کے سامنے آتا ہے، وہ سوالات جو انسانی معاشروں کو در پیش رہے ہیں وہ درج ذیل تین مسائل کے گرد گھومتے ہیں:۔

۱: ہم کہاں سے آئے ہیں؟

۲: ہم کس لیے آئے ہیں۔

۳: ہمیں کہاں جانا ہے؟

حافظ شیرازی جو بیدار اور آگاہ انسانوں کے دل کی آواز ہے، اس سلسلہ میں کہتا ہے:۔

از کجا آمدہ ام ، آمدنم بہر چہ بود!

بہ کجا می رُوم آخر، نہ نمائی وطنم

''میں کہاں سے آیا ہوں اور میرے آنے کا مقصد کیا تھا، مجھے آخر کہاں جانا ہے میرا وطن مجھے نظر نہیں آتا۔''

انسان کے بارے میں جدید انکشافات نے انسان کو دُنیا کے عظیم مفکرین کے سامنے، ایک عجیب وغریب مخلوق ثابت کیا ہے، لیکن اُنہوں نے انسان کی ہمہ جہتی شناخت کے باوجود اسے ''موجود ناشناختہ'' کا لقب دیا ہے۔[1]

قرآن مجید جس نظر سے جہانِ طبیعت اور کتابِ آفرینش کو دیکھتا ہے۔ اسی نظر سے انسان کو بھی ''کتابِ نفسی'' کی اصطلاح میں دیکھتا ہے دونوں کا ایک دُوسرے کے ساتھ ذکر کرتا ہے، اور دونوں کے عجائبات کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝۲۰ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۲۱

(ذاریت: ۲۰،۲۱)

''یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں اور خود تمہارے نفسوں میں نشانیاں موجود ہیں۔ تم (ان میں) غور کیوں نہیں کرتے؟''

''خودشناسی'' اور ''معرفتِ نفس'' نے عارفانِ حق کو ہر چیز سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ وہ اپنے باطن کے مطالعے اور اس میں غور وخوض کو حقائق کی معرفت کی کلید سمجھتے ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں حد سے زیادہ دُور چلے جاتے ہیں جیسا کہ جلال الدین رومیؒ کہتا ہے۔[2]

آنچہ حق است اقرب از حبل الورید
تو فگندی تیر فکرت رابعید
ای کمان و تیر ہا بر تاختہ
گنج نزدیک و تو دُور انداختہ

''جو حق ہے وہ تو شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے'' ''لیکن تو نے اپنی فکر کا تیر بہت دُور پھینکا ہے'' ''اے کمان اور تیر اُٹھانے والے۔'' ''خزانہ تو تیرے نزدیک ہی ہے مگر تو نے تیر دُور پھینکا ہے۔''

جب ہم اس منطق کا قرآن کی رُو سے مطالعہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ قرآن جہان وانسان کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے اور دونوں ہی کی معرفت کی دعوت دیتا ہے اور فرماتا ہے:۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ (حٰم سجدہ: ۵۳)

---

[1] الکسیس کارل مؤلف کتاب ''انسان موجود ناشناختہ''

[2] مثنوی دفتر ششم ص ۵۸۸ چاپ میرخانی

''ہم عنقریب اپنی نشانیاں دُنیا اور خود انسان کے وجود میں دکھائیں گے تا کہ واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے۔''

حقیقت میں اِسلام کی منطق معرفتِ باطن کے ساتھ معرفتِ ظاہر کی بھی دعوت دیتی ہے اگر چہ دورِ حاضر کے انسان نے، زمینی اور عالمی موجودات کی عظیم شناخت کی توفیق پائی ہے۔ تاہم افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ باہر کی دنیا میں غرق ہونے اور طبیعی موجودات کے روابط کی شناخت میں لگے رہنے کی وجہ سے، خود اپنے آپ سے بیگانہ ہو گیا ہے اور اس نے یہ توفیق خود اپنے نفس کے لیے حاصل نہ کی۔

یہ انصراف یا ٹکراؤ اُس دن سے شروع ہوا جب علم نے اپنی جہت کو جس کا مقصد کشفِ حقیقت اور واقعیت کا علم تھا بدل دیا، نیز دولت اور قوت کی خدمت میں لگ گیا۔

ماضی میں علم حقائق کے معلوم کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کو حصُول کمال کی غرض سے حاصل کرتے تھے، اور حصولِ علم کو بہت ہی مقدس چیز جانتے تھے۔ لیکن مغرب کی علمی تبدیلیوں سے علم حاصلِ کرنے کے سلسلہ میں انسان کی منطق تبدیل ہو گئی اس سلسلہ میں انگلستان کے بیکن' اور اس کے بعد فرانس کے ڈکارٹ نے اسے تہ و بالا کرنے اور اس کا رُخ قوت و طاقت کی طرف موڑنے کے سلسلہ میں بہت کام کیا۔ اب وہ علم طلب کیا جانے لگا جو مادی انسان کی حفاظت کر سکے اور اس کی قوت و طاقت میں اضافہ کا سبب بنے، لہٰذا ایسے علم نے ترقی کی جو کشفِ طبیعت اور جہان خارج پر انسان کے تسلط کا سبب بنے اور اس کی دانائی اس کی توانائی کا مقدمہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نفسِ انسان کی معرفت کی طرف توجہ خصوصاً انسان کی اپنی قدر و منزلت اور اس کی طبیعی اور روحانی خواہش ختم ہو کر رہ گئی اور ان اُمور سے متعلق علوم کو نظریاتی کہہ کر خارج از بحث قرار دے دیا گیا۔

اس آخری صدی میں کچھ علوم 'روانشناسی' (نفسیات یا سائیکولوجی) اور روانکاری، (نفسیاتی تحلیل و تجزیہ) کی از سرِ نو بنیاد رکھی گئی۔ بہتر تعبیر کے مطابق کتب خانوں کے گوشوں سے نکال کر ان علوم پر بحث و تحقیق ہونے لگی۔ اور جستجو کرنے والے انسان نے روح انسانی کے بارے میں بعض نئے نکات سے آ گاہی حاصل کی۔ لیکن اس کے مباحث ہرگز جان شناسی کے دائرہ سے باہر نہ نکلے اور انسان کی معرفت سے محبت رکھنے والوں کی پیاس نہ بجھ سکی۔ یہ دونوں علوم نفسِ انسان میں پیدا ہونے والے امور اور خارج سے ٹکراؤ کی صورت میں تاثیر اور ان کی پیدائش کے علل و اسباب کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور اس سے آگے نہیں بڑھتے۔

مغرب کا علم الاخلاق بھی، اس کے جامعہ شناسی کی طرح ہی، مادی پہلو رکھتا ہے اس کا مقصود زیادہ تر انسان کی توانائی میں اضافہ کرنا ہے، نہ کہ انسان کو انسان بنانا۔ اسی طرح دیگر انسانی علوم ہیں جن کی مغرب میں بنیاد رکھی گئی ہے، یا انہوں نے وہاں ترقی کی ہے۔

معرفتِ نفس کا مقصد

اِسلام کی نظر میں، معرفتِ نفس، عام طور پر دو صورتوں میں سے ایک کی بناء پر انجام پاتی ہے:۔

ا: معرفتِ نفس خدا شناسی کا ایک راستہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا شناسی کا راستہ انسان شناسی سے نکلتا ہے ہم اس سلسلہ میں

بعض اسلامی نصوص کی طرف، ان نصوص کے علاوہ جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اِشارہ کرتے ہیں۔

قرآنِ مجید مقامِ رُبوبیت سے انسان کے رشتہ کو اس قدر محکم اور استوار سمجھتا ہے کہ خُدا سے غفلت کا سبب جانتا ہے قرآن پہلی مرتبہ اس مطلب سے پردہ اُٹھاتے ہوئے فرماتا ہے:۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾ (حشر:۱۹)

''تم ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا۔ جنہوں نے خدا کو بھلا دیا ہے اور نتیجتاً وہ خود اپنے آپ ہی کو بھُول گئے ہیں۔ یہ لوگ فاسق ہیں۔''

قرآن مارکس کے نظریہ کے خلاف، جو خدا شناسی اور علائقِ مذہبی کو اپنے آپ سے بیگانگی کا سبب جانتا ہے تکالیف دینی کی حفاظت کو اپنی پہچان اور محبت کا سبب جانتا ہے اور اس حقیقت سے بے توجہی کو خود سے بیگانگی کا ذریعہ سمجھتا ہے اس مطلب کے لیے اس کے پاس ایک روشن گواہ موجود ہے وہ اس طرح کہ خدا کی مخلوق اور علتِ خلق ہونے کی بناء پر انسان کی اس علت اور اپنے خالق سے وابستگی و تعلق کے علاوہ اور کوئی واقعیت نہیں رکھتی۔ اس اصل کو نظر انداز کرنا خود انسان کو نظر انداز کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس رشتہ کو نظر انداز کرنا خود انسان کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ عارف کے قول کے مطابق:۔

در اندرونِ من خستہ دل ندانم کیست؟
کہ من خموشم و او در فغان و درغوغا است

''مجھ جیسے خستہ دل کے اندر کون ہے؟ مجھے معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ میں تو خاموش ہوں، لیکن میرے اندر آہ و فغان اور شور و غوغا برپا ہے۔''

رسُولِ اکرمؐ نے فرمایا:۔

اَعْلَمُكُمْ بِنَفْسِهٖ اَعْلَمُكُمْ بِرَبِّهٖ [1]

''تم میں سے اپنے نفس کے بارے میں زیادہ علم رکھنے والا اپنے رب کے بارے میں زیادہ علم رکھتا ہے۔''

ایک روز آنحضرتؐ کی ایک زوجہ محترمہ نے آپؐ سے پوچھا۔ ''انسان خدا کو کسِ وقت پہچانتا ہے؟''

حضرتؐ نے فرمایا:۔

---

[1] امالی مرتضیٰ ج۲ ص ۳۲۹ مصر

اِذَا عَرَفَ نَفْسَهٗ

''جب وہ اپنے آپ کو پہچان لے۔''[۱]

کہتے ہیں کہ ایک عارف نے اپنے ساتھی سے کہا: کہ تو یہ کہتا ہے کہا اَلٰهِیْ عَرِّفْنِیْ نَفْسَكَ'' خدایا مجھے اپنی معرفت کرا دے۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں۔''اِلٰهِیْ عَرِّفْنِیْ نَفْسِیْ'' خدا مجھے میرے اپنے نفس کی معرفت کرا دے۔''[۲]

بُوعلی کے رسالۂ حجِ عشرہ، میں ہے کہ وہ کہتا ہے کہ امام الائمہ علی ابن ابی طالبؑ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

رئیس الحکماء ارسطو بھی یہی کہتا ہے:۔

''جو شخص اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتا، وہ اپنے خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ کسی ایسے شخص کی شناخت پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے، جو خود اپنے آپ کو بھی نہ پہچانتا ہو۔''[۳]

جس بات کو بُوعلی نے امام سے نقل کیا ہے، وہ کتاب ''غرر الحکم'' میں ان باتوں کے باب میں جو لفظ من سے شُروع ہوتی ہیں۔ بیان ہوئی ہے۔[۴]

حضرت امام جعفر صادقؑ پیغمبر اکرمؐ کی اس حدیث کی تفسیر میں کہ: ''علم حاصل کرو، چاہے وہ چین میں ہی کیوں نہ ہو'' اس طرح فرماتے ہیں:

هُوَ مَعْرَفِةُ عَلْمِ النَّفْسِ وَفِیْهَا مَعْرِفَةُ الرَّبِّ

''اس سے مُراد خود نفسِ انسان کی معرفت ہے جس میں پروردگار کی معرفت پوشیدہ ہے۔''

مسلمہ طور پر امام جعفر صادقؑ کا مقصد علم کی ایک مخصوص اور اہم صف کا بیان کرنا ہے، کہ انسان کو جس طرح بھی ممکن ہو اسے حاصِل

---

[۱] گذشتہ مدرک ج ۱ ص ۲۷۴

[۲] ان دونوں دعاؤں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ خدا کی معرفت کے ذرائع میں ایک خود اپنے آپ کو پہچاننا ہے۔ وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ خُدایا مجھے اپنی ذات کی معرفت کرا دے اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی معرفت کے سبب خود اپنے نفس کی معرفت میں جانتا ہے اور اپنے نفس ہی کی معرفت چاہتا ہے۔ لہٰذا اس عارف کی گفتگو کے ذیل میں آیا ہے۔ فان معرفة النفس مرقاة معرفة ال رب کیونکہ اپنے نفس کی معرفت خدا کی معرفت کا زینہ ہے۔

[۳] رسالہ انہ الحق بوعلی کے رسالہ حج عشرہ سے نقل ہوا۔

[۴] غزر الحکم ص ۲۸۲ طبع نجف چاپ نعمانی

کرنا چاہیے۔لیکن رسُول اکرمؐ کے کلام میں ایک خاص وسعت پائی جاتی ہے۔

۲: انسان کی مادی ومعنوی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے انسان کی اپنی پہچان۔اس کے لائحہ عمل کا مقدمہ،کیا ہونا چاہیے اور کیا نہ ہونا چاہیے کہ شناخت کا وسیلہ اور انسان کے تخیل کو جہت بخشنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔کوئی بھی مکتبِ فکر اور نظام،انسان کی اپنی معرفت کے بغیر نہ تو اس کے لیے کوئی ذمہ داری معین کرسکتا ہے نہ امرونہی کا حکم دے سکتا ہے۔نہ اس کے لیے کسی حقوقی،سیاسی اور اقتصادی نظام کا تعین کرسکتا ہے اور نہ ہی کسی خانگی نظام یا طرزِ حکومت کی پیش نہاد کرسکتا ہے جب تک کوئی مکتبِ فکر انسان کا حامل نہ ہو،کیسے اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں کوئی صحیح جامع منصوبہ پیش کرسکتا ہے یا کوئی خاص روش اور فرہنگ وتمدّن اس کے سامنے رکھ سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے بارے میں ہر قسم کے نئے منصوبے ہر قسم کی معروفات اور منہیات اس کے مقام ومرتبہ کو بلندو بالا کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔اس صورت میں معرفتِ انسان کے لیے لازم ہے کہ بنیادی طور پر اس کی زندگی کے لائحہ عمل کو معین کیا جائے۔احادیثِ اسلامی میں اس قسم کی معرفتِ انسان کے بارے میں کئی اشارے پائے جاتے ہیں۔جن مُیں سے بعض کو ہم ذکر کرتے ہیں۔

امیرالمومنینؑ نے فرمایا:

اَعۡظَمُ الۡجَهۡلِ جَهۡلُ الۡاِنۡسَانِ اَمۡرَ نَفۡسِهٖ اَعۡظَمُ الۡحِكۡمَةِ مَعۡرَفَةُ الۡاِ نۡسَانِ نَفۡسَهٗ وَوُقُوۡفِهٖ عِنۡدَ قَدۡرِهٖ [۱]

''سب سے بڑی جہالت خود اپنے آپ کو نہ پہچانا ہے اور سب سے بڑی حکمت خود اپنی شناخت ہے تا کہ انسان اپنی حد سے تجاوز نہ کرے۔''

ووقوفہ عند قدرہ۔کا جملہ یہ بتاتا ہے کہ انسان کی زندگی کا لائحہ عمل ان حدود اور سرحدوں کے مطابق ہونا چاہیے جو خود اس کی دسترس میں ہوں۔مثلاً اگر ہم خود انسان کی شناخت کے سلسلہ میں،اس کی اندرونی خواہشات،یعنی تلاش خدا،طلب علم،یا جنسی میلان سے واقف ہوجائیں تو ضروری ہوگا کہ زندگی کے لائحہ عمل میں،عبادت و پرستش علم ودانش کی تلاش اور جنسی خواہش کا پورا کرنا،ایک فرض اور قابلِ عمل امور کی صُورت میں پیش ہوں۔

حضرت علیؑ کے دوسرے ارشادات میں وارد ہوتا ہے:۔

العارف من عرف نفسه فاعتقها ونزهها عن کل ما يبعد ها و يوبقها۔" [۲]

---

[۱] غررالحکم ص ۷۷

[۲] غزرالحکم ص ۷۷

عارف وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو پہچانے، اپنے آپ کو غلامی سے نجات دلائے، اور جو چیز اس کو کمال سے دُور رکھتی اور ہلاکت وتباہی تک لے جاتی ہو، اس سے خود کو دُور رکھے۔"

اس مختصر سی بحث میں، جو قرآن کی رُو سے "انسان کی معرفت" کے عنوان سے انجام دی جارہی ہے اس کی تمام خصوصیات تمام وجودی جہات اور پہلوؤں کو پیش نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس بیکراں موجود کے بارے میں، قرآن کی رُو سے بحث کرنے کے لیے بہت وسیع مباحث کی ضرورت ہے، جنہیں ہم سر دِست پیش نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہماری بحث ایک خاص دائرہ میں ہی ممکن ہے جس کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں۔

وہ موضوعات، جن پر اس حصہ میں بحث اور تحقیق پیش کی گئی ہے۔ درج ذیل ہیں:۔

۱: اِنسان کی خلقت میں مستقل اور مشترک بنیاد۔

۲: خلقت کے مراحل۔

۳: انسان کی روح، اور موت کے بعد اس کی بقاء۔

۴: انسان کی واقعیت وحقیقت اس کی رُوح اور جان ہے۔

۵: انسان کی روح اور جان کے ابعاد وجہات۔

۶: قرآن کی رُو سے انسان کی حیثیت۔

۷: انسان خیر وشر کا آمیزہ نہیں ہے۔

۸: انسان اور غرائز طبیعی کا اعتدال۔

۹: اِنسان اور شگوفہ ہائے کمالات۔

۱۰: انسان کا اختیار وآزادی۔

(١٦)

انسان کی خلقت میں مستقلِ اور مُشترک نظریات

سب سے پہلا مسئلہ جو معرفت انسان کے سلسلہ میں پیش آتا ہے وہ اس کی خلقت کی کیفیت کی معلومات کا ہے۔ اسی طرح ہر صاحبِ فکر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے اسلاف کو پہچانے اور ان کی نشو ونما کی کیفیت سے آگاہ ہو۔

یُونانی تمدّن کے زمانہ سے خلقتِ انسان کے بارے میں دانشوروں کے درمیان دو نظریئے۔

۱: انسان اور دوسرے جانداروں کی خلقت میں مشترک بنیاد کا نظریہ۔

نیز یہ کہ ہر وجودِ زندہ ازل سے اسی شکل وصورت میں موجود تھا۔ جس میں وہ اس وقت ہے۔ اگر رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ کچھ اختلاف آئے بھی ہیں تو وہ ان انواع کے حالات وعوارض کے ماتحت تھے۔ ایسا نہیں کہ تغیرات اس حد تک پہنچ جائیں کہ ایک نوع کو دوسری نوع میں بدل دیں اور ایک نئی نوع کو وجود میں لے آئیں۔

۲: انسان اور دوسرے جانداروں کی خلقت میں مشترک بنیاد کا نظریہ:

نیز یہ کہ سب جانوروں کی قسمیں، سب کی سب ایک ہی کی طرف یا گنتی کی چند انواع کی طرف لوٹتی ان میں بتدریج اختلاف پیدا ہوا ہے۔ اور انجام کار اایک نوع جو اس سے پہلی نوع کی ترقی یافتہ شکل ہے اور اسی طرح سے بہت سی انواع پیدا ہو گئی ہیں۔

یونانی فلسفہ میں دونوں نظریے موجود تھے جیسا کہ رسائل ''اخوان الصفا'' میں اور ''ابن مسکویہ'' کی تحریروں میں یونانی علوم کے اسلام کی طرف منتقل ہونے کے زمانے میں مطلق جانداروں کے بارے میں دونوں نظریات پر بحث اور گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں کسی دوٹوک نظریہ کا اظہار نہیں کیا گیا۔

انواع کی تدریجی تبدیلی اور تکامل وارتقاء کے مسئلہ نے اس وقت سے قوت پکڑی جب فرانس کے سائنسدان طبیعی ''لا مارک'' (۱۷۴۴۔۱۸۲۹) نے ''ماحول کی تبدیلیوں کے ساتھ تدریجی سازگاری کو ''انواع کی تبدیلیوں اور تکامل وارتقاء میں موثر سمجھا۔ اُس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ ماحول کے ساتھ تدریجی سازگاری غذا کی تبدیلیوں، خصوصاً اعضاء کے استعمال یا عدم استعمال سے فراہم ہوتی ہے۔ ہر عضوِ جسم جتنا زیادہ استعمال میں آتا ہے اتنا ہی زیادہ نشوونما پاتا ہے اور جتنا اُسے استعمال سے دور رکھا جائے اتنا ہی وہ نابودی کے قریب پہنچتا ہے۔

انواع کے تکامل وارتقاء کی فکر اور نباتات اور جانداروں کی خلقت وآفرینش کی بنیادِ واحد ہونے کی سوچ پر اس وقت زیادہ توجہ دی

جانے لگی جب انگریز دانشور ''چارلس ڈارون کے مفروضہ کے قیام سے انواع کی تبدیلیوں اور ان کے تدریجی تکامل کے مسئلہ نے گونا گوں صورتوں میں پیش رفت کی، اور'' لامارکزم'' نیولامارکزم'' ڈاروزم'' اور'' نیوڈارون ازم کے عنوانات کے تحت کئی مفروضوں نے علمی اجتماعات میں راہ پائی۔ تاہم آخر کار یہ تمام مفروضے اختتام کو پہنچ چکے ہیں اور مفروضہ تغیر MUTATION یا NATURE عُلمائے حیات شناس کی محافل میں قوت پکڑ چکے ہیں آخری مفروضہ ہائے ماقبل میں فرق یہ ہے کہ وہ چاروں مفروضے تکامل وارتقاء انواع کو تدریجی سمجھتے ہیں جبکہ آخری مفروضہ اسے دفعی صورتِ واقعہ (دافعتہ اور ایک ہی وقت میں) کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یعنی اچانک ایک نوع غیر معلوم علل واسباب کے ماتحت دوسری نوع میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نباتات، حیوانات اور انسان میں انواع کی تحویل کا مفروضہ ''تشریح تطبیقی''، اور'' جنین شناسی تطبیقی''، اور'' آثار شناسی'' سے مدد حاصل کرتا ہے۔

ہم نے ان تمام دلائل کو کتاب ڈاروزم DARWINISH یا تکامل انواع سے حاصل کیا ہے۔ ان مطالب کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم ان مفروضوں کے مختصات سے صرفِ نظر کرلیں تو پھر یہ کہیں گے کہ ماہرین فن کے نباتات اور حیوانات کے بارے میں دو نظریے ہیں۔

۱: ثُبوتِ انواع

ہر نبات وحیوان کی ایک مستقلِ خلقت ہے وہ ابتدا سے اسی طرح تھا جیسا کہ اب ہے زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ خلقت کی بنیادِ کلی اس طرح ہے کہ ہر نبات وحیوان اپنے ہم نوع سے پیدا نہیں ہوا نہ ہی اس سے مشتق ہے۔

۲: تکامُل انواع

یعنی نباتات اور حیوانات کی انواع کی کوئی مستقل خلقت نہیں ہے وہ سب کے سب ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ اور تعلق رکھتے ہیں اور ان کے اسلاف وبزرگ مشترک ہیں۔ لیکن اصل موضوع میں آنے سے پہلے چند ایک نکات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے:۔

الف: ان پانچ مفروضوں کا ان دو صدیوں کے دوران وجود میں آنا (لامارک کے زمانہ سے لے کر موجودہ زمانہ تک) ان مفروضوں کی بے ثباتی اور تزلزل کی نشانی ہے۔ اور ان دانشمندوں کی زحمتوں کی قدردانی کے باوجود اس عقیدہ پر ایک محتاط انسان ہرگز تکیہ نہیں کرسکتا۔ نہ یہ تصور کرسکتا ہے کہ یہ حضرات ان مفروضات کی مدد سے کشفِ حقائق تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ب: نباتات اور حیوانات کی جدا اور مستقل خلقت، اور ان کے تدریجی و یا فعی تکامل وتحول کا مسئلہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا، خواہ آپ ان میں سے ہر ایک کی خلقت و افرینش کو مستقل اور ایک دُوسرے سے جدا فرض کرلیں اور ان کی خلقت کو'' فیکسیسیم'' (ثبوتِ انواع)'' کی بنیاد قرار دیں۔ یا ان کی ساخت اور بنیاد کو ایک تصور کریں۔ یعنی ان سب کے لیے بنیادِ مشترک خیال کریں اور موجودہ اصطلاح

کے مطابق آپ TRANSFORMISM کے طرفدار ہوں (ان میں سے کوئی نظریہ ہمارے لیے اہم نہیں ہے) جو چیز اس وقت ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ خصوصیت کے ساتھ خلقتِ انسان کا قرآن کے حوالہ سے مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ آیاتِ قرآن کے ظواہر ان دونوں میں سے کس کی تائید کرتے ہیں۔ کیا قرآن انسان کی خلقت سے کو ایک قدر مستقل کے طور پر تسلیم کرتا ہے اور اس کو دیگر تمام انواع خلقت سے الگ سمجھتا ہے یا قرآن بھی انسان اور حیوانات کی تخلیق کے لیے ایک مشترک 'بنیاد' ہی پر انحصار کرتا ہے۔ اور اس کا انواعِ دیگر کی ترقی یافتہ شکل کے طور پر تعارف کرواتا ہے؟

لہٰذا ہم جو کچھ اس بارے میں لکھ رہے ہیں وہ قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہمیں اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں۔

ج: ہمارا موضوعِ سخن، آدمؑ اور ان کی زوجہ کی خلقت ہے جن کا تعارُف قرآن نے روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کے ماں باپ کے طور پر کرایا ہے۔ اس گفتگو میں قابلِ غور امر یہ ہے کہ کیا ان دونوں افراد کی خلقت مستقل ہے، یا ان کی دوسری نوع کے تکامل وارتقاء کی شکل ہے جس کا نام قرآن میں نہیں آیا، اور صرف زیست شناسی BIOLOGY کے علوم نے اس سے پردہ اٹھایا ہے۔

تاہم یہ بات جاننا چاہیے کہ آدمؑ کے بارے میں ابوالبشرؑ کے عنوان سے عقیدہ رکھنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اس کرۂ خاکی پر قدم رکھا، یا ایسے باپ اور اس کی مستقل خلقت کا اعتقاد جو کسی اور نوع سے مشتق نہ ہوا ہو اور تکامل وارتقاء کی منازل سے گذر کر یہاں تک نہ پہنچا ہو نہ ہی اس سے پہلے کسی بشر کی نفی کے معنی میں ہے۔ کیونکہ ظواہر آیات وروایات کے مطابق آدم ''ابوالبشر'' سے پہلے بھی انسان ایک خاص نام کے ساتھ زمین پر زندگی بسر کرتے تھے۔ جو مختلف علل واسباب کی بناء پر ختم ہوتے گئے۔ اس بارے میں ایک سلسلہ آیات کے علاوہ بہت سی واضح احادیث بھی موجود ہیں اور شائقین ان کے مدارک کی طرف رجوع کر سکتے ہیں[1]

اس بیان سے واضح ہوجاتا ہے کہ ممکن ہے زمین کے اندر موجود آثارِ قدیمہ اور انسانی ڈھانچوں کے بارے میں ماہرین کی تمام تحقیقات، آدم ابوالبشر سے قبل کے انسانوں سے متعلق ہوں، لہٰذا ان نظریات اور نتائج کو صحیح فرض کر لینے کے باوجود ہم موجودہ انسان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ انسانی ڈھانچے ایک مطلب کے اثبات کے معاون ہیں اور وہ یہ ہے کہ ازمنہ قدیم میں اس کرہ خاکی پر ایک زندہ وجود انسان کی صورت میں زندگی بسر کرتا تھا اور یہ وجود ہزار ہا سال پہلے اس وسیع وعریض زمین میں زندہ تھا ''دیرینہ شناسی'' کے اصول پر مبنی تحقیقات کے مطابق یہ نظریہ، کہ آدم وحوا سے پہلے کوئی انسان روئے زمین پر موجود نہ تھا۔ کلی طور پر غلط ثابت ہوتا ہے۔ خصوصاً جبکہ آدم وحوا کی تاریخ چند ہزار سال سے آگے نہیں بڑھتی۔

یہاں ایک بات باقی رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وحی کی صحت وسند پر عقیدہ رکھنے والے حضرات آدمؑ کی خلقتِ مستقل کے بارے میں

---

[1] توحید صدوق ص ۲۸۸ وخصالِ صدوق ص ۶۳۹۔ امیر المومنینؑ ایک مناجات میں خدا کی اس طرح توصیف کرتے ہیں وَلَمْ يَزَلْ سَيِّدِىْ بِالْحَمْدِ مَعْرُوْفًا۔ وَلَمْ يَزَلْ سَيِّدِىْ بِالْجُوْدِ مَوْصُوْفًا۔ میرا آقا ہمیشہ ہی حمد کے سات معروف رہا ہے اور جود وسخا کے ساتھ موصوف رہا ہے۔

قرآن کے نصوص وظواہر کی موجودگی میں وحی کی قطعیت وصحت کی بناء پر یہی سمجھیں گے کہ دیرینہ شناسوں کی تمام تر تحقیق ومطالعے کا تعلق آدم وحوا سے پہلے کے انسانوں سے ہے اس انسان سے نہیں جس سے ہم بذریعہ وحی متعارف ہوئے ہیں یا اس کی خلقت سے واقف ہوئے ہیں۔

مثلاً علم دیرینہ شناسی کے مطابق لاکھوں سال پہلے کے دریافت شدہ ڈھانچوں کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ان زندہ موجودات نے سادہ اور عام قسم کی صورتوں سے پیچیدہ تر اور کامل تر صورتوں میں اپنی شکلوں کی تبدیل کیا ہے سادگی سے پیچیدگی کی طرف عبور کرنے کا یہ عمل انواع کی تبدیلی اور باہم دیگر مشتق ہونے کے نظریہ کو ثابت کرتا ہے۔

یہ نظریہ اگر صحیح مان لیا جائے تو سب کا سب ان انسانوں سے متعلق ہوگا، جو ان دیرینہ شناسوں کے مطابق لاکھوں سال پہلے اس وسیع زمین میں زندگی بسر کرتے ہوں گے نہ کہ اس جدید اور دورِ حاضر کے انسان سے جس سے وحی آسمانی نے پردہ اٹھایا ہے۔

انواع کے تحول کے طرفداروں نے دیرینہ شناسیٔ کے علاوہ 'تشریح تطبیقی' سے بھی مدد لی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تشریح اس قیاس کی نشاندہی کرتی ہے کہ موجودات کے درمیان اتنی زیادہ شباہتیں پائی جاتی ہیں جو جانداروں کے درمیان قریبی روابط موجود ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ انہوں نے نظام گردشِ خون، نظام تنفس، نظامِ اعصاب پر مطالعہ کی رُو سے موجودات کے درمیان کئی مشابہتیں معلوم کی ہیں اور انجام کار یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ نظام سادگی سے پیچیدگی کی طرف ترقی پذیر ہیں۔

فرض کریں اگر یہ نظریہ سو فی صد صحیح اور درست ہو، پھر بھی دو مطالب سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

۱: زیست شناسی مشابہ انواع کے مطالعہ کے علاوہ اور کسی چیز پر قادر نہیں۔ لیکن یہ بات کہ ایک نوع دوسری نوع سے مشتق اور جدا ہوئی ہے صرف قیاس ہی پر مبنی ہے جس کو ہرگز محسوسات کا جزء شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی قیاسی اور اٹکل پچو بات کی بناء پر وحی الٰہی کی کسی تاویل کی قطعی کوئی گنجائش نہیں۔

دوسرے الفاظ میں اس قسم کی نشانیاں ہرگز انسان کی حیوانات سے رشتہ داری کی گواہ نہیں بن سکتیں۔ اور نہ ہی ایک جانور کے دوسرے جاندار سے مشتق ہونے کو ثابت کر سکتی ہیں۔ اس بات میں کون سی رُکاوٹ ہے کہ خلقت وآفرینش کی بنیاد ڈالنے والا مشابہ انواعِ موجودات پیدا کرے۔ پھر سب کے لیے ایک مستقل طرز اور بنیاد ڈالے۔ اور کسی سابقہ مثال کے بغیر ہی از سرِ نو ایک دُوسرے سے مشابہ انواع کو ایک ہی جگہ بیک وقت پیدا کر دے۔ بغیر اس کے کہ ان میں سے کوئی بھی دُوسری سے مشتق نہ ہوئی ہو۔ گویا خلقت کی بنیاد ایک عظیم عمارت کی مانند ہے جس کی تعمیر میں کام آنے والے تمام مصالح موجود ہیں۔ سوائے اس کے کہ صانع نے سب قسم کے حیوانات کی تخلیق میں صرف ان کے ظواہر میں گوناں گوں آرائشیں انجام دی ہیں۔

۲: ان تبدیلیوں کی تاریخ ان کے طرفداروں کی تصدیق کے مطابق، ان انسانوں سے مربوط ہے جو کئی لاکھ سال پہلے زندہ تھے اس صورت میں اگر وحی کی منطق نے آدمی کی خلقت کی مستقل بنیاد ہونے کی بات کی ہے، جو قدیم انسان کی قدامت کی نسبت بہت ہی کم عمر ہے، تو اس صورت میں ان علمی تحقیقات کو آدمؑ سے پہلے کے انسانوں سے مرُبوط سمجھنا چاہیے جیسا کہ قرآن اور اسلامی احادیث نے بھی ان کے

وجود کی تصدیق کی ہے۔

د: قرآن انسانوں کے لیے ان مسائل میں کتاب ہدایت ہے اور ان کی رہنمائی کرتا ہے کہ اگر قرآن ان مسائل کی طرف توجہ نہ دیتا تو انسان کی عقل و خرد آسانی کے ساتھ ان تک نہ پہنچتی۔ اس بناء پر قرآن سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ انواع کی تبدیلی اور اس کی بنیاد کے مسئلہ کو ایک کتاب طبیعی یا زیست شناسی کی صورت میں پیش کرے، لیکن اس کے باوجود جہاں قرآن انسان کی خلقت کو تربیتی اور اجتماعی اہداف کے لیے پیش کرتا ہے وہاں اس میں کچھ ایسے بیانات بھی ہیں جو ان دونوں نظریات میں سے کسی ایک کا بیان ہو سکتے ہیں۔

ھ: خلقتِ انسان کے تکامل وارتقاء کا اعتقاد ڈارون وغیرہ کے مفروضہ کو قبول کر لینے کے معنی میں نہیں ہے جو انسان کے لیے براہ راست بندر وغیرہ کی ترقی یافتہ شکل کا عقیدہ رکھتے ہیں، کیونکہ یہ مفروضہ ایک تھیوری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا کسی تکامل وارتقاء کا عقیدہ رکھنے والے کو اس طریقہ سے مغلوب نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ انسان کے تکامل وارتقاء کا طریقہ اس شکل میں ہو کہ حضرت آدمؑ کی مستقل طور پر خلقت نہ ہوئی، بلکہ وہ اپنے ہم عصر افراد میں سے منتخب کیے گئے ہیں اور وہ افراد بھی تکامل وارتقاء سے اتصال کی بناء پر دوسری انواع کی طرف بازگشت کرتے ہوئے۔ انجام کار موجودہ انسان کی طرف منتھی ہوئے ہوں۔

و: انسان میں مستقل خلقت کی بنیاد کا اعتقاد، فکری و عقلی اور تمام اجماعی پہلوؤں سے انسان کے تکامل وارتقاء کی نفی کے معنی میں نہیں ہے۔ مستقل خلقت کا نظریہ رکھنے والوں کو ہرگز انسان کے بارے میں تکامل وارتقاء کا منکر نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ ان پہلوؤں سے انسان کا تکامل وارتقاء کوئی نظری مسئلہ نہیں ہے کہ ایک اس کا منکر ہو اور دوسرا اس کا مثبت ہو، کیونکہ اکثر اوقات ان مسائل کے خلط ملط ہو جانے سے ذہن میں تشویش پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہرگز یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ انسان کی الگ نوع کے ثبوت کا اعتقاد مطلق تکامل وارتقاء کی نفی ہے۔

ان چھ نکات کی طرف توجہ کرتے ہوئے اب اس بات کا وقت آ گیا ہے کہ ہم قرآن سے انسان کی خلقت کے بارے میں وارد شدہ آیات سے اپنے اخذ کردہ نتائج کو واضح کریں۔

(۱۷)

قرآن کی رُو سے
انسان اول کی خلقت کے مراحل

سب سے پہلا مسئلہ جو انسان کے بارے میں سامنے آتا ہے۔ وہ ''انسان کی خلقت کی معرفت'' کا مسئلہ ہے۔ انسان کس چیز سے کس طرح وجود میں آیا۔ دوسرے لفظوں میں آغازِ خلقت اور اس کی کیفیت کیا ہے؟ اتفاق سے قرآن نے جو اِسلامی نظریات کا منبعِ اصل ہے۔ ان دونوں موضوعات کو ایک خاص طریقہ سے بیان کیا ہے۔ پس انسان کے بارے میں تمام وارد شدہ آیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱: قرآن اور انسان کا آغازِ آفرینش
۲: قرآن اور آغازِ اوّل کے تحولات
۳: قرآن اور تعلقِ رُوح کا مرحلہ

دوسرے لفظوں میں قرآن سب سے پہلے انسان کے لیے خلقتِ کے تین مرحلوں کا قائل ہے۔ آغاز کا مرحلہ: مثلاً مٹی، چپکنے والی مٹی، سیاہ رنگ کی مٹی، ڈھلنے والی مٹی، ٹھیکری کی طرح خشک مٹی۔

''تصویر' اور 'تسویہ' کا مرحلہ یعنی مٹی کے اس مجسمہ کی صورت بندی جسے آیات میں 'تصویر' یا 'تسویہ' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تعلقِ رُوح کا مرحلہ۔ یعنی موجود متحرک اور احسّاس صُورت اختیار کرنا۔

ہم تینوں حصّوں کی تمام آیات کو اس بحث میں پیش کریں گے۔ ان میں بعض آیات کی تشریح کریں گے جن کے بارے میں یہ تصور کرلیا گیا ہے کہ وہ انسان کے تدریجی تکامل وارتقاء پر صادق آتی ہیں۔ نیز کہ وہ دیگر زندہ موجودات سے ترقی یافتہ ہے۔ انسان کے آغازِ خلقت کی تشریح اس طرح ہے۔

۱: خلقتِ انسان کے آغاز سے کیا مُراد ہے؟

آغازِ آفرینش سے مُراد پہلا مادہ ہے جس کی طرف انسان کی خلقت منتہی ہوتی ہے۔ یعنی اگر ہم خلقت کے بعد کے مراحل کو یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کے پیچھے رکھتے چلے جائیں تو انجام کار اس مادہ تک پہنچ جائیں گے۔ البتہ ہوسکتا ہے کہ پہلے مادہ کی مختلف حالتیں ہوں

اوران میں سے ایک دوسری سے مقدم ہو یا پہلی حالت کو دوسری کی اصل شمار کیا جائے۔لیکن چونکہ یہ حالات مختلف انواع کی پیدائش کا سبب نہیں بنتے۔ بلکہ اسی مادہ کے حالات وکیفیات شمار ہوتے ہیں۔لہٰذا ہم ان سب کو مبداء واحد کے عنوان کے تحت رکھیں گے۔اگر چہ ممکن ہے کہ ان کے درمیان تقدم وتاخر پایا جاتا ہو۔مثلاً مٹی اور گیلی مٹی، یا چپکنے والی مٹی اور ڈھلنے والی مٹی، یا ٹھیکری کی طرح خشک مٹی،متعدد انواع نہیں ہیں بلکہ تراب' (مٹی) کے مادہ کی مختلف کیفیات ہیں جو اُسے دو یا زیادہ صورتوں میں ظاہر کرتے ہیں۔جبکہ ان سب کی اصلیت وحقیقت شئے واحد سے زیادہ نہیں ہے۔لہٰذا ہم نے ان تمام حالات کو''مبدءِ آفرینش'' کا نام دے کر اس حصہ میں بیان کیا ہے۔قرآن انسان کے آغازِ آفرینش کو، حسب ذیل تشریح کے ذریعہ چند امور کے ساتھ متعارف کراتا ہے:۔

انسان:

۱: عام مٹی ۲: چپکنے والی مٹی ۳: سیاہ بدبودار مٹی

۴: گیلی مٹی ۵: ڈھلنے والی مٹی ۶: کھنکھنانے والی خشک مٹی،

جو کسی چیز کے ساتھ ٹکرا کر آواز پیدا کرے۔(ٹھیکرے اور پیالے کی طرح) سے پیدا ہوا ہے۔

یہ تمام چھ امور ایک ہی چیز کی مختلف صورتیں شمار ہوتی ہیں۔ان سب میں مادہ اصلی ایک سے زیادہ نہیں ہے۔ان چھ کے چھ اُمور سے متعلق آیات کے متون سے آگاہی کے لیے ہم ان میں سے ہر ایک کے بارے میں صرف ایک ایک آیت کے ذکر پر اکتفا کریں گے اور پھر دوسری آیات کی طرف اشارہ کریں گے۔

۱: عام مٹی

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ(حج:۵)

''اے لوگو! اگر تمہیں قیامت کے بارے میں شک اور تردد ہے تو (جان لو کہ) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے۔''

علاوہ ازیں آلِ عمران:۵۹،کہف:۳۷،روم:۲۰،فاطر:۱۱،غافر(مومن)۶۷ کی طرف بھی رجوع فرمائیں۔

۲: گیلی مٹی

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (سجدہ:۷)

وہ خدا جس نے ہر چیز کی خلقت کو زیبا اور خوب صورت بنایا۔اُس نے انسان کی خلقت کا گیلی مٹی سے آغاز کیا۔

اس کے علاوہ سورۃ انعام: ۲، اعراف: ۱۲، ص: ۷۱ و ۷۶، اسرائ: ۶۱ کی طرف بھی رجوع کریں۔

۳: چپکنے والی مٹی

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ (صافات: ۱۱)

''ہم نے انہیں چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا۔''

۴: سیاہ بدبودار مٹی

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾ (حجر: ۲۶)

''ہم نے انسان کو صلصال سے، جو بدبودار کالے رنگ والی گیلی مٹی سے لی گئی تھی، پیدا کیا ہے۔

اس سورہ کی آیت ۲۸، ۳۳ کی طرف رجوع کریں۔

۵: ڈھلنے والی مٹی

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ (مؤمنون: ۱۲)

''ہم نے انسان کو گیلی ڈھلنے والی مٹی سے پیدا کیا ہے۔''

۶: کھنکھنانے والی خشک مٹی

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ (رحمن: ۱۴)

''ہم نے انسان کو ٹھیکرے کے مانند ایسی خشک مٹی سے پیدا کیا جو کسی چیز سے ٹکرا کر آواز دیتی ہے۔''

اور یہی مضمون حجر ۲۶، ۲۸ اور ۳۳ میں بھی آیا ہے۔''

یہ آیات انسان کے مادہ اول کو بیان کرتی ہیں اور یہ چھ امور مادہ اوّل کی مختلف صورتیں ہیں۔ بغیر اس کے کہ انہیں ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف تبدیلی اور تغیر کے عنوان سے شمار کیا جائے۔

مادۂ اوّل کی پیدا کردہ تحوّلات،

مذکورہ آیات سے وجودِ انسان کے مادۂ اوّل کی وضاحت ہوگئی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ دوسرے مسئلہ، یعنی افعال کو، جو مادۂ اول پر واقع ہوئے ہیں۔ بیان کریں۔

جیسا کہ ہم نے قبل ازیں بیان کیا، قرآن علوم طبعی کی کتاب نہیں ہے۔ تاہم بعض اوقات انسان کی ہدایت کے لیے ان علوم سے متعلق

مسائل کو بھی پیش کرتا ہے۔جن سے انسان کی تربیت کے مختلف پہلو مراد ہوتے ہیں۔لہٰذا اگر ایک یا کئی آیات میں ان تبدیلیوں کو بیان کیا گیا ہے۔جو مادہ اول پر انجام پائے ہیں،تو اس کی وجہ تربیت اور رہنمائی کے پہلو ہیں۔

بعض لوگ چاہتے ہیں کہ گذشتہ آیات،خاص طور سے ان آیات کو،جو مادۂ اول کو صلصال یا فخار [1] جیسی کوئی چیز بتاتی ہیں۔مادۂ اول پر واقع ہونے والی تبدیلیوں کی تصویر کشی کے طور پر پیش کریں۔وہ اس سلسلہ میں بعض استعارات اور تشبیہات سے مدد لیتے ہیں اور کہتے ہیں:

''چینی ساز اور کوزہ بنانے والے گیلی مٹی پر ایک مدت تک کام کرتے ہیں تا کہ وہ اچھی طرح یک جان اور لیس دار ہوجائے اور استعمال کے لیے تیار ہوجائے۔''

کوزہ گر کوزہ یا پیالہ بنانے کے لیے مٹی سے پہلے سینکڑوں شکلیں ڈھالتے ہیں یہاں تک کہ ان کی مطلوبہ چیز بن جاتی ہے۔

گلدان،پیالے،تھالی،کوزہ،سبو وغیرہ جیسی مختلف چیزوں کی ابتداء میں ایک ہی شکل ہوتی ہے اور پھر درجہ بدرجہ دوسری اشکال بنتی چلی جاتی ہیں۔حتیٰ کہ مطلوبہ شکل حاصلِ ہوجاتی ہے کچی اور بے قوت متی میں نقصان دہ عوامل کے مقابلہ کی سکت نہیں ہوتی۔یہ گرمی پا کر پکی اور سخت ہوجاتی ہے پھر ہر قسم کی مٹی کا ردِعمل حرارت کے مقابلہ میں یکساں نہیں ہوتا۔کوئی مٹی پگھل جاتی ہے یا نقص پیدا کر لیتی ہے۔لیکن ایسے کوزے جن کی مٹی میں ملاوٹ نہیں ہوتی اور جس کی گیلی مٹی کو پورے طور پر گوندھا گیا ہوتا ہے وہ حرارت کو برداشت کرنے کی کامل طور پر سکت رکھتی ہے اور سالم اور خوش رنگ بن کر نکلتی ہے۔[2]

یہ نتیجہ پیش فہمی کی بُنیاد پر ہے

آیات سے یہ مفاہیم نکالنے کا مقصد انسان کی خلقت کے سلسلہ میں پہلے سے کیے ہوئے فیصلہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے یہ انسان کے تدریجی تکامل وارتقاء اور ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف تبدیلی وترقی کو ثابت کرتا ہے۔لہٰذا وہ کہتا ہے:۔

''کوزہ گر ایک کوزہ بنانے کے لیے ابتداء میں مٹی کی کئی سو شکلیں اپنی عقل سے ڈھالتا ہے......''

اس کی نظر میں زندگی کے مختلف حالات اور زمانوں میں انواع کا وجود کوزہ پکانے کی بھٹی میں کوزہ کے وجود کی مانند ہے۔یعنی جس طرح حرارت کے زیرِ اثر ہر طرح کی مٹی کا ردِعمل یکساں نہیں ہوتا،اسی طرح مختلف حالات میں جانداروں کی قوت برداشت بھی یکساں نہیں ہوتی،اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض جاندار تو نابود ہوجاتے ہیں اور بعض جن میں قوت زیادہ ہوتی ہے اور بقاء وحیات کی صلاحیت ہوتی ہے وہ محفوظ رہ جاتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ انواعِ حیات جن سے انسان ترقی پا کر انسان بنا،خود تو ضعف وناتوانی اور صلاحیت کے فقدان کی بناء پر نابود

---

[1] فخار کا معنی پیالہ یا پکی مٹی کا کوزہ ہے۔

[2] خلقتِ انسان ۱۲۵،۱۲۷

ہو گئی ہیں اور صرف انسان باقی رہ گیا۔

لیکن اگر ہم اپنے ذہن کو مذکورہ مسائل سے آزاد کرلیں تو آیات سے اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ سکتے کہ انسان کا پیکرِ اوّل خشک مٹی کی طرح تھا، جسے عنایاتِ الٰہی کی مدد سے کمال وروح حاصل ہوئی ماوراو ہی ذاتِ باری ہے جس نے اس بے مقدار وجود کو یہ تمام کمالات بخشے۔ باقی رہیں دیگر خصوصیات جو حقیر مولف نے چینی کے مادہ اور مٹی کے کوزوں اور ان کے بنانے والوں کے بارے میں تصوّر کی ہیں۔ اور انسان کے مادہ اور اس کے بنانے والے کی طرف بھی اس کی اشارتاً نسبت دی ہے وہ اس بیان سے ہرگز سمجھ میں نہیں آتیں۔

قرآن مادہ سفالی (مٹی کے ظروف) کے تمام خصائص میں سے صرف ایک خصوصیت کا ذکر کرتا ہے اور وہ یہ کہ ہم نے انسان کو چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا ہے[۱] اور یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ اگر وہ مٹی چپکنے والی نہ ہوتی تو پھر مجسمہ ہی نہ بن پاتا جس میں رُوح پھونکی جاتی۔

اس موضوع کی مزید وضاحت کے لیے ہم کہیں گے کہ مادہ انسانی کو فخار[۲] کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے لیکن اس کے خالق اور پیدا کرنے والے کو چینی ساز اور کوزہ گر کے ساتھ تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ اصولاً تشبیہ میں ہمیشہ مشبہ کی نمایاں صفت ہی کو مدِ نظر جاتا ہے۔ اس کی تمام خصوصیات کی نہیں۔ مثلاً اگر ہم کہیں کہ زید شیر ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ شجاعت میں شیر ہے۔ یہ نہیں کہ گردن کے بال، موٹی گردن، قوی بازو اور دم وسم اور منہ کی بدبو وغیرہ سب شیر جیسی ہیں۔

اگر یہ نظریہ بے دلیل ہے، تو اسی طرح اس کے مدِ مقابل نظریہ کا بھی کوئی جواز نہیں۔ وہ یہ ہے کہ مادۂ اوّل کے تمام تغیرات دفعتاً پیش آئے تھے اور ان کے درمیان کوئی زمانی فاصلہ نہیں تھا۔ کیونکہ یہ بات کسی طرح بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ یہ تمام مراحل جن کو ہم نے انسان کے مادۂ اوّل کا نام دیا ہے۔ وہ زمانہ کے مخصوص فاصلوں کے ساتھ انجام پائے ہوں چند روایات بھی اس امر کی گواہی دیتی ہیں۔

بحار الانوار ج ۱۱ ص ۱۲۰ بہ نقل از ''سعد السعود'' ابن طاؤس

لیکن قرآن اس بارے میں بالکل خاموش ہے اور کسی چیز کو اس میں زبردستی شامل نہیں کیا جاسکتا۔

مادۂ اوّل کے بارے میں واحد تبدیلی جسے قرآن نے بیان کیا ہے وہ اس کی تصویر اور صورت بنانے کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس سلسلہ میں وضاحت پیش کریں۔

۲: خلقت کے بعد مرحلہءِ تصویر

قرآن انسانِ اوّل کے لیے اس کی خلقت کے بعد اس کی شکل وصورت بنانے کا عقیدہ رکھتا ہے جیسا کہ کہتا ہے:۔

---

[۱] اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ (صافات: ۱۱)

[۲] خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ الرحمٰن: ۱۴

وَلَقَدۡ خَلَقۡنٰكُمۡ ثُمَّ صَوَّرۡنٰكُمۡ ثُمَّ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَ ؕ لَمۡ يَكُنۡ مِّنَ السّٰجِدِيۡنَ ⑪ (اعراف:۱۱)

''پس ہم نے تمہیں خلق کیا، پھر تمہاری صُورت بنائی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ پس ابلیس کے سوا سب نے (آدم کو) سجدہ کیا۔''

اب دیکھنا یہ ہے کہ خلقت کے بعد صورت بنانے سے کیا مُراد ہے؟ پہلے ہم ایک نکتہ کی یاد دہانی کرادیں اور وہ یہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ خلق دو مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

۱: اندازہ، اسی لیے کہتے ہیں:۔ خَلَقَ الْخَيَاطُ الثَّوْبَ۔ درزی نے کپڑے کا اندازہ لگایا۔

۲: ایجاد اور پیدا کرنا۔

اساس البلاغۃ کے مولف کہتے ہیں کہ 'خلق' کے صحیح اور بُنیادی معنی اندازہ لگانا'' ہی ہیں جبکہ دوسرے معانی مرورِ زمانہ سے پیدا ہوئے ہیں۔[1]

لیکن اگر یہ بات صحیح مان لی جائے تب بھی اس آیت میں قطعی اور یقینی طور پر دوسرے معنی ہی مُراد ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ (لَقَدۡ خَلَقۡنٰكُمۡ) کے جُملہ کے بعد ثُمَّ صَوَّرۡنٰكُمۡ ثُمَّ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا۔ کے جملے آئے ہیں۔ لہٰذا کسی وضاحت کی ضرورت کے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ صورتِ انسانی کا بنانا اور فرشتوں کا اس خلق شدہ انسان کے سامنے سجدہ کرنے کا عمل بیک وقت واقع ہوئے ہیں۔ یہ عمل خلقتِ انسان کے صرف اندازہ کے ساتھ واقع نہیں ہوا۔

بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں صورت سے کیا مُراد ہے؟''

اس بات کی واضح ترین تفسیر ہے وہی ہے جو سورۂ حجر میں اس بارے میں آئی ہے۔

جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىۡ خَالِـقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ㉘ فَاِذَا سَوَّيۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِيۡنَ ㉙ (حجر:۲۸،۲۹)

خَالِـقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ صَلۡصَالٍ کا جملہ، زیر بحث آیت میں اِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ کے جملہ کے مقام پر آیا ہے۔

[1] المنارج ۸ ص ۳۲۸

اسی طرح فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ [1] کا جملہ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ کے معنی کی تشریح کرتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ سورۂ حجر کی آیات میں محورِ بحث خلقت آدم ہے اور زیرِ بحث آیت میں تمام انسانوں کی آفرینش مراد ہے۔ چونکہ قرآن خلقتِ آدم کو تمام انسانوں کی خلقت قرار دیتا ہے، اس لیے اس کی خلقت کے مراحل کی بھی تمام انسانوں کی طرف نسبت دیتا ہے۔ خلقتِ انسانی سے متعلق آیات کی طرف رجوع کرنے سے یہ مطلب مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے[2]

لہٰذا خشک شدہ مٹی سے انسان کی خلقت کے بعد تصویر و تسویہ کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اور یہ درحقیقت انسان کی ظاہری صورت بندی کا مرحلہ ہے، جس میں ابھی روح نہیں پھونکی گئی۔ کیونکہ اس مرحلہ کے بعد وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ۔ کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ثم کا لفظ جو خشک مٹی سے انسان کی ابتداء اور اس کی صورت گری کے مرحلہ کے درمیان استعمال ہوا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں بتاتا کہ ان دونوں مراحل کے درمیان کچھ زمانہ گزرا ہے۔ لیکن یہ مدت کتنی تھی قرآن اس سلسلہ میں خاموش ہے۔ لیکن اس عرصہ کو ہرگز کئی لاکھ سال پر محیط نہیں سمجھا جا سکتا اور نہ ہی یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نظر آتی ہے۔ کہ ان دو مراحل کی درمیانی مدت میں سینکڑوں انواع تخلیق ہوئی ہیں۔

بفرض محال اگر ایسا ہو بھی تو انواع کو جان اور روحِ حیوانی کا بھی حامل ہونا چاہیے۔ جبکہ انسان فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ۔ کے جملہ کے مطابق تصویر و تسویہ کے مراحل کے درمیانی عرصہ میں روح اور جان سے خالی ہے۔ یعنی صورت بن جانے کے بعد اس میں رُوح داخل ہوتی ہے۔

اس بات سے کہ سورۂ اعراف میں لفظ ثم اور سورۂ حجر کی آیات میں لفظ 'فا' استعمال ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مرحلوں (خلقت و تصویر) کے درمیان فاصلہ بہت ہی تھوڑا تھا، اسی تصوُّر سے ان دو مختلف المعانی حروف عطف کے استعمال کا جواز ملتا ہے۔

جو لوگ ثم صورنکم کے جملہ کو لاکھوں سال کے گذرنے اور ہزار ہا انواع کے وجوہ میں آنے پر گواہ بنانا چاہتے ہیں، انہوں نے اپنے قائم کردہ نظریہ کو آیت کے معنی میں زبردستی ٹھونسنا چاہا ہے اور بس، اس کے برعکس یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مادۂ اوّل کی خلقت اور شکِل انسانی کی تصویر کشی کے درمیان کوئی نوع نہیں تھی، کیونکہ قرآن اس بارے میں خاموش ہے اور اس کی کوئی وضاحت نہیں کرتا ہے۔

۳: مرحلہ نفخ رُوح

قرآن کی نظر میں صورت گری انسان کی خلقت کا مرحلہ آخر نہیں، بلکہ اس کے بعد ایک بہت ہی عظیم اور بڑا امر مرحلہ موجود ہے اور وہ نفخ رُوح، یعنی اس کے جسم میں جان ڈالنے کا مرحلہ ہے۔ انسان کا برگزیدہ خلقت اور برتر موجود شمار ہونا، اسی رُوح اور جان کا مرہون منت ہے، جس نے اُسے دو عظیم کاموں پر قادر و توانا بنایا ہے۔

---

[1] جس وقت اس کی جسمانی خلقت مکمل ہوگئی

[2] سورۂ سجدہ آیت ۸ اور غافر (مومن) آیت ۶۷ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱: انسان روح ہی کے باعث غور وفکر کرتا ہے، استدلال کرتا ہے اور مقدمات سے نتائج تک پہنچتا ہے۔ اس کی انہیں خصوصیات کو عقل وخرد کہتے ہیں، اور انہی خصوصیات کی وجہ سے اس کا ''ناطق'' (متفکر) کے عنوان سے تعارف کرایا جاتا ہے۔

۲: وہ خاص موقعوں پر متحرک اور سرگرم عمل ہوجاتا ہے۔ کچھ باتوں کو چاہتا ہے اور کچھ چیزوں سے دور بھاگتا ہے اس خصوصیت کی بناء پر اُسے نفس کہتے ہیں اور طرح طرح کی خواہشات کے مرکز کے طور پر بھی اس کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رُوح خاص تجلیات کی حامل ہوتی ہے۔ غور وفکر کرنا، کسی چیز کی خواہش کرنا یا ادراک وتحریک، رُوح کی خصوصیات میں شمار ہوتے ہیں، جب فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ انسان عقل اور نفس کا حامل ہے تو وہ حقیقت میں انسان کے گوناگوں خصائص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کو گوناگوں صلاحیتوں کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں، ورنہ روح، عقل اور نفس تینوں الگ الگ اور ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی حقیقت کی تین مختلف تعبیریں ہیں۔

قرآن نے خلقتِ انسانی کے اس مرحلہ کو مختلف آیات میں بیان کیا ہے۔ جن میں سے بعض کو ہم یہاں پر نقل کرتے ہیں۔

۱۔ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ [1] فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾ (حجر: ۲۹)

''جب میں اس کو درست کرلوں اور اس کے بدن کے اعضاء کو مساوی اور متناسب بنادوں) اور اس میں اپنی (باعظمت وشرف) رُوح پھونک لوں، توتم سب کے سب اس کو سجدہ کرنا۔''

---

[1] سورہ اعراف کی آیت ۱۱ میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں یہ آیت انسان کی خلقت کے دو مرحلوں کو بیان کررہی ہے ۱۔ مٹی اور کیچڑ سے ۔۔۔ ۲۔ ''صورت گری'' کا مرحلہ اور ہرگز نفخ روح کا نام نہیں لیتی، بلکہ ان دو مراحل کو بیان کرنے کے بعد فرشتوں کے سجدہ کرنے کے مسئلہ کو ثمہ کے ساتھ پیش کرتا ہے جبکہ سورۃ حجر کی آیت میں تصویر وتسویہ کے بعد روح پھونکنے کے موضوع کا ذکر آتا ہے اور پھر قرآن فرشتوں کے سجدہ کرنے کو لفظ فا کے ساتھ پیش کرتا ہے اب اس اختلاف کی وجہ معلوم کرنا چاہیے۔ لیکن ان دونوں آیات کے مضمون کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ سورۃ اعراف میں توصورتگری کے مسئلہ کے بعد ملائکہ کے سجدہ کرنے کو لفظ ثمہ سے جو تصویر بنانے اور ملائکہ کو سجدہ کرنے کے فاصلہ کو بیان کرتا ہے پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ صورت گری اور فرشتوں کے سجدہ میں فاصلہ، زمانی تھا، لہٰذا یقینی طور پر اس فاصلہ میں روح پھونکنے کا واقعہ صورت پذیر ہوا، لیکن سورہ حجر میں ملائکہ کے سجدہ کو روح پھونکنے کے بعد لفظ فا کے ساتھ جو ترتیب اور ان دونوں کے درمیان زمانی فاصلہ نہ ہونے کو ظاہر کرتا ہے، پیش کرتے ہوئے کہا جاتا ہے وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ۔ کلام میں اس قسم کی باریکی اس بات کی ترجمانی کرتی ہے کہ یہ دونوں کلام عالم وحی سے تعلق رکھتے ہیں اور فکر بشر کی پیداوار نہیں ہیں اور وہ بھی تئیس (۲۳) سال کی اس طویل مدت میں جو نزول قرآن کا زمانہ ہے، جب اس کا لانے والا مشکلات کے انبوہ میں گھرا ہوا تھا۔

سورۂ ص کی آیت ۷۲ بھی اسی موضوع پر انسانِ اوّل کے متعلق ہے۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (سجدہ:۹)

اس کے بعد اسے انسان کی صورت میں پیدا کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی، اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل قرار دیئے۔ لیکن تم ان نعمتوں کا بہت ہی کم شکر ادا کرتے ہو۔''

اس آیت میں ''تسویہ'' سے مراد وہی اعضاء جوارح کو اعتدال اور افراط اور تفریط سے پاک صورت میں پیدا کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کی صورت گری حکیمانہ اصول پر اور نقص وعیب سے پاک ہے۔ دوسری آیات میں بھی تسویہ سے یہی مُراد ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:۔

الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ (انفطار:۷)

''وہی جس نے تجھے پیدا کیا (اور اپنے حکیمانہ ارادے کے مطابق) تجھے اعتدال بخشا۔''

پھر فرماتا ہے:۔

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ (اعلیٰ:۲)

''خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اُسے درست بنایا، اس لیے تسویہ سے مُراد خلقتِ ظاہری کی تکمیل ہے۔''

عربی زبان میں اس شخص کو جو ظاہری خلقت کے لحاظ سے صحیح و معتدل ہو ''سوی'' کہتے ہیں۔

اس کے بعد تیسرا مرحلہ جو رُوح کا مرحلہ ہے۔ شروع ہوتا ہے۔ جیسا کہ اسی آیت میں فرماتا ہے۔ **ونفخ فیه من رُّوحِهٖ** کے الفاظ کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یعنی خُدا نے خود اپنی رُوح اس میں پھونکی۔

مذکورہ آیت کے معنی میں غور وفکر ہمیں ایک طرح سے روح انسانی کی عظمت سے آشنا کرتی ہے، کیونکہ رُوح پھونکنے کے بعد 'سننے' اور دیکھنے کے مسائل کو پیش کرتا ہے، اور فرماتا ہے۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۲۳ (الملك)

''تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے، لیکن تم بہت ہی کم شکر ادا کرتے ہو۔''

انسان کے وجود کے حالات میں روح پھونکنے کے بعد (سننے، دیکھنے اور سوچنے) کے حصہ کو پیش کرنا، اس امر کی دلیل ہے کہ اس قسم کی حسیّ اور فکری کارکردگیاں سب کی سب رُوح کی مرہونِ منت ہیں۔ یہ روح ہی ہے جو کان کے دریچہ سے سنتی ہے، روح ہی آنکھ کے روشندان

سے دیکھتی ہے اور یہی قلب کے راستہ سے تعقل وتفکر کرتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ صورت گری کے مرحلہ کے بعد یا قرآن کی تعبیر میں تصویر وتسویہ کے بعد، روح کے تعلق کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ خواہ وہ سوہ حجر کی آیت ۲۹ کے مطابق صورت آغاز میں ہو یا سورہ سجدہ کی آیت ۹ کے مطابق انسان کی موجودہ کیفیت میں ہو۔

اس مرحلہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن انسان کو ایک ایسے مرکب کے طور پر پیش کرتا ہے جو مادہ اور روح سے مل کر بنا ہو۔ اگر ہم اس کے مادی پہلو پر غور کریں اور اس کی تحلیل وتجزیہ کریں تو گیلی مٹی سے سیاہ رنگ بد بودار مٹی تک جا پہنچیں گے، جو کیچڑ یا گارے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ پھر اگر اس کے معنوی پہلو کی طرف توجہ کریں تو وہ ایسی روح کا حامل ہے جو عظمت وشائستگی کے لحاظ سے ایسے مرحلہ تک پہنچتی ہے کہ خُدا اُسے خود اپنی طرف نسبت دیتا ہے اور فرماتا ہے: ''میں نے اس میں خود اپنی طرف سے رُوح پھونکی۔'' ہم سب جانتے ہیں کہ خدا نہ جسم ہے اور نہ رُوح لیکن اس کے باوجود خدا انسان کی رُوح کو، اس کی عظمت کی وجہ سے، اپنی طرف نسبت دیتا ہے جیسا کہ کعبہ کی عظمت کی بناء پر اسے اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور فرماتا ہے۔

اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ (بقرہ:۱۲۵)

''میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے بتوں سے پاک رکھو۔''

اسی ماہِ مبارک رمضان کو احادیث اسلامی میں ''شہر اللہ'' کہا گیا ہے۔ اس قسم کی اِضافت ہر زبان اور ہر قوم وملت میں رائج ہے۔ موجودہ زمانہ میں بھی 'مجلس شورٰی' کو خانہ ملت'' (ملت کا گھر) کہتے ہیں۔

قرآن نے اس مرحلہ میں انسان کی خلقتِ اوّل ہی کو ہر طرح سے مکمل قرار دیا ہے۔ اسی روحِ الٰہی اور ان گونا گوں استعدادوں کی وجہ سے جو اس میں پوشیدہ ہیں اور اس خاص قوتِ آگاہی کی بناء پر جو انسان اشیاء وجہان کے بارے میں رکھتا ہے، فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس عجوبہ خلقت کے سامنے سجدہ کریں اور اس کی تعظیم وتکریم کریں۔ قرآن ان مراحل کے بارے میں، جو ممکن ہے ان تین مراتب کے درمیان موجود ہوں، بالکل خاموش ہے۔ لہٰذا اس پر ہرگز کسی نظریہ کو مسلط نہیں کیا جا سکتا۔

تحوّلِ انواع کے مُدّعی اور قرآن

بعض لوگوں نے انسانِ اوّل کے بارے میں، بعض دیگر مراحل کو، جو تکامُل وارتقاء کے طرف داروں کے نظریہ پر منطبق ہوتے ہیں۔ ثابت کرنا اور آیاتِ قرآنی کو ان پر منطبق کرنا چاہا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم چند آیات سے استدلال کرتے ہیں، جن میں سے اہم ترین آیت ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ ہم اس آیت کو نقل کرنے کے بعد ان کے استدلال پر توجہ دیں۔

آیت کا متن یہ ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةً

بَعۡضُهَا مِنۡۢ بَعۡضٍ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۳۴﴾ (آل عمران:۳۴:۳۳)

''خدا نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو عالمین سے منتخب کیا۔ ان میں سے بعض بعض کی اولاد ہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

اس آیت کے سلسلہ میں تکامل وارتقاء کا نظریہ رکھنے والے اس طرح استدلال قائم کرتے ہیں:۔

یہ آیت ''آدم'' کا نام نوح وابراہیم کی طرح ایک خاص صورت میں ذکر کرتی ہے، اور آدم کی پیدائش کی کیفیت اور ماحول کے بارے میں واضح بیان رکھتی ہے۔ کیونکہ اصطفیٰ چُننے اور انتخاب کرنے کے معنی میں آتا ہے اور ہر نوع کا انتخاب، اس کی مانند دیگر ہم نوع جماعتوں یا کئی جمیعتوں میں سے صورت پذیر ہوتا ہے۔ نوح آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کے برگزیدہ افراد میں سے ہر ایک اپنی قوم یعنی ان لوگوں میں سے منتخب ہوئے ہیں، تو یقینی طور پر یہی وضع وکیفیت آدم کے لیے بھی جن کے لیے کوئی خاص حالات آیت میں ذکر نہیں ہوئے فراہم تھی۔ یعنی آدم بھی اپنے ہم نوع افراد کے درمیان سے، جو جسمانی اور زندگی کی وضع وکیفیت کے لحاظ سے آدم کی مثل تھے چُنے گئے تھے۔

استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ آیت میں 'عالمین' آدم یا نوح کے ہم عصر لوگوں کے معنی میں آیا ہے۔ اس صورت میں آدم کے منتخب ہونے کے لیے لازم ہونا چاہیے کہ اس کے وجود میں آنے کے وقت اس کی مانند اس کے ہم نوع موجود تھے۔

لیکن لفظ عالمین کی اس قسم کی تفسیر اس کے لغوی اور قرآنی معنی کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن میں جہاں بھی لفظ عالمین سے عاقل وذی شعور موجودات مُراد لیے گئے ہیں وہاں دنیا کے تمام انسان مراد ہوتے ہیں۔ جنہوں نے عرصۂ وجود میں قدم رکھا ہو، نہ کہ خاص ہمعصر انسان۔ یہ حقیقت مندرجہ ذیل آیات کی طرف متوجہ کرنے سے واضح ہو جاتی ہے۔

وَمَا اللّٰهُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۸﴾ (آل عمران:۱۰۸)

''خدا عالمین پر ظلم وستم کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۚ۹۶﴾ (آل عمران:۹۶)

پہلا گھر جو زمین میں لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا، وہی گھر ہے جو مکہ میں ہے جس میں عالمین کے لیے برکت اور ہدایت ہے۔[1]

---

[1] اس سلسلہ میں سورہ بقرہ:۲۵۱، شعراء: ۱۶۵، اعراف:۱۴۰ عنکبوت ۲۹ کی طرف رجوع فرمائیں۔ ان آیات میں ''عالمین'' سے تمام انسان اور دنیا جہان کے لوگ مُراد ہیں، نہ کہ صرف ہمعصر انسان۔

اس بناء پر آدم جیسے انسان کے انتخاب کے لیے ضروری نہیں کہ خود اس کے ہی زمانہ میں اس کے ہم نوع موجود ہوں۔ بلکہ روئے زمین کے تمام انسانوں کو سامنے رکھتے ہوئے جو آئندہ اس عرصہ زمین میں قدم رکھیں گے۔ انتخاب کا معاملہ انجام پا سکتا ہے۔ اس انتخاب سے مُراد یہ ہے کہ اُسے ایسے کمالات و خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ جو دوسرے انسانوں میں ہرگز موجود نہیں ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے تمام قرون و اعصار کے انسانوں سے ان چند افراد کو منتخب کیا ہے، نہ کہ اپنے سے پہلے کے انسانوں میں سے یا ان کے معاصر انسانوں میں سے انتخاب کیا ہے۔

انواع میں تبدیلیوں کے نظریہ کے طرفداروں نے کچھ اور آیات سے بھی استدلال کیا ہے۔[1] جنہیں ہرگز استدلال کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ آیت پر اپنی رائے کو ٹھونسنے کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں رکھتے۔

نتیجہ بحث

انسان اوّل کی خلقت کے سلسلہ میں واردشدہ آیات کے ملاحظہ سے یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ قرآنی آیات کا طرز و آہنگ انسان کی خلقت کا مستقل طرز و آہنگ ہے۔ اگر آدم کی مٹی سے خلقت سے لے کر انسان اول تک پہنچنے کے درمیان انواع کی تبدیلیوں کی قسم کے کچھ مراحل تھے بھی تو قرآن اس قسم کے انواع کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا۔ پھر انواع کی تبدیلیوں کے طرفداروں کے دلائل بھی بالخصوص ایک مفروضہ کے دائرہ سے باہر نہیں نکلتے۔ نہ ہی ابھی تک آیات کا مضمون اس طرح کا بھی نہیں ہے، جو صراحت کے ساتھ ان مراحل کو رد کرتا ہو۔ بلکہ اس میں یہ سکت بھی ہے کہ اگر کسی دن انسان اول کی خلقت میں تغیرِ انواع کا مسئلہ قطعیت اور یقین کی حد تک پہنچ جائے۔ تو اس سے ہرگز الگ نہ ہوگا۔

انسان اوّل کی نسل کی بقاء

قرآن انسانِ اول کی خلقت کو بیان کرنے کئے بعد اس کی نسل کی بقاء کو نر و مادہ کی جنسی آمیزش کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف سورتوں میں بہت سی آیات وارد ہوئی ہیں۔ ہم اختصار کے ساتھ ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ (سجدہ :۸:۷)

[1] اس حصہ میں ہم نے ان آیات کی، جن سے وہ زیادہ تر استدلال کرتے ہیں، وضاحت کردی ہے۔ ان میں سے ایک تو یہی آیت اصطفاء ہے۔ دوسری آیت وہ ہے جو انسان کی خلقت کو صلصال اور فخار سے قرار دیتی ہے۔ اور تیسری آیت وہ ہے جو صورتگری کے مرحلہ کا ثم کے لفظ سے عطف کرتی ہے۔ ان تینوں دلائل کا بودا پن اس حصہ میں پورے طور پر واضح ہوگیا ہے۔

''انسان کی خلقت کا آغاز گیلی مٹی سے کیا، اس کے بعد انسان کی نسل کی پیدائش اور بقاء کو، ایک حقیر پانی میں قرار دیا۔''

قرآن کبھی تو بقاء نسل کے سبب کو لفظ ''ماء'' سے یاد کرتا ہے اور کبھی لفظ ''نطفہ'' سے۔ آپ اس موضوع کو ذیل میں ذکر شدہ آیات میں پائیں گے۔[1]

قرآن نے رحم میں نطفہ کی تکمیل کے عمل کو مختلف آیات میں بیان کیا ہے۔ لیکن ان سب میں مکمل طریقہ سے سورۂ مومنون میں پیش کیا ہے۔ جسے ہم ابھی نقل کر کے اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:۔

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۚ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ (مومنون:۱۴)

''اِس کے بعد ہم نے نطفہ کو علقہ (جما ہوا خون) بنایا پھر علقہ کو مضغہ (لوتھڑا) بنایا، پھر مضغہ کو ہڈی بنایا اور پھر ہڈی پر گوشت کا لباس پہنا دیا۔ اس کے بعد ہم نے (اس میں روح پھونک کر) اسے ایک اور طرح کی خلقت دے دی۔ آفرین ہے خدا کی قدرت پر جو بہترین خالق (پیدا کرنے والا) ہے۔''

یہ موجودہ انسان کے وجود کا شجرہ نسب ہے۔ اس شجرہ سے آگاہی نے کسی انسان میں کوئی مشکل یا تکلیف پیدا نہیں کی نہ ہی اس کی کسی طرح کی تحقیر شامل ہے۔ لیکن دیگر مکاتب فکر، جنھوں نے انسان کو جانوروں کی اولاد، اس کے بعد بندر سے مشابہ وجود اور پھر انسان نما بندر سمجھا ہے۔ درحقیقت انسان کی تحقیر و تذلیل کی ہے، اور اس میں ایک قسم کی حقارت اور چھوٹے پن کا احساس پیدا کیا ہے۔

---

[1] سورہ فرقان: ۵۴، سجدہ: ۸، مرسلات: ۲۰، طارق: ۶، (ان سورتوں میں لفظ ''ماء'' آیا ہے) ان کے علاوہ سورہ نحل: ۴، کہف: ۳۷، حج: ۵، مومنون: ۱۳، ۱۴، فاطر: ۱۱، یٰس: ۷۷ غافر (مومن) ۶۷، نجم: ۴۶، قیامت ۳۷، انسان (دہر): ۲، عبس: ۱۹ کی طرف رجوع فرمایئے۔

(۱۸)

اِنسانی رُوح کی بعد از موت بقاء

ہم خلقت انسانی کے مراحل میں آخری مرحلہ سے واقف ہو چکے ہیں اور یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ رُوح پھونکنے کا مرحلہ خلقتِ انسان کا آخری مرحلہ ہے۔خلقتِ انسان سے متعلق یہ حصہ اس کے لیے علوم ومعارف کی بُنیاد، اس کی خواہشات اور اصطلاح کے مُطابق اس کے غرائز وفطرت پر مشتمل ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ روحِ انسانی کے دو پہلو ہیں۔عقلانی وادراکی، اور نفسانی وغریزی۔[1]

لیکن یہاں سوالات کا ایک سلسلہ سامنے آتا ہے۔اسلام کی عالمگیر کیفیت کو ان کا جواب دینا چاہیے اور وہ جواب ایسا ہو جو قرآن اور اسلامی احادیث سے مستفاد ہو۔

وہ سوالات یہ ہیں:۔

۱: روح کے بدن سے تعلق اور قرآن کی رُو سے نفخِ رُوح سے کیا مراد ہے؟ اور کیا خلقت کا یہ مرحلہ، پہلی خلقتوں کے مراحل کا تکامل وارتقاء ہے؟ اور کیا مادہ تکمیل کے مراحل سے گذر کر رُوح میں تبدیل ہو جاتا ہے؟ یا یہ کہ روح کسی اور عالم سے تعلق رکھتی ہے اور مخصوص حالات میں بدن سے متعلق اور اس میں ضم ہو جاتی ہے؟ دُوسرے لفظوں میں کیا رُوح کی پیدائش، خلقتِ جسم کے بعد اور بدن کے تسویہ یا تصویر گری کے بعد ہوتی ہے، یا یہ کہ رُوح جسم سے پیدا ہوتی ہے اور مخصوص حالات میں بدن کا ضمیمہ بنتی اور اس سے ملحق ہو جاتی ہے؟

پہلے نظریہ کے مطابق ارواح کی پیدائش، خلقتِ ابدان کے بعد ہوتی ہے۔ اور دُوسرے نظریہ کے مُطابق مُعاملہ اس کے برعکس ہے۔

۲: کیا جسم سے تعلق قائم ہونے کے بعد رُوح میں مادی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں؟ یا وہ ان خصوصیات سے حُسن حاصل کرتی ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا رُوح کا کوئی مادی وجود ہے یا وہ مادّہ اور اس کی خصوصیات سے جلا پایا ہوا وجود ہے؟

۳: کیا انسان کی موت کے ساتھ، جب بدن فانی اور متلاشی ہو جاتا ہے۔روح بھی فنا ہو جاتی ہے؟ یا یہ کہ جسم کا فنا ہونا رُوح کے فنا ہونے کا سبب نہیں بنتا۔ بلکہ روح دائمی اور جاودانی ہے۔

یہ تینوں سوالات ہر مکتبِ فکر کو درپیش ہیں اور مکتبِ اسلام کے لیے، جس کی عالمگیری اور کائنات کے علم کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے۔ یہ سب زیادہ واضح ہیں۔قرآن ان سوالات کا مختصر جواب دیتا ہے۔

---

[1] آئندہ ہم ان دونوں موضوعات پر بحث کریں گے

پہلے دوسوالوں کا جواب

سورۂ مومنون کی چودھویں آیت پہلے دوسوالوں کا جواب دیتی ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ (مؤمنون:۱۴)

''نطفہ کو جمے ہوئے خون کی صورت دی۔اس کے بعد ہم نے اسے گوشت کا لوتھڑا بنا دیا۔پھر لوتھڑے کو ہڈیاں بنا دیں، اور ان ہڈیوں پر گوشت کا لباس پہنا دیا۔پھر ہم نے اُسے دوسری خلقت بخشی، عظیم و بابرکت ہے اللہ جو بہترین خالق ہے۔''

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ کا جملہ دونوں سوالات کا جواب دیتا ہے، اور جواب کے طریقہ سے آ گاہی اس بات سے وابستہ ہے کہ ہم اس جملہ میں موجود چار (۴) نکات میں غور وخوض کریں۔

۱: اَنْشَاْنٰهُ کی ضمیر کے بارے میں کافی غور کر کے اس کے مرجع سے اچھی طرح آشنا و واقف ہوں۔

۲: روح کی خلقت کو گذشتہ جملوں پر عطف کرنے میں لفظ ثم کو استعمال کیا ہے، جبکہ گذشتہ جملوں کے ایک دوسرے پر عطف میں لفظ 'فا' کو استعمال کیا ہے۔

۳: اس بارے میں اَنْشَاْنٰهُ استعمال کیا ہے جو عربی زبان میں ایک مخصوص معنی رکھتا ہے۔

۴: روح کی خلقت کو ''خلقِ آخر'' کا جو دوسری خلقت کے معنی میں ہے، نام دیا گیا ہے۔

ان چاروں نکات کی وضاحت اس طرح ہے:۔

پہلا نکتہ

انشاناہُ میں ضمیر انسان کی طرف (جو آیت کے آغاز میں آیا ہے) لوٹتی ہے جہاں فرماتا ہے:۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾

''ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔اس کے بعد ہم نے اُسے نطفہ کی صورت میں ایک محکم و استوار

قرارگاہ میں ٹھہرایا۔

اس صورت میں اَنْشَاْنَاہُ کی ضمیر سے مُراد وہ انسان ہے جو چھ مراحل اپنے پیچھے چھوڑ کر آ رہا ہے۔یعنی گیلی مٹی، نطفہ، علقہ، مضغہ، ہڈی اور ہڈی پر گوشت پہنانے کے مراحل کی تکمیل کے بعد اس نے خلقت کی نئی صورت اختیار کر لی ہے۔اب خدا ایسے انسان کے بارے میں فرماتا ہے: ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ۔اس قسم کے انسان کو ہم نے ایک نئی خلقت بخشی۔''

جب خدا اس قسم کے انسان سے جس نے کئی مراحل طے کیے ہیں۔یہ فرماتا ہے کہ ہم نے اُسے نئی خلقت بخشی تو لازماً اس سے مندرجہ ذیل دو نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

الف:۔ انسان کا جسم کئی مراحل طے کرتا ہے اور قرآن کی تعبیر میں تسویہ وصورت گری کے مرحلہ کو آخر تک پہنچاتا ہے۔اس کے بعد اس میں اس قسم کی قابلیت وشائستگی پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ روح وجان میں تبدیل ہوجاتا ہے۔اس صورت میں نتیجہ یہ نکلا کہ روح کی مادہ کے تکامل اور اسکی تکمیل پر اثرات کے باعث جان میں تبدیل ہوجانے کے علاوہ اور کوئی حقیقت نہیں۔یہ خود خدا کی ایک نشانی ہے کہ اس مادہ کو جس میں کوئی درک وشعور نہیں ہوتا تکامل کے ایسے مرتبہ تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ اپنے دامن میں ایک ایسے وجود کو جو سراسر ادراک وشعور ہے پرورش کرتا ہے۔

ب:۔ روح کی پیدائش جسم کی خلقت اور اس کی تکمیل کے بعد ہوتی ہے مادہ کی تکمیل رُوح اور جان کی پیدائش کے لیے زمین ہموار کرتی ہے ایسا نہیں کہ روح بدن سے پہلے پیدا ہوتی ہو۔اور مخصوص شرائط کی موجودگی میں حساس جسم کے ساتھ ملحق ہوجاتی ہے۔

یہاں تک تو پہلے نکتہ کے بیان سے، انشاناہُ کے جملہ کی ضمیر میں غور وخوض کرنے سے پہلے سوال کا جواب واضح ہو گیا۔اب ہم ان نکات کو بیان کرتے ہیں جو دوسرے سوال کا جواب بن سکتے ہیں۔

دوسرا نکتہ

قرآن نے انسان کی خلقت کے مراتب کے بیان میں کبھی لفظ ثم اور کبھی لفظ فاء استعمال کیا ہے اس میں پوشیدہ نکتہ یہ ہے کہ جہاں ایک کیفیت دوسری کیفیت کی نسبت فاصلہ زیادہ رکھتی ہے اس کے لیے لفظ ثم استعمال ہوا ہے۔مثلاً کیفیت ''طین''، ''نطفہ'' کی نسبت اور ''نطفہ'' ''علقہ'' کی نسبت کیونکر گیلی مٹی، منی، اور جما ہوا خون تین قسم کے مختلف وجود شمار ہوتے ہیں۔اور بظاہر جوہری اختلاف رکھتے ہیں لیکن جہاں کیفیات کا اختلاف صرف صفات کے لحاظ سے تھا۔جیسے علقہ کا مضغہ سے مضغہ کا عظام سے، تو ان موارد میں لفظ فا جو خلقت میں تھوڑے عرصہ یا کم جوہری فاصلہ کو ظاہر کرتا ہے۔استعمال ہوا ہے۔اس بیان سے واضح ہوجاتا ہے۔کہ قرآن نے انسان کی خلقت کے آخری مرحلہ کو بیان کرنے میں ثم کا لفظ کیوں استعمال کرتے ہوئے کہا ہے: ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ۔کیوں کہ اس کیفیت اور اس سے پہلی کیفیت میں جوہری فاصلہ بہت عمیق ہے۔اور انسان اس سے پہلے کی کیفیت میں ایک گوشت کے ٹکڑے کے سوا جو ہڈی سے ملا ہوا تھا اور کوئی چیز نہیں تھا، نہ علم

وآ گاہی رکھتا تھا اور نہ ہی قوت وتوانائی۔ لیکن اس مرحلہ سے بہت ہی اونچے اور بلند مرحلہ میں قدم رکھتا ہے۔ اب وہ بظاہر ایسا مردہ وجود نہیں ہے۔ جو حیات وزندگی میں حیوانی حیات کے سوا کوئی چیز نہیں رکھتا بلکہ وہ ایک حیات وزندگی رکھتا ہے جس میں علم وآ گہی کے ساتھ قدرت وتوانائی بھی ہے اور بہترین مخلوق کی صف میں قرار پاتا ہے۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ ہے کہ وہ بنیاد ومشابہت جو نطفہ، علقہ، مضغہ اور بعد والے دوسرے مراحل کے درمیان موجود تھی، اب وہ ان مراحل اور آخری مرحلہ میں ہرگز نہیں پائی جاتی گذشتہ مراحل میں اثر خلقت اس کے علاوہ کچھ نہ تھا کہ ایک رنگ دوسرے رنگ کی جگہ لیتا رہا۔ اور سفید انسانی سلول، قرمزی خون کی صورت اختیار کرتے رہے۔ یا قرمزی خون زیادہ سخت اور پختہ ہو کر گوشت کی صورت اختیار کر لیتا۔ لیکن ان مراحل میں سے کوئی بھی حیات، شعور اور قدرت وتوانائی کا حامل نہیں تھا۔ پیدائش کے بعد یہی وہ مرحلہ ہے جس میں خلقت کا انداز مکمل طور پر بدل گیا اور ایک مختلف چیز پیدا ہو گئی۔

تیسرا نکتہ:

قرآن نے پیدائش کے آخری مرحلہ میں ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ کا جملہ استعمال کیا ہے۔ انشاء عربی زبان میں ایسی احداث وایجاد کو کہتے ہیں جو سابق میں موجود نہ ہو۔ مثلاً جب انسان کسی دوسرے شخص کا شعر پڑھے تو کہتے ہیں ''انشد'' لیکن جب خود اپنا شعر کہے تو اس کو انشاء کہتے ہیں۔

قرآن ''انشاناہ'' کا لفظ استعمال کر کے بتاتا ہے کہ یہ خلقت مکمل طور پر نئی اور جدید خلقت ہے۔ جو ہرگز گذشتہ صورتوں کے مشابہ نہیں ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ مادّہ انسان اور اس کی گذشتہ صورتوں کے مشابہ نہیں ہے، تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ مادّہ انسان اور اس کی گذشتہ حالتیں اس کی پیدائش میں کوئی حصہ نہیں رکھتیں، بلکہ باوجودیکہ گذشتہ صُورتیں اس قسم کی تحویل اور ایجاد کے لیے بنیادی زینہ تھیں، پھر بھی خلقت کے اس مرحلہ میں گذشتہ مراحل سے بہت زیادہ فاصلہ ہے۔

چوتھا نکتہ:

قرآن مجید نے خلقت کے اس مرحلہ کی خلقاً اٰخر کے ساتھ توصیف کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خلقت کی یہ قسم پہلی نوع سے بالکل مختلف ہے بلکہ یہ مرحلہ ایک قسم کے ذاتی اختلافِ ذات اور جوہری دوئیت کو ظاہر کرتا ہے۔

ان آخری تین نکات کو سامنے رکھنے سے دوسرے سوال کا جواب بھی پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے۔

یہ اس بناء پر ہے کہ اس حصہ کے بیان میں ثم کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو اس مرحلہ اور گذشتہ مراحل کے درمیان جوہری فاصلہ کی موجودگی کا ترجمان ہو سکتا ہے۔ نیز لفظ انشاء سے بھی جو جدید خلقت اور کامل طور سے بے سابقہ آفرینش کے لیے استعمال ہوتا ہے، مدد لی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو ایک دوسری آفرینش بھی کہا گیا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن روح کی خلقت کو گذشتہ خلقتوں سے الگ قرار دیتا

ہے۔اور اس مغایرت سے مقصود گذشتہ مراحل کے مادّی ہونے اور اس مرحلہ کے مجرد ہونے کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی، یا کم ازکم آیت کے ظاہری معنی یہی ہیں۔

تیسرے سوال کا جواب

یہاں پہلے دو سوالوں سے قطع نظر ایک تیسرا سوال بھی سامنے آتا ہے۔اور وہ جسم اور بدن کے فنا ہوجانے کے بعد رُوح کی بقاء کا مسئلہ ہے۔قرآن نے اس حقیقت کے متعدد آیات میں تصریح فرمائی ہے۔جن میں بعض کو ہم یہاں نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

جسم کی موت کے بعد روح کی بقاء اسلام کے بلند معارف میں سے ایک ہے۔

جس کی وجہ سے اسلام موت کی زندگی کا اختتام نہیں جانتا، بلکہ اس کو دوسری زندگی کا دریچہ بتلاتا ہے جو ایک برتر اور بالاتر عالم کی زندگی ہے۔

مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ

(جاثیہ:۲۴)

''دنیا کی زندگی کے علاوہ اور کوئی زندگی نہیں ہے اور زمانہ ہی ہمیں ہلاک و نابود کرتا ہے۔''

فرماتا ہے:''زندگی کا رشتہ موت کے بعد بھی باقی ہے اور وہ ہرگز ختم نہیں ہوتا یہ حقیقت کئی آیات کے ذریعہ بیان ہوئی ہے جن میں سے بعض کو ہم نقل کرتے ہیں:۔

۱: شہداء زِندہ ہیں

قرآن پوری صراحت کے ساتھ راہِ خدا کے شہداء کو زندہ بتاتا ہے اور فرماتا ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

(بقرہ:۱۵۴)

''وہ لوگ جو راہِ خدا میں قتل ہوجانے میں انہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ تو زندہ ہیں، لیکن تم (ان کی زندگی کا) شعور نہیں رکھتے۔''

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ

يُرْزَقُوْنَ ﴿١٦٩﴾

(آلِ عمران:۱٦٩)

''راہِ خدا میں قتل ہونے والوں کو مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ تو زندہ ہیں، اور اپنے پروردگار کے ہاں سے رزق پاتے ہیں۔''

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿١٧٠﴾ (آلِ عمران:۱۷۰)

''خدا نے اپنے فضل وکرم سے جو کچھ انہیں دیا ہے، وہ اس پر خوش ہیں اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے ہیں، انہیں بشارت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہیں کوئی خوف اور حزن نہیں ہے۔''

یہ آیات راہِ خدا کے شہیدوں کی حیات کی خبر دے رہی ہیں جو جسمانی حیات کے آثار بھی رکھتے ہیں (چونکہ روزی کھاتے ہیں) اور رُوحانی ونفسانی حیات کے بھی حامل ہیں جیسا کہ فرماتا ہے (فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ) جو کچھ خُدا نے انہیں دیا ہے اس پر خوش ہیں۔

۲: فرعونی پیشِ آتش

اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۗ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿٤٦﴾ (غافر (مومن):٤٦)

''آلِ فرعون کو صبح اور شام کے وقت آگ کے سامنے لایا جاتا ہے، جس دن آخرت برپا ہوگی تو حکم ہوگا آلِ فرعون کو سخت ترین عذاب میں ڈال دو۔''

یہ آیت آلِ فرعون جیسے مجرمین کی زندگی کی خبر دے رہی ہیں۔ جو آخرت کے وقوع سے پہلے بھی زندہ ہیں اور اس کے برپا ہونے کے بعد بھی زندہ رہیں گے۔ البتہ آخرت کے برپا ہونے سے پہلے ان کی سزا آگ کے سامنے پیش ہونا ہے جبکہ آخرت کے برپا ہونے کے بعد ان کی سزا آگ میں داخل ہونا ہے۔

وہ آیات جو موت کے بعد روح کی بقاء کی گواہی دیتی ہیں اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ انہیں یہاں پیش کیا جائے۔ ہم نے اس سلسلہ کی تمام آیات کتاب ''اصالت روح از نظر قرآن'' کے صفحہ ٦۵ سے لے کر صفحہ ٧٦ تک نقل کر دی ہیں۔ مہربانی فرما کر مذکورہ کتاب کی طرف رجوع فرمائیے۔

(۱۹)

رُوح! واقعیت انسان

''نظریہ ثنویہ'' کے برخلاف، جو انسان کو جسم اور رُوح کا مرکب یا نور و ظلمت کا مرقع سمجھتے ہیں نیز یونان کا عظیم فلسفی ارسطو اور مغرب میں ''نشاۃ ثانیہ'' (رنسانس) کی بنیاد رکھنے والے ''دکارت'' بڑی شدت کے ساتھ اس کی حمایت کرتے ہیں۔ قرآن انسان کو جسم اور جان یا جسم وروح سے مرکب نہیں سمجھتا۔ بعض آیات سے اس قسم کا نتیجہ نکالنا ان دوسری آیات کے منافی ہے، جو اس سلسلہ میں مکمل صراحت رکھتی ہیں۔

آیاتِ قرآن انسان کی حقیقتِ واقعیت کو اسی روح ورواں اور نفس وجان کا مرہون منت جانتی ہیں۔ یہ نفس وجان کچھ دن کے لیے بدن کے ساتھ اس لیے رہتی ہے کہ جسم کا آلہ کار رہے۔ اور اگر یہ آلہ کار اس کے ہاتھ سے لے لیا جائے۔ تو وہ نہ تو کوئی کام کر سکتا ہے اور نہ ہی تکامل وارتقاء کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔

اس قسم کی آیات جو قرآن کے نظریہ کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں، اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ انہیں یہاں پیش کیا جائے۔ البتہ ہم ان میں سے بعض کو نقل کرتے ہیں۔

قرآن سورۂ سجدہ میں، نویں آیت کے بعد بعض مشرکین کے حیاتِ نو کی طرف بازگشت کے امکان کے سلسلہ میں اعتراض کو نقل کر کے کہتا ہے۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ (سجدہ:۱۰)

''اور وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم مر گئے اور ہمارے بدن کے اجزاء زمین میں بکھر کر گم ہو گئے تو کیا ہم دوبارہ نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے۔''

اس کے بعد قرآن اس اعتراض کے دو طرح سے جواب دیتا ہے۔

بَلْ هُمْ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ

''وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کا انکار کرتے ہیں۔

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝

''کہہ دیجئے کہ موت کا فرشتہ تم پر مقرر کیا گیا ہے۔ وہ تمہیں لے لے گا۔ اس کے بعد تم اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جاؤ گے۔'' (السجدۃ)

معترض کا صحیح جواب اس دوسرے جواب میں پوشیدہ ہے اور قرآن کے جواب کا طریقہ اسی صورت میں واضح ہوتا ہے جب ہم جان لیں کہ آیت میں توفی سے مراد مارنا نہیں ہے بلکہ قبض کرنا، پکڑنا اور لینا ہے۔ یہ لفظ یہاں اور بہت سی دوسری آیات میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور قرآنی آیات میں اس لفظ کے موارد کی طرف رجوع کرنے سے اس کے معنی اور صحیح مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔

جواب کی حقیقت یہ ہے کہ تمہارے جسم تو اس دنیا میں بکھر کر گم ہوجائیں گے، لیکن جس چیز پر تمہاری واقعیت کا انحصار ہے، اور اصطلاح کے مطابق جو تمہاری اصلیت وحقیقت ہے۔ وہ تمہاری روح ہی ہے جو ہمارے پاس محفوظ رہتی ہے۔ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے اس کو لے لیتا ہے اور ہمارے قبضہ میں دے دیتا ہے۔ پھر جب ہم اُسے مادی عالم کی طرف لوٹائیں گے تو وہ وہی ہوگی جو ابتداء میں تھی۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیں کہ جو چیز گم ہوجاتی ہے وہ چھلکا اور جلد ہے، جبکہ تمہاری واقعیت اور اصل حقیقت وہی ہے جسے موت کا فرشتہ قبض کر لیتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔ یتوفّٰکم تمہیں لے لیتا ہے۔

اس بیان سے واضح ہوجاتا ہے کہ ان کی واقعیت وحقیقت اس کی روح ہی ہے۔ جسے فرشتہ نکال لیتا ہے۔ اور اگر انسان کی واقعیت کوئی اور چیز ہوتی تو پھر یتوفّٰکم تمہیں لے لیتا ہے۔ فرمانا صحیح نہ ہوتا۔

ذیل میں ذکر شدہ دو آیات سے بھی اسی مطلب کا اظہار ہوتا ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾

(حشر:۱۹)

''تم ان لوگوں کی مانند نہ ہوجاؤ، جنہوں نے خدا کو بھلا دیا ہے کیونکہ خدا نے بھی انہیں خود فراموشی سے دوچار کردیا ہے۔ یہ فاسق لوگ ہیں۔''

یہ خود اور خویشتن اور قرآن کی تعبیر میں انفسھم کیا چیز ہے۔ کہ خدا کی فراموشی خود اس کی فراموشی کا سبب بن جاتی ہے۔ کیا آپ کے خیال میں اس سے مراد آنکھ اور لذائذِ جسمانی ہیں؟ ہرگز ایسا نہیں ہے، کیونکہ خدا کی اطاعت نہ کرنے والے فاسق لوگ تو جس چیز کو کبھی نہیں بھلاتے وہ جسم ہی ہے، بلکہ وہ تو تن پروری اور لذائذِ مادی کے سوا اور کچھ سوچتے ہی نہیں۔ لہٰذا آیت میں 'خود' اور ''خویشتن'' سے مراد روح ہے جو 'میں' 'وہ' خود' خویشتن اور ان سے ملتے جلتے الفاظ کی اصل حقیقت ہے۔

پس جس چیز کو فاسق لوگ بھلا دیتے ہیں وہ اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے جس کو وہ نہیں بھلاتے۔ وہ بھلائی ہوئی چیز ہی ان کی واقعیت اور اپنا آپ ہے جو اجزاء میں منقسم نہیں ہوتی۔ لفظ ''انفسھم'' (خود اپنے نفس کو) اس بات پر شاہد ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ

اَخۡرِجُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ ؕ اَلۡيَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡهُوۡنِ بِمَا كُنۡتُمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ غَيۡرَ الۡحَـقِّ وَكُنۡتُمۡ عَنۡ اٰيٰتِهٖ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ۝۹۳ (انعام:۹۳)

''اگر آپ اس حالت کا مشاہدہ کریں، جب ظالم و متکبر لوگ موت کے گرداب میں پھنسے ہوں گے اور فرشتے ہاتھ پھیلا کر ان سے کہہ رہے ہوں گے: اپنی جانوں کو باہر نکالو آج ان ناحق باتوں کی وجہ سے جو تم کہا کرتے تھے۔ اور خدا کی آیات کے مقابلہ میں تکبّر کیا کرتے تھے۔ تمہیں ذلیل کرنے والے عذاب کی سزا دی جائے گی۔''

یہ آیت ذیل میں ذکر شدہ جملوں کے ساتھ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ انسان کی واقعیت و حقیقت صرف اس کی رُوح ہے جہاں فرماتا ہے۔

اَخۡرِجُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ ؕ (اپنی جانوں کو باہر نکالو)

اور اس کے بعد فرماتا ہے

اَلۡيَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ (آج تمہیں سزا دی جاتی ہے)

لیکن اس بناء پر کہ یہ سزا ایک لمحہ کے لیے ہی نہیں ہوگی، اور صرف جان کنی کے وقت کے ساتھ ہی محدود نہیں ہے' بلکہ ''مضارع کے جملہ'' تجزون کے پیشِ نظر یہ سزا مستقل رہے گی، لہٰذا قطعی اور یقینی طور پر اس سے مرُاد روح کی سزا ہے اور وہ چیز جو موت کے بعد دائمی عذاب میں مبتلا رہ سکتی ہے وہ وہی روح ہی ہے ورنہ جسم تو موت کے بعد بتدریج بکھر جاتا ہے [1]

اس بناء پر اگرچہ سطحی نظر میں انسان جسم اور رُوح کا مرُکب ہے۔ لیکن انسان کی واقعیت رُوح کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔

---

[1] یہ بحث عالم برزخ سے متعلق ہے اور معاد میں روح و جسم دونوں اکٹھے مل کر مُعذب ہوں گے۔

(۲۰)

رُوحِ انسانی کے ابعاد وجہات

علم الاخلاق کے عُلماء اور دانشور، انسان کو دو اجزاء والا مرکب وجود بتلاتے ہیں جس میں ایک مادی اور دوسرا معنوی جزو ہے انسان بدبودار اور سیاہ رنگ کی گیلی مٹی سے بنا ہے۔ اور تکمیل وارتقاء کی منازل طے کرنے کے بعد اس نے مستقیم القامہ وجود کی شکل اختیار کی ہے۔ لہٰذا یہ صورت اس کے جزو مادی کی علامت ہے۔

علاوہ ازیں اس کی خلقت کے بعض مراحل میں چونکہ خدا کی طرف سے اس کے جسم میں روح پھونکی گئی ہے اور اُسے خاص قسم کی صفاء وجلا بخش دی گئی ہے لہٰذا یہ اس کا معنوی جزو ہے۔

پھر وہ مزید کہتے ہیں کہ انسان ہمیشہ ان دونوں ابعاد کے درمیان جن میں سے ہر ایک اپنے لیے ایک خاص قسم کی جاذبیت وکشش رکھتا ہے، حالتِ اضطراب میں رہتا ہے۔ ان البعاد کی وجہ سے بعض انسان تو اعتدال پر رہتے ہیں جب کہ بہت سے لوگ ان دو قطبوں میں سے کسی ایک کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ اگر کسی انسان کا جھکاؤ مادی امور کی طرف بڑھ جائے تو وہ بدبختی کے گڑھے میں جا گرتا ہے اور حیوان سے بھی پست تر اور درندہ بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اس کا جھکاؤ معنوی امور کی طرف زیادہ ہوجائے تو وہ فرشتے سے بھی بالاتر ہوجاتا ہے۔ کسی شاعر کے قول کے مطابق:

آدمی زادہ ، طرفہ معجونی است
کز فرشتہ سرشتہ وحیواں
گر رَوَد سوی ایں ، شود کم ازیں
وز کند میل آں، شود بہ از آں

(آدم زاد بھی ایک عجیب معجونِ مرکب ہے، جس میں فرشتے اور حیوان دونوں کی سرشت موجود ہے) (اگر وہ حیوانیت کی طرف مائل ہوجائے تو حیوان سے بھی بدتر ہوجاتا ہے اور اگر وہ فرشتہ کی طرف مائل ہوجائے تو اس سے بہتر ہوجاتا ہے۔

یہ استادانِ تربیت اور علمائے اخلاق کا قول ہے آیہ مبارک ثم سواہ ونفخ فیہ من روحہ انسان کی مادہ ومعنی یا جسم وروح سے ترکیب کی واضح گواہ ہے اور یہ تجزیہ ایک طرح صحیح ودرست ہے، لیکن اس کے باوجود کہا جاسکتا ہے کہ انسان تین اجزاء سے مرکب وجود ہے بلکہ شاید اس سے بھی بلند تر وزیادہ۔ کیونکہ انسانی وجود کا وہی دوسرا جزو جسے رُوح کہتے ہیں، دومختلف خصوصیات کا حامل ہے اور ہر خاصیت کو انسان کی رُوح کا ایک جزو

کہا جا سکتا ہے۔ وہ دو خصوصیات یہ ہیں۔

۱: عقلانی و اوراکی

۲: نفسانی و غریزی

اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان ادراک و شعور کا مالک ہے۔ اور قوتِ ادرک کی مدد سے عظیم معارفِ الٰہی کو درک کرتا ہے اور پوشیدہ طبیعی رُموز کو منکشف کرتا ہے۔ اس طرح وہ مجہول کیفیات کو حل کرتا ہے۔ اور اسی لیے اُسے مجردِ مدرک (عاقل) کہتے ہیں۔

اس خصوصیت کے ساتھ اس میں ایک اور خصوصیت بھی پائی جاتی ہے۔ جس کا اس کو عقل و ادراک سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ بعض خاص حالات میں مسائل کے ایک سلسلہ کی طرف کھینچ جا تا ہے، بعض امور کے لیے اس میں تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔

اس لحاظ سے انسان کی ترکیب جسم اور روح سے بھی صحیح ہے کہ رُوحِ انسان عقل و نفس اور ادراک و تحریک سے مُرکب ہے۔

انسان کی روح کے عقل و نفس سے مرکب ہونے کا مسئلہ یعنی یہ کہ وہ ایک فرد کی مدد سے ادراک کرتا ہے۔ اور دُوسرے کی مدد سے تحریک، سمجھنے اور بیان میں سہولت پیدا کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت ان تمام تعبیروں سے بالاتر ہے کیونکہ رُوح انسانی ایک ایسا واحد وجود بسیط ہے جس کی کسی قسم کی ترکیب ممکن نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے وہ اسی ایک ہی وجود کی تجلیات ہیں جو مختلف حالات میں مختلف پہلو رکھتی ہیں۔

جب انسان کو ادراک اور کشف کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو قوت عاقلہ کام کرنے لگ جاتی ہے جس کی مدد سے انسان دیکھنے، سننے، اور تصورّ میں آنے والی اشیاء کا ادراک کرنے لگ جاتا ہے اسی طرح جہاں رُوحانی احتیاجات و ضروریات کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے وہاں روح خاص حالات میں متحرک ہوتی ہے، اور انسان اپنے اندر سے احتیاج کو محسوس کر کے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر رُوح نامی ایک ہی چیز مختلف حالات میں اپنی تجلیات دکھاتی اور اپنے آپ کو روبہ عمل لاتی ہے۔

پس اس مسئلہ کی سب سے زیادہ واضح تشریح یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ انسان کی رُوح کے دو جز و ہیں۔ یعنی ایک جز و احساس و ادراک وفکر کی صُورت میں اور دوسرا خواہش و تحریک کی صورت میں پہلے حصہّ کو قوائے عقلانی اور دُوسرے حصہّ کو قوائے عقلانی اور دُوسرے حصہّ کو امور نفسانی کہتے ہیں۔

فطریات و غرائز

یہ مختصر بحث ہمیں اِنسان کی روح و رواں کے کئی اجزاء میں سے دو سے آشنا کرتی ہے اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جہاں روح ادراک و فکرِ عمل میں لاتی ہے، وہاں اُسے عقل کہا جاتا ہے اور جب اس میں تحرّک کے ساتھ خواہش جنم لیتی ہے تو اُسے نفس کا نام دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نفس و عقل، وجود رُوح کے دو مراتب یا رُوحِ انسانی کے دو اجزاء ہیں۔ تاہم یہ دونوں علیحدہ علیحدہ اور ایک دُوسرے سے جُدا موجودات کی

صورت میں نہیں ہیں۔اس لحاظ سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ انسان کی رُوح اور عقل و نفس ایک ہی چیز ہیں دراصل یہ سب مروجہ فلسفیانہ اطلاحات ہیں اور کوئی امر مانع نہیں ہے۔اگر ہم رُوح کو عقل یا نفس کا نام دے دیں۔جیسا کہ درجِ ذیل آیت میں تمام قوائے روحانی کو نفس کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ (شمس:۷،۸)

''قسم ہے انسان کے نفس کی اور اس خدا کی جس نے اُسے پیدا کیا ہے اور اسے برائیوں اور اچھائیوں سے آگاہ کیا۔''

اہم ترین بات یہ ہے کہ ہم امورِ نفسانی سے جو ہماری اندرونی خواہشات اور نفسانی احتیاجات وضروریات پر مشتمل ہیں زیادہ سے زیادہ آشنائی حاصل کریں۔

انسان کی روحانی ونفسانی احتیاجات وضروریات ایک دو نہیں ہیں بلکہ علوم انسانی کی پیش رفت سے روحانی حاجات وضروریات اور بھی زیادہ واضح ہو رہی ہیں۔علم اندرونی رجحانات کے ایک سلسلہ کو معلوم کر چکا ہے۔جو گذشتہ زمانہ کے ماہرین کو معلوم نہیں تھا۔لہٰذا سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہم ان خواہشات وحاجات کی اجمالی تعریف سے واقف ہوں۔

مختصر طور پر یہ کہنا چاہیے کہ ہر قسم کی اندرونی میل ورغبت اور باطنی تحریک جو انسان کو عُمر کے کسی حصہ یا تمام حصوں میں پیدا ہوتے ہیں۔اور وہ ان کے لیے اپنے اندر سے ایک جذبہ وکشش اور رغبت وحرکت محسوس کرتا ہے۔امورِ نفسانی میں سے ہیں اور یہ سب چیزیں انسان کے اندر مزاج وفطرت وجبلّی مقام رکھتی ہیں۔ان امورِ نفسانی کی خاص خاص باتیں مندرجہ ذیل کیفیات سے تعلق رکھتی ہے۔

۱: یہ اندرونی احساسات ومیلانات ایک طرح کی نداو دعوت ہوتے ہیں۔جنہیں انسان اپنے اندر سے سنتا ہے۔یہ ایک ایسی تحریک ہے جس کی محرک انسان کی اندرونی قوتِ فہم ہوتی ہے۔اس کے لیے اُسے تعلیم پانے اور کسی سے سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی اور انسان کو کوئی تعلیم حاصل کیے بغیر،اور کسی سے کوئی بات سیکھے یا سُنے بغیر اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔

۲: چونکہ اس قسم کی کشش کا ماخذ انسان کی خلقت و پیدائش میں ہے،ایسی خلقت وآفرینش جو سب انسانون میں مساوی اور برابر اقدار رکھتی ہے تو لازم ہوا کہ اس قسم کے میلانات عالمی اور مشترک ہونے چاہئیں اور تمام انسانوں میں ان کو موجود ہونا چاہیے۔

اگر اس قسم کے تمام میلانات کا سرچشمہ انسان کی خلقت ہے اور یہ سب کے سب اس کی خلقت کے ساتھ ہی جنم لیتے ہیں۔تو پھر فطری طور پر جغرافیائی حالات اقتصادی کیفیات یا سیاسی وتبلیغاتی عوامل سے۔خواہ تعریف کی صورت میں ہوں یا مذمت کی صورت میں ان پر کوئی اثر نہ پڑنا چاہیے۔اگرچہ یہ عوامل ان میلانات کے نشوونما یا ضعف وتخفیف کے طور پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ عوامل اندرونی میلانات کو پیدا کرنے یا نابود کرنے کا باعث نہیں ہوں گے،اگرچہ یہ ان میلانات کے بڑھنے

یا ختم ہونے میں موثر ہو سکتے ہیں۔

۳: اندرونی میلانات وخواہشات آگے بڑھنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اور انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی پر مکمل طور سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

فطرت اور جبلّت میں فرق

کیا فطری اور جبلّی اُمور میں کوئی فرق ہوتا ہے:۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، جو غالباً ہر انسان کے سامنے آتا ہے وہ یہ کہ اگر انسان کی اندرونی خواہشات ومیلانات کو امورِفطری وجبلی کہتے ہیں تو کیا یہ دونوں الفاظ جن کی اصل فطرت وجبلت ہی ہیں۔ ایک دوسرے کے ہم معنی ہیں یا ان کے دو معنی ہیں اور یہ دونوں معنی و مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ''فطرت'' عربی لغت میں خلقت کی بالکل پہلی بنیاد ہے جس پر دوسری خلقت یا دوسرے کمالات اسی کی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں۔ زیادہ واضح عبارت میں یوں کہہ لیں کہ انسان کی یہ وہ صفات ہیں جو کامل طور سے طبیعی ہوتی ہے نہ کہ اکتسابی۔ قرآن میں بھی اس سے یہی معنی لیے گئے ہیں۔[1]

غریزہ (جبلت) لُغت میں طبیعت اور سرشت کے معنی میں آتا ہے، باوجودیکہ یہ دونوں الفاظ یعنی طبیعت وسرشت اپنی اصل کے لحاظ سے ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں لیکن عام طور پر ''امورفطری'' تو غالباً انسان کے بُلند واعلیٰ میلانات وخواہشات کے اس سلسلہ کو کہتے ہیں، جو خدا کی تلاش، عدالت خواہی اور جدوجہد پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جبکہ لفظ ''عزیزہ'' (جبلت) اندرونی میلانات کی اس قسم کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں بلندی کا پہلو نہ پایا جاتا ہو اور جو زیادہ تر انسان وحیوان کے درمیان قدرِ مشترک کی کیفیت میں پائی جاتی ہو۔ مثلاً جنسی حس اور خودخواہی وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ غریزہ (جبلت) کا لفظ زیادہ تر حیوان ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

آپ ان دونوں کے درمیان ایک اور طرح سے بھی فرق ظاہر کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ غرائز (جبلت) امورِفطری کے اس سلسلہ کو کہتے ہیں جو انسان میں طبیعاتی اور کیمیائی مقام رکھتے ہیں۔ مثلاً غریزہ جنسی جس میں دو قسم کی کیفیات ہوتی ہیں۔

۱: **طبعیاتی مقام:** جسم میں (بیضہ اور رحم) کا مقام

۲: **کیمیائی مقام:** ایک خاص قسم کے کیمیائی اثر کا حامل ہوتا ہے

مثلاً بیضہ اور رحم سے منی کے ہارمونوں کی ترشیح۔ لیکن اندرونی میلانات کا ایک حصہ ایسا ہے جسے فطریات کہا جاتا ہے۔ اس میں یہ

---

[1] روم: ۳۰

دونوں ہی مقام نہیں پائے جاتے۔مثلاً خدا کی تلاش، عدالت طلبی اور اپنی نوع سے دوستی کی حسیات، جن کے لیے جسم میں ہرگز کوئی طبیعیاتی مقام نہیں پایا جاتا، اور جسم کا کوئی خاص عضو اس قسم کے اندرونی احساسات کی تحریک کا مظہر نہیں ہوتا، اسی طرح اس قسم کے میلانات کی کوئی تحریک جسم کے کسی فعل یا عملِ کیمیائی کے ذریعہ بھی واقع نہیں ہوتی۔

اُمورِ فطری و جبلّی کی تعداد

علومِ انسانی نے خصوصاً علم نفسیات کی پیش رفت سے فطری و جبلیّ امور کے ایک حصہ پر دسترس حاصل کر لی ہے۔جس پر ماضی میں توجہ نہیں دی جاتی تھی۔لیکن ان میں سے اکثر اصولِ فطرت کے ایک حصہّ کی شاخیں ہیں جو ماضی میں بھی معلوم اور ظاہر تھیں۔ہم یہاں ان میں سے چند نمونے پیش کرتے ہیں، جن میں سے بعض تو اصل ہیں اور بعض دوسری ایک اور اصل کی شاخیں ہیں۔مثلاً۔

۱: تلاشِ خُدا کی حس

۲: دریافت کی حسِ

۳: نیکی کی حسِ

۴: زیبائی و حُسن کی حس

۵: خودخواہی کی حِس

۶: حصولِ دولت کی حسِ

۷: راحت طلبی کی حسِ

۸: جنسی حسِ

۹: محبتِ مادری

۱۰: انحراف و درگذر کی حسِ۔وغیرہ وغیرہ۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ان میں سے اکثر اُمور کسی ایک اصل ہی کی طرف لوٹتے ہیں اور ایک دُوسرے کا نتیجہ ثابت ہوتے ہیں۔

فطری اور مکتبی انسان

بچپن سے نوجوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمری اور پھر ضعفِ پیری تک انسان کی زندگی کا مطالعہ اس بات کو وضاحت کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ زندگی کے ابتدائی دَور سے ہی انسان کا وجود اور اس کی ہستی میلانات، جاذبیت، استعداد اور شائستگیوں کے ایک سلسلہ کے ساتھ مرکب ہوا ہے نیز انسان کے رُشد و تکمیل کے ساتھ ساتھ یہ اندرونی خواہشات بھی رُشد و تکمیل پاتی رہتی ہیں۔

میلانات کی اقسام کے فطری ہونے کا واضح ثبوت ان کا سارے جہان والوں کے لیے مشترک اور وسیع ہونا ہے۔یعنی اس طرح سے

کہ کوئی بھی انسان خواہ عالم کے کسی بھی مقام اور علاقے میں ہو اس میں مشترک قسم کے رجحانات ضرور پائے جائیں گے۔ اور کوئی بھی انسان ان کے بغیر صحیح وسالم نہیں ہوسکتا۔

مثلاً ساری دنیا میں اور انسانی زندگی کے مختلف ادوار میں جنسی میلانات کا ظہور اس قسم کی روحانی کششوں کے فطری وطبیعی ہونے کی نشانی ہے۔ اگر ایسا فطری وجبلی میلان موجود نہ ہوتا اور صرف خارجی وطبیعی ہونے کی نشانی ہے۔ اگر ایسا فطری وجبلی میلان موجود نہ ہوتا اور صرف خارجی عوامل یعنی جغرافیائی عمل، اقتصادی حالات، پروپیگنڈا اور تمدن کا ہی ان کی پیدائش اور نشوونما میں کوئی داخل رکھتا ہے اور ایسا مشترک طور پر پایا جاتا ہے، ان کی بنیاد اور نشوونما میں داخل رکھتا ہے۔ اور ایسا مشترک عامل، خلقت وفطرت کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

اگر ہم اس عامل سے صرفِ نظر کرلیں تو اس قسم کے جذبات کی دوسرے عوامل سے باہر ہوں۔ ہرگز تفسیر وتوجیہہ نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ عوامل مشترک صورت میں اور یکساں طور پر تمام انسانوں میں ہرگز نہیں ملتے۔ مثال کے طور پر جغرافیائی عوامل اور اقتصادی حالات ہر جگہ یکساں نہیں ہوتے۔ اسی طرح ہر جگہ سیاست ونظام بھی مشترک اقدار کے حامل نہیں ہوتے تاکہ میلانات کی اس قسم کی ان عوامل کے مطابق شرح کی جاسکے۔

تمام دنیا میں صحیح سالم مائیں اپنی اولاد سے محبت کرتی ہیں۔ اسی طرح تمام انسان عدل وانصاف کی تعریف اور ظلم وجور کی مذمت کرتے ہیں۔ امانت کو لوٹانا دنیا کی تمام اقوام میں اچھی بات ہے اور اس میں خیانت کرنا ہر جگہ بُرا اور مذموم فعل شمار ہوتا ہے۔

ان مشترک ویکساں میلانات کی فطری وخلقت کی طرف نسبت دیئے بغیر، کیسے توجیہہ کی جاسکتی ہے اگر ان میلانات کی پیدائش کے اسباب جغرافیائی عوامل اور قوموں کے اقتصادی حالات کے ماتحت ہیں تو لازم ہوگا کہ ہر علاقے کے عوامل وحالات ایک خاص قسم کے ہوں۔

اگر یہ کشش وقتی سیاستوں اور تمدنی حالات کی پیداوار ہوں تو ماننا پڑے گا کہ اس قسم کے عوامل کبھی بھی سب جگہ مشترک نہیں رہے۔ بلکہ ہمیشہ مختلف رہے ہیں۔

اس بناء پر اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ کہ اس قسم کے میلانات کو انسان کی سرشت اور فطرت کی پیداوار سمجھا جائے اور تسلیم کیا جائے کہ ان نداؤں کا سرچشمہ انسان کا اپنا وجود ہے اور یہ سب کے سب فضائی وتکوینی حکم سے اس کے صفحہ وجود میں تحریر ہوئے ہیں۔

لہٰذا فطری انسان قرآن کی رُو سے انسان ہے جس کی آفرینش وخلقت میں رُوحانی میلانات اور جذبات کا ایک سلسلہ خمیر ہوا ہے۔ جو بطورِ اساس اس کے وجود میں نقش ہوئے ہیں۔

حقیقت میں یہ میلانات ابتدائی سرمایوں کا ایک سلسلہ ہیں جن سے انسان پوری آزادی کے ساتھ سعادت اور نفع کے لیے فائدہ اٹھاسکتا ہے۔ علی ہذا القیاس، اس قسم کے میلانات کسی بھی راہ کو اختیار کرنے میں انسان کے لیے رکاوٹ نہیں بنتے۔

''مکتبی انسان'' وہ ہوتا ہے جس کے کام فطرت اور اس کی فطری اقدار کے مطابق ہوتے ہیں۔ ایسا انسان سچا انسان ہوتا ہے۔ اور اس کے مدِ مقابل فرد مسخ شدہ انسان ہوتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے ماہرین نفسیات انسانی معاشروں میں کردار کی وسعت کو اس کے جبلی ہونے کی نشانی سمجھتے ہیں اور اس بارے میں یہ کہتے ہیں۔ظاہر ہوا کہ تمام انسانی معاشروں میں تمدن کے اختلاف کے باوجود ایک مشترک کردار پایا جاتا ہے۔اس مشترک کردار کی موجودگی بذاتِ خود اس کے قوی ہونے کی دلیل ہے [1]

ماہر وجودیت کا فطرت سے انکار

اس مقام پر وجودیت کی مخالفت درپیش ہے۔وجودیت نے اپنے نظریے کی بنیاد حفظِ آزادی پر رکھی ہے۔اس نظریہ نے انسان کے لیے فطرت اور وجدان طبیعی کا انکار کر دیا ہے، کیونکہ اس مکتب کے پیروکاروں کے خیال میں فطرت کا وجود انسان کے میدانِ عمل میں خواہش کو محدود کر دیتا ہے اور اس طرح انسان فطرت کے خلاف کوئی کام انجام نہیں دے سکتا۔کم از کم اتنا ضرور ہے کہ فطرت کے نظریہ سے میلان کا پلڑا ایک طرف کو زیادہ جھک جاتا ہے۔اور اس قسم کی محدودیت اور میلان آزادی کے خلاف ہیں لہٰذا اس مکتبِ فکر کے نزدیک انسان میں نہ صرف یہ کہ فطرت و وجدان نہیں ہوتا بلکہ اس میں طبیعت و ماہیت اور کسی بھی قسم کی ذاتی قید و بند کی کوئی کیفیت نہیں ہوتی، جو اس کی آزادی کے خلاف ہو،انسان اس مکتبِ فکر کے اعتبار سے ایک وجود رکھتا ہے۔جس کو نظم و رنگ وہ خود دیتا ہے اور وہ بھی انتخاب و آزادی کے ذریعہ سے۔

انسان کے لیے یہ مکتبِ فکر جس قسم کی محدودیت کا قائل ہے وہ صرف وہی مخصوص حالات ہیں، جن کے تحت انسان مصروفِ عمل ہوتا ہے۔مثلاً:

۱: دنیا میں اس کا وجود

۲: دنیا میں میدانِ عمل

۳: دوسروں کے ساتھ زندگی بسر کرنا

۴: اس کے بعد نابود ہو جانا

نظریہ وجودیت EXISTENTIALISM ہر قسم کی محدودیت کو ردّ کرنے کے سلسلہ میں کہتا ہے:۔

اِنسان کا وجود اس کی ذات (ماہیت وطبیعت پر مقدم ہے، لہٰذا:

اولاً: انسان کے وجود یا شخصیت کے قیام سے پہلے، وجود کے بارے میں کسی قسم کا منصوبہ یا عقیدہ موجود نہیں ہوتا۔

ثانیاً: ہم اپنی ذات کو خود اپنے آزاد انتخاب۔اپنے ارادہ کے تبدیل ہونے بتاتے ہیں [2]

خلاصہ یہ ہے کہ یہ مکتبِ فکرا انسان کے لیے (ان تمام طبیعی موجودات کے خلاف جو مشخص اور پہلے سے تسلیم شدہ ماہیت رکھتے ہیں)

---

[1] روانشاسی اجتماعی ج ا ص ۹۳۰۔

[2] ژان پال سارتر کے اقوال، کتاب عصر تجزیہ و تحلیل ص ۱۲۵ کی طرف رجوع کریں۔

کسی خاص ماہیت کا قائل نہیں ہے۔اس کے مطابق انسان کی ماہیت وہی ہے جسے وہ خود اپنے ہی ہاتھ سے بناتا ہے جس کے لیے وہ آزادی اور قوتِ اختیار انتخاب رکھتا ہے۔

عمومی اور خصوصی ماہیت

نظریہ وجودیت (Existentialism) نے انسان کی ماہیتِ عمومی جو ازل سے اس کے لیے بنی ہے اور ماہیتِ خصوصی جو وہ اپنے ہاتھ سے اپنے ارادہ و اختیار کے ذریعہ بناتا ہے کے درمیان کوئی فرق قرار نہیں دیا اسی لیے یہ نظریہ انسان کے لیے ہر قسم کی مشخص ماہیت کے فقدان کا قائل ہے حالانکہ ان دونوں قسم کی ماہیت میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔

جس وقت انسان سلول یا جنین کی صورت میں رحمِ مادر میں قرار پاتا ہے۔ یا ایک مدت کے بعد دنیا میں آ کر آنکھ کھولتا ہے اور ابھی وہ کسی ارادہ و انتخاب پر قادر نہیں ہوتا، اس وقت وہ عمومی ماہیت و طبعیت کا حامل ہوتا ہے جو اُسے نباتات و جمادات سے جُدا کرتی ہے۔اس وقت وہ اپنے متعلق ایک زندہ موجود کی طرح تقسیم و نمود وغیرہ کے کچھ خواص رکھتا ہے۔اس صورت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا وجود اس کی ذات اور ماہیت پر مقدم ہے اور پہلے سے کسی طرح کا نقش و اثر اس پر موجود نہیں ہوتا۔

البتہ خصوصی ماہیت و شخصیت اور اصلاح کے مُطابق اس کا مزاج اس کی نمو کا باعث ہوتا ہے جو خود اس کی صفتِ انتخاب کا ساختہ و پرداختہ ہوتا ہے تاکہ وہ آزادی اور اپنی مرضی سے اپنی راہ انتخاب کرتا ہے اور اپنی مخصوص ذات و طبیعت کو بناتا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ میلانات طبیعی و فطری کے ایک سلسلہ کا اعتقاد انسان کی آزادی کے دائرے کی محدویت کا سبب بنتا ہے حالانکہ جبلی اور اندرونی میلانات بنیادی طور پر انسان میں موجود ہوتے ہیں جو انسان سے اختیار و آزادی کو ہرگز سلب نہیں کرتے۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ انسان ایک مدت تک اپنی جبلت کو دبا سکتا ہے۔

انسان میں اس قسم کے میلانات ایسی ملائم جاذبیت پیدا کر دیتے ہیں جو اس کے امور کی انجام دہی کے موافق ہوتی ہے تاہم اس کے باوجود انسان کا ارادہ و خواہش اس کی جبلت سے ہر طرح بالاتر ہیں۔پس انسان اپنے فطری اختیارات کے ذریعہ زمام زندگی کو اپنے اختیار میں رکھتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات بعض مصالح کی رُو سے انسان اپنی جبلت کے خلاف بھی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

انسان کی آزادی اس کی جبلت اور ذاتی احساسات سے انکار کی مرہون منت نہیں ہے۔ بلکہ اس کے مستقل ارادے اور خواہش اصلی کے مستحکم ہونے میں مضمر ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان بہت سے میلانات پیش نہاد، استعداد اور کششوں کا حامل ہے لیکن اس قسم کے میلانات سے اس کی بنیادی شخصیت اور مخصوص ماہیت تشکیل نہیں پاتی، بلکہ اُسے چاہیے کہ کوشش اور ارادہ کی مدد سے ان طبیعی اور فطری سرمایوں سے فائدہ پاتی بلکہ اُسے چاہیے کہ کوشش اور ارادہ کی مدد سے ان طبیعی اور فطری سرمایوں سے فائدہ اٹھائے، خود کو بنائے اور اپنی ماہیت، و کیفیت کو مشخص کر لے۔

اس سلسلہ میں نظریہ وجودیت Existentialism نے ایک اور مطلب کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے اور یہ تصور پیش کیا ہے کہ تقدیر الٰہی پر

اعتقاد انسان سے اختیار کے سلب ہونے کا ذمہ دار ہے۔اس بناء پر اس مکتب فکر کو اصرار ہے کہ انسان خود اپنے آپ کو بنانے کا ذمہ دار ہے اور اسی لیے یہ نظریہ اس کی سرنوشت کو منحصر طور پر اسی کے انتخاب میں قرار دیتا ہے۔

ہم انسان کی آزادی اور تقدیر الٰہی کی بحث میں اس نظریہ کی رُو سے غور کریں گے۔اور واضح کریں گے کہ تقدیر الٰہی انسان کی آزادی اور انتخاب میں مانع نہیں ہے۔(غور کیجئے)

(۲۱)

اِنسان کی قدر و منزلت از رُوئے قرآن

۱: تمام موجودات پر انسان کی برتری۔

۲: انسان زمین پر خلیفہ خدا ہے۔

۳: انسان مسجودِ ملائکہ ہے۔

۴: انسان حامل امانت ہے۔

۵: انسان ھدف خلقت کا مظہر ہے۔

۶: انسان کے لیے تسخیر جہاں۔

۷: انسان کی معنوی اور مادی قدر و منزلت۔

مغرب کے مشینی تمدّن اور تکنیکی فنون کی بڑھتی ہوئی قوت نے آنکھوں کو خیرہ اور ظاہر بین عقلوں کو مبہوت کر دیا ہے اور نسلِ حاضر کو اس بات کا خوگر بنا دیا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی زندگی کا مذاق اڑائیں اور انہیں مجبور جانیں کہ انہوں نے آنکھ اور کان بند کر کے زندگی گذاری اور چلے گئے۔

مشینی استعداد نے صنعتی پیدوار اور ''مصرف'' کے مسئلہ میں ایک عظیم انقلاب بر پا کر دیا ہے رز''اندوزی'' اور حُصولِ دولت کو بالکل آسان بنا دیا ہے اور نتیجہ کے طور پر انسانوں کے اندرونی میلانات کو تحریک کر کے اس میدان میں انسان کی حسِ طمع و آز کو ہر حس سے زیادہ موقع دیا ہے۔

ایک حس کی طرف توجہ اور دُوسرے اندورنی میلانات سے بے اعتنائی اس بات کا سبب بن گئی کہ بہت سی اخلاقی اقدار آسیب زدہ ہوجائیں انسانی کرامت وشرافت دولت و صنعتی پیدوار میں محصور ہوجائیں۔

جس معاشرے میں 'اِقتصاد' وپیداور' اور گذشتہ لوگوں کی اصطلاح میں سیم وزر کو محورِ ستائش اور فضائل کی بلندی قرار دے دیا جائے۔ وہاں زہد و وارستگی اور تقویٰ و پارسائی کی بحث کو بے معنی اور ایک قسم کی قدامت پسندی سمجھا جائے گا۔

مغرب کے تمدن نے نہ صرف مسئلہ پیداوار کو سہولت بخشی ہے اور اس کے لالچ و طمع کی حسِ کو تیز کیا ہے بلکہ طریقِ پیدوار میں ہر قسم کی رکاوٹوں کو دُور کرنے کی غرض سے، ہر ممکن طریقہ سے دولت، بڑھانے کو جائز سمجھتے ہوئے دیگر میلانات اور انسان کی اندرونی کششوں میں بھی تحریک کی ہے۔اس سلسلہ میں حسِ جنسی کا دیگر میلانات سے زیادہ حصہ ہے۔نتیجہ کے طور پر انسان اقتصاد اور شہوت، دوسرے لفظوں میں پیٹ اور ''اس سے نیچے'' میں بٹ کر رہ گیا ہے ہر روز اقتصاد اور دیگر عنوانات کے سلسلہ میں کئی قسم کے مکاتب فکر ظاہر ہو رہے ہیں یہاں تک کہ

مارکسزم MARXISM نے اقتصاد ہی کو تاریخ کے پہیہ کا محور و محرک قرار دیا ہے اور فروید FROID نے اجتماعی و انفرادی امور کی عوامل جنسی کے طریق سے تفسیر کی ہے۔ پس دونوں مکاتب نے جن میں سے ایک تو پیداوار پر اور دوسرا شہوت پر تکیہ کرتا ہے۔ انسان کی قدر و منزلت پر، خاص طور سے اس کے اخلاق پر، ایک خطرناک ضرب لگائی ہے۔

فلسفہء انسانیت یا اِنسان کی اصلیت:

''فوئرباخ' نے جس سے ''مارکس'' نے مادیت کا سبق لیا۔ جب مشین کی شدت و درشتی اور اس قسم کے ماحول میں انسان کے بے قدر منزلت ہونے کی طرف توجہ کی اور محسوس کیا کہ خود اس پر اور اس کے پیروکاروں پر انسان کی قدر و منزلت کے سلسلہ میں اعتراض کیا جا رہا ہے۔ تو اس نے ایک نیا راگ الاپنا شروع کیا اور فلسفہء انسانیت Humanism اور اصلیتِ انسان کے مسئلہ کو پیش کیا، تا کہ اس طریقہ سے مشینی تمدن کی درشتی، شدت اور بے رحمی میں کچھ کمی کر سکے اور اپنے مادی افکار پر ایک غلاف چڑھا دے۔ یہی غلاف ''مارکس'' نے اس سے طوطے کی طرح سیکھا اور اسے اپنا موضوع بحث بنا کر اس میدان میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ اپنے غیر سے انسان کے تعلق کو حتیٰ کہ خدا اور پیغمبروں تک سے بھی جو کمال و جمال کے مظاہر ہیں۔ انسان کے وجود کو بیگانہ ہونے کا سبب قرار دیا۔[1]

تعجب اس بات پر ہے کہ وہ شخص جس کی نظر میں مادّہ اور مادیات کے سوا کسی چیز کی کوئی اصلیت ہی نہیں ہے۔ اور اس کی نظر میں معنویت اور روحانیت قدامت پسندی کی دلیل ہیں، وہ انسان کی اصالت کا کس طرح سے دم بھر سکتا ہے۔ یا اس مکتب فکر کی درشتی و سختی کی تلافی کی خاطر سادہ لوح عوام کو متوجہ کرنے کے لیے فلسفہ انسانیت Humanism کو کیسے پیش کر سکتا ہے۔

ا: تمام موجودات پر انسان کی برتری

وہی مکتبِ فکر انسان کی اصالت کا قائل ہو سکتا ہے جو انسان کو جسم و روح مادہ و معنی اور فناء و بقاء سے مرکب جانے، اصولی طور پر مجموعہ عالم کو ملک و ملکوت کی تالیف خیال کرے چیزوں کی ظاہری شکل سے دھوکہ نہ دے اور وہ اس بات سے مطمئن ہو کہ جو کچھ بھی اس عالم میں ہے۔ ''صورتی درزیر دارد آنچہ در بالاستی۔'' (جو کچھ ظاہر ہے اس کے نیچے بھی ایک صورت ہے) کا مصداق ہے۔

ایسا ہی مکتب فکر انسان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ اطمینان اور بلند آواز میں کہہ سکتا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (اسراء:۷۰)

---

[1] اسی کتاب کی تیسری جلد میں ''انسان کی خود بیگانگی'' کے مسئلہ میں جسے مارکس نے پیش کیا ہے ہم نے تفصیل سے گفتگو کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ خدا پر اعتقاد انسان کی بلندی اور تکمیل وارتقاء کا سبب ہے نہ کہ خود سے بیگانگی کا۔

''ہم نے انسان کو عزت بخشی ہے اور اُسے مکرّم و محترم بنایا ہے۔ اُسے خشکی اور تری پر تسلط عطا کیا ہے۔ پاکیزہ رزق دیا ہے اور بہت سی دیگر مخلوقات پر فضیلت و برتری بخشی ہے۔''

اس آیت میں انسان کی چار جملوں میں توصیف کی گئی ہے جن کی ہم وضاحت کرتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ كَرَّمْنَا ۲۔ حَمَلْنٰهُمْ ۳۔ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۴۔ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا

۱: کرامت و عزت ۲: خشکی و تری پر تسلط ۳: پاکیزہ رزق ۴ دیگر مخلوقات پر فضیلت و برتری۔

اب ہم ان میں سے ہر وصف کے معنی و مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں:۔

الف: لفظ كَرَّمْنَا کا راز یہ ہے کہ ہم نے اسے عزت بخشی ہے اور اسے مکرم و محترم بنایا ہے۔ لیکن اُسے کس طرح مکرم و محترم بنایا ہے آیت میں اس بات کی طرف بالکل اشارہ نہیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ خدا نے جو مواہب اور نعمتیں انسان کو عطا فرمائی ہیں وہ ایک دو نہیں کہ انہیں مشخص طور پر پیش کیا جا سکے بلکہ انسان استعدادوں، شائستگیوں اور قابلیتوں وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ لیکن ان میں سے عقل و خرد کے عطیہ و نعمت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ یہ وہ عطیہ و نعمت ہے جس نے انسان کو دوسرے جانداروں سے ممتاز کر دیا ہے، اور اس کو فراواں اختیار بخشے ہیں۔ یہاں تک کہ دُوسرے عطیات اس عظیم نعمت کے بغیر کارآمد نہیں ہوتے اور نہ ہی انسان کی تکمیل و ارتقاء کا وسیلہ بنتے ہیں۔

ب: لفظ ''وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ نعمت حرکت کی طرف اشارہ ہے جس کے بغیر انواع و اقسام کے طیب ارزاق سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر موجود زمین کے صرف ایک حصہ پر تسلط رکھتا ہے جبکہ انسان وہ ہستی ہے جس کا پوری وسیع و عریض زمین پر عقل و خرد کی قوت کے زیر سایہ تسلط ہے اور وہ اس پر حکومت کرتا ہے۔

ج: وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ۔ لفظ طیب عربی لغت میں ہر پاکیزہ چیز کے معنی میں آتا ہے اس بناء پر اس نعمت کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے کہ ہم اس کا تصور کر سکیں۔

د: وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا۔ آیت کے آغاز میں اس کی کرمنا کے جملہ کے ساتھ اور یہاں فضلنا کے لفظ کے ساتھ توصیف کی گئی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں الفاظ میں فرق کیا ہے؟ شاید پہلے جملہ میں انسان کے فطری عطیات و نعمات کی طرف اشارہ ہے جبکہ دُوسرے جملہ کے ذریعہ اس کی اکتسابی نعمات کو بیان کیا گیا ہے۔

بہر حال اس آیت میں ان مختصر جُملوں کے ذریعے ایک ایسی ہستی کی شخصیت کی تصویر کشی کی گئی ہے جو مورد کرامت و تفصیل الٰہی قرار پائی ہے۔ اس ہستی کو دشت و دمن اور خشکی و دریا پر تسلط حاصل ہے۔ طیبات اس کی پہنچ میں قرار پاتے ہیں اور وہ زیادہ تر یا تمام کائنات پر برتری

اور فضیلت رکھتا ہے۔[1]

۲: اِنسان زمین پر خلیفہ خدا ہے

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

(بقرہ:۳۰)

''اُس وقت کو یاد کیجئے جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں خلیفہ بنانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا: کیا تو اس کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جو فساد و خوں ریزی کرے...... جبکہ ہم تیری حمد و ثناء کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔ خدا نے کہا: میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''

اس آیت میں گذشتہ آیت کے خلاف تمام زمین اور طیبات پر تسلط کے ذریعہ انسان کی برتری کی گفتگو نہیں کی گئی بلکہ محورِ سخن اس کا روئے زمین پر خدا کا خلیفہ اور جانشین ہونا ہے۔ لہٰذا انسان کو ایسی برتری و بالا ہستی ہونا چاہیے جو رُوئے زمین پر خدا کا جانشین اور نمائندہ ہو سکے، اس خدا کا جو تمام کمالات کا مجموعہ ہے۔

خدا کی جانب سے خلافت سے مقصود و مُراد یہ ہے کہ انسان اپنے وجود سے خدا کے وجود اپنی صفات و کمالات سے خدا کی صفات و کمالات اور اپنے افعال سے خُدا کے افعال کی نمائندگی کرے، وہ آئینہ ایزدی ہو، دوسرے لفظوں میں انسان اپنے تمام وجودی اور فعلی شون و خصوصیات کے ساتھ اللہ کے کمالات و صفات کی نشان دہی کرائے یہ مقام و حیثیت صرف اور صرف انسان ہی کی حاصل ہے اور بس۔

بعض بے علم لوگوں نے، جو ٹھیک طرح سے قرآن کو سمجھ ہی نہیں پائے اور جن کی سوچ قرآن کے مطابق نہیں بن سکی یہ خیال کر لیا ہے کہ جانشینی آدم سے مُراد آدم کو ان اووارِ ماضی کی موجودات کا جانشین بنانا ہے جو اُن سے پہلے ختم ہو چکے اور فنا کی راہ پر چلے گئے ہیں۔

اس قسم کے نظریہ کی ایک قبل از وقت مفروضہ کے سوا کوئی علّت و بنیاد نہیں، اور ان چاروں آیات میں غور و خوض کرنے سے جو اس بارے میں نازل ہوئی ہیں، اس نظریہ کی بے پائیگی ثابت ہو جاتی ہے۔[2]

---

[1] یہ تردید اس بنا پر ہے کیونکہ احتمال یہ ہے کہ کثیر جمیع کے معنی میں ہو جیسا کہ قرآن شیاطین کے بارے میں فرماتا ہے: واکثرھم کاذبون (شعراء: ۲۲۳) حالانکہ سارے شیاطین جھوٹ بولتے ہیں نہ کہ اکثر و بیشتر۔

[2] ''تفسیر صحیح آیات مشکلہ قرآن'' تالیف مولف کی طرف رجوع فرمائیں۔

صرف ہم نے ہی آدم کی خلافت کو خدا کی جانشینی نہیں سمجھا، بلکہ فرشتوں نے بھی اس کے یہی معنی لیے تھے......اسی لیے انہوں نے زبانِ سوال کھولی اور عرض کیا تھا: ''مٹی سے خلق شدہ یہ مخلوق، جس کی اجتماعی زندگی فساد و خوں ریزی سے پُر ہو، خدا کا خلیفہ کیسے ہو سکتی ہے؟ اور اپنے شئون و حالات کے ساتھ کیسے خُدا کے اسماء وصفات کا مظہر بن سکتی ہے؟ پھر انہوں نے مزید کہا: اگر جعل خلافت کا ہدف ومقصد تیری تسبیح وتقدیس ہے تو یہ کام ہم کر سکتے ہیں اور ہم ہمیشہ سے تیرے ثنا خوان اور تسبیح کرنے والے ہیں۔''

خُدا نے اس موقع پر ان کے سوال کے دو جواب دیئے ایک اجمالی اور وہ یہ کہ ''میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور دوسرا تفصیلی، جسے بعد والی آیات بیان کرتی ہیں، جہاں فرماتا ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ (بقرہ: ۳۱)

''خدا نے آدم کو کُل کے کُل اسماء کی تعلیم دی، پھر انہیں ملائکہ کے سامنے پیش کیا اور کہا اگر تم سچ کہتے ہو تو ہمیں اِن اسماء کے بارے میں خبر دو۔''

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾

(بقرہ: ۳۲)

''فرشتوں نے کہا تیری ذات پاک و پاکیزہ اور منزہ ہے ہم اس کے سوا جو تو نے ہمیں بتلایا ہے کچھ نہیں جانتے۔ بیشک تو دانا و حکیم ہے۔''

اس آیت میں جہاں فرشتوں کا تفصیلی جواب ہے کئی نکات موجود ہیں جنہیں ہم بتدریج بیان کریں گے۔

۱: تعلیم اسماء سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے مراد اشیاء و موجودات کے نام ہیں یا کوئی اور چیز؟

مسلمہ طور سے اس سے ناموں کی تعلیم مُراد نہیں ہے۔ کیونکہ اس صُورت میں آدم اور فرشتوں کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہتا کیونکہ جس طرح آدمؑ نے یہ نام خدا سے سیکھے تھے۔ اسی طرح فرشتوں نے انہیں آدم سے سیکھ لیا[1] اور اس طرح یہ دونوں برابر ہو گئے، فرق صرف اتنا ہے کہ آدم نے یہ الفاظ بلا واسطہ سیکھے تھے اور فرشتوں نے بالواسطہ سیکھ لیے اور اس قسم کا فرق ایک دوسرے پر فضلیت کا سبب نہیں بنتا۔

[1] قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾ (بقرہ: ۳۳)

اس صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ ''اسماء کے بارے میں آدم کی آگاہی'' ایک خاص قسم کی آگاہی تھی، یعنی آدم میں تو اس قسم کی تعلیم اور سیکھنے کی قوت تھی، لیکن فرشتوں میں اس قسم کی شائستگی اور لیاقت نہیں پائی جاتی تھی۔ ورنہ لُغت والفاظ اور ناموں سے آگاہی، اور ان کا علم دونوں جماعتوں کی قوت وتوانائی میں موجود تھا اور دونوں نے اسے تدریجاً ہی سیکھا تھا۔

اس بات کا ثبوت کہ آدم کی اسماء کے بارے میں آگہی الفاظ اور چیزوں کے ناموں کے بارے میں نہیں تھی۔ وہی **ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ** کا جُملہ ہے۔

عرضھم میں **ھم** کی ضمیر متصل اس بات کی ترجمانی کرتی ہے کہ اس تعلیم سے مراد اسماء کی تعلیم نہیں تھی کیونکہ اگر یہ مراد ہوتی تو لازم تھا کہ یہ فرماتے۔ **وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهَا**۔

آیت کے اسلوب کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ کہنا پڑے گا تعلیم اسماء سے مُراد عالمِ آفرینش وخلقت کے اسرار ورموز کی تعلیم ہے۔ یہ اسرار ورموز اس طرح آدم کی نظر میں مجسم ہوئے کہ ان کی نظر میں سما گئے۔ اسی بناء پر لفظ عرض (معرضِ وجود میں آنا) استعمال ہوا ہے جبکہ فرشتوں میں اس طرح سے حقائق واسرار کے ادراک کی استعداد وشائستگی موجود نہ تھی۔

اس بات کا سبب کہ یہاں لفظ ھم اِستعمال ہوا ہے۔ جو عام طور پر زندہ وعاقل موجودات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ عالم کے حقائق واسرار کی عظمت وجلالت اس چیز کی مجوز بنی کہ ان کے بارے میں وہ ضمیر استعمال ہو جو ذوی العقول کے لیے مخصوص ہے۔ چنانچہ اسی قسم کا معاملہ سورۂ یوسف میں سورج اور چاند کے بارے میں بھی انجام پایا ہے جہاں فرماتا ہے۔

وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ④ (یوسف: ۴)

''میں نے سُورج اور چاند کو دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

۲: کیا یہ جانشینی آدم کی خصوصیات سے ہے یا ان کی اولاد بھی اس فضیلت میں حصہ دار ہے؟ اگر پہلا نظریہ درست وصحیح ہو تو پھر اس کا کوئی تعلق انسان کی قدر ومنزلت سے نہیں ہوگا۔

دوسری آیات کا ظاہر دوسرے نظریہ کی تائید کرتا ہے، کیونکہ قرآن آدم کے مقام بلند کو ثابت کرنے کے بعد، اور یہ کہ وہ ایسے اسرار کے متحمل ہوئے جن کے تحمّل کی ملائکہ میں سکت نہیں تھی، فوراً آدم کو فرشتوں کے سجدہ کرنے کے واقعہ کو پیش کرتا ہے اور اس بات کو واضح کرتا ہے کہ آدم کے مسجودِ ملائکہ ہونے کا سبب وہی ان کا مقام بلند ہے۔ یعنی اگر آدم اس قسم کے مقام فضیلت کے حامل نہ ہوتے تو خدا ہرگز فرشتوں کو یہ حکم نہ دیتا کہ وہ ان کو سجدہ کریں۔

ایک طرف تو یہ بات ہے۔ دوسری طرف ہم آئندہ بحث میں یہ بتائیں گے، کہ ملائکہ کا آدم کو سجدہ کرنا آدم کے لیے کوئی رنگ خصوصی نہیں رکھتا تھا، بلکہ ان کو سجدہ کرنا اس عنوان سے تھا کہ وہ تمام انسانوں اور آدمیوں کے نمائندہ تھے اور ان کو سجدہ کرنا تمام انسانوں کو سجدہ کرنا تھا۔ ان دونوں مطالب کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ خدا کی جانشینی صرف آدم کی ذات کے ساتھ وابستہ نہیں تھی بلکہ یہ فیض

اولادِ آدم میں بھی جاری رہا ہے۔

دوسرے لفظوں میں معلول کی وسعت اور یہ کہ فرشتوں نے آدم کو سجدہ کر کے مطلقاً نسلِ آدم کو سجدہ کیا تھا، اور ان کو سجدہ کرنا تمام انسانوں کی نمائندگی کے عنوان سے تھا، علت کی وسعت (یعنی تمام انسان خدا کے خلیفہ ہیں اور تمام انسانوں میں اسرارِ عالم کی آ گاہی کا امکان ہے) کو سمجھا جا سکتا ہے۔

فرق صرف اتنا ہے کہ آدمؑ، ابوالبشر نے ان تمام اسرار ورموز کو بالفعل اور ایک ہی جگہ سیکھا تھا کیونکہ وہ ایسی جگہ موجود تھے جہاں حرکت وتدریج درکار نہیں تھی۔ جبکہ اولادِ آدم ایسے مقام پر زندگی بسر کر رہی ہے جس کی اساس وبُنیاد تدریج وحرکت اور استعداد فعلیت پیدا کرتی ہے۔ اس بناء پر آدم کا سیکھنا ابداع استعداد اور لیاقت وامکان رکھنے کی صورت میں ہوگا کہ وہ بتدریج اسرارِ ہستی کو حل کرسکیں گے اور ان سے آ گاہ ہو جائیں گے۔

اس کے علاوہ کچھ اور آیات سے بھی یہ استفادہ ہوتا ہے کہ آدم کی جانشینی انہیں کے ساتھ مخصوص نہیں تھی۔ بلکہ ان کی اولاد بھی ان امور میں ان کے ساتھ شریک ہے۔ کیونکہ خدا رُسولِ اسلام کے زمانہ اور ان کے بعد کے تمام انسانوں کی اس طرح توصیف کرتا ہے۔

وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۟ (نمل: ۶۲)

''ہم تمہیں زمین میں جانشین بنا دیتے ہیں کیا خدا کے ساتھ اور کوئی خدا ہے تم بہت ہی کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

۳: اِنسان۔ مسجودِ ملائکہ

انسان کی قدرو قیمت معلوم کرنا اور اسکی وجودی قدرومنزلت کی تشریح اس مکتبِ فکر میں اسی صورت میں شائستہ اور مناسب طریقہ پر انجام پا سکتی ہے جب ہم اس کی حقیقت وواقعیت سے آشنا ہو جائیں اور انسان کی انسانیت کے سبب کو دریافت کر لیں۔

عام لوگ انسان کی واقعیت کو اس کے ظاہری پیکر اور صورت میں جبکہ اس میں حس وحرکت موجود ہو منحصر سمجھتے ہیں اور اگر بہت زیادہ دقت سے کام لیں تو اسے جسم وروح سے مرکب قرار دیتے ہیں جن میں سے ہر ایک اس کی واقعیت کے ایک حصہ کی تشکیل کرتا ہے۔ حالانکہ فلسفہء اسلام کی رُو سے اس کی واقعیت وحقیقت کو صرف اس کی روح ہی تشکیل دیتی ہے۔ جسم فقط ایک لباس ہے جو اس کی روح کو پہنایا گیا ہے۔ اور رُوح ہی اُسے عمل کی قوت اور فعالیت بخشتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں جسم رُوح کے لیے ایک ذریعہ ہے تا کہ وہ اس سے دیکھی جانے والی چیزوں کو دیکھے اور سنی جانے والی چیزوں کو سنے، اور اسی طرح دوسری باتوں کے لیے، حتیٰ کہ محسوسات کے ادراک کے طریق سے معارف اور عقلی مسائل کو پالے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان پہلے دن، جب اس نے رُحم، کے نہاں خانہ سے دنیا کی روشن سرائے میں قدم رکھا، ایسی روح کا جو اس قسم کا ادراک اور بینش رکھتی ہو حامل نہیں تھا بلکہ وہ انسان کی صورت میں ایک پیکر تھا، اور آثارِ حیات میں سے صرف حسِ وحرکت کا مالک تھا،

جو حیاتِ حیوانی سے زیادہ مقام نہیں رکھتی۔ اس کے بعد بتدریج اندرونی اور جوہری حرکت کے سائے میں اس نے یہ قابلیت پیدا کر لی کہ وہ اس قسم کی روح سے فیضاب ہو یا اس کا جسم اپنے دامن میں اس قسم کی روح کی پرورش کرے اور وہ ایسی رُوح کا حامل بن جائے جو اپنے افکار وانظار یا مادی وطبعی کوششوں کی جولانگاہ بن جائے۔

اس مکتبِ فکر کی نظر میں اگر اس کے جسم کے لیے فنا ہے تو اس کی رُوح کے لیے فنا نہیں ہے۔ یعنی جسم کے مرنے، اس کے سرد ہو جانے اور حرارت غریزی کے ختم ہو جانے سے اس کی روح ہرگز فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ سرائے ابدی میں ایک خاص طریقہ سے زندہ رہتی ہے۔

اس موضوع کے فلسفی و قرآنی دلائل کی تشریح و تفصیل ہماری بحث سے باہر ہے۔[1]

بہتر یہی ہے کہ ہم انسان کے مقام و موقعیت اور حیثیت کو اس مکتبِ فکر سے معلوم کریں۔

خدا ملائکہ کو حکم دیتا ہے کہ آدم کو سجدہ کرو اور اس کی ایک خاص قسم کی تعظیم و تکریم بجالاؤ جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓـئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِيۡسَؕ اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ٘ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ۝۳۴ (بقرہ: ۳۴)

اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے جو کافروں میں سے ہو گیا۔

اس قسم کا حکم بلا وجہ اور بغیر کسی سبب کے نہیں تھا۔ اگر آدم خلقت کے گلِ سرسبد نہ ہوتے تو ہرگز ملائکہ کے لیے موردِ تعظیم و تکریم نہ ہوتے۔ جو چیز اس قسم کے حکم کا سبب بنی، وہ آدمؑ کی عالمِ آفرینش وخلقت کے اسرار و رموز سے آگاہی ہے جس کے برداشت کی ملائکہ میں طاقت نہیں تھی اور یہی آگاہی تھی جس کے سبب آدم زمین میں خدا کے خلیفہ قرار پائے۔ ایسا خلیفہ جو اپنی دانش اور علم و توانائی کی مدد سے خدا کی صفات کے مظہر اور اسکے علم وقدرت کی تجلی قرار پائے وعلیٰ ہذا۔

آدم کیسے قدر و منزلت والے اور گرانبہا گوہر ہیں کہ خدا کے وہ ملائکہ جو ہمیشہ اس کے فرمانبردار رہتے ہیں اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے فرمان سے انحراف نہیں کرتے، انہوں نے خضوع کی پیشانی آدمؑ کے آستانہ پر رکھ دی اور اس کی تعظیم و تکریم کرنے لگے۔

یہاں پر دو سوالات سامنے آتے ہیں، اور ہم ایک طرح سے ان دونوں کا جواب دیتے ہیں:۔

ا: کیا ملائکہ کا سجدہ خصوصیت کے ساتھ آدم کے لیے تھا؟

ذکر شدہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ ملائکہ کا سجدہ خصوصیت کے ساتھ آدم ہی کے لیے تھا۔ اور یہ تمام تکریم اور تعظیم آدم ہی کے ساتھ مخصوص تھی۔ اس صورت میں اس آیت سے تمام انسانوں کی قدر و منزلت پر کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے؟

---

[1] اس سلسلہ میں ''اصالتِ رُوح از نظر قرآن'' کے چوتھے حصہ میں اس موضوع پر گفتگو کر چکے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری آیات جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں گواہی دیتی ہیں کہ آدم کو سجدہ اس عنوان سے صورت پذیر ہوا تھا کہ وہ تمام انسانوں کے نمائندہ ہیں اور ان کو سجدہ حقیقت میں تمام آدمیوں کے لیے سجدہ تھا، جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَلَقَدۡ خَلَقۡنٰكُمۡ ثُمَّ صَوَّرۡنٰكُمۡ ثُمَّ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَ ؕ لَمۡ يَكُنۡ مِّنَ السّٰجِدِيۡنَ ﴿۱۱﴾ (اعراف:۱۱)

''ہم نے تمہیں خلق کیا، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، سب نے ہی تو سجدہ کیا سوائے ابلیس کے جو سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا۔''

آیت کا آغاز واضح طور پر بتاتا ہے کہ خدا نے پہلے سب آدمیوں کو پیدا کیا، پھر ان کی صورت بنائی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، حالانکہ اس وقت آدم کی اولاد کی خلقت اور صورت بنانے کا کوئی معمولی سے معمولی نام ونشان بھی نہیں تھا۔ لیکن چونکہ آدم تمام انسانوں کے نمونہ اور نمائندہ تھے تو گویا ان کی خلقت اور صورت گری تمام انسانوں کی خلقت اور صورت گری تھی اور اسی وجہ سے ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے تم سب کو پیدا کیا اور تمہاری صورت گری کی۔ پس اس صورت میں کہنا پڑے گا کہ آدم کو سجدہ ان کی ساری اولاد کو بھی سجدہ کے مترادف تھا۔

دوسرے لفظوں میں اگر قرآن ان کی خلقت اور صورت گری کو تمام افراد کی خلقت اور تصویر بنانا قرار دیتا ہے اور یہ کہتا ہے۔ ولقد خلقنکم ثم صورنکم۔ تو یقیناً آدم کے سجدہ کی بھی اسی طرح تفسیر کرتا ہے۔

آدمؑ کا نمونہ اور نمائندہ ہونا صرف اس کا ہی موجب نہیں بنا کہ ان کی خلقت وصورتگری ان کی تمام اولاد کی خلقت وصورتگری قرار پائے۔ بلکہ دوسرے آثار بھی ان میں پائے جاتے ہیں مثلاً۔

قرآن آدم کے زمین پر اُترنے کو تمام انسانوں کا زمین پر اترنا قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے۔

قَالَ اهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۲۴﴾

(اعراف: ۲۴)

''فرمایا نیچے اتر جاؤ۔ تم میں سے بعض دوسروں کے دشمن رہو گے اور تمہارے لیے زمین پر استقرار اور زندگی محدود ہے۔''

یہاں تک کہ ایسی اکتفا نہیں، بلکہ جس وقت آدم جنت سے نکالے جاتے ہیں۔ اسی وقت اولادِ آدم کو خطاب فرماتا ہے۔

قَالَ فِيۡهَا تَحۡيَوۡنَ وَفِيۡهَا تَمُوۡتُوۡنَ وَمِنۡهَا تُخۡرَجُوۡنَ ﴿۲۵﴾ (اعراف: ۲۵)

''فرمایا تم رُوئے زمین میں ہی زندگی بسر کروگے، وہیں مروگے اور وہیں سے باہر نکلوگے۔''

اس دن، جبکہ اولادِ آدم کا نام ونشان تک نہ تھا اس قسم کے وسیع خطابوں کا محور یہی چیز تھی۔ جس کو ہم نے بیان کیا ہے کہ آدمؑ اس دن تمام انسانوں کے نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے لہٰذا وہ تمام احکام اور خطابات جو آدمؑ کے حق میں انجام پائیں، وہ دوسروں پر بھی حکم فرما ہیں۔

۲: آدمؑ کا سجدہ اور توحید درعبادت

سوال: آدم کے لیے سجدہ ان کی پرستش وعبادت ہے اور شرک درعبادت کی حد میں داخل ہے۔ اس صورت میں خدا نے اپنے غیر کی عبادت کا حکم کیسے دے دیا؟

اس سلسلہ میں طرح طرح کے جواب دیئے گئے ہیں لیکن اس کا محکم اور استوار جواب یہ ہے کہ سجدہ ہر حالت میں مسجود کی عبادت وپرستش نہیں ہوتا۔ سجدہ صرف ایک ہی صورت میں عبادت وپرستش شمار ہوتا ہے جب مسجود کی الوہیت اور خدائی کا عقیدہ رکھتے ہوئے کیا جارہا ہو۔ یعنی مسجود کو خدا یا خدائی کاموں کا مبدء سمجھ کر اس عقیدہ کے ساتھ اس کو سجدہ کیا جائے۔ لیکن اگر اس عمل کا مقصد اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہو مثلاً اولیاء خدا کے سامنے یا ماں باپ کو ان کے احترام وتعظیم کے عنوان سے سجدہ کیا جائے تو اسے ہرگز عبادت وپرستش نہیں کہا جائے گا۔ چونکہ فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنا آدمؑ کی تکریم وتعظیم کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھا، نہ ہی فرشتے آدمؑ کی الوہیت کا اعتقاد رکھتے تھے، لہٰذا ان کا سجدہ کرنا عبادت شمار نہیں ہوسکتا۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں۔

فرشتوں نے آدمؑ کی تعظیم وتکریم کے لیے، جس کا خدا نے انہیں حکم دیا تھا، اپنی پیشانیاں زمین پر رکھی تھیں۔''[۱]

ایک اور حدیث میں فرمایا:

''فرشتوں نے اس عمل سے خدا کے حکم کی اطاعت کی اور آدم سے اظہار مہر ومحبت کیا۔''[۲]

قرآن واضح طور پر گواہی دیتا ہے کہ یعقوبؑ کے بیٹوں نے یوسفؑ کے سامنے سجدہ کیا، اور اس طرح سے خدا نے یوسف کے خواب کو تعبیر بخشی اور ان کے باپ نے ان کی ہرگز مذمت نہ کی، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَرَفَعَ اَبَوَيۡهِ عَلَى الۡعَرۡشِ وَخَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا ۚ (یوسف:۱۰۰)

وہ اپنے ماں باپ کو تخت کے اوپر لے گیا، اور وہ سب کے سب سجدہ میں گر پڑے

یہ آیت اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ انسان کا بعض خاص شرائط وحالات میں سجدہ کرنا عبادت نہیں ہوتا۔ گذشتہ شریعتوں میں تو یہ

[۱] تکرمة من الله تعالیٰ، بحارالانوار ج ۱۱ ص ۱۳۹

[۲] كَانَ ذٰلِكَ طَاعَةَ اللهِ وَمَحَبَّةً مِّنۡهُمۡ لِاٰدَمَ ۔ مدرک سابق، اور تفسیر نور الثقلین میں بھی ج ۱ ص ۴۹ پر تقریباً یہی مضمون نقل ہوا ہے۔

حکم موجود بھی تھا۔ تاہم شریعت اسلامی میں غیر خدا کیلئے کسی قسم کا سجدہ بھی جائز نہیں ہے چاہے وہ عبادت و پرستش شمار نہ کیا جائے

۳۔ انسان خدا کی امانت کا حامل ہے

قرآن کی آیات انسان کو خدا کا امانت دار کہتی ہیں یہ وہ امانت ہے جس کے اُٹھانے سے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے انکار کر دیا تھا اور اس سے ڈر گئے تھے، لیکن انسان نے امانت کے اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا۔

اس امانتِ الٰہی کا بوجھ اٹھانے والے انسان تین گروہوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں: منافق مشرک اور مومن۔ پہلی دو جماعتیں امانت میں خیانت کرنے کی وجہ سے سزا پائیں گی اور تیسری جماعت پر خدا کی رحمت ہوگی۔

ان دونوں آیات کا متن یہ ہے۔

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَّحۡمِلۡنَہَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡہَا وَحَمَلَہَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَہُوۡلًا ﴿۷۲﴾ (احزاب:۷۲)

''ہم نے امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اور انسان نے اُسے اٹھا لیا۔ یقیناً انسان بہت بڑا ظالم اور نادان ہے۔''

لِّیُعَذِّبَ اللّٰہُ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتِ وَالۡمُشۡرِکِیۡنَ وَالۡمُشۡرِکٰتِ وَیَتُوۡبَ اللّٰہُ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۷۳﴾ (احزاب:۷۳)

''تاکہ خدا منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو تو عذاب دے اور ایمان لانے والے مردوں اور ایمان لانے والی عورتوں کو اپنی رحمت میں شامل کرے اور خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

امانت کیا ہے؟

وہ مال جسے انسان کسی کے سپرد کرے اُسے امانت اور امانت لینے والے شخص کو موتمن کہتے ہیں۔ اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ امانت کو صحیح و سالم، جب وہ چاہیں مالکوں کو لوٹا دے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا ۙ (نساء:۵۸)

''خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں اُن کے مالکوں کو لوٹا دو۔''

اگر امانت رکھنے والا (موتمن) امانت واپس نہ کرے اور اس میں تصرف کر کے واپس دے۔ تو اس صورت میں تصرف کر کے واپس تو

اس صورت میں وہ خیانت کا مُرتکب ہوگا۔ جو بذاتِ خود ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ قرآن اس بارے میں فرماتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۲۷﴾

(انفال: ۲۷)

''اے ایمان والو! خدا اور رسولؐ کے ساتھ خیانت مت کرو۔ اسی طرح سے ایک دُوسرے کی امانتوں میں بھی خیانت نہ کرو۔ حالانکہ تم جانتے ہو۔''

امانت کا لغوی معنی وہ مال ہے جو کسی کے سُپرد کیا جاتے۔ لیکن قرآن و حدیث کی اصطلاح میں یہ لفظ وسیع تر معنی رکھتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص تم سے کوئی ایسی بات کرتا ہے جس کے لیے وہ راضی نہیں ہے کہ تم اُسے ظاہر کرو تو اُسے بھی امانت ہی کہا جائے گا، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔

اِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ بِحَدِيْثٍ ثُمَّ الْتَفَتَ فَهُوَ اَمَانَةٌ

''اگر کوئی شخص کوئی بات کرے اور پھر اِدھر اُدھر دیکھے کہ کسی نے اس کی بات سُنی تو نہیں، تو وہ بات امانت ہے، اور اس کو فاش نہیں کرنا چاہیے۔''

بعض احادیث میں لوگوں کے رازوں کو امانت کا نام دیا گیا ہے جیسا کہ امام جعفر صادق فرماتے ہیں۔

مَنْ غَسَّلَ مُؤْمِنًا فَاَدّٰى فِيْهِ الْاَمَانَةَ غُفِرَلَهٗ

''جو شخص کسی مومن کو غسل دے اور اس سلسلہ میں امانت کو ادا کرے تو وہ بخشا جائے گا۔

ایک شخص نے امام سے ادائے امانت کا مطلب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:۔

لَا يُخْبِرُ بِمَا يُرٰى

''جو کچھ حالتِ غسل میں اُس نے دیکھا ہے کسی سے بیان نہ کرے۔''[1]

اس تفصیل کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ اس آیت میں امانت سے مُراد سرِ الٰہی ہے جس کے لیے دنیا کی سخت ترین موجودات میں استعداد نہ ہونے کی بنا پر اسے اٹھانے کی طاقت نہیں تھی لہٰذا انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ڈر گئے۔ اس کے بعد یہ امانت انسان کے سامنے پیش کی گئی تو انسان نے اسے قبول کرلیا اور اپنے آپ کو اس امانت کے اٹھانے کے قابل سمجھا۔

---

[1] سفینۃ البحار ج ۱ ص ۴۱۔

یہاں چند سوالات تشریح کے ساتھ ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

۱: یہ سرِ الٰہی جسے انسان نے قبول کر لیا کیا تھی؟

۲: اگر انسان نے قابلیت کی بناء پر اس سرِ الٰہی کو قبول کیا، تو پھر آیت میں اس کی ظلوم وجہول کے الفاظ سے کیوں تعریف کی گئی، جبکہ مناسب تھا کہ دوسرے الفاظ میں اس کی توصیف کی جاتی۔

۳: اس قسم کی امانت کا بار اُٹھانے سے انسان تین جماعتوں میں کیسے تقسیم ہو جاتے ہیں، جبکہ انہیں صرف دو جماعتوں (امین اور خائن) سے باہر نہیں ہونا چاہیے۔

۱: آیت میں امانت سے کیا مُراد ہے؟

اس امانت سے مُراد، جسے خدا نے آسمانوں زمین پہاڑوں اور انسانوں کے سامنے پیش کیا اور صرف انسان ہی نے اُسے قبول کیا۔ وہی ہے جو اصطلاح کے مطابق ''عالم ذر'' سے متعلق آیت میں وارد ہوئی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی توحید کو ربوبیت کے ساتھ انسانوں کے سامنے پیش کیا ہے جس کا سب نے اعتراف کیا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ‌ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ‌ ؕ قَالُوۡا بَلٰى‌ ۛۚ شَهِدۡنَا ‌ۛۚ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِيۡنَ ۙ‏ ﴿۱۷۲﴾

(اعراف: ۱۷۲)

''اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے اولادِ آدمؑ سے ان کی ذریت ونسل کو لیا، انہیں خود انہیں پر گواہ بنایا اور فرمایا: کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا، ہاں! ہے یہ (اقرار) ہم نے اس لیے کرایا کہ وہ قیامت کے دن یہ نہ کہنے پائیں کہ ہم تو اس بات سے غافل تھے۔''

اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنۡۢ بَعۡدِهِمۡ‌ ۚ اَفَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ﴿۱۷۳﴾ (اعراف: ۱۷۳)

یا یہ کہنے لگو کہ ہمارے آباؤ اجداد پہلے سے مشرک تھے، اور ہم انہی کی اولاد تھے، کیا تو ہمیں اس بات کی بناء پر جو اھل باطل انجام دیا کرتے تھے نابود کر دے گا۔

یہ آیت زیر بحث آیت سے ابہام کو دور کر سکتی ہے اور بتاتی ہے کہ پیش شدہ امانت اس کی توحید ربوبی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔

خداوندِ تعالیٰ نے انسان کو ایسی استعداد عطا فرمائی ہے جس کے ذریعہ یہ امانتِ خدا کا متحمل ہوسکتا ہے انسان اپنی زندگی کو پروردگار عالم اور جہان آفرینش کے کردگار کی وحدانیت کی بنیاد پر چلاسکتا ہے۔ اور وہ اس قابل ہے کہ دل وزبان سے اللہ کی واحدانیت کا اقرار کرے، اور جو چیز اس اعتراف کے مخالف ہو، اسے انجام نہ دے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ سارے کا سارا عالمِ آفرینش ہی، یہاں تک کہ تمام آسمان وزمین، اس کی یکتائی کی گواہی دیتے ہیں جیسا کہ فرماتا ہے۔"

اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنۡۢ بَعۡدِهِمۡ‌ۚ اَفَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ﴿۱۷۳﴾ (اسراء:۴۴)

"دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کی تسبیح نہ کرتی ہو اور ہر قسم کے نقص وعیب اور شریک وسہیم سے اس کے پاک ومنزہ ہونے کو بیان نہ کرتی ہو، لیکن تم اُسے سمجھتے نہیں۔"

اس بناء پر اس بوجھ کا اٹھانا صرف انسان کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔

جواب: جس چیز کا انسان متحمل ہوا ہے کہ وہ اسے اپنے کاندھوں پر اُٹھائے، وہ اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے جسے دوسرے انجام دیتے ہیں، کیونکہ دیگر مخلوقات کی تسبیح تکوینی اور فطری تسبیح ہے۔ یعنی وہ غیر شعوری طور پر تسبیح کرتے ہیں، جبکہ انسان کی تسبیح وتوحید دل وزبان کے ذریعہ عقل وخرد کے سائے میں تشریعی اور مکمل خود آ گاہی کے ساتھ قرار پاتی ہے۔ ان دونوں قسم کی تسبیح وتنزیہ میں بہت فرق ہے۔

انسان کو چھوڑ کر عالم کے دیگر موجودات سے تسبیح تکوینی مطلوب ہے جو خود بخود بے اختیارانہ انجام پاتی ہے، لیکن جو تسبیح انسان سے مطلوب ہے وہ تسبیح تشریعی ہے، جو عقل وخرد، علم وآ گہی اور اختیار وآزادی کے ساتھ مربوط ہے۔ انسان میں توحید اور یکتا پرستی کی استعداد موجود ہے جو اس کے تحمل اور پذیرائی کی نشانی ہے، جبکہ جمادات میں یہ قابلیت موجود نہیں۔ لہٰذا یقینی طور پر وہ اس بارِ امانت کے متحمل نہ ہوسکے۔

اس بیان سے عرضہ، کے معنی بھی واضح ہوگئے کیونکہ سوال وجواب یا پیش ہونا اور قبول کرنا۔ (الست بربکم قالو ابلیٰ) عام اور عادی صورت میں نہیں تھا بلکہ تکوینی اور استعدادی پہلو رکھتا تھا۔ یعنی ہم نے انسان کو یہ لیاقت واستعداد عطا فرمائی تھی کہ وہ رُشد وبلوغ کو پہنچنے کے بعد عالمین کے خالق (رب) کی یکتائی کا صمیم قلب سے اعتراف کرے اور زبان سے بھی اُسے بیان کرے، جبکہ دیگر موجودات میں عقل وخرد کے فقدان کے باعث یہ قابلیت نہیں تھی۔ اسی لیے انسان نے اپنی استعداد کی زبان سے اس امانت کو قبول کرلیا، جبکہ دیگر موجودات نے استعداد کے فقدان کے باعث اُسے قبول نہ کیا۔

مفسرین کی ایک جماعت نے "امانت" کی فرائض ومحرماتِ شرعی یا اس سے وسیع وکشادہ معنی میں تفسیر کی ہے اور کہا ہے کہ انسان میں عقل وخرد ہونے کی وجہ سے اس خطاب وتکالیفِ شرعی کی قابلیت موجود تھی۔ یہی لیاقت وشائستگی اس کے تحمل کی علامت ہے، جبکہ دیگر موجودات میں جماد ہونے اور عقل وخرد اور حریت وآزادی کے نہ ہونے کے بناء پر اس کے تحمل کی قابلیت نہ تھی۔ اور اصطلاح کے مطابق انہوں نے اس

امانت کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اگرچہ اس قسم کی تفسیر کا ایک شاہد حدیث کی شکل میں بھی موجود ہے۔ تاہم وہ دوسری آیت کے ساتھ، جو لوگوں کو ادائے امانت کے سلسلہ میں تین جماعتوں میں تقسیم کرتی ہے، چنداں ساز گار نہیں ہے۔ کیونکہ لوگ تکالیفِ الٰہی کے سلسلہ میں صرف دو جماعتوں یعنی 'مطیع' و 'عاصی' میں تقسیم ہوتے ہیں نہ کہ تین جماعتوں میں۔

ظاہر ہے پہلے معنی دوسرے معنی کی نسبت زیادہ واضح ہیں بالخصوص جبکہ عالم 'ذر' سے متعلق آیت بھی پہلے معنی کی صحت پر گواہ ہے اور دوسرے معنی آیت کے ساتھ چنداں ساز گار معلوم نہیں ہوتے، جب تک کہ ان کی اس طرح توجیہہ نہ کی جائے جس سے لوگوں میں تکالیفِ الٰہی کے سلسلہ میں تین قسم کی حالتیں پیدا نہ ہوں۔

۲: اِنَّه كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً سے کیا مُراد ہے؟

سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر آیت کا مقصد انسان کی مدح وستائش ہے یا اس کے مقام ومنزلت کی نشان دہی کرنا ہے تو اس صورت میں یہ بات یعنی آیت میں اُسے ظلوم وجہول کہنا مناسب معلوم نہیں ہوتا اور اگر یہ آیت اس کی مذمت وتخفیف کے اظہار کے لیے ہے تو اس صورت میں انسان کی قدر ومنزلت پر اس آیت سے استدلال صحیح نہیں۔

جواب: آیت کے معنی ومفہوم میں مدح وذم اور ستائش ومذمت دونوں موجود ہیں۔ آیت میں ایک طرف تو انسان پر اللہ تعالیٰ کے احسان کا ذکر ہے۔ کہ اُسے مخصوص قسم کی لیاقت وشائستگی عطا فرمائی گئی ہے۔ جو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کو عطا نہیں ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں انسان کو ایسی خلعت عطا کی گئی ہے جس سے دیگر تمام مخلوقات محروم ہیں۔

لیکن اس تکریم وعزت بخشی کے باوجود انسان بعض اوقات حکمِ فطرت سے روگردانی کا مرتکب ہو کر شرک کی راہ، جو ظلمِ عظیم ہے۔[1] اختیار کر لیتا ہے۔ انسان کے اس عمل کی اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنی قدر ومنزلت اور مقام سے جاہل ونا آشنا ہے اور اصطلاح کے مطابق 'جہول' ہے۔ اس صورت میں مذکورہ جملہ کے معنی یہ ہوں گے کہ انسان 'ظلوم' ہے اور حد سے تجاوز کر کے شرک سے آلودہ ہو جاتا ہے۔ نیز انسان جہول بھی ہے۔ کیونکہ یہ اپنے مقام سے جاہل اور قدر ومنزلت سے بے خبر ہے۔

فخر رازی اپنی تفسیر میں اس لفظ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان دو صفات سے مُراد یہ نہیں ہے کہ انسان ہمیشہ ہی سے ظالم وجاہل ہے بلکہ اس سے مُراد یہ ہے کہ انسان میں ظلم وتجاوز اور جہالت ونادانی کا مادہ بھی موجود ہے۔ جیسا کہ عرب اس گھوڑے کو جس میں سرکشی کا مادہ ہوتا ہے۔ دابۃ جموح کہتے ہیں یعنی وہ گھوڑا جس میں سرکشی کا مادہ پایا جاتا ہو۔ یہ نہیں کہ وہ گھوڑا ہمیشہ ہی سرکش رہتا ہو۔ انہ ظلوم جہول کا جملہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان ایک مخصوص استعداد وشائستگی کا حامل ہونے کے باوجود انواع واقسام کے جبلی وطبعی مادہ ہائے ظلم وتجاوز اور حقائق وواقعات کے

---

[1] اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿١٣﴾ (لقمان: ١٣)

شئون وحالات سے جہالت ونا آ گاہی کا حامل ہے۔اسی بناء پر کچھ انسان خوبی استعداد کے حکم سے انحراف کر کے شرک ودوگانگی کی راہ اختیار کر لیتے ہیں،اگر چہ ان کی ایک جماعت نفس کی اسی طہارت و پا کیزگی پر باقی بھی رہتی ہے۔

استاد علامہ طباطبائی نے ایک اور طرح سے اس سوال کا جواب دیا اور فرمایا ہے کہ:ظلم ونادانی اگر چہ مذمت کا سبب ہوتے ہیں، تاہم ان کے باوجود انسان حملِ امانت کا اہل بھی ہے۔کیونکہ جو شخص ان دوصفات سے متصف ہوتا ہے، یقیناً اس میں عدل وعلم کی اساس موجود ہونی چاہیے۔اگر انسان ظلم ونادانی دونوں کا حامل ہے۔تو طبعاً اس میں مادۂ عدل وعلم بھی موجود ہونا چاہیے۔جبکہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں میں ان سب باتوں کا مکمل فقدان ہے۔''[1]

۳:انسان تین جماعتوں میں کیسے تقسیم ہوتا ہے:

اس وسیع وکشادہ بحث سے تیسرے سوال کا جواب بھی واضح ہوجاتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔'امانت'' سے مُراد توحیدِ ربوبی اور توحید درعبادت ہے۔لوگ اس معاملہ میں درج ذیل تین جماعتوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں۔

۱:　ایک جماعت موحدین کی ہے۔توحید کا درخت ان کے دلوں میں جڑ پکڑ لیتا ہے، پھر ان کے کردار و گفتار سے توحید پرستی کی شاخیں نکلتی ہیں اور اقرارِ توحید کے شگوفے پھوٹتے ہیں۔

۲:　دوسری جماعت مشرکین کی ہے۔یہ دونوں لحاظ سے پہلی جماعت کا نقطہءمخالف ہے اور اس کے اندر اور باہر شرک کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔

۳:　تیسری جماعت منافقین کی ہے۔اس جماعت نے امانتِ الٰہی کے بارے میں نفاق کا راستہ اختیار کیا۔یہ لوگ بظاہر مومن اور بہ باطن مشرک وکافر ہیں۔

۴:انسان بطورِ ہدف آفرینش:

بطلیموس قصرِ خلقت کی تشریح میں زمین کو کئی دائروں کا مرکز قرار دیتا ہے۔اُس کا نظریہ یہ تھا کہ تمام نو کے نو افلاک زمین کے گرد گھومتے اور گردش کرتے ہیں جبکہ نئے نظریہ کے مطابق سورج اس نظام کا مرکز ہے اور زمین اس کا ایک سیارہ ہے جو سُورج کے گرد چکر لگا رہا ہے۔

بعض لوگوں نے بطلیموس کے نظریہ کو انسان کی انا کی پیداوار سمجھا ہے یعنی انسان نے چاہا ہے کہ اپنی زندگی کے محیط کو پورے عالم کے مرکز کے طور پر متعارف کروائے اور یہ ظاہر کرے کہ تمام سیارگان حیرت زدہ اور سرگردان ہو کر اس کے وجود کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بطلیموس کے نظریہ پر اس قسم کا اعتراض، استدلال کی بجائے طعن وطنز اور مذاق اڑانے کے مترادف ہے کیونکہ

---

[1] المیزان ج ۱۶ ص ۳۷۲

اگر اس کے نظریہ کی بنیاد انسان کی انا پرستی سمجھی جائے تو اس کے مقابلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ عالم کے بارے میں جدید نظریہ جس کی چار ماہرین فلکیات [۱] نے بنیاد رکھی ہے، اور جس میں زمین کو مرکزیت سے ہٹا دیا گیا ہے، انسان کی خود سے بیگانگی کا مظہر ہے اور جس میں زمین کو مرکزیت سے ہٹا دیا گیا ہے، انسان کی خود سے بیگانگی کا مظہر ہے۔ اور انسان نے اس نظریہ میں اس قدر کاوش کی ہے کہ اس نے نہیں چاہا کہ اپنی زندگی کو محورِ عالم کے طور پر متعارف کرائے۔

علمی اور فلسفیانہ مسائل کو بے معنی اور فضول باتوں میں نہیں ملانا چاہیے۔ نہ ہی حقائق عالم کے انکشاف کے سلسلہ میں ماہرین کی زحمتوں کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ خواہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کے نظریات فرسودہ اور کہنہ ہی ہو جائیں کیونکہ ان باطل اور بے بنیاد نظریات نے ہی آج کے انسان کی موجودہ زمانہ کے مسلّمہ حقائق کی طرف رہبری کی ہے۔ اگر وہ غلطیاں اور اشتباہات نہ ہوتے تو انسان کا ہاتھ موجودہ تمدن تک نہ پہنچتا نہ ہی عالم کے بارے میں وسیع علم و آگہی حاصل ہو سکتی۔

ہم کہیں مقصد سے دُور نہ ہو جائیں۔ اگر قرآن نے انسان کی قدر و منزلت بیان کرتے ہوئے اُسے ہدفِ آفرینش قرار دیا ہے تو یہ اس منطق کی بناء پر ہے جس کی طرف اس بحث میں اشارہ ہوا ہے۔ قرآنی تعارف میں 'انا' کا مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ قرآن انسان اور اس کے میلانات سے بالاتر مقام پر مسئلہ خلقت کی تحقیق پیش کرتا ہے، جہاں وحی کی نظر میں انسان کی منفعت اور 'انا' کا مسئلہ ہرگز سامنے نہیں آتا، نہ ہی اس بیان میں خطا و لغزش ممکن ہے، ہم اس اصل کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہدفِ خلقت کے بارے میں قرآن کا فیصلہ سنتے ہیں۔

قصرِ آفرینش بے مقصد نہیں ہے

اس میں شک نہیں کہ خلقت کا یہ محل کسی مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے منزہ و پاک ہے کہ وہ مقصد کے بغیر کوئی کام انجام دے۔ قرآن خلقتِ عالم کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ فرماتا ہے۔

مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (روم: ۸)

''سارے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے حق سے توام ہیں [۲] یعنی ان کی کوئی غرض و غایت

---

[۱] ہیئت جدید کی چار ماہرین نے بنیاد رکھی ہے جو حسب ذیل ہیں۔

۱: کپر نیگ لہسانی۔ سور کی مرکزیت پر بنیاد رکھنے والا

۲: کپلر منجم المانی۔ سیاروں کے بیضوی مدار کا معلوم کرنے والا

۳: گلیلیو ایتالیائی۔ کہکشاں کی صورت میں ستاروں کے انبوہ کا داعی

۴: نیوٹن: جاذبہ مجموعی اور مرکز سے گریز کے نظریہ کا موجد

[۲] بالحق میں 'با' مصاحبت کے لیے ہے

حقیقی ہے جو ان کے مقصد کو ظاہر کرتی ہے۔

قرآن ان لوگوں کی تعریف کرتا ہے۔ جو صفحہ آفرینش کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر یہ کہتے ہیں۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (آلِ عمران: ۱۹۱)

''خدا نے قصرِ آفرینش کو باطل، فضول اور بے مقصد پیدا نہیں کیا۔''

ان آیات میں غور کرتے ہوئے دیکھنا چاہیے کہ اس پورے جہان، زمین سے لے کر آسمان تک، انواع واقسام کے جانوروں، نباتات اور معاون کی خلقت کا اصل مقصد کیا ہے؟

انسان ہدفِ خلقت کا مظہر ہے

عالم طبعی اگر چہ مختلف اور گوناگوں انواع کی صُورت میں نمایاں ہے اور اِنسان اور انواع واقسام کے جانور نیز نباتات میں سے ہر ایک ایک مستقلِ نوع رکھتا ہے، تاہم عالم کی قوتوں کا زیادہ حصہ انہیں انواعِ حیات کی خدمت میں مصروف ہے۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ ان انواع میں سے ہر ایک نوع غرضِ خلقت اور ہدفِ آفرینش ہے۔ دوسرے لفظوں میں مادۂ عالم کے اجزاء کے درمیان ارتباط اور بعض کا بعض دوسروں سے فائدہ اٹھانے کا امکان یہ سمجھا تا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ عالم طبعی کا کوئی حصہ سارے آسمانوں اور زمین کی خلقت کا ہدف ہو اور ان میں سے برتر انواع، مثلاً نباتات وحیوانات وانسان ہر چیز کی نسبت عناصرِ عالم سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہوں۔ اسی بناء پر ان میں سے ہر ایک ہدفِ خلقت اور آفرینش کی علت نمائی ہوسکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ ان انواع میں سے ہر ایک قرآن کی نگاہ میں ادراک وشعور کا حامل ہے اور اپنے خالق کے سامنے آگہی کے ساتھ اپنا فرض انجام دے رہا ہے۔

لہٰذا جب ان انواع میں سے ہر ایک ہدف خلقت اور غرضِ آفرینش ہوسکتا ہے تو ان میں سے انسانِ کامل ترین اور استوار ترین ہستی ہے جو اس عالم میں وجود میں آیا ہے۔ پس اگر علم وعمل کے لحاظ سے بہترین طریقہ سے اس کی پرورش ہوجائے تو وہ اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ سکتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انسان کو خلقت کا ہدف برتر اور غایت اصلی شمار کیا جائے۔ اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اگر چہ قصرِ آفرینش کے بہت سے اہداف وغایات ہیں لیکن خلقتِ عالم کا بلندترین ہدف انسان کی تربیت ہے اور اس سلسلہ میں قرآن فرماتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ (هود: ۷)

''وہی ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن (ادوار) میں پیدا کیا۔ سب سے پہلے اس کی فرمانروائی پانی پر تھی (اس نے یہ کام اس لیے کیا) تاکہ وہ یہ آزمائے کہ تم میں سے کون نیکوکار ہے۔''

علم کلام کے مباحث میں واضح طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ انسان کو آزمانے سے خدا کا مقصد خود علم وآگہی حاصل کرنا نہیں، کیونکہ کوئی چیز اس پر مخفی نہیں ہے۔ بلکہ آزمائش کا مقصد ان کمالات کا ظہور ہے جو انواع یا افراد کے اندر مخفی ہیں۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا نے عالم خلقت کو اس لیے قائم کیا ہے کہ نوعِ انسانی میں نیکو کارترین فرد عالم میں استقرار پاتے۔ یہ وہی بات ہے جس کو علم کلام کی کتابوں میں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔ اس عالم کو انسانِ کامل کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اور حدیثِ قدسی میں یوں وارد ہوا ہے۔

لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ (حدیث قدسی)

''اے پیغمبر! اگر تیرا وجود نہ ہوتا تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا۔''

''لہٰذا اس سے بڑھ کر انسان کی اور کیا قدر و منزلت ہوگی کہ اسے غرضِ خلقت اور ہدفِ آفرینش قرار دیا جائے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو کمال کی چوٹی سے پلیدگیوں اور برائیوں کی پستی کی طرف نہ گرادے۔

۵: انسان کے لیے تسخیر جہاں

قرآن میں انسان کا ہدفِ آفرینش ہونا ایک اور طرح سے بھی پیش کیا گیا ہے جو گذشتہ بیان سے بالکل مختلف ہے۔ قبل ازیں ہم ہدفِ خلقت متعین کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ عالمِ خلقت کے خواہ بہت سے اہداف ہوں لیکن ان متعدد اہداف میں انسان بلند و بالا ترین ہدف کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

لیکن اب ہم ہدف تخلیق کا تعین نہیں کر رہے، ہدف خواہ کچھ بھی ہو سر دست ہمارے سامنے نہیں بلکہ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ خلقتِ عالم کچھ اس طرح سے ہے کہ عالم کو نوعِ بشر کے نفع اور فائدہ کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے اور انسان اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے یہ حقیقت قرآن میں متعدد سورتوں میں بیان ہوئی ہے۔ جن میں سے ہم بعض کا ذکر کرتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ (لقمان:۲۰)

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ خدا نے ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، تمہارے نفع اور فائدے کے لیے مسخر کر دیا ہے اور اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو تمہارے لیے پورا کر دیا ہے۔'' ایک اور آیت میں فرماتا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ (جاثیہ:۱۳)

''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے اور سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔''

قرآن متعدد آیات میں سورج، چاند، دن، رات چشموں اور سمندروں کی تسخیر کے بارے میں بات کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اس

مقام اور حیثیت کی وجہ سے، جو انسان کو حاصل ہے، یہ عظیم موجودات انسان کے نفع او فائدہ کے لیے تسخیر ہوئے ہیں اور سب انسان ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿٣٣﴾

(ابراھیم :۳۳)

''سورج اور چاند جو ہمیشہ اپنے فرض کی ادائیگی میں مصروف رہتے ہیں اور رات اور دن کو انسان کے فائدے اور نفع کے لیے (ہم نے) مسخر کر دیا ہے۔''

اس میں کوئی غلط فہمی نہ ہونا چاہیے۔انہیں مسخر کرنے والا بشر نہیں ہے، بلکہ ان کا تسخیر کرنے والا خُدا ہے۔عام طبیعی تسخیر ہونے والا عالم ہے اور انسان اس تسخیر سے فائدہ اُٹھانے والی ہستی ہے۔

مادی و معنوی قدر و منزلت

اِسلام میں انسان کی دو طرح قدر و منزلت رکھی گئی ہے، ایک معنوی اور روحانی لحاظ سے اور دوسری مادی اور طبیعی لحاظ سے پہلی قدر و منزلت کے بارے میں کئی باتیں ہو چکی ہیں، جن میں سے بعض کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک انسان کا قتل تمام انسانوں کے قتل کے برابر ہے جبکہ ایک انسان کے زندہ کرنے کو تمام افراد بشر کے زندہ کرنے کے مساوی کہا گیا ہے جیسا کہ اس آیت میں فرماتا ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ط (مائدہ :۳۲)

''جو کسی انسان کو (بغیر کسی وجہ کے) نہ تو قصاص کے طور پر اور نہ ہی روئے زمین میں فساد کرنے کی بناء پر قتل کر دے تو کیا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا ہے۔اور اگر کوئی شخص کسی ایک انسان کو زندہ کرے (یعنی اُسے موت سے نجات دلائے) تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زِندہ کیا ہے۔''

کیا اس قسم کی قدر و منزلت قرار دینا۔انسان کی قدر افزائی میں مبالغہ ہے یا یہ عین حقیقت ہے؟

ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا کہ وحی الٰہی اپنی جہاں بینی میں غلط بیانی سے کام لے اور کسی موجود کی قدر و منزلت کو بلا وجہ بڑھا دے۔

اس بلند بالا قدر و منزلت کا راز یہ ہے کہ جو شخص کسی بے گناہ انسان کو کسی بھی وجہ سے قتل کر دے وہ اس بات کے لیے بھی آمادہ و تیار ہوگا کہ وہ اسی بہانہ سے تمام بے گناہ انسانوں کو قتل کر دے، کیونکہ اس کے لیے کسی خاص شخص کا قتل کرنا مقصود نہیں ہوگا۔اس کی نظر میں کسی بے گناہ شخص اور کسی گناہ گار شخص کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوگا۔لہٰذا وہ لازماً اسی بہانہ کی بناء پر تمام بے گناہ انسانون کو قتل کرنے کے لیے آمادہ و تیار

ہوگا۔لہٰذا قرآن اس کے بارے میں فرماتا ہے۔

فَكَاَنَّمَآ قتل النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ

''یعنی یہ تمام انسانوں کے قتل کے برابر ہے۔''

فرض کیجئے ایک شخص کسی گھر میں داخل ہوجاتا ہے اوراس بے گناہ گھرانے کا قتلِ عام کرنا چاہتا ہے۔لیکن وہ اس خاندان کے صرف ایک ہی فرد کو قتل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، جبکہ باقی لوگ بھاگ کر جان بچا لیتے ہیں۔اس شخص کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ:

اس خاندان میں سے ایک چھوٹے سے بچے کو بے گناہ قتل کرنا تمام خاندان کے لوگوں کو قتل کرنے کے برابر ہے کیونکہ اگر باقیماندہ افرادِ خاندان فرار نہ کرتے تو سب کا قتل ہوجانا قطعی ویقینی تھا۔

اس کے برعکس اگر کوئی شخص انسانی مہر ومحبت اور جذبہ کے تحت کسی کو موت سے نجات دلاتا ہے تو چونکہ اس کے سامنے مقصد انسانی مہر ومحبت کا جذبہ کارفرما ہے اوراس کے سامنے کوئی خاص شخص بھی نہیں ہے تو اس صورت میں تمام انسان اس کے لیے یکساں ہوں گے۔اس صورت میں یہ بالکل صحیح ہوگا کہ ہم ایک فرد کی نجات کو تمام انسانوں کی نجات قرار دیں۔

اس سے قطعِ نظر معاشرے کے تمام افراد ایک انسان کے اعضاء وجوارح کی طرح ہوتے ہیں۔اگر ایک عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو اس کا اثر کسی نہ کسی طرح دوسرے اعضاءِ جسم پر بھی ظاہر ہوتا ہے یہی ایک فرد کے ضائع ہونے کی صورت ہے کیونکہ ہر فرد اپنے وجود اپنے وجود کے اثر کی مناسبت سے معاشرے کے بنانے میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔لہٰذا اس کو معاشرے کے پیکر سے جدا کرنا معاشرے پر اسی طرح اثر انداز ہوتا ہے اور یہی حال کسی فرد کے معاشرے میں واپس لوٹانے کا ہے۔

مادی قدرومنزلت

انسان کی مادی قدر افزائی یہی ہے کہ انسان کی جان ومال اور عزت وآبرو کو محترم شمار کیا گیا ہے۔اور قانونِ قصاص اور سالم انسان یا اس کے اعضاء کی دیات کے لیے قانون بنا کر انسان کے مقام کو بلند کیا گیا ہے اس طرح معاملہ دوسرے جانداروں سے الگ کردیا گیا ہے۔

فقہائے اسلام نے قصاص ودیات کی کتابوں میں احکام قصاص ودیات [1] کے بارے میں طویل گفتگو کی ہے جس کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔ہم ایک صورت کامل میں انسان کے لیے چار امنیتوں کے بارے میں اسلام کے عظیم پیشوا کی ایک حدیث کو نقل کرکے اپنی بحث کو ختم کرتے ہیں۔

---

[1] اسلامی دیات کے بارے میں سب سے زیادہ طویل ہدایات اس خط میں ہیں جو امیرالمومنینؑ نے اپنی فوج کے سالاروں کو لکھا تھا اور فقہاء کی زبان میں وہ ''ظریف بن ناصح'' کی روایت کے نام سے مشہور ہے مرحوم صدوق نے اُسے ''من لا يحضره الفقيه'' میں نقل کیا ہے۔اس کتاب کی چوتھی جلد کے حصہ دیات کی طرف رجوع فرمائیں۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا:

اِنَّ اللہَ حَرَّمَ مِنَ الْمُسْلِمِ دَمَہٗ وَمَالَہٗ وَعِرْضَہٗ وَاَنْ یَّظُنَّ بِہٖ ظَنَّ السَّوْءِ [1]

(حدیث رسولؐ)

''خدا نے مسلمان کے خون، مال اور آبرو پر تجاوز کرنے کو حرام قرار دیا ہے (بلکہ اس سے بھی زیادہ، اس بات کی بھی اجازت نہیں دی ہے کہ اس کے بارے میں بدگمانی کی جائے)

اس حدیث نے مسلمانوں کے لیے چار قسم کی امنیت کی ضمانت دی ہے۔اور اتنی بھی اجازت نہیں دی کہ محیط فکر اور دماغ کے پردوں کے اندر بھی کسی مسلمان پر حملہ کیا جائے۔ان چاروں امنیات کا وجود ایمان کے سائے میں انسان کے نشوونما پانے کے سوا ممکن نہیں ہے۔

[1] المحجة البیضاء ج۵ ص۲۶۷

(۲۲)

کیا اِنسان خیر و شر کا آمیزہ ہے؟

پہلی نظر میں انسان ایک ایسے وجود کی صورت میں جو خیر و شر یا مثبت و منفی سے مرکب ہو دکھلائی دیتا ہے اور آدمی یہ سوچتا ہے کہ انسان خیر و شر، اچھائی، برائی اور مثبت و منفی کا مرکب ہے۔ لہٰذا ان اقدارِ متضاد میں سے ہر ایک کسی نہ کسی مصلحت کی بناء پر، اس کی آفرینش میں استعمال ہوئی ہے۔

انسان کے بارے میں یہ بات ہمارے تجربہ اور ان آیات قرآنی سے ظاہر ہوتی ہے جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں اور جو اس کے عین مطابق ہے کیونکہ قرآن انسان کی آفرینش کے بیان میں اس کے وجود کے مثبت و منفی تضادات کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے یہ تصور واضح ہو جاتا ہے۔ کہ آفرینش انسان خیر و شر کا آمیزہ ہے۔

اس نظریہ کی وضاحت کے بارے میں ہم کہیں گے کہ انسان کی سرشت میں مختلف قسم کے محرکات موجود ہیں۔ اگر انسان کی خلقت آفرینش میں ''حق طلبی'' ''حقیقت دوستی'' عدالت خواہی اور نیک جوئی جیسے اوصاف شامل ہیں تو اس کے برعکس اس میں 'انا' منفعت خواہی، اور مقام طلبی، ثروت اندوزی، اور شہرت خواہی جیسی صفات پائی جاتی ہیں۔ ان دونوں متضاد قسم کے نظریات کو ہرگز ایک ہی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ لازمی طور پر ان تمام کششوں میں مثبت قسم کی روحِ ملکوتی سے قیام پائی ہے اور دوسری یعنی منفی قسم اس کے مادی و خاکی حیثیت سے۔

اسی لیے کہتے ہیں کہ انسان خیر و شر اور مثبت و منفی کا آمیزہ ہے۔

انسان کی آفرینش سے متعلق بعض آیات ظاہری طور پر اس قسم کا تجزیہ پیش کرتی ہیں۔ کیونکہ قرآن اس سلسلہ میں انسان کے قوت وضعف کی جہات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور اس کی متضاد اور گونا گوں صفات کے ساتھ تعریف کرتا ہے۔

اب ہم اس کے وجود کے بارے میں متضاد صفات و نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱: انسان زمین پر خُدا کا خلیفہ ہے۔

اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً ؕ (بقرہ:۳۰)

۲: انسان عالمِ آفرینش کے حقائق سے آگاہ ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا (بقرہ:۳۱)

۳: انسان فرشتوں کا اُستاد ہے۔

قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ (بقرہ:۳۳)

۴: انسان مکرم و محترم ہے اور خشکیوں اور سمندروں پر مسلط ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (اسراء:۷۰)

۵: انسان کو خدا کی جانب سے تعلیم دی گئی ہے۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (علق:۵)

۶: انسان کو بہترین ترکیب سے خلق کیا گیا ہے۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (تین:۴)

۷: اس کی خلقت کو خدا شناسی کے ساتھ خمیر کیا گیا۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ (روم:۳۰)

یہ اور ان ہی جیسی دیگر آیات جو انسان کی خلقت اور اس کی اقدار مثبت کو بیان کرتی ہیں اس کی ملکوتی فطرت کی طرف ہماری رہبری کرتی ہیں اور اُسے خیر و نیکی کے مرکز کے طور پر متعارف کرواتی ہیں۔

ان آیات کے برعکس کچھ آیات ایسی ہیں انسان کی صفاتِ ضعف کو بیان کرتی ہیں۔

قرآن ذیل میں ذکر شدہ صفات کے ساتھ، جن میں سے ہر ایک اس کے وجود کے منفی پہلو کو ظاہر کرتی ہے۔ انسان کا تعارف کراتا ہے۔

۱: انسان عجلت پسند اور جلد باز ہستی ہے۔

وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝ (اسراء:۱۱)

اور دوسری آیت میں فرماتا ہے۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۭ (انبیاء:۳۷)

۲: اِنسان لڑنے جھگڑنے والا ہے۔

وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝ (کھف:۵۴)

۳: انسان ہلوع، جزوع، منوع، کا مرقع ہے اور تینوں صفات نے اسے خلاصہء حرصِ شدید بنا دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ

مَنُوۡعًا ﴿۲۱﴾

(معارج :۱۹:۲۱)

قرآن پہلی آیت میں صفتِ 'ہلوع سے انسان کی تعریف کرتا ہے، پھر بعد والی آیات میں کہتا ہے کہ اگر اُسے کوئی نقصان پہنچ جائے تو دادو فریاد بلند کرنے لگتا ہے۔ پھر اگر اسے کوئی منفعت پہنچ جائے تو اسے دُوسروں سے روکنے لگتا ہے۔

ایک اور آیت میں قرآن انسان کی 'قتوز' کے لفظ سے تعریف کرتا ہے جو معنی کے اعتبار سے گذشتہ صفت کے ساتھ ہم آہنگ ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ قَتُوۡرًا ﴿۱۰۰﴾ (اسراء:۱۰۰)

اور اگر ان چاروں صفات یعنی ''ہلوع، جزوع، منوع اور قتور کو جمع کردیں تو یہ بات انسان کی خودغرضی اور دنیا ولذائذ دنیا میں اس کی شدید حرص وطمع کو ثابت کرے گی۔

۴: انسان کفور و کنود کا مجموعہ ہے اور یہ دونوں الفاظ اس کی حق ناشناسی اور ناسپاسی کی مظہر ہیں جب اُسے نعمت ملتی ہے تو وہ اپنے منعم کو بھول جاتا اور سرکش ہوجاتا ہے۔ پھر جب اس کے بُرے اعمال کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے وہ نعمت نکل جاتی ہے تو دادو فریاد بلند کرنے لگتا ہے گویا کہ وہ قرضخواہ کے طور پر اپنا قرض واپس مانگ رہا ہو۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنَّا رَحۡمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ فَاِنَّ الۡاِنۡسَانَ كَفُوۡرٌ ﴿۴۸﴾ (شوریٰ:۴۸)

''جب ہم نے انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھایا تو وہ خوش ہوگیا، اور جب اُس کے گذشتہ اعمال کیوجہ سے اُسے کوئی برائی پہنچتی ہے (تو ناگواریوں کو تو شمار کرتا ہے اور نعمتوں کا انکار کرتا ہے) کیونکہ انسان ناشکرا ہے۔''

ایک اور آیت میں فرماتا ہے۔

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوۡدٌ ۚ﴿۶﴾ (عادیات:۶)

''انسان اپنے پروردگار کا بہت ہی ناشکرا ہے۔''

۵: انسان نعمت کے چھن جانے سے مایوس اور ناامید ہوجاتا ہے اور قرآن کے الفاظ میں یؤس وقنوط ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے۔

وَاِنۡ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـئُوۡسٌ قَنُوۡطٌ ﴿۴۹﴾ (حٰم سجدہ:۴۹)

جب اسے کوئی برائی پہنچتی ہے، تو وہ مایوس اور ناشکرا ہو جاتا ہے۔[1]

۶: انسانؑ جو ظلوم کفار، یا ظلوم جہول ہے اور ان سب کا مطلب انسان کا خود اپنے اوپر یا دوسروں پر ظلم کرنا اور جہانِ آفرینش میں اپنے مقام اور حیثیت سے بے خبر ہونا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ (احزاب: ۷۲)

''پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝ (ابراھیم: ۳۴)

۷: انسان حصولِ نعمت پر خوش ہوتا اور فخر کرتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:۔

اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ (ھود: ۱۰)

۸: انسان مال و دولت کے ساتھ شدید لگاؤ اور محبت اور ان کے لیے خاص قسم کی کشش رکھتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝ (عادیات: ۸)

یہ بھی ارشاد ہوتا ہے۔

وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ (فجر: ۲۰)

''(انسان) مال و دولت کے ساتھ بڑی شدت سے محبت رکھتے ہیں۔''

یہ آیات ظاہری طور پر انسان کے تضاداتِ وجودی کو بیان کر رہی ہیں، نیز یہ کہ خلقت و آفرینش انسان میں خیر و شر، نیکی و بدی اور مثبت و منفی اقدار سے کام لیا گیا ہے جس سے خیر و شر کا آمیزہ ثابت ہوتا ہے۔

تضاداتِ بالا کے بارے میں ایک اور نظریہ

جیسا کہ ہم نے بحث کے آغاز میں عرض کیا ہے، تجربہ اور آزمائش اور کچھ آیات اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں، لیکن ایک اور نظریہ بھی ہے جو نظریہ اوّل سے زیادہ عمیق ہے اور ظاہراً آیات بھی اس کے عین مطابق ہیں۔ وہ یہ ہے کہ انسان کی خلقت میں موجود سب کی سب کششیں خیر پر مبنی اور مثبت و فائدہ مند تھیں۔ حتیٰ کہ اس کے وجود میں شر کا کوئی شائبہ موجود نہیں۔ اگر ان اقدار میں سے ایک بھی اس کے وجود سے الگ ہو جائے اور اس کی زندگی سے نکل جائے تو اس کی زندگی میں خلل واقع ہو جائے اور انسانیت خطرے میں پڑ جائے۔

وہ انسان جس کی خلقت کے بارے میں اللہ تعالیٰ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ (مومنون: ۱۴) کے جملہ سے اپنی قدرتِ

---

[1] اس سلسلہ میں بالترتیب سورہ ھود، اسراء اور روم کی آیت ۹، ۸۳ اور ۳۶ کی طرف رجوع فرمائیں۔

تخلیق کی توصیف فرماتا ہے خیر وشر اور نیکی و بدی کا آمیزہ نہیں ہوسکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض اقدار، دودھاری تلوار کی مانند یا دورُخ والے سکہ کی مثل ہیں۔ اگر ان کی صحیح رہبری نہ ہو عقل وخرد کی مہار سے ان کی رہنمائی نہ کی جائے تو یہی اقدار انسان کی تباہی کا سبب بن سکتے ہیں وہ سب باتیں جنہیں منفی الجاد وجہات کا نام دیا جاتا ہے اور جو شر و بدی کے مظاہر سمجھی جاتیں جنہیں منفی العباد وجہات کا نام دیا جاتا ہے اور جو شر و بدی کے مظاہر سمجھی جاتی ہیں، سب کی سب اس رہبری اقدار کے فقدان اور اعتدال سے انحراف کا نتیجہ ہوتی ہیں جن سے انسان کی زندگی اور بقاء وابستہ ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ تصورّ اس نظریہ سے بالکل علیحدہ ہے کہ ہم خلقتِ انسان کو خیر وشر اور نیکی و بدی کا آمیزہ قرار دیں۔

ان منفی اور مبنی بر شر اقدار سے اور غور وخوض سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی سرشت میں اس قسم کے العباد وجہات بنیادی طور پر ہرگز موجود نہ تھے بلکہ بعد میں جو اقدار منفی یا شر کے نام سے موسوم ہوئیں۔ وہ سب انسانی وجود کی ضروری اقدار کا ایک غیر تربیت یافتہ سلسلہ ہے جو صحیح رہبری کے فقدان کے باعثِ اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

مثلاً ''حرص اور لالچ انسان میں حُبِ ذات، یا نفسانی کیفیات کی طغیان یافتہ صورتیں ہیں جو اعتدال کے فقدان کی وجہ سے حرص ولالچ کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔

''لڑائی جھگڑے'' کی کیفیت انسان کی جستجو کی حِس کی ایک شاخ ہے۔ البتہ حقیقت یہ کہ اس حس کے واردِ عمل، دیگر موارد میں کشفِ حقیقت اور واقعیت کو معلوم کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، لیکن جہاں جدال پر اتر آئے تو یہ حسِ غلط راستہ اختیار کرلیتی ہے۔ اور انسان میں جھگڑنے کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ انسان کی دیگر منفی اقدار کا بھی یہی حال ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ منفی اقدار انسان کی سرشت میں ازل سے موجود نہیں تھے۔ بلکہ بعض انسانی اقدار کی سرکشی کی حالتیں ہیں یہ ہے کہ قرآن جب انسان کی منفی اقدار کو بیان کرتا ہے۔ تو اس کے فوراً بعد، صبر کرنے والے لوگوں کو جنہوں نے صالح اور نیک عمل انجام دیئے ہوئے ہیں۔ مستثنٰی قرار دیتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔

اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾ (ھود:۱۱،۱۰)

''انسان نعمت کے ملنے پر خوش ہوجاتا ہے اور فخر کرنے لگتا ہے مگر جن لوگوں نے صبر واستقامت سے کام لیا اور نیک اعمال انجام دیئے۔ ان کے لیے بخشش اور اجرِ عظیم ہے۔''

دوسری آیت میں فرماتا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾ (والعصر:۳،۲)

''انسان سراسر گھاٹے میں ہے، مگر ایمان لانے والے لوگ، جن کے اعمال اچھے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو حق واستقامت کی نصیحت اور دعوت دیتے ہیں۔''

یہ استثناء اس بات کا ثبوت ہے کہ شر اور بُرائیاں اور اصطلاح کے مطابق منفی اقدار انسان میں اول سے موجود نہیں تھے، کیونکہ تمام انسانوں کی خلقت وآفرینش یکساں تھی۔ اس سلسلہ میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے بلکہ اس قسم کے حالات خدا پر ایمان نہ رکھنے والے افراد کے اعمال سرکشی کے معلول ہیں۔ لیکن ایمان لانے والے لوگ، جو محرمات کے مقابلہ میں استقامت اور خود پر ضبط رکھتے ہیں۔ (الا الذین امنوا۔۔۔وتواصوابالصبر) اس قسم کی سرکشی سے بچے رہتے ہیں۔ اوران کی اقدار بھلائی اور تکمیل وارتقاء کردار کے کام آتی ہیں۔

دوسرے الفاظ میں جو انسان مکتب وحی اور انبیاء کی حیات بخش تعلیمات سے انحراف کرتا ہے، اس کی فطرتِ اندرونی اُسے معاند، ہٹ دھرم، ظالم، حریص اور لالچی بنا دیتی ہے لیکن جب اس کی رُوح مکتب وحی سے ہدایت ورہنمائی حاصل کرتی ہے اور اس میں خدا ترسی کی حالت پیدا ہوجاتی ہے۔ تو یہی اقدارِ فطرت دوسری شکل اختیار کر لیتے ہیں اور سب کے سب اس شخص کی تکمیل وارتقاء کردار میں کام آنے والے عناصر بن جاتے ہیں۔

غرائز کی سرکشی کا سبب

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر اقدارِ اصلی انسان کی حیات کی بقاء کا سبب ہیں تو پھر اس کے بگڑنے، سرکشی کرنے یا انحطاط کا فلسفہ کیا ہے؟ اور ہماری خلقت وآفرینش اس قسم کی حالت کے ساتھ توأم کیوں ہے؟ دوسرے لفظوں میں انسان اس طرح کیوں خلق کیا گیا ہے کہ وہ فطرت کے کاموں میں رکاوٹ ڈال سکے یا اس کے کاموں میں افراط پیدا کردے لہٰذا انسان کی آفرینش اور خلقت میں اس کیفیت کا فلسفہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ یہ کیفیت دراصل انسان کے تکامل وارتقاء اور نشوونما کا مقدمہ ہے اگر انسان کی فطرت میں اس پر اختیار وآزادی موجود نہ ہوتی، تو وہ روح وجسم کے لحاظ سے ہرگز تکمیل وارتکاء کی راہ میں آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ ہی وہ موجود ملکوتی بن سکتا ہے۔

انسان کی تکمیل وارتقاء کی منازلِ آخر تک پہنچ سکتا ہے جو اپنے اصل وجود کی حفاظت کے لیے اپنے (حبّ ذات) کی مدد سے (وہ بھی اہداف کے ایک سلسلہ کی بنا پر) فائدہ اٹھائے۔ نہ یہ کہ وہ مال ودولت کا اسیر ہو کر رہ جائے اور ثروت ولذت کے دیگر مظاہر کا حریص بن جائے۔

تکمیل کی ارتقاء کی چوٹی پر وہی انسان پہنچ سکتا ہے جو علم کی حسِ سے کشفِ حقیقت کے لیے فائدہ اُٹھا سکے۔ یہ نہیں کہ اسی علم کو شیطنت کا ذریعہ بنا کر مسلمہ حقائق کا انکار کردے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تکامل وارتقاء کا مفہوم اسی انسان پر صادق آتا ہے جو دوراہے پر پہنچ کر اپنی اقدار کے راستے کو بدل کر انہیں ہدف اور مقصد پر لگا سکے۔ یہی وہ عمل ہے جس سے تکمیل وارتقائے انسانیت حاصل ہوتی ہے لیکن جس کا ہاتھ اقدار وخواہشات پر قابو پانے اور انہیں بامقصد، بنانے میں کمزور واقع ہوگا وہ قافلہ، تکامُل سے پیچھے رہ جائے گا اور کبھی بھی اس تک نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان میں خواہشات واقدار اوران کے اعتدال کا مسئلہ سمجھ میں آتا ہے ان دونوں کو یہاں پر اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

(۲۳)

خواہشات و اِقدارِ مُختلفہ اور اِعتدال اِقدار

انسان کومختلف استعدادوں اور گونا گوں قوتوں کا حامل بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔اس کی فطرت میں مثبت ومنفی قوت ہائے جاذبہ اور فضائل ورذائل دونوں کے خواص ومقدمات موجود ہیں اِنسان ان میں ہر ایک صفتِ قوت کے مرحلہ سے فعلیت کے مرحلہ تک پہنچ سکتا ہے۔ انسان کوقوتِ انتخاب، دوراندیشی اور فطرت سازی سے نوازا گیا ہے۔لہٰذا یہ استعداد رکھتا ہے کہ اپنے مدارِ زندگی کو دونوں طرح قوتِ جاذبہ میں جس کے چاہے سپرد کردے۔

اگر انسان میں فطرتاً جنسی امور کی طرف رغبت رکھی گئی ہے،تو اس کے برعکس عفت وحیاء بھی بنیادی طور پر اس کے وجود میں موجود ہے۔ان دونوں جبلی قوتوں میں کسی ایک کا بھی بلا قید وشرط اور اعتدال ورہبری کے معرضِ عمل میں آنا عمروزندگی کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں انسان عقل وخرد کے سائے میں جو اس کے عرصہ حیات کے لیے چراغِ روشن کی حیثیت رکھتی ہے،حُریت وآزادی کے احساس کے زیر اثر جو ایک لگام کا درجہ رکھتی ہے اپنی جبلی قوتوں کو جو زندگی میں تحرک کی ذمہ دار ہیں۔صحیح مقامِ اعتدال پر رکھتے ہوئے ان دونوں قوتوں سے مکمل فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اس طرح عمل کرسکتا ہے جس کے نتیجہ میں اپنی سعادت پر زد نہ پڑنے دے۔

انسان کے وجود میں مال ودولت جمع کرنے کا شوق مناسب حد تک موجود ہے اس کے ساتھ ہی استقامت وعزتِ نفس بھی ایک جذبہ کی صورت میں اس کے وجود میں شامل ہے۔ان دونوں جبلتوں میں کسی ایک کا بلا قید وشرط استعمال انسان کے رشد وتکامل میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔دوسری طرف صحیح رہنمائی سے اعتدال کے ساتھ ان سے فائدہ اٹھانا انسان کی سعادت کا ضامن ہے۔

یہ کام عقل وخرد کی تشخیص کے سائے اور ذاتی حریت وآزادی کی رہنمائی کے بغیر،صورت پذیر نہیں ہوسکتا۔ان دونوں قوتوں کے موارد کو پیش کرنے اور ان کی تشریح سے، دیگر قوتوں کا مقام بھی واضح ہوجاتا ہے۔اور زندگی کی راہ میں حُریت وآزادی کی قدر ومنزلت اور انسان کی قوتِ انتخاب کے نقش کا اثر کامل طور پر ظاہر ہوجاتا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ مخصوص مواقع پر ان جبلی قوتوں سے فائدہ اٹھانا انسان کی زندگی میں رشد اور اس کی انفرادی اور اجتماعی حیات کی بقاء کا سبب ہے۔اگر یہ اصل قوت ختم ہوجائے یا اس سے مطلقاً فائدہ ہی نہ اٹھایا جائے تو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خلل واقع ہوجائے۔اس کی مثال اس طرح ہے کہ اگر جنسی میلان نہ ہو یا اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔تو نسلِ انسانی منقطع ہوجائے یا اگر کھانے کی طرف رغبت نہ ہو تو یا رغبت سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے تو بھوک انسان کو ختم کردے گی۔

مختصر یہ کہ: جبلی قوتوں کا فقدان یا ان کا تعقل، انسان کی نابودی کا سبب ہے جبکہ ان قوتوں سے سوچے سمجھے بغیر فائدہ اٹھانا بہت بڑی مصیبت اور انسان کی تباہی کا موجب ہوسکتا ہے۔لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان راہِ اعتدال ہی انسان اور انسانیت کی محافظ ہے یاد

رہے کہ زندگی میں اس راستہ کو پالینا اور پھر اس کو طے کرنا یہی انسان کی سب سے بڑی مشکل ہے۔

اہم ترین بات یہ ہے کہ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ جبلتِ اصلی کیا ہے اور معقول طریقہ سے اس سے کس طرح فائدہ اٹھانا ہوگا یہی اصلی مطلوب ہے کیونکہ اس کے برعکس جبلت کی سرکشی اور کسی ایک چند قوتوں کی بے لگامی، انسانیت کے سقوط اور بیدادگری کا سبب بن جاتی ہے۔

شرائع آسمانی، خصوصاً اسلامی شریعت کے اہداف، انسان کی تمام جبلی قوتوں اور ان سب سے صحیح فائدہ اٹھانے کی کیفیت کو مقدس سمجھا جاتا ہے سوائے اس کے کہ انہیں سرکشی سے روکنا اور عقل وخرد کے ذریعہ انہیں اعتدال پر رکھنا اور ان کی رہبری کرنا لازم ہے تا کہ زندگی کی لگام کو اندرونی میلانات کے ہاتھ میں دے کر انسان جبلت کا محکوم نہ بن جائے بلکہ یہ چاہیے کو عقل ان سب کو انسان کی سعادت کی خدمت میں استعمال کرے اور ہر ایک سے مصلحت وسعادت کی حدود میں فائدہ اٹھائے۔

قرآن میں آیات کے دو مجموعے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک وہ ہے جو میلانات کے ایک سلسلہ کی اصلیت کی تصدیق کرتا ہے اور ایک ایسی پکار قرار دیتا ہے جسے انسان اپنے اندر سے سنتا ہے اور جواب دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رکھتا۔

اس مجموعہ آیات کے بالمقابل آیات کا ایک اور مجموعہ ملتا ہے جو افراط وتفریط افزائش طلبی اور اندرونی میلانات سے بلا قید وشرط فائدہ اٹھانے کو، خسارے اور نقصان کا سبب جانتا ہے اور شدت کے ساتھ ان سے منع کرتا ہے۔

ہم یہاں پر دونوں طرح کی آیات کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

الف: جبلت سے فائدہ اٹھانے کی دعوت

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ (آلِ عمران: ۱۴)

”لوگوں کے لیے عورتوں اور بیٹوں سے محبت، سونے اور چاندی کے اموال (نشاندار) ممتاز سے لگاؤ کو گھوڑوں، چوپاؤں اور زراعت سے لگاؤ کو زینت دے دی گئی ہے کہ یہ چیزیں دنیاوی زندگی کا سرمایہ ہیں، اور نیک انجام تو خدا ہی کے پاس ہے۔“

لفظ زین جو صیغہ مجہول کی صورت میں آیا ہے اور ”زینت دے دی گئی ہے“ کے معنی میں ہے اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ میلانات انسان کے اندر سے پھوٹتے ہیں اور کسی خارجی عامل نے انہیں نفسِ انسانی کی لوح پر نقش نہیں کیا۔ اس آیت سے قطع نظر ہے۔ خصوصاً بیوی بچوں کی محبت، انسان کی قوی ترین مظہر ہے جو بہت سے حوادث کا باعث رہا ہے۔

آیت میں ان چھ امور کو پست ترین دنیوی اثاثہ کہا گیا ہے۔ اور خدا کے یہاں حیاتِ اُخروی کو نیک انجام جانا گیا ہے لہٰذا یہ بات اس

امر کو ظاہر کرتی ہے کہ انسان کو اس قسم کے امور سے وسیلہ اور ذریعہ کی حد تک ہی فائدہ اٹھانا چاہیے اور انہیں ہرگز زندگی کا ہدف قرار نہ دینا چاہیے۔

یہ ہی وہ اعتدال جبلت ہے جو ہماری دوسری بحث کا موضوع ہے۔

۲۔ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴿۸﴾ (عدیات:۸)

''وہ مالِ دنیا سے شدید محبت اور لگاؤ رکھتا ہے''

۳۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾ (معارج)

''انسان حریص اور بے صبر پیدا ہوا اگر اسے برائی پہنچتی ہے تو بے صبر ہو جاتا ہے اور اگر اسے کچھ مال مِل جائے تو وہ دوسروں کو اس سے محروم کر دیتا ہے۔

یہ آیات اور ان سے ملتی دیگر آیتیں ان امور اور ان ہی جیسے دیگر امور کے جبلی ہونے کو واضح طور پر ثابت کرتی ہیں۔

ہم یہاں تک پہلے مجموعہ آیات سے کسی حد تک آشنا ہوتے ہیں۔ تمام متعلقہ آیات کو نقل کرنا ہماری بحث سے باہر ہے۔

اب موقعہ آن پہنچا ہے کہ دوسرے مجموعہ آیات سے آشنا ہوں۔ یہ وہ مجموعہ ہے جو بلا قید و شرط جبلت کے مطابق عمل کرنے کو روکتے ہوئے تعلیم دیتا ہے کہ لذائز جبلی کو ہرگز انسان کے لیے قبلہء خواہشات و کعبہ امید نہیں بننا چاہیے۔ اسی بنا پر اس مجموعہ آیات میں انسان کی کرامت، فضیلت اور حسِ عدل کو ہوا و ہوس سے نفسِ انسانی کو روکنے میں قرار دیا گیا ہے۔

ہم اس سلسلہ میں وارد شدہ چند آیات نقل کرتے ہیں۔

ب: لذائذ سے فائدہ اٹھانا ہی ہدف نہیں ہے

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ (نساء:۱۳۵)

''ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو تا کہ تم عادل رہو۔''

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (ص:۲۶)

''لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر، اور ہوا و ہوس کی پیروی نہ کر، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تجھے راہِ حق طے کرنے سے روک دے۔''

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝

(نازعات: ۴۰،۴۱)

جو شخص اپنے خُدا کے مقام سے ڈرے، اور اپنے آپ کو ہوا و ہوس سے روک لے۔ تو جنت اس کا ٹھکانہ ہے۔‘‘

قرآن مجید میں بہت سی ایسی آیات وارد ہوئی ہیں جو خواہشات کی سرکشی اور ان کے اعتدال میں نہ رہنے کی شدت کے ساتھ مذمت کرتی ہیں یہ آیات انسان سے مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ اعلیٰ میلانات و بلند رجانات کی پرزوش وتربیت کر کے پست درجہ خواہشات کی مشکل کو حل کرے۔ مثلا انسان کو چاہیے کہ اجتماعی مقام وحیثیت کو خود غرضی اور ذاتی افتخار کے بجائے عدل وداد پھیلانے اور ظلم وستم دُور کرنے کے لیے حاصل کرے۔

قرآن ایک انتہائی مختصر مگر پُرمغز آیت میں رستگاری اور نجات کو اس شخص کے لیے قرار دیتا ہے جو نفس کی سرکشی سے امان میں ہو، جہاں فرماتا ہے۔

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (حشر: ۹)

مختصر یہ کہ اسلام کا مطلوب اور مورد نظر ہے اندرونی میلانات سے فائدہ اٹھانا ہے۔

اس لیے اسلام رہبانیت کو بدعت قرار دیتا ہے جو کلیسا کی اختراع ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (حدید: ۲۷)

’’لذائز دنیوی کو ترک کرنا ایسی بدعت ہے جسے ہرگز جائز قرار نہیں دیا گیا ہے۔‘

رسول اکرمؐ نے امتِ اسلامی کو لَارَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ۔ کے جملہ کے ذریعہ اپنی شریعت کے اہداف کی طرف متوجہ فرمایا۔ آپؐ نے عثمان بن مظعون کی جو راتیں عبادت اور دن روزے سے گذارتے تھے اور بیوی واولاد کو چھوڑ چکے تھے سختی کے ساتھ مذمت کی ہے۔ [1]

یا یں ہمہ آپؐ نے لذائز دنیوی سے فائدہ اٹھانے کے لیے انسان کو قیود وحدود اور شرائط کا قائل کیا ہے۔ نیز غصہ وشہوت کی سرکشی کو انسان کی تباہی کا سبب بتلایا ہے۔ جہاں فرمایا ہے:۔

اَعْدٰى عُدُوِّ الْاِنْسَانِ غَضَبُهٗ وَشَهْوَتُهٗ

[1] اسدالغابہ ج ۵ ص ۶۰۴

''انسان کے سخت ترین دشمن اس کا غضب اور اس کی شہوت ہیں۔''

تاہم یہ دونوں جبلتیں انسان کی زندگی کا سرمایہ ہیں لیکن ان کی بے اعتدالی اس زندگی کے فساد اور تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔

فطرت انسانی سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں اِسلام کے نظریہ کو ذیل میں ذکر شدہ دو آیات بیان کرتی ہیں، ارشاد ہوتا ہے:۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ (نور:۳۷)

''ایسے لوگ جنہیں تجارت اور خرید و فروخت یادِ خدا سے نہیں روکتی اور نہ مشغول کرتی ہیں۔''

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ

(منافقون:۹)

''اے ایمان والو! تمہیں مال و اولاد خدا کے ذکر سے غافل نہ کر دیں۔''

ان دونوں آیات میں، تجارت اور خرید و فروخت سے یا مال و اولاد سے محبت کرنے سے منع نہیں کیا گیا، کیونکہ اس قسم کی رکاوٹ سنتِ خلقت اور قانونِ آفرینش کے خلاف ہے۔ جس چیز سے روکا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ کہیں یہ مصروفیات یادِ خدا اور خدائی وظائف و احکام میں مانع نہ ہو جائیں اور انسان خواہشات ہی کا محکوم بن کر قعرِ مذلت میں نہ گر جائے۔

اب جب کہ بات یہاں تک پہنچ گئی تو آیئے خواہشات نفسانی کے سلسلہ میں اسلام کے نظریہ کو کسی قدر تفصیل سے بیان کریں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام انسان کی خواہشات کو بے قید و شرط پورا کرنے کا داعی ہے اور ان کی سیر کرنے کے لیے کسی رکاوٹ یا مانع کا قائل نہیں ہے؟

کیا اسلام رہبانیت کا طرفدار اور انسانی خواہشات کی مکمل سرکوبی کا حامی ہے؟

کیا اسلام بعض خواہشات کو تسلیم کرنے اور بعض کو ختم کرنے کا حامی ہے؟

آیا وہ روایات جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ ان تینوں نظریات کو وضاحت کے ساتھ رد کرتی ہیں اور ایک چوتھی راہ کو جو ایک طرح انسان کی فطرت اور آفرینش کے مطابق ہے پیش کرتی ہیں۔ لہٰذا ہم ان جبلتوں کے سلسلہ میں اِسلام کے نظریہ واقعی کو چند حصوں میں بیان کرتے ہیں۔

۱: ہر جبلت انسان کے جسم و روح کے لیے ایک حاجت اور ضرورت کو پیدا کرتی ہے لہٰذا لازم ہے کہ انسان کی تمام حاجات اور ضروریات پر غور کیا جائے اور ان سب کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ میں کوئی استثناء نہ ہونا چاہیے۔

۲: ہر جبلت اپنے مقام اور دائرہ عمل میں، انسانی زندگی کی ایک اصل ہے۔ لہٰذا کسی ایک جبلت کے دائرہ عمل کو دوسری جبلت کی شکست کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ کیونکہ اس صورت میں محلِ سعادت چکنا چور ہو جائے گا اور انسان کی مادی اور معنوی زندگی میں خلل واقع ہوگا۔

کسی ایک اصل اور ایک جبلت کی طرف توجہ اور دیگر سرشتوں کی سرکوبی یا انہیں نظر انداز کرنا ایسا ہی ہوگا گویا ہم ایک محل تعمیر کرنے کے لیے صرف ایک ہی بنیاد اور ستون پر اکتفا کرلیں اور دوسری بنیادیں اور ستون تعمیر کرنے سے غافل ہوجائیں۔

۳: یہ سب جبلتیں انسان کی مادی اور معنوی زندگی میں بذاتِ خود مستقل اصل کا درجہ رکھتی ہیں۔لہٰذا ان میں سے بعض کو محور بنا کر اصطلاح کے مطابق، ایک کو بنیاد اور باقی کو اوپر کا حصہ قرار نہیں دینا چاہیے۔

۴: اسلام فرائڈازم کا جو جبلتِ جنسی کو انسان کی تمام جسمانی و روحانی فعالیت کا محور قرار دیتی ہے اور نیکوکار لوگوں کے افعال یہاں تک کہ بچہ کے ماں کے پستان چوسنے کو بھی عزیزہ جنسی کا آئینہ سمجھتا ہے بالکل مخالف ہے اسی طرح اِسلام مارکسزم کا بھی جو اقتصاد اور مالی واقتصادی ضروریات کو حاجات کو بنیاد بنا کر معاشرہ، تاریخ تحریکات قیام اور انقلابات کا ذمہ دار گردانتا ہے قطعی مخالف ہے۔

۵: اسلام نے اگر ان مفرط حضرات کی مخالفت کی ہے اور انسان ملکوتی کو ان کی فہم سے اس لیے کہیں بلند و بالا سمجھا ہے کہ اس کی حرکات اس کے جنسی میلانات یا اقتصادی ضروریات کے بہت بڑے حصہ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ترک دنیا کرکے ویران گوشوں میں زندگی گذارتے ہیں، برسرِ پیکار ہے اسلام ان لوگوں کو بھی جنہوں نے زہد کے مقدس لفظ سے جس کے بہت ہی بلند اور مطابق فطرت معنی ہیں غلط فائدہ اٹھا کر اپنی بہت سی خواہشات کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔مذمت کرتا ہے۔

۶: اسلام کو امورِ فطری کی رہبری کے الفاظ میں منحصر کیا جا سکتا ہے اِسلام تو امور فطری کی سرکشی کی حدود کے نہ پہچاننے کا خواہاں ہے نہ ہی ان کے استیصال کا حامی ہے بلکہ ہمیشہ انہیں اعتدال پر رکھنے اور ان کی صحیح رہنمائی کا داعی ہے اور وہ اس طرح کہ کسی ایک خواہش کا عمل دوسری خواہشات کو نقصان نہ پہچائے۔یعنی (پست وحیوانی) ''ملکی ضروریات کی طرف توجہ (برتر انسانی ضروریات) فطریاتِ ملکوتی کی طرف توجہ کرنے میں مانع نہ ہو۔

۷: انسان کا وجود مختلف جبلتوں سے مُرکب ہے جن میں بعض اس کے خاکی اور حیوانی وجُود سے متعلق ہیں۔مثلاً غصہ، شہوت، انا، حرص اور حب مال ومقام۔اسی طرح اس کی بعض دیگر جبلتیں اس کے ملکوتی اور انسانی وجود سے تعلق رکھتی ہیں۔مثلاً قربِ خدا اور رضا جوئی خدا کی طرف اس کے اندرونی میلانات، عدالت جیسی خوبیوں اور نیکیوں کی طرف اس کی کشش اور ظلم وستم سے اس کی بیزاری۔

۸: ہر قسم کی ضروریات فطری ذاتی وعادی ہوں یا ملکی وملکوتی ہوں، حیوانی وانسانی، انسان کی روح میں موجود ہوتی ہیں اور اس کی روح کے پہلوؤں میں کسی نہ کسی پہلو کو تشکیل دیتی ہے۔اس بناء پر انسان کی تربیت کے لیے صحیح ترین راہ خواہشات کو اعتدال پر رکھنا اور امورِ فطرت کی رہبری کرنا ہے اور وہ اس طرح کہ ان سب کو ہم آہنگ کرکے انسان کو تکمیل کے راستہ پر جس کے لیے وہ پیدا ہوا ہے چلائے اور اس کی مدد کرے۔

۹: یاد رکھیں کہ امورِ فطری کے مطابق عمل اور اندرونی خواہشات کا پورا کرنا ہی کوئی ہدفی پہلو نہیں رکھتا کیونکہ انسان صرف کھانے پینے سونے غصہ کرنے اور شہوات ہی کے لیے پیدا نہیں ہوا بلکہ انسان کی زندگی کا مقصد ان پر عمل کرنے اور ان کو معتدل رکھنے میں مضمر ہے۔لہٰذا

لازم ہے کہ ان سے ترقی کے زینہ اور وسائل کے حصول میں فائدہ اٹھایا جائے۔

۱۰: امور فطری کے بارے میں اسلام کے نقطہ ہائے نظر کی تشریح و تفصیل ان مختصر بیانات میں نہیں سا سکتی۔ تاہم نمونہ کے طور پر ان امور کے بارے میں ہم اسلام کی عناصرِ رہبری کی طرف، جو کلی طور پر یا خصوصی طور پر وارد ہوئی ہیں آپ کو متوجہ کرتے ہیں۔

ا: اسلام خدا کی رضا جوئی کو فطری کشش قرار دیتا ہے۔ آیاتِ قرآن اور اِسلامی احادیث میں اس بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے۔

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ

(روم: ۳۰)

(ہر طرف سے رُخ موڑ کر) خُدا کے دین کی طرف اپنا رُخ کرلو۔ یہ خدا کی (پیدا کردہ) فطرت ہے جس کی بنیاد پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔

رُسول اکرمؐ نے فرمایا:

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُّوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ [1]

ہر انسان خداشناسی کی فطرت لے کر دنیا میں آنکھ کھولتا ہے۔

اِسلام نے خداشناسی کی روح کو زندہ رکھنے کے لیے صرف دعوتِ فطری پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے واضح اور محکم بیانات کے ذریعہ یہ کوشش کی ہے خداخواہی کی سرشت کی صحیح سمت میں رہبری کرے۔ لہٰذا اِسلام خداشناسی کے بارے میں ذیل میں ذکر شدہ انحرافات سے مبارزہ کرتا ہے۔

الف: اسلام میں شرک اور دوگانگی کی مختلف طریقوں سے مذمت کی گئی ہے۔ خواہ شرک در ذات کی صورت میں ہو، یعنی صفحۂ ہستی میں دو قدیم اصل موجود ہیں۔

خواہ شرک در فعل کی صورت میں ہو اور وہ یہ ہے کہ عالم کے لیے دو خالق اور آفریدگار ہیں، یا شرک در عبادت ہو اس سلسلے میں اتنی کثیر آیات و احادیث وارد ہوئی ہیں کہ ان کا قلیل حصہ بھی یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ب: خدا کو ممکن موجودات کے ساتھ تشبیہ دینا باطل ہے اس سے یہ مُراد ہے کہ اللہ کے لیے مادہ وصورت یا زمان و مکان کا تصور ہو اور اسے اپنی کسی مخلوق کے قالب اور صفات میں آجانے کے قابل سمجھا جائے۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا۔

---

[1] توحید صدوق ص ۳۳۱

مَا عَرَفَ اللهَ مَنْ شَبَّهَهُ بِخَلْقِهِ [1]

جس نے خدا کو اس کی مخلوقات کے ساتھ تشبیہ دی اس نے اسے نہیں پہچانا۔

ج: کنارہ کشی بھی شرک اور تشبیہ کی طرح باطل اور مذموم ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم خدا کے وجود اور اس کی صفات و افعال کے بارے میں زبان بند رکھیں اور اس بارے میں کچھ نہ کہیں، بلکہ شرک سے پرہیز اور تشبیہ سے بیزاری کے ساتھ ساتھ ہمیں اللہ تعالیٰ کی ہستی کے بارے میں بحث کرتے ہوئے اصولِ خداجوئی کی صحیح سمت میں رہبری کرنی چاہیئے۔

۲: فطرتِ جنسی اصلی اور چھپنے والے امورِ فطرت میں شامل ہے اگر یہ میلان موجود نہ ہوتا تو تولیدِ نسل اور خاندانی مراکز کی تشکیل کا کوئی محرک وجود نہ پاتا۔ اِسلام نے لوگوں کو اس سے فائدہ اُٹھانے کی دعوت دی ہے اور اس میلان کے کچلنے کو غیر منطقی قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبر اکرم نے فرمایا۔

''اِسلام میں کوئی ادارہ ہمارے لیے ازدواج سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔'' [2]

اسلام نے نہ صرف ازدواج کی دعوت دی ہے بلکہ اس عمل کو نوجوانوں کے دین کے نصف کی حفاظت کا سبب سمجھا ہے۔

فرماتے ہیں:

''جس نے شادی کی اس نے اپنے آدھے دین کو محفوظ کر لیا اب وہ باقیماندہ نصف کی فکر کرے۔'' [3]

لیکن اس کے باوجود اسلام اس امرِ فطری کے لیے بعض پابندیوں اور شرائط کا حکم دیتا ہے اور اس عمل کو کئی طرح سے محدود کیا گیا ہے۔ یہ قیود فقہ اسلامی کی کتب میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔

۳: معاشرے میں مقام و احترام کی طرف رغبت ہر شخص کے لیے ایک فطری امر ہے اور یہ مسئلہ انا کی ایک شاخ ہے اسلام کا ادّعا یہ ہے کہ یہ امرِ فطری، ثمر بخش، فائدہ مند اور معاشرے کی ضرورت کے مطابق کوششوں کی صورت میں ظاہر ہو، اور اس کا مقصد احیائے حق و ابطال باطل ہو۔

امیر المومنین نے ابنِ عباس سے فرمایا:۔

''میرے نزدیک جوتے کا ایک پرانا جوڑا فرمانروائی اور حکمرانی سے گرامی تر ہے مگر یہ کہ حق کو بپا کروں اور باطل کو مٹا دوں [4]

---

[1] توحید صدوق ص ۴۷

[2] مَا بُنِيَ بَنَاءٌ فِي الْإِسْلَامِ اَحَبُّ اِلَى عَزَّوَجَلَّ مِنَ التَّزْوِيجِ۔'' (وسائل الشعیہ ج ۴ ص ۳)

[3] من تزوج احرز نصف دینه فلیتق الله فی النصف الاٰخر (سابق مدرک ص ۵)

[4] وَاللهِ لَهِيَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اِمْرَتِكُمْ اِلَّا اَنْ اُقِيْمَ حَقًّا اَوْ اَدْفَعَ بَاطِلًا۔ (نہج البلاغۃ خطبہ ۳۲)

حضرت امام حسین ابن علی علیہما السلام خدا کے سامنے اپنی ایک مناجات میں فرماتے ہیں۔

پروردگار! تو جانتا ہے کہ ہماری تحریک اقتدار پر قبضہ کرنے یا دولت وثروت میں اضافہ کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ میں لوگوں کو تیرے دین کی نشانیاں دکھاؤں۔ تیری زمین میں اصلاح کروں جس سے انجام کار مظلوموں اور ستم دیدہ لوگوں میں احساسِ امن پیدا ہو اور وہ تیرے دین کے واجبات اور مستحبات پر عمل کریں۔''[1]

یہ بیانات جن کی مثالیں کتاب وسنت میں کم نہیں ہیں بتاتے ہیں کہ اسلام ان امورِ فطرت کو پورا کرنے کا، جبکہ وہ اجتماعی طور پر ثمر بخش ہوں، مخالف نہیں ہے۔ اِسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس قسم کے میلانات سرکش ہو کر ایک بُت کی صورت اختیار کرلیں اور انجام کار دیگر محرکات پر غلبہ کر کے ظلم کا باعث بنیں۔ انسان ان کے حصول کے لیے، دولت، خوشامد، پستی انواع واقسام کے حیلے بہانے بنانے اور مکائد شیطانی کے استعمال میں کوتاہی نہ کرے یا قدرت واقتدار کے تحفظ اور اضافہ کے لیے دھمکی، جرم وگناہ، قتل وغارت کی مدد سے، انسان دوستی اور عدالت خواہی جیسی اعلیٰ انسانی اقدار کو پامال کر کے اپنے مدعا کو پانے کی کوشش کرے۔

اِسی بناء پر حاکمِ وقت یعنی حضرت داؤدؑ کو حکومت عطا فرماتا ہے اور پھر اس طرح حکم دیتا ہے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

(ص:۲۶)

''لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلہ کر اور نفسانی خواہشات کی پیروی سے پرہیز کر، مبادا کہ وہ (خواہشات) تجھے راہِ حق سے گمراہ کر دیں۔''

آیات کا یہ سلسلہ نشاندہی کرتا ہے کہ انسان کی تمام خواہشات کے لیے جن میں سے ہر ایک واقعی طور پر اس کرہ خاکی میں انسانی زندگی کا سبب ہے اسلام کا موقف ان کو اعتدال پر رکھنے اور ان کی رہبری کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسلام ہمیشہ سے اس بات کا داعی ہے کہ انسان کے تمام میلانات اجتماعی طور پر ثمر بخش اور مفید راستہ کے حصول کی کوششوں میں صرف ہوں، حتیٰ کہ تلاش وجستجو، شوقِ آگہی، جمال دوستی، جمال دوستی اور ہنروز یبائی کی طلب وغیرہ جیسے فطری امور، سب کی سرنوشت ایسی ہی ہونی چاہیے۔

۴: فطرت جستجو اور شوقِ آگہی جبلت انسانی کا حصہ ہیں جن پر اسلام نے آیات واحادیث کے ذریعہ دارومدار کیا ہے۔ انسان کی جبلت علم جوئی۔

میں رہبری لازم ہے۔ انسان کی تمام علمی کوششیں رشد وتکمیل فطرت کے لیے ہونی چاہئیں، نہ کہ اس لیے کہ وہ استکبار جہانی کا آلہ کار بن جائے اور شیطانی اقدار کو وسعت دے کر مرادنِ حُر اور آزادی انسان کا خاتمہ کر دیں۔

---

[1] تحف العقول ص ۲۷۱ چاپ بیروت، اور شریف رضی نے اسے امام علیؑ سے نہج البلاغۃ میں بھی نقل کیا ہے۔

۵: امیر المومنینؑ جہالت کو شر کی کان سمجھتے ہیں لیکن اس دانش کو جو نوعِ بشر کی اصلاح نہ کرے گمراہی شمار کرتے ہیں۔ [۱]

٦: تلاشِ حسن ایک محرکِ فطری ہے اور ہنر اسی حسِ کی پیداوار ہے۔ اسلام اس حسِ کی اصل کا احترام کرتا ہے اور ایک خاص لب ولہجہ میں فرماتا ہے:۔

قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِيۡنَةَ اللّٰهِ الَّتِىۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِهٖ (اعراف:۳۲)

''کہہ دیجئے، ان زینتوں کو، جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں۔ کس نے حرام کیا ہے۔''

لیکن اس کے باوجود اس حس کو دیگر افراد کے مفاد کے راستے میں اس طرح رکاوٹ نہ بننا چاہیے کہ انسان کی شرافت وحیثیت خطرے میں پڑ جائے۔ اور انسان ہوا اور ہوس کو اس طرح سے دل میں پیدا کرلے کہ زیبائی وخوب صورتی کی حس کے روبکار لانے کے لیے کسی حدود ہی کو نہ پہچانے۔

---

[۱] الجهل معدن الشر وعلم لا يصلحك ضلال

(۲۴)

اِنسان اور اظہارِ کمالات

قوتِ فکر سے فائدہ اٹھانا، راز ہائے خلقت سے واقفیت، اندھی تقلید سے اجتناب، شخصیت پرستی، میلاناتِ خلافِ عقل سے پرہیز انسان کے اندرونی کمالات کی شگفتگی کے اسباب ہیں۔

انسان کی اندرونی استعداد کا بروئے کار آنا انسان شناسی کے اہم مسائل میں سے ہے کیونکہ ہر انسان استعداد شائستگی کے ایک معیار کے ساتھ دنیا میں آنکھ کھولتا ہے۔ اس کی ترقی انہی میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ جوں جوں انسان کی عمر گذرتی ہے یہ قوتیں خاص شرائط کے تحت روبہ عمل آ کر کھلتی جاتی ہیں۔

اب یہ دیکھنا ہوگا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے کہ یہ سرمایہ ہائے طبیعی مخصوص شرائط کو طے کرتے ہوئے پھلیں پھولیں اور اس کے نتیجہ میں انسان اپنے کمالِ وجودی اور رُشدِ واقعی کو پہنچ جائے۔

انسان حُرد آزاد، خودمختار اور اپنی پسند سے انتخاب کرنے والا وجود لے کر پیدا ہوا ہے اور اس کی سرنوشت خود اسی کے ہاتھ میں ہے وہ نہ تو ملک اور فرشتہ کی مانند ہے، اور نہ ہی چیونٹی اور زنبور (بھڑ) کی طرح ہے جن کی صرف ایک ہی فطرت ہوتی ہے۔ بلکہ انسان زندگی کے ہر لمحہ میں دوراہے پر کھڑا ہوا ہے۔ اور اس دوراہے سے ایک راہ کا انتخاب کرنا خود اس کے اپنے اختیار میں ہے۔

وہ جس طرح طبیعی زندگی کے لیے جدوجہد کرتا ہے اسی طرح اُسے اپنی اندرونی قوتوں کے کمال کو روبہ عمل لانے کی بھی جدوجہد کرنا چاہیے۔ اور اس سلسلہ میں ایسے راستے کا انتخاب کرنا چاہیے جو اُسے سعادت اور خوش بختی تک پہنچا دے۔

قرآن ان راستوں کو ایک خاص طریقہ پر واضح کرتا ہے۔

۱: قوتِ فِکریہ کا شناختی عمل

انسان دوسرے جانداروں میں صرف عقل وخرد ہی کی وجہ سے ممتاز ہے۔ اس کی سوچ اور افکار ہی ہیں جو اسے دیگر جانداروں سے جدا کرتی ہیں اور اسے ان پر فضیلت بخشتی ہیں۔

کمالاتِ انسانی کے پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے میں فکر ونظر کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ قرآن نے ۴۷ مرتبہ 'عقل'، ۱۸ مرتبہ مادۂ فکر ۱۶ مرتبہ ''لفظ 'لب' اور چار مرتبہ لفظ ''تدبر'' پر انحصار کیا ہے، لفظ 'نہی' بھی جو عقل کا مترادف اور ہم معنی ہے دو مرتبہ استعمال ہوا ہے اور علم ودانش کی اصطلاح جو فکر ونظر کو کام میں لانے کا ماخذ ہے، ۷۷۹ مرتبہ اپنے تمام مشتقات کے ساتھ قرآن میں وارد ہوا ہے۔

انسان کے کمالات وجودی میں ایک کائنات کے اسرار اور اس کی آفرینش کے رازوں سے ایسی آشنائی ہے جس کی مدد سے زبانِ خلقت کو سمجھ پائے اور اسے اپنے اور دوسرے انسانوں کے مفاد و منفعت کے لیے تسخیر کرے یہ کام فکر و نظر کو کام میں لائے بغیر ممکن نہیں، اور اس سیر فکری کی اہمیت کے بارے میں قرآن اس طرح فرماتا ہے۔

جس دن انسان اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے معمولی سی آگہی بھی نہیں رکھتا۔''

جوں جوں وہ اعضائے شناخت یعنی آنکھ کان اور دل کے ذریعہ باہر کی دُنیا سے واقف ہوتا جاتا ہے تو وہ رازہائے خلقت سے بھی آشنا ہوتا جاتا ہے۔لہٰذا اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس عظیم نعمت کی خاطر سپاس گذار اور شکر گذار بنے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ (نحل:۷۸)

''خدا نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکم سے اس حال میں باہر نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دِل (آلاتِ خرد) قرار دیئے تا کہ تم غور و فکر کرو اور شکر گزار بنو۔''

قرآن مختلف طریقوں سے انسان کو غور و فکر اور اس کے نتیجہ میں رازہائے خلقت کی شناخت کی دعوت دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ ہم نے تمہارے باپ آدم کو عالمِ ہستی کے اسرار سے آشنا کیا تھا، تم بھی اسی باپ کی اولاد ہو، لہٰذا اسرارِ خلقت سے آشنا ہو جاؤ، فرماتا ہے۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

(یونس:۱۰۱)

کہہ دیجئے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس میں غور کرو آیاتِ الٰہی اور ڈرانے والے (انبیاء) ایمان نہ لانے والوں سے عذاب کو ہرگز نہیں ٹال سکتے۔

قرآن سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۹۰ میں عقلمندوں کے لیے اولی الالباب کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد والی آیت میں ان کی اس طرح سے تعریف و توصیف کرتا ہے۔''

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ (آلِ عمران:۱۹۱)

''یعنی عقلمند وہی ہیں جو اپنی عقل وخرد سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اور مصنوع کی عظمت وآفرینش کی ظرافت وعمدگی کو دیکھ کر اس کے پیدا کرنے والے کی جستجو کرتے ہیں۔ خدا کو کھڑے ہو کر، بیٹھے ہوئے اور پہلوؤں پر لیٹنے کی حالت میں یاد کرتے ہیں۔ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور وفکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تیری ذات پاک ہے۔ تو نے یہ قصرِ خلقت بغیر کسی مقصد کے خلق نہیں فرمایا خدایا ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے۔''

۲: علم رُشد آفریں

اگر چہ قرآن غور وفکر کی ہدایت کرتا ہے اور اس بات کا مقصد ہے کہ اندرونی قوتِ فکر کو کام میں لانے سے علم ودانش کے دروازے اور خلقت کے راستے، انسان کے سامنے کھل جاتے ہیں۔ لیکن دوسری آیات میں یہ بھی فرماتا ہے کہ ہر قسم کا علم ودانش انسان کے رشد وتکامل اور اس کے کمالات کے پھلنے پھولنے کا سبب نہیں بنتا۔ لہٰذا علم کو اس کے خاص مقام ہی سے حاصل کرنا چاہیے، نیز یہ جو کہتے ہیں کہ ''ہر چیز کا جاننا اس کے نہ جاننے سے بہتر ہے۔'' صحیح اور درست بات نہیں ہے، کیونکہ بعض مواقع پر معاملہ اس کے اُلٹ ہو جاتا ہے کیونکہ علم بے مہار و بے محاسبہ ایسا ہتھیار جو کسی حبشی (نا اہل) کے ہاتھ میں ہو۔

علوم رُشد آفریں وہی ہوتے ہیں جو انسان کو خدا کی طرف متوجہ کرتے ہیں، اور اصطلاح کے مطابق ان میں رنگ خدائی چڑھا ہوتا ہے۔ جس سے انسان کو ایک فردِ خدائی بنا دیتے ہیں۔ پھر وہ انسان اپنی کاوش وجدوجہد میں اسی منزل کو سامنے رکھ کر خدا کی رضا حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے۔

قرآن حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ (انبیاء: ۵۱)

''ہم نے ابراہیمؑ کو رُشد وہدایت کے اسباب عطا کیے اور ہم اس کی لیاقت وقابلیت سے آگاہ تھے۔''

آیئے اب یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہ رشد وہدایت کب حاصل ہوئی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے جوانی کے آغاز میں ہی غور وفکر شروع کر دیا تھا۔ وہ ستاروں، سورج اور چاند کی منظم حرکات اور ان کے طلوع وغروب میں غور وفکر کرتے تھے۔ اس طرح انہوں نے اس عمدہ اور عجیب نظام کا مشاہدہ کر کے رب جہاں، اور اس نظام کو گردش میں لانے والے کارکنوں کی ٹوہ لگالی تھی یعنی قرآن کی اصطلاح میں وہ ملکوتِ جہانی سے جن کا اپنے خالق کے ساتھ رابطہ قائم رہتا ہے۔ آشنا ہو گئے تھے۔ اس جگہ فرماتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾ (انعام: ۷۵)

''ہم اس طرح سے ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت دکھاتے رہے تا کہ وہ عالم ودانا اور یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔''

ان حالات میں جب حضرت ابراہیمؑ اپنی فکر کو کام میں لاتے ہیں، نظامِ عالم کا مطالعہ کرتے ہیں اور عالمِ خلقت پر غور کرنے سے وہ ملکوت اور اس کے خالق کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں تو صاحبِ یقین ہو جاتے ہیں۔

(پھر) خداوندِ عالم ان کے بارے میں فرماتا ہے:۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ (انبیاء: ۵۱)

''ہم نے ابراہیمؑ کو رشد عطا فرمایا۔''

رشد و ہدایت کے یہ اسباب یا خود رشد، ان کے نظام عالم سے آگاہ ہونے اور اس کے بعد ملکوت اور عالمِ غیب کی طرف راہ یابی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ رشد آفریں علم، علم ودانش کی وہ قسم ہے جس کے ذریعہ انسان خدا کے راستہ پر چلنے لگتا ہے۔ اور اس کی ذات وصفات اور اوامر واحکام کو پہنچاننے لگتا ہے۔ اللہ کی ذات کی پہچان اور اس کے رازوں سے آشنائی، اس کے احکام تاکیدی میں شامل ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ معرفت ملکوتِ جہاں میں نفوذ کا سبب بنے، انسان کی خدا کی طرف رہبری کرے اور اس کو خدا سے غافل نہ ہونے دے۔

یہ بات بلاوجہ نہیں ہے کہ جب حضرت موسیٰ بن عمران اپنے سے بڑے عالم کے ساتھ ہم سفر ہوتے ہیں اور اس مصاحبت کے مقدمات خُدا کے حکم سے انجام پاتے ہیں تو آپ اس عالم سے کہتے ہیں۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ۞ (کهف: ٦٦)

''کیا میں اس شرط پر آپ کی پیروی کروں کہ آپ مجھے وہ باتیں سکھا دیں گے جو رُوح کے رشد اور پھلنے پھولنے کے بارے میں آپ جانتے ہیں۔''

دَورِ حاضر کا انسان حق کی رسّی کو چھوڑنے اور خدا سے دُوری اختیار کرنے کی وجہ سے، ایسے علوم کے حاصل کرنے میں مصروف ہے جو نہ صرف اس کو خدا سے ہی دُور کرتے ہیں، بلکہ اس کی انسانیت اور تمدّن کے لیے بھی خطرہ ہیں، یہاں تک کہ مشرق ومغرب کے اسلحہ سازی کے کارخانے محض رقابت کی بناء پر مخرب اور تباہ کن ہتھیاروں کے بنانے میں مصروف ہیں جن میں تھوڑے سے ہتھیاروں کا استعمال ہی تمدن کو برباد اور انسانیت کو نابود کرنے کے لیے کافی ہے۔ ان اسلحہ کو محدود کرنے کے مذاکرات خود اس بات کی نشانی وہی کرتے ہیں دورِ حاضر کے تجرباتی علوم بالکل بے مہار اور رشدِ انسانی کے خلاف ہیں۔

۳: کورانہ تقلید سے پرہیز

اِسلام نے نہ صرف غور وفکر کرنے اور رشدِ انسانی کی حدود کے اندر رہ کر اسرارِ عالم کو حاصل کرنے کا حکم دیا ہے، بلکہ اس نے انسان کو کسی کی کورانہ پیروی سے بھی روکا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان کی ضروریاتِ جبلیّ میں ایک حسِ محاکات بھی ہے اور صحیح تعبیر میں اس کو ہم رنگی کی طرف میلان کہتے ہیں۔

یہ میلان حیاتِ انسانی کے ہر دور میں خصوصاً بچپن میں انسان کی تربیت اور تکمیل میں اہم اثر رکھتا ہے، اور اگر کسی بچہ میں اس قسم کا میلان نہ ہوتو نہ تو وہ بات کرنا سیکھ سکتا ہے اور نہ ہی اُسے چلنا پھرنا آ سکتا ہے۔

لیکن اِس میلان سے معقول اور منطقی حُدود تک ہی فائدہ اٹھانا چاہیے اور اسے ہرگز اس حد تک نہ پہنچنا چاہیے کہ انسان کی فکر ونظر کی اہلیت ہی معطل ہو کر رہ جائے۔

بعض لوگ تعصب کی بناء پر اپنے آباؤ واجداد اور بڑوں کی راہ وروش پر چلنے کے عقل وخرد کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور ان کی اندھی تقلید میں ایسے میلانات کے غلام ہو جاتے ہیں۔

قرآن زمانہ جاہلیت کے عربوں کا ذکر کرتا ہے۔

جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر اس کے ناتواں کی طرف رجوع کرنا دستگاہِ تعقل وتفکر کے ارتقاء کی نشانی ہے اسی طرح غیر آگاہ افراد کا اہل خرد کی طرف رجوع کرنا عقل وخرد کے احکام میں شامل ہے۔ درحقیقت اندھی تقلید اور نامعقول پیروی قابل اعتراض ہیں جبکہ دانشمند اور دانا آدمی کی طرف رجوکرنا صحیح پیروی ہے جو عقل وخرد کے عین مطابق اور شعور وادراک کی سطح کے بلند ہونے کا سبب ہوتی ہے محور بحث فکر واندیشہ کی دستگاہ کو معطل کر کے کسی کے پیچھے اس طرح لگتا ہے جو انسان کی شخصیت کو ختم کر کے اسے اپنی انفرادیت سے بیگانہ کر دے۔

اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ﴿۲۳﴾ (زخرف:۲۳)

''ہم نے تو اپنے بڑوں کو اسی راہ روش پر پایا ہے لہٰذا ہم تو انہیں کی پیروی کریں گے۔[1]

دوسری آیت میں فرماتا ہے:۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰى مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوۡلِ قَالُوۡا حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ﴿۱۰۴﴾

(مائدہ:۱۰۴)

---

[1] سورہ یونس آیت ۷۸، انبیاء آیت ۵۸، شعراء آیت ۷۴، لقمان آیت ۲۱، اور زخرف آیت ۲۳ کی طرف بھی رجوع کریں۔

''جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور (اس کے) رسول کی طرف آؤ، تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو ہمارے آباؤ اجداد کا دین ہی کافی ہے۔ (کہہ دیجئے) چاہے وہ کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور راہِ ہدایت سے آشنا ہی نہ ہوں۔''[1]

بہت سے غلط اور فضول مکاتبِ فکر کی بقاء، جن کی نہ تو علم اور نہ ہی عقل و خرد تصدیق کرتے ہیں۔ انہیں نارواتعصّبات کے باعث ہے جو آباؤ اجداد کے طریق کو ہر چیز پر مقدم جانتے ہیں۔

تعصب ایک ایسا پردہ ہے جسے انسان اپنی عقل و خرد کے اوپر رکھ کر اپنے آپ کو اس کی روشنی سے محروم کرلیتا ہے۔

مشرق و مغرب کے میلانات

اثرِ مشرق اور مغرب زدگی دونوں فکرِ انسانی کی دستگاہ کے معطل ہونے اور انسان کو خود سے بیگانہ بنانے کا سبب بن گئے ہیں۔ بہت سے نقصانات ناقابلِ تلافی ہوجاتے ہیں۔ ہدایت یافتہ اور رشید لوگ وہی ہوتے ہیں جو زندگی کے احساسات کو قابو میں رکھتے ہیں اور عقل و خرد کے چراغ سے راہِ حیات کو روشن کرتے ہیں۔

اسی لیے قرآن اس یتیم کو جو اپنے نفع و نقصان کو پہچانتا ہو رشید کہتا ہے، اور فرماتا ہے۔

فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا فَادۡفَعُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ ۚ (نساء: ٦)

''اگر تم ان میں رشد و استقلال دیکھو (یعنی وہ حدِ رشد و کمال کو پہنچ چکے ہوں) تو ان کے اموال ان کے سپرد کردو۔''

رشد کے بھی کچھ درجات و مراتب ہوتے ہیں، جو شخص اپنے نفع و نقصان کو پہنچانتا ہے وہ رشدِ مالی، رکھتا ہے۔ لیکن کیا آپ ضروری ہوگا کہ وہ دینی اجتماعی، سیاسی اور فرہنگی رشد بھی رکھتا ہو؟ پس یقیناً مالی اور دیگر مراتب اقدارِ مشترک نہیں رکھتے۔ رشدِ کامل وہ ہوتا ہے جو تمام امور میں اپنے کمالِ مطلوب کو پالے اور تمام مراحل میں چراغِ عقل سے فائدہ اٹھائے۔

البتہ کورانہ تقلید و پیروی سے پرہیز کے یہ معنی نہیں کہ اہل خرد کے تخصص ہی کو رد کردیا جائے اور ان کے علوم و معلومات سے استفادہ نہ کیا جائے، کیونکہ ماہرین کی طرف رجوع کرنا دستگاہ تعقل و تفکر کے ارتقاء کی نشانی ہے اسی طرح غیر آگاہ افراد کا اہل خرد کی طرف رجوع کرنا عقل و خرد کے احکام میں شامل ہے۔ درحقیقت اندھی تقلید اور نامعقول پیروی قابل اعتراض ہیں جبکہ دانشمند اور دانا آدمی کی طرف رجوع کرنا صحیح پیروی ہے، جو عقل و خرد کے عین مطابق اور شعور و ادراک کی سطح کے بلند ہونے کا سبب ہوتی ہے محور بحث فکر و اندیشہ کی دستگاہ کو معطل کرکے کسی

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۱۷۰ کی طرف بھی رجوع فرمائیں۔

کے پیچھے اس طرح لگتا ہے جو انسان کی شخصیت کو ختم کر کے اسے اپنی انفرادیت سے بیگانہ کر دے۔

شخصیت زدگی

شخصیت زدگی ایک قسم کی بیماری ہے جو ترقی معاشرہ کو روک دیتی ہے، لہٰذا جب انسان واضح محاسبات کے ذریعہ حق کو باطل سے جدا کر سکتا ہو تو اسے اس راستہ پر نہیں چلنا چاہیے، نہ ہی شخصیتوں کی طرف میلان کو اپنی حقانیت کی راہ وروش کی نشانی سمجھنا چاہیے، اس سلسلے میں امیر المومنینؑ کا ایک ارشاد ہے اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے قول کے مطابق وحی الٰہی کے بعد اب تک زمانے نے اس قدر عظمت والی بات نہیں سنی جیسا کہ فرماتے ہیں:

اِنَّ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ لَایُعْرَفَانِ بِاَ قْدَارِ الرِّجَالِ اِعْرِفِ الْحَقَّ تَعْرِفُ اَهْلَهٗ اِعْرِفِ الْبَاطِلَ تَعْرِفُ اَهْلَهٗ۔ [1]

''حق اور باطل کو اشخاص کی عظمت اور بزرگی کے ذریعہ نہیں پہچانا جا سکتا حقیقت طلب انسان کیلئے لازم ہے کہ وہ پہلے خود حق و باطل کو پہچانے، اس کے بعد اس کے طرفداروں کو ایک دوسرے سے جدا کرے۔''

اس ساری بحث میں صرف رشد کے ایک عامل یعنی دستگاہ فکر سے فائدہ اٹھانے فکر واندیشہ کو کام میں لانے اور اس کے نتیجہ میں لسان خلقت اور راز آفرینش سے واقفیت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کورانہ تقلید یا مشرق ومغرب کی طرف جھکاؤ یا شخصیت پرستی، سب کے سب رشد انسانی کی ترقی میں مانع اور عوامل ترقی کو بیکار کرنے والے امور ہیں۔ تاہم رشد کے عوامل صرف انھی مین منحصر نہیں ہیں جو اس بحث میں بیان کیے گئے ہیں۔ ہم دیگر عوامل میں سے صرف ایک کی طرف اشارہ کریں گے جسے ''تربیت'' کہتے ہیں۔

تربیت کے ذریعہ کمال کی نشوونما

اگر عقل وخرد کو کام میں لانے اور فروغ عقل کے موانع سے دوری اندرونی شائستگیوں کی نشوونما اور پھولنے پھلنے کا سبب بنتی ہے تو مربی کی تربیت کمالات کے پھلنے پھولنے اور نشوونما کا دوسرا عامل ہے، جس کی طرف قرآن میں بہت ہی بلیغ طریق سے توجہ دلائی گئی ہے۔ اس امر کو انبیاء کی بالعموم اور پیغمبر اسلامؐ کی بالخصوص پہلی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ (جمعه:۱)

''وہ ان کی پرورش کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

اس عامل کے سلسلہ میں بحث بہت وسیع ہے اور اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں اور رسالے لکھے جا چکے ہیں۔ علوم انسانی میں اس

---

[1] علی وفرزندانش ص ۲۰

کا مقام بہت بلند ہے لیکن ہم ان مباحث میں زیادہ تر ان عناصر کی طرف جو اندرونی کمالات کے پھلنے پھولنے اور نشوونما سے متعلق ہیں اشارہ کریں گے اور دیگر مباحث کو ماہرین متخصصین کیلئے چھوڑتے ہیں

پس ان مباحث میں مندرجہ ذیل تین باتیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱: تربیت سے کیا مراد ہے؟

۲: مُربی اور اس کی شرائط

۳: وارثت کے میدان میں تربیت کا اثر

پہلی بحث کی وضاحت اس طرح ہے

الف: تربیت کی تعریف

تربیت اس کو کہتے ہیں کہ مُربی کسی چیز کی خصوصیات سے واقفیت رکھتے ہوئے وہ کام کرے جو اس چیز کی مخفی قوتوں کو فعال بنا دیں تا کہ وہ بتدریج تکامل وارتقاء کی راہ کو طے کر سکے۔

دوسرے لفظوں میں تربیت سے مُراد یہ ہے کہ مربّی کا عمل کسی چیز کے مخفی قوی کمالات کو بروئے کار لائے تربیت کی اس تعریف کو سمجھنے کے لیے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

ایک باغبان درخت کا مربی کہلاتا ہے اور درخت اس کے زیر تربیت ہوتا ہے اب دیکھنا چاہیے کہ باغبان کرتا کیا ہے۔ باغبان کا کام اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ پودے اور بیج کی نشوونما کے لیے مناسب حالات فراہم کرتا ہے...... تا کہ حالات نشوونما کے سازگار ہونے اور ان کے خلاف رکاوٹوں کے دُور ہونے کے نتیجہ میں وہ قوتیں اور طاقتیں جو پودے اور بیج کے اندر مخفی ہیں اپنے آپ کو ظاہر و آشکار کر دیں۔ بلکہ خاص حالات میں ہی اپنے کمالات کو ظاہر و آشکار کر سکتے ہیں اس سلسلہ میں باغبان کا کام اس قدر ہے کہ وہ مٹی کی آزمائش کر کے پودے کو صحیح و تیار زمین میں لگائے نہ کہ شور زمین میں کاشت کر دے یا بیج کو مناسب مٹی میں بوئے اس کے ساتھ ساتھ نشوونما کی رکاوٹوں یعنی کنکر پتھر وغیرہ کو اس کی جڑوں کے راستے سے ہٹائے، فضول قسم کی گھاس پھونس کو جو پودے اور بیج کی نشونما میں رکاوٹ بنتے ہوں نکال باہر کرے۔ پھر بیج اور پودے کو تقویت پہنچانے کے لیے طبیعی یا مصنوعی کھاد اور تقویت دینے والے دوسرے وسائل سے فائدہ اٹھائے۔ یہ وہ حالات ہوں گے جن میں ہم دیکھیں گے کہ پودے اور بیج اپنے مخفی کمالات کو باہر نکال رہے ہیں اور باغ اور گلستان کو وجود میں لا رہے ہیں۔ ثابت ہوا کہ باغبان اپنی طرف سے پودے اور بیج میں کوئی چیز داخل نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اس بات کے مقدمات فراہم کرتا ہے کہ پودے اور بیج اپنے کمالات دکھا سکیں۔ باغبان کا کام بھی دیگر مربیوں کی طرح، رشد وترقی قدرتوں اور قوتوں کے پھلنے پھولنے اور نشوونما کرنے کے عوامل کو فراہم کرتا ہے اور ان قوتوں کے ظاہر ہونے کے اسباب مہیا کرتا ہے جن کی تربیت اس نے اپنے ذمہ لی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فلاسفہ کہتے ہیں کہ تربیت کسی چیز کی مخفی قوتوں اور قدرتوں کو جو مربی کی توجہ کی محتاج ہیں بروئے کار لانے کو کہتے ہیں۔

لہٰذا خود باغبان اپنی طرف سے کوئی کمال پیدا نہیں کرتا بلکہ اس کا کام مناسب حالات پیدا کرنا اور رکاوٹوں کو دُور کرنا ہوتا ہے۔ حقیقت میں خود درخت ہی ہوتا ہے جو اپنے کمالات کو سامنے لاتا ہے۔

بشر کی تربیت کا مسئلہ بھی اسی طرح ہے۔ دستِ آفرینش نے انسان کے اندر استعدادوں اور شائستگیوں کو مقدمہ اور قوت کی صورت میں ودیعت کیا ہے۔ لہٰذا مربی کا فرض ہے۔ کہ مخفی کمالات کو پہچان کر وہ کام کرے جس سے مخفی کمالات ظاہر ہونے لگیں یعنی شائستگیوں کے ظاہر ہونے کے لیے حالات فراہم ہوں اور موانع رشد برطرف ہو جائیں۔ مثلاً دستِ آفرینش نے ہر انسان کی فطرت میں خداشناسی کی طرف میلان، سچائی کی طرف رغبت، امانت واپس دینے کی خواہش اور پاکیزگی کی طرف رغبت جیسی صفات کو جمع کر دیا ہے۔ لیکن یہ تمام کمالات ایک بہت بڑی کان کے مانند جو پہاڑ کے اندر چھپی ہوئی ہو مقدمہ اور استعداد کی صورت میں انسان اس کے وجود کے اندر چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ مُربی معدنیات کے انجینئر کی طرح ہوتا ہے جو پتھروں اور مٹی کے اندر سے جواہرات کو نکال کر باہر لاتے ہے۔ لہٰذا اسے کوشش کرنا لازم ہے کہ پوری جدوجہد سے انواع واقسام کے کمالات منصۂ شہود پر لائے۔

اسلامی نظریہ کے مطابق دستِ آفرینش نے قضاء الٰہی کے قلم سے بہت کمالات بچے کے ضمیر پر بنیادی طور پر لکھ دیے ہوتے ہیں اور اس کی ضمیر ان کمالات سے مملو ہوتی ہے۔ لیکن یہ کمالات بالعموم خود بخود ظاہر نہیں ہوتے اور نہ ہی اپنی نشاندہی کرتے ہیں۔ بچہ کی پرورش کرنے والوں پر لازم آتا ہے کہ وہ ان مخفی کمالات کو نشوونما کے لیے اسباب فراہم کریں تاکہ مناسب حالات میں نمو کی رکاوٹوں کو دور کر کے یہ کمالات نشوونما پائیں۔ ماننا پڑے گا کہ بچہ اپنے بچپن کے زمانہ میں فطرتاً، خداجو خداخواہ، صادق وراست گو ہوتا ہے۔ وہ امانت کی سیانت کے سوا وہ کچھ اور سوچتا ہی نہیں لیکن سارے کا سارا ماحول اور تمدن ہی اگر خداخواہی سے منحرف ہو۔ یا بچہ خیانت وفساد کے ماحول میں نشوونما پائے تو ان کمالات کی جڑیں جل جائیں گی یا کم از کم ڈھیروں رکاوٹوں کے نیچے دب کر رہ جائیں گی۔ لہٰذا لازم ہے کہ ان کمالاتِ فطری کے رشد اور نشوونما کے لیے مناسب اور سازگار بنیاد فراہم کی جائے اور پھر ان کمالاتِ فطری کے روبکار آنے اور نشوونما کی توقع کرنی چاہیے۔

رُوحِ اِنسانی کی چار حسّیات

دورِ حاضر کے ماہرین نفسیات نے انسانی ذہن کے چار احساسات کا انکشاف کیا ہے جو ہمارے ذہن وروح میں پیوست ہیں۔ یہ ماہرین ان جہات کو تشکیل دیتے ہیں۔ یہ چاروں حسّیات درج ذیل عنوانات سے عبارت ہیں۔

۱: حسِ خداجوئی یا حسِ مذہبی

۲: حس نیکی یا اخلاق

۳: حس علم جوئی یا جستجو

۴: حسِ ہنر اور میلانات زیبائی

ماہرین نفسیات نے ان چاروں حسّیات کو بنیادی طور پر ثابت کرنے کے لیے ایک ایک حقیقت سے پردہ ہٹایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

حسِ مذہبی کوئی وارداتی یا اتفاقی فکر یا سوچ نہیں ہے جو باہر سے انسان کے ضمیر میں داخل ہوتی ہو۔ اور اس کی کوئی فطری اور طبعی بنیاد نہ ہو، بلکہ روحِ انسان کے ضمیر میں داخل ہوتی ہو، اور اس کی کوئی فطری اور طبیعی بنیاد نہ ہو۔ بلکہ روحِ انسان میں دیگر تین حسیات کے ساتھ حسِ مذہب کی موجودگی انسان کے لیے مذہب کے فطری ہونے کی حقیقت کو ثابت کرتی ہے اور تجرباتی علوم جن پر موجودہ علم نفسیات کی اصل استوار ہوتی ہے۔ وحی الٰہی کی تائید کرتے ہیں (اگرچہ تائید کی ضرورت نہیں۔)

ان چار حسّیات کی تفصیل

ا: اگر دستِ آفرینش نے انسان کی سرشت میں زیبائی کی طرف میلان اور عمدہ وخوب صورت صنائع کی طرف جھکاؤ نہ رکھا ہوتا۔ تو خود نوجوان طبقہ ہرگز نقاشی، خوبصورت منظر کشی کرنے اور دل آرا تصویریں بنانے میں رغبت کا اظہار نہ کرتے۔ اگر اس قسم کے تمام میلانات ور جحانات مصنوعی اور وقتی نہیں ہو سکتے کیونکہ جب تک باطنی میلانات اور رغبت قلبی وکشش فطری نہ ہو انسان تحقیق کی تکالیف برداشت نہیں کرتا۔

۲: علماءِ اعلام آدھی آدھی رات تک مرطوب ونمناک کمروں کے اندر ناسازگار حالات وفقیرانہ طرزِ زندگی کے ساتھ مطالعہ وتحقیق میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ حضرات اکثر اوقات کھانے پینے اور سونے تک کو بھی بھول جاتے ہیں مادی ضروریاتِ زندگی سے بھی وقتی طور پر اپنا رشتہ منقطع کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تمام میلانات ور جحانات مصنوعی اور وقتی نہیں ہو سکتے، کیونکہ جب تک باطنی میلانات اور رغبت قلبی وکشش فطری نہ ہو انسان تحقیق کی تکالیف برداشت نہیں کرتا۔

۳: تمام افرادِ انسانی میں فطرتاً نیکی کی طرف میلان اور خوش اخلاقی کی طرف رغبت موجود ہوتی ہے۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ پیمان شکنی تمام دنیا کے لوگوں میں قبیح اور بُری سمجھی جاتی ہے۔ اس کے برعکس عہد و پیمان کی پختگی کو سب لوگ خوبی تصور کرتے ہیں علیٰ ہذا القیاس کوئی قوم ظلم وستم کو پسند نہیں کرتی اور نہ ہی کسی جماعت کے نزدیک اقدارِ عدل کو قابل مذمت سمجھا جاتا ہے۔ ان صفات کا سب میں قدرِ مشترک ہونا، اس قسم کے میلانات کی فطری گہرائی کی خبر دیتا ہے اور اس ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام کششیں اور جذبے فطری اور پیدائشی جڑیں رکھتے ہیں۔ یعنی ہمارا وجود اس قسم کے میلانات سے خمیر ہوا ہے۔

۴: ان تینوں حسّوں کی شرح کے بعد لازم آتا ہے کہ چوتھی حس کی یعنی حسِ مذہبی کے بارے میں تحقیق کی جائے۔

دُنیا کی اقوام وملل میں مذہب کا وجود اور ماوراء طبیعت مسائل کی تحقیق کی طرف میلان مذہبی مسائل کے فطری وہمہ گیر ہونے کا ثبوت ہے دورِ حاضر کے تمام تمدّن شناس ماہرین تائید کرتے ہیں کہ ہر زمانہ میں نوعِ انسان کے ذہن میں خدا پرستی عبادت اور پرستش کی فکر، قدیم ترین فکر رہی ہے۔ یعنی تمام مختلف تمدنوں میں کوئی نہ کوئی مذہبی تعلق قدرِ مشترک کے طور پر موجود رہا ہے اور ان تعلقات کی نشانیاں تمام تمدنوں میں آج بھی نظر آتی ہیں۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ دنیا کی قدیم ملل واقوام نے مقصدِ اصلی کو گم کر دیا تھا، جس کے نتیجہ میں ان کے مذاہب انواع واقسام کے خرافات سے آلودہ ہو گئے تھے انہوں نے خدا کی معرفت کرانے والوں کو ہی خدا سمجھ لیا تھا اور مجاز کو حقیقت تصورّ کر لیا تھا۔ تاہم ان سب باتوں کے باوجود ایک حسِ ہمیشہ ان کے درمیان موجود رہی، جس کا وجُود اپنے سے مافوق وماوراء ہستی کے ساتھ انسان کے تعلق کی خبر دیتا ہے۔

ان غلط تصورات سے اس حس کی آلودگی مذہبی حسِ کے فطری تصور میں کمی پیدا نہیں کر سکتی۔ آپ اگر کسی جمعہ کے روز یا اتوار کو ہوائی جہاز پر سوار ہوں اور عالم کے مختلف براعظموں کے اوپر سے پرواز کریں تو آپ اکثر جگہ اللہ اکبر کی صدا یا ناقوس کی ندا سنیں گے۔ یہ چیز خود بتاتی ہے کہ مذہب کی طرف میلان ایک اندرونی میل ورغبت ہے جس کا سرچشمہ خود انسان کے اپنے وجود کی گہرائیاں ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں کہ کسی جماعت نے بیٹھ کر اس قسم کے افکار گھڑ لیے ہوں، ان کا قلوب انسانی میں نفوذ کر دیا۔ ہو کیونکہ کوئی اتفاقی فکر اس حد تک ہمہ گیر، متفق علیہ اور اتنی استوار و پائیدار نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ موقع ہے جہاں اُن آیات کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے جو اصل مذہب، نیکیوں کی طرف میلان اور برائیوں سے دوری کے فطری ہونے کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں ان میں سے چند آیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

فطرت سے مربُوط آیات

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۞

(روم: ۳۰)

''تم خدا کے دین کی طرف رُخ کرلو، جو دین فطرت ہے اور جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کے کارِ تخلیق میں (کسی طرح) کوئی تبدیلی نہیں یہی استوار و محکم دین ہے۔ لیکن اکثر اس سے آگاہ نہیں ہیں۔''

اس آیت میں دین کا ایک امر فطری کے طور پر جس کا انسان اپنے اندر سے خواہشمند ہے۔ تعارف کروادیا گیا ہے۔ یہاں دین سے مراد اس کے اصول ہیں، یعنی خُدا جوئی توحید، عدل وداد کی طرف میلان اور اسی طرح کے دیگر اُصول۔

وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰٮهَا ۞ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰٮهَا ۞ (شمس: ۷،۸)

قسم ہے انسان کے نفس کی، اور اس خدا کی جس نے اسے پیدا کیا ہے، اور اچھائیوں اور برائیوں کا اسے الہام کیا ہے۔

مسلمہ طور پر یہ الہام پیغمبروں کے الہاموں جیسا الہام نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک ندا اور آواز ہے جسے انسان اپنے ضمیر سے سنتا ہے اور باطنی طریقہ سے اچھائیوں اور برائیوں کی تشخیص کرتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ عدل وداد اور نیکی واحسان اچھی چیزیں ہیں اور ظلم وستم قبیح و مذموم ہیں۔ انسان کبھی کسی مکتب کا رُخ نہ کرے۔ حسن وقبح کے بارے میں فلاسفہ کے اقوال وآراء سے بھی اس کو آگاہی نہ ہو۔ پھر بھی اسے کوئی شک وشبہ نہیں ہوگا کہ عدل اچھی اور ظلم بری چیز ہے۔

قرآن ایک اور مقام پر فرماتا ہے:۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝۱۰ (بلد:۱۰)

''ہم نے اُسے نیک و بد سے آشنا کر دیا۔''

اس بارے میں دیگر آیات و روایات بھی ہیں جو سب کی سب اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ انسان کے اندر میلانات کا ایک سلسلہ فطرتاً موجود ہے اور اس نے انہیں کسی معلم اور استاد سے حاصل نہیں کیا۔

مارکسزم ۷۰ سال سے مملکت روس اور اس کے گرد و نواح پر اپنا منحوس سایہ ڈالے ہوئے ہے۔ وہ اپنی قدرت کے ساتھ اس کوشش میں مشغول ہے کہ مذہب کے تصوّر کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے اس سلسلے میں طرح طرح کے حیلے، مکر پروگرام اور تبلیغات پیش کر رہا ہے تا کہ وہاں کے عوام کے قلوب کو تصورِ خدا جوئی سے خالی کر دے لیکن اسے اس میں کوئی نمایاں کامیابی ہوئی ہے؟ اگر مارکسزم کی زنجیر اسارت جوان ملکوں کی ستم زدہ اقوام کے ہاتھوں اور پاؤں میں پڑی ہوئی ہے دور ہو جائے تو یقیناً مسجدوں اور کلیساؤں میں لوگوں کا ہجوم پھر دوبارہ واضح و ظاہر صورت میں دکھائی دینے لگے گا۔

یہ حقیقت اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ انسان کے وجود کے اندر ایک خاص قسم کی جاذبیت کا سلسلہ موجود ہے جس سے اس کی فطرت بنائی گئی ہے۔ جس طرح انسان بھوک اور پیاس کا فطرتاً احساس کرتا ہے اور ذاتی طور پر مقام و ثروت کا طالب ہوتا ہے بالکل اسی طرح وہ فطرتاً خدا اور مذہب کی ضرورت اور عدل و داد کی اشاعت اور نیکیوں کے پھیلنے کا طالب ہوتا ہے۔

حالات مشروط بہ اظہارِ فطرت

بہت سی باتیں فطرتاً انسان کے اندر سے نمودار ہوتی ہیں۔ تاہم ہر قسم کے حالات میں ان کی نمو نہیں ہوتی۔ امورِ فطری کی نشو و نما کے لیے تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جس میں موانع کی بیخ کنی اور رشد و تکامل کے تقاضوں کا پورا کرنا شامل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ طریقِ کار اختیار کرنا لازم ہے، جس سے مذہب کے ساتھ تعلق زیادہ ہو جائے۔ نیکی کے ساتھ لگاؤ اور بڑھ جائے، علم کے ساتھ محبت میں اور زیادہ اضافہ ہو اور بالآخر ہنر و زیبائی کے ساتھ جاذبیت زیادہ نمایاں ہونے لگے۔

صرف ان ضروریاتِ فطری کے لیے ہی مربی کی طرف سے صحیح تربیت کی ضرورت نہیں، بلکہ تمام فطری ضروریات کے لیے یہی اصول کارفرما ہے۔

جنسی میلان جو ایک طبیعی اور باطنی میلان ہے ہر قسم کے حالات میں نشو و نما نہیں پاتا، نہ ہی انسان میں ازدواج کی خواہش پیدا ہوتی ہے بلکہ اس رجحان کی بھی مناسب اور سازگار حالات میں ہی نشان دہی ہوتی ہے۔

اس بحث کے مطابق ماننا پڑے گا کہ مربی بذاتِ خود کوئی احساس بیدار نہیں کرتا بلکہ اس کا وجود انسان کے سعادت کی چوٹی تک پہنچنے میں معاون ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں مربی راہ دکھانے والا ہوتا ہے، کسی احساسِ نو کو پیدا کرنے والا نہیں ہوتا۔ مربی کوئی جدید سبق بچے کو

نہیں پڑھاتا بلکہ جو سبق بچے نے مکتبِ فطرت سے پڑھا ہوا ہے اور امتداد زمانہ سے اس کے نقوش پھیکے پڑ جاتے ہیں، مربی کے وسیلہ سے وہ نقوش ایک بار پھر فروغ پا کر زیادہ روشن و واضح ہو جاتے ہیں۔

مربی کا کام تیل نکالنے والے انجنیئر وں کی طرح ہوتا ہے۔ انجنیئر بذاتِ خود مٹی یا سمندر کے اندر قوت پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی تدابیر اور فکر کے ذریعہ وہ کام کرتے ہیں جس سے قوت ہزاروں ٹن مٹی کے نیچے سے باہر نکل کر دوسرے کارکن ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہے۔ یہی کیفیت ایک معلم اور استاد کی ہے کہ جب وہ سچ بولنے، علم حاصل کرنے، بزرگوں اور محسنوں کا احترام کرنے، عہد و میثاق کو پورا کرنے اور اسی طرح کی دوسری باتوں کی نصیحت کرتا ہے تو حقیقت میں وہ کوئی نئی بات اور نئی فکر بچے کے سامنے پیش نہیں کرتا بلکہ وہ نقوشِ فطرت جو پہلے سے بچے کی لوحِ قلب پر موجود ہوتے ہیں اور جو امتدادِ زمانہ سے پھیکے پڑ چکے ہوتے ہیں، ان کو وہ معلم یاد دلاتا اور استحکام بخشتا ہے۔

☆☆☆

انبیاء بطورِ مربی انسان

امیر المومنینؑ نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں ہی پیغمبروں کا تعارف کوئی نئی چیز لانے والے کے بجائے ماضی کی تعلیمات کے یاد دہانی کرانے والوں کے طور پر کراتے ہیں دوسرے لفظوں میں پیغمبر معلم و استاد ہونے سے پہلے انسانوں کے باطنی سلسلۂ میلانات کے مربی اور ان کی نشاۃ ثانیہ کے ذمہ دار ہوتے ہیں جنھیں دستِ آفرینش نے قلوبِ انسانی کے اندر رکھ دیا ہوتا ہے۔

انبیاء کے بارے میں امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے:

فَبَعَثَ فِيهِمْ رُسُلَهُ وَوَاتَرَ إِلَيْهِمْ أَنْبِيَاءَهُ لِيَسْتَأْدُوهُمْ مِيثَاقَ فِطْرَتِهِ وَيُذَكِّرُوهُمْ مَنْسِيَّ نِعْمَتِهِ وَيَحْتَجُّوا عَلَيْهِمْ بِالتَّبْلِيغِ وَيُثِيرُوا لَهُمْ دَفَائِنَ الْعُقُولِ

(نہج البلاغۃ: خطبہ:۱)

اللہ نے اپنے پیغمبروں کو انسانوں میں مبعوث فرمایا اور انھیں یکے بعد دیگرے معین فاصلوں کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ انسانوں سے فطرت کے اس پیمان کا جو انھوں نے خدا کے ساتھ باندھا ہے، مطالبہ کریں (انسان فطرت کی اقدار کے مطابق عمل کریں) اور ان فراموش شدہ نعمتوں کو (ان فطری اقدار کو جن کی طرف سے بعض عوامل کی بناء پر غافل ہو گئے ہیں) یاد دلاتے ہوئے تبلیغ کے ذریعہ خدا کی حجت ان پر تمام کریں اور مختلف معارف کو ان کے اندر سے اُبھاریں۔

آپ نے ملاحظہ کرلیا ہے کہ میثاق فطرتہ و منسی نعمتہ اور دفائن العقول کے جملے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انبیاء کرام کے لائحۂ عمل کا بہت بڑا حصہ امورِ فطری کی یاد دہانی اور انسان کو ان اقدار و علوم کی طرف متوجہ کرنا ہے، جو اکثر اوقات فاسد تمدنوں اور معاشروں کے زیرِ اثر غفلت کا شکار ہو کر بھلا دیے جاتے ہیں۔

مربی کا معیار

جواب: مربی اسے کہتے ہیں جو کسی موجود چیز کیلئے نشوونما اور پھلنے پھولنے کے حالات فراہم کر کے اس کے تکامل وارتقاء کو تیز کرے۔ اور ایک باغبان کی طرح ٹیڑھا اور بے راہ ہونے سے محفوظ رکھے۔

پیغمبر معلم ہونے سے پہلے انسان کے مربی ہوتے ہیں اسی طرح انبیاء کوئی نئی چیز پیش کرنے سے پہلے تعلیمات ماضی کی یاد دہانی

کراتے ہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ پیغمبروں کی تمام باتیں صرف گذشتہ کی یاددہانی ہوتی ہیں بلکہ انبیاء کی تعلیمات کی کچھ مخفی جڑیں ہوتی ہیں جن کی نشوونما اور تکامل وارتقاء کیلئے پیغمبروں کو مبعوث کیا جاتا ہے اسی لئے قرآن آنحضرت سے اس طرح خطاب فرماتا ہے۔

فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ (غاشیه)

''انہیں یاددلاؤ، بیشک تم تو یاددلانے والے ہو، تمہیں ان پر مسلط نہیں کیا گیا۔''

لہٰذا ماننا پڑے گا کہ انسان کی دو شخصیتیں ہوتی ہیں اور اس کی روحانیت کے بھی دو پہلو ہیں:

ا۔شخصیت ذاتی

۲۔شخصیت عرضی

پہلی شخصیت وہی پاک وپاکیز روحانی شخصیت ہے جسے دست خلقت نے ہر انسان کی سرشت میں رکھا ہے اور جو ہر قسم کی دست بردسے پاک ہوتی ہے اس سلسلہ میں پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں:

كُلُّ مَوْلُوْدٍ عَلَى الْفِطْرَةِ ثُمَّ اَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ وَيُنَصِّرَانِهٖ وَيُمَجِّسَانِهٖ [1]

ہر پیدا ہونے والا دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کے ماں باپ اُسے یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت (کے شرک وگمراہی) کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔

شخصیت عرضی ان مادی افکار کا نام ہے جو طاغوتی تمدن، آلودہ ماحول اور نامناسب دوست، فطرت کے معصوم چہرے پر ایک حجاب اور پردے کی صورت میں ڈال دیتے ہیں اور انسان ان مادی افکار میں اتنا غرق ہوجاتا ہے کہ فطرت کا نوران افکار کے پردے میں چھپ جاتا ہے۔

ب: مُربی اور اُس کی شرائط

مُربی کو مختلف شرائط کا حامل ہونا چاہیے ان میں دو شرطیں سب سے زیادہ اہم ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ مربی کو اس چیز کی خصوصیات سے، جس کی تربیت کی اس نے ذمہ داری قبول کی ہے مکمل طور پر آگاہ ہونا چاہیے۔ مثلاً جب تک باغبان درخت زمین اور ان کی جملہ ضروریات پرورش سے کاملاً آگاہ نہ ہوگا اس کی ساری زحمتیں بیکار رہوں گی۔ یہی حال بچے کی تربیت کرنے والے کا ہے جب تک وہ بچے کے مخفی میلانات ورجانات اور ان کی نشوونما میں حائل رکاوٹوں سے آگاہ نہ ہوگا اس کی تمام کوششیں بے کار اور بے معنی ثابت ہوں گی۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا اپنے قول پر مکمل ایمان ہو اور عمل بھی قول کے مطابق ہو۔ اگر اس کے عمل اور قول میں اختلاف ہوگا تو بچے

---

[1] التاج الجامع للاصول ج ۴ ص ۱۸۱، تفسیر برہان ج ۲ ص ۱۶۲ حدیث ۵

کی تربیت جس کے آنکھ اور کان مربی کی رفتار و گفتار کی طرف متوجہ ہیں ہرگز موثر انداز میں ممکن نہ ہوگی۔ مربی کی رفتار و گفتار میں اختلاف سے تربیت کی تمام کوششیں نقش بر آب ثابت ہوں گی۔ اسی لئے قرآن ایک باایمان معاشرے سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝۲ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝۳ (صف)

''ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو۔ جس پر عمل نہیں کرتے، خدا کے نزدیک یہ بات حد سے زیادہ ناپسندیدہ ہے کہ تم وہ بات کہو جس پر خود عمل نہ کرو۔''[1]

اس سلسلہ میں بہترین اور واضح ترین نمونہ پیغمبر اکرمؐ کا اپنا عمل ہے۔ آپ جو کچھ کہتے تھے اس پر بعینہٖ عمل فرماتے تھے۔ مثلاً اگر آپ لوگوں کو نصف شب کی عبادت کی تاکید کرتے تھے تو نصف شب میں خود اس قدر نماز پڑھتے تھے کہ آپ کے حق میں ذیل کی آیات نازل ہوئیں۔

طٰهٰ۝۱ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى۝۲ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى۝۳ (طٰه: ۲،۳)

''اے طٰہٰ! (پیغمبر گرامی کا نام ہے) ہم نے قرآن اس لیے تو نازل نہیں کیا کہ تو خود کو زحمت میں ڈال دے بلکہ یہ تو ان لوگوں کی نصیحت کے لیے ہے جو (خدا کا) خوف رکھتے ہیں۔''

اگر رسولِ اکرمؐ لوگوں کو جہاد اور دشمن سے جنگ کرنے کا حکم دیتے تھے، تو خود میدانِ کارزار میں دشمن سے اتنے قریب ہوتے تھے کہ امیر المومنینؑ آنحضرتؐ کے بارے میں فرماتے تھے۔ ''میدانِ کارزار میں، آنحضرتؐ دشمن سے سب سے زیادہ نزدیک ہوتے تھے۔''

یہی صورت آنحضرتؐ کے دیگر نورانی طریقِ کار کی ہے کہ آپ سب سے پہلے خود اپنے اقوال کا نمونۂ عمل پیش کرتے تھے۔[2]

☆☆☆

[1] آیت کے دوسرے حصہ کا ترجمہ فارسی متن میں موجود نہیں ہے مگر جب آیت لکھی ہے تو ترجمہ بھی ہونا چاہیے

[2] نہج البلاغۃ، کلمات قصار بخش غریب شمارہ ۹

(۲۵)

انسان کا اختیار و آزادی از روئے قرآن

مفکرین کے نزدیک انسان کے اختیار و آزادی کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ ہر فلسفی چاہتا ہے کہ انسان کی فطرت کا ''جبر'' و ''اختیار'' کے لحاظ سے مطالعہ کرے۔ اسی طرح عام آدمی بھی چاہتا ہے کہ وہ اپنے اور دیگر افراد کے بارے میں معلوم کرے کہ کیا وہ زندگی کے کاروبار میں آزاد ہے، اور ہر کام پوری آزادی اور رغبت سے انجام دیتا ہے، یا کیا کوئی ایسی ہستی ہے جس کو کسی قسم کی کارکردگی کا کوئی اختیار و آزادی نہیں، بلکہ کوئی مرئی یا غیر مرئی عامل اسے ارادہ اور عمل پر آمادہ کرتا ہے۔

ایک عام آدمی کی تلاش و جستجو اور ایک مفکر کی علمی و فلسفیانہ کاوش میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر مسئلہ کے بارے میں زیادہ وسعتِ نظر نہیں رکھتا۔ وہ اپنے تخیلاتی نقطۂ نظر سے یا فطری طور پر دوزاویوں سے مسئلہ کی طرف دیکھتا ہے۔ جبکہ ایک فلسفی مختلف زاویوں اور مخصوص تحلیل و تجزیہ کی رُو سے مسئلہ پر غور و خوض اور تحقیق کرتا ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ بھی فلسفہ کے دیگر مسائل مثلاً انسان کی روح کیا ہے؟) کی طرح انسان کو درپیش رہا ہے، اور انسان اس کی تحقیق کے سلسلہ میں دل چسپی لیتا رہا ہے۔ اگرچہ اس تحقیق کی کیفیت ہمیشہ ایک طرح یکساں نہیں رہی۔

''جبر'' واختیار کا مسئلہ ایک اور لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے وہ یہ کہ بہت سے علومِ انسانی اسی صورت میں قابلِ عمل ہیں کہ مذکورہ مسئلہ کسی رُخ پر سمجھ میں آجائے۔ یہ علوم خصوصیت کے ساتھ وہ ہیں، جو انسان کو ایک مکلف اور ذمہ دار فرد کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ انسان بعض اعمال بجالائے اور بعض سے دور رہے یہ مطالبہ اس بناء پر ہے کہ اس طریقہ سے انسان تکمیل وارتقاء کی راہ کو طے کرتا ہے اور اپنے نقائص کو دور کرتا ہے۔

لہٰذا ان علوم کے ماہرین، انسان کے لیے اختیار اور کامل آزادی یا کم از کم کسی قدر آزادی کے معتقد نہ ہوں تو انسان کی روح کو بلند کرنے اور ترقی دینے کی ہر کوشش نقش بر آب ثابت ہوگی اور اس کے اعمال کے لیے جزا و سزا کا تعین ہرگز درست نہ ہوگا۔

مسئلہ میں علتِ ابہام

اس مسئلہ میں پیچیدگی اور ابہام کا سبب یہ ہے کہ انسان ایک طرف تو اپنے اندر جبر کی علامات اور نشانیوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور دوسری طرف اختیار و آزادی کی واقفیت کو بھی محسوس کرتا ہے۔ پس وہ حیرت و سرگردانی میں بسر کرتا ہے۔ تاوقتیکہ مسئلہ کے دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو اختیار نہ کرلے۔

مثلاً ایک طرف تو وہ مشاہدہ کرتا ہے کہ ہرگز اپنے اختیار اور آزادی کے ساتھ اس دنیا میں نہیں آیا یعنی اپنی خواہش کے بغیر اس نے ایک خاص نظام کے اندر ہوش سنبھالا اس کے اختیار کے بغیر ہی 'وراثت' تمدن اور ماحول جیسے عوامل نے اس کی فطرت میں خاص قسم کے اثرات

پیدا کر دیئے ہیں۔نتیجہ کے طور پر اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی یا پیدا ہونے کے بعد ان عوامل کے زیر اثر اس نے ایک حد تک ایک وجودِ مجبور کی حیثیت اختیار کر لی ہے جس کی وجہ سے اُسے ایک خاص راستہ پر ہی چلنا پڑے گا۔اس کے برعکس اگر وہ آزادِ مطلق ہوتا اور اُسے پورا پورا اختیار ہوتا تو اس قسم کے خارج از اختیار عوامل اس کے وجود پر قابو نہ پاتے۔یہ مسئلہ کا ایک پہلو ہے۔

دوسری طرف وہ ہوش سنبھالنے غور وفکر کرنے ،ادراک وتعقل کے مرتبہ تک پہنچنے اور بالغ ہوجانے کے بعد حقیقتِ آزادی کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہے اور اپنے آپ کو کسی کام کی انجام دہی سے لاچار و مجبور نہیں پاتا۔

یہ سمجھنے میں وہ حق بجانب ہے کہ اس نے کسی اختیار کے بغیر دنیا میں قدم رکھا ہے اور ایک ایسے نظام کے تحت پرورش پائی ہے جس میں اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ۔لیکن اب اس نے زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور اب وہ زندگی کی مشکلات وموانع کا مقابلہ کر کے جس طرف چاہے زندگی کا رخ موڑ سکتا ہے۔

آزادی کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ انسان کی تمام وجودی خصوصیات پیدائش سے لے کر موت تک بالکل اس کے اپنے ختیار میں ہوں ، یا اپنی مرضی سے پیدائش ورشد وتربیت کے جملہ عوامل کو مکمل آزادی کے ساتھ اختیار کر لے، بلکہ اس کی اصلیت یہ ہے کہ انسان خود کو ہاتھ اور دل کی حرکت اول کیلئے ذمہ دار اور بااختیار سمجھے، جبکہ حرکت آدھے راستے میں ہی اپنے آپ کو ہر کام کیلئے بااختیار وآزاد سمجھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ زندگی کے مختلف ادوار میں بہت سی کیفیات انسان کے اختیار سے باہر ہوتی ہیں۔اکثر اوقات انسان آگ کی لپیٹ میں یا زلزلہ اور سیلاب کی زد میں آجاتا ہے۔ یا اپنی خواہش کے خلاف خونین جنگوں میں پھنس جاتا ہے،لیکن اس کے باوجود وہ بعض امور میں اپنے اختیار وآزادی کا احساس کرتا ہے اور اپنے ارادہ کے پورا ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں پاتا۔لہٰذا ان کاموں کے بارے میں جو اس کے اختیار سے باہر ہوتے ہیں وہ کسی قسم کی ذمہ داری یا سزا وجزا کا تصور نہیں رکھتا۔اس کی ذمہ داری صرف انہی کاموں سے متعلق ہے جو بالکل اس کے اپنے اختیار میں ہوں اور وہ حالات کی مہار کو جدھر چاہے موڑ سکتا ہو۔

یہ مسئلہ کب پیدا ہوا

جبر واختیار کا مسئلہ کب وجود میں آیا اس کیلئے کوئی قطعی تاریخ معین نہیں کی جاسکتی ۔جس دن سے انسان نے اپنی فطری صلاحیت میں غور وفکر کیا اسی دن سے یہ مسئلہ اس کے سامنے چلا آرہا ہے اس بناء پر کہنا پڑے گا کہ تمام تمدنوں میں اعمال کے سلسلہ میں انسان کے بااختیار ہونے کا مسئلہ موجود رہا ہے۔

اسلامی تمدن میں انسان کے جبر واختیار کے مسئلہ پر بحث وتحقیق میں بہت وقت صرف ہوا ہے اور حکماء و متکلمین نے اس سلسلہ میں خوب بحثیں کی ہیں۔

بعض متکلمین جبر کی طرف مائل ہوگئے ہیں۔اور انھوں نے افعالِ انسانی میں اختیار کے جلوؤں کو بے اہمیت قرار دے دیا ہے۔جبکہ بعض دیگر حضرات اس موقف کے قائل ہوگئے ہیں کہ انسان اپنے افعال واعمال میں مکمل طور پر بااختیار ہے،اور انجامِ کار فلسفہ وکلام کے میدان

میں دو متضاد نظریات قائم ہو گئے، جبکہ اس سلسلہ میں ایک تیسری راہ بھی موجود ہے جو دونوں نظریات کے اختلافات کو ختم کر سکتی ہے۔ یہ تیسری راہ ''جبر و تفویض'' کے درمیان کی وہی راہ ہے جس کی قرآن وسنت میں تصریح ہوئی ہے اور فلسفیانہ دلائل بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ ہم دونوں مکاتبِ فکر میں تحقیق پیش کرنے کے بعد تیسرے نظریہ جبر و تفویض کو ''نظریۂ بین الامرین'' کے طور پر پیش کریں گے۔

قارئین کرام کو اس بحث کے بڑے بڑے مطالب سے آگاہ کرنے کی غرض سے ہم یاد دہانی کرائے دیتے ہیں کہ مندرجہ ذیل مکاتبِ فکر پر جن میں سے بعض تو انسان کی حریت وآزادی کے قائل ہیں اور بعض جبر کے مدعی ہیں ہم بالترتیب تحقیق پیش کریں گے۔

۱: مکتبِ وجودیت میں حریت وآزادی

۲: مکتبِ الٰہیات (اشاعرہ) کے نزدیک اہمیتِ جبر۔

۳: مکتب مادیین میں مقامِ جبر۔

۴: مکتبِ معتزلہ کے نزدیک انسان کے مکمل اختیار و تفویض کی کیفیت۔

۵: ''امر بین الامرین''۔

انسان اور سلسلۂ امورِ متحرک

انسان کی آزادی واختیار ایسے مسائل میں سے ہے جنھوں نے ماضی وحال میں فلاسفہ اور مفکرین کے ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کیے رکھا ہے جس کے نتیجہ میں ایسے مکاتبِ فکر پیدا ہوئے ہیں جو افراط وتفریط کا شکار ہو گئے ہیں۔

ان میں ایک مسئلہ وجودیت EXISTENTIALISM ہے جو انسان کے اختیار و آزادی میں اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ انسان کے ہر قسم کے فطری وطبیعی میلانات کے اثبات کو بھی اس کی آزادی کے منافی سمجھتا ہے۔ اس نظریہ کے مدعی دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان کے وجود کے لیے کسی قسم کا پہلے سے بنایا ہوا قالب (فطرت وسرشت کی صورت میں بھی) موجود نہیں ہے۔ حتیٰ کہ وجودِ انسان اس کی ماہیت وفطرت پر مقدم ہے۔ لہٰذا ہر قسم کا رنگ اور خصوصیت جسے انسان اپنے لیے اختیار کرتا ہے اس کے عمل وسعی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ درحقیقت افعال واعمال ہی انسان کو بنانے والے ہوتے ہیں۔

''امیل دورکھیم'' اگرچہ ماہرین وجودیت EXISTENTIALISM کی طرح ہی انسان کے لیے ہر قسم کی طبیعی اور فطری اقدار کا منکر ہے، تاہم وہ ان کے برعکس جو انسان کے لیے آزادیٔ کامل کے دعوے دار ہیں 'جبرِ اجتماعی' کا معتقد ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے دو پہلو ہیں، ایک جسمانی جسے وہ ''انسانِ جسمانی کہتا ہے۔ اور دوسرا اجتماعی جسے وہ 'انسانِ اجتماعی' کا نام دیتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ انسان کے زیادہ تر پہلو اس کی اجتماعی زندگی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس طرح انسان اپنی اجتماعی کیفیات کا ساختہ و پرداختہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے افکار ونظریات و میلانات، نیز اس کی اخلاقی روش کے طور طریقے معاشرہ سے جنم لیتے ہیں۔

مسلمانوں کی ایک جماعت نے جسے 'اشاعرہ' کہتے ہیں، انسان کے افعال واعمال کے بارے میں ایسا نظریہ پیش کرتا ہے جس کے

تحت انھوں نے انسان کا ایک ''فاعلِ مجبور کے طور پر تعارف کرایا ہے، اگر چہ وہ اپنی زبان سے اس بات کا اعتراف نہیں کرتے۔

دوسرے اسلامی فرقے، خصوصاً فرقۂ امامیہ، دلائلِ عقلی، فلسفی اور قرآن وسنت کی پیروی میں انسان کو ایک آزاد و با اختیار فرد جانتے ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے بہت سے رسالے بھی تحریر کیے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں پہلے تو ''وجودیت'' کے نظریہ کے بارے میں گفتگو کریں گے اور اس کے بعد دیگر نظریاتِ جبریہ کا تجزیہ پیش کریں گے۔

فطری میلانات وانجذاب

انسان میں میلانات، طبیعیات اور قوتِ جاذبہ کا وجود اس بات کا شاہد ہے کہ وہ ایک سفید کاغذ کی طرح جس میں کوئی نقش نہ بنایا گیا ہو، پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی خلقت پہلے دن سے ہی تحرکات ورجحانات کے ایک سلسلہ سے عبارت ہے۔ جن میں سے ہر ایک اُسے کسی جہت میں حرکت کے لیے ابھارتا ہے۔ ان رجحانات میں سے بعض تو مادی وحیوانی اور اصطلاح کے مطابق انسان کی ملکی اقدار سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض دیگر اس کی روحانی اقدار سے مربوط ہوتے ہیں۔ ان دونوں انواع میں امتیاز کوئی مشکل کام نہیں۔

ان رجحانات کا اعتراف اور یہ امر کہ انسان کی خلقت اندرونی میلانات کے ایک سلسلہ کے ساتھ مربوط ہے ایک سوال پیدا کرتا ہے، کہ کیا ان فطری اقدار کا وجود حریتِ انسان کو سلب تو نہیں کرتا اور انسان کو رجحانات کے چنگل کا اسیر تو نہیں بنا دیتا؟

کیا آزادی واختیار کی حفاظت کے لیے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم ہر قسم کی فطری قیود کا، جو انسان کے لیے حدود اور راہِ عمل کا تعین کرتی ہیں انکار کردیں، اور اس کے لیے اس کی کوشش وعمل سے حاصل کردہ اقدار کے علاوہ کسی قسم کی ماہیت کے قائل نہ رہیں۔

اس سوال کا جواب واضح طور پر نفی میں ہے، کیونکہ یہ فطری اقدار انسان میں ایک قسم کا میلان اور انجذاب پیدا کرتی ہیں نہ یہ کہ اس کی آزادی کو سلب کرتی ہوں۔

درحقیقت یہ اقدار تو انسان کو شوق دلاتی اور قوتِ تحریک کا باعث ہوتی ہیں نہ کہ اسے مسخر کرتی ہیں۔ یہ سب کی سب طبیعات انسان کے ارادہ کے ماتحت ہوتی اور اس کی مددگار بنتی ہیں، اس پر حاکم اور مسلط نہیں ہوتیں۔ انسان ان کی پیروی مخالفت، رہبری، آسودگی یا سیری کے میلانات میں ہر ایک صورت کے اختیار کرنے میں کامل طور پر آزاد وخود مختار ہے۔ انسان کے ہر معقول فعل کی بنیاد اس کے ارادہ وخواہش پر ہے جو اس کی حریت وآزادی کی قوت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مقدمات پر اعتقاد سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان کو بنیادی طور پر ہی ایسے ساختہ و پرداختہ وجود کا مالک سمجھ لیا جائے جو اپنی ایسی اقدار کا اسیر ہو جو اسے ہر لحاظ سے پہلے سے معین شدہ راستہ پر چلائیں۔ ہم مکتب جبریہ پر تنقید کے بعد ''مثلث شخصیت'' کی تاثیر کی بنیاد کے بارے میں بحث کریں گے۔

ہم اس بحث میں دو متضاد مکاتبِ فکر کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ایک مکتبِ 'وجودیت' (EXISTENTIALISM) ہے جو آزادیٔ عمل کو ثابت کرنے میں اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے فطری محرکات اور باطنی میلانات کا بھی منکر ہو گیا ہے، مبادا کہ اس قسم کے

بعض ذاتی میلانات کا اثبات سلبِ آزادی کا سبب بن جائے۔[۱]

دوسرا نظریۂ جبر ہے جو انسان سے ہر قسم کے اختیار و آزادی کو سلب کرتا ہے، جبکہ قرآن دونوں مکاتبِ فکر کی مخالفت کرتے ہوئے انسان کے لیے فطری امور کے ایک سلسلہ کی پابندی کا اعتراف کرنے کے باوجود اُسے آزاد و خود مختار قرار دیتا ہے۔

اب ہم دونوں مکاتبِ فکر کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

مسئلہ وجود اور اس کی بنیاد

یہ مکتبِ فکر دورِ حاضر کے مکاتب میں ایک مشہور مکتب ہے۔ اس کے مباحث کا ایک حصہ انسان سے متعلق ہے، پھر انسان کے بارے میں اہم ترین بحث اس کی حریت و آزادی سے تعلق رکھتی ہے۔

یہ نظریہ انسان کی آزادی کی حفاظت کے لیے باطنی کیفیات اور بنیاد کے اعتقاد کا انکار کرتا ہے اور انھیں انسان کی آزادی کے محدود ہونے کا سبب قرار دیتا ہے اس نظریہ کے مطابق فعل و عمل ہی انسان کی شخصیت بنانے کے اصلی عامل قرار پاتے ہیں، اس سلسلہ میں داعی ہے کہ:

''انسان کا وجود اس کی ذات اور فطرت پر مقدم ہے۔''

لہٰذا......

اولاً: انسان کی شخصیت یا اس کے وجود کے ظاہر ہونے سے پہلے اس کے بارے میں کسی قسم کا خاکہ یا عقیدہ موجود نہیں ہوتا، اور[۲]

ثانیاً: ہم خود اپنی ذات کو اپنے آزادانہ اختیار سے اور اپنے ارادے کی تبدیلی سے بناتے ہیں۔[۳]

☆☆☆

انسان کی عمومی اور خصوصی ماہیت

جس مقام پر ماہرینِ وجودیت نے لغزش کھائی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے انسان کی عمومی و طبیعی ماہیت، جس پر اس کی خلقت ہوئی ہے اور ماہیت خصوصی کے درمیان جسے وہ اپنے عمل و سعی سے بناتا ہے کوئی امتیاز نہیں رکھا، بلکہ آزادی کے تحفظ کی خاطر فطری امور کا بھی انکار کر دیا ہے۔

انسان دو قسم کی طبائع کا مالک ہے:

---

[۱] یہ مکتب مغرب میں مشرق کے تفویض و جبر بر انسان کے نظریہ کا جانشین ہے۔ ہم وجودیت اور جبر پر تنقید کرنے کے بعد مکتبِ تفویض پر بھی گفتگو کریں گے۔

[۲] اس سے مراد فطرتِ الوہی ہے۔ ہم اس سلسلہ میں بعد میں بحث کریں گے۔

[۳] عنصر تجزیہ و تحلیل ص ۱۲۵

۱: عمومی طبیعت

وہ طبیعت جس کو لے کر انسان پیدا ہوتا ہے۔ یہ انسان کے عمل و سعی سے پیدا نہیں ہوتی۔ یہ وہی طبیعی استعداد اور شائستگی ہوتی ہے اور زیادہ صحیح تعبیر کے مطابق مواہبِ خداوندی ہے جو انسان کو عطا ہوتی ہے۔ یہی استعداد انسان کو ایک سلسلۂ میلانات کے ساتھ آراستہ کرتی ہے لیکن ان میلانات کی تسخیر اور ان سے فائدہ اٹھانے کا طریق کار نفس کے سپرد کر دیا گیا ہے جو صحیح راہ کا انتخاب کرتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ محرکات انسان کے وجود میں ایک قسم کی محدودیت پیدا کر دیتے ہیں، لیکن یہ سب تشویش و تحریک پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہیں اور یہ آزاد اور انتخاب کرنے کے قابل نفس ہی ہے جو ان محرکات سے مختلف صورتوں میں فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے میلانات وہ سرمایہ ہوتے ہیں جن کو نفس اپنے دائرۂ اختیار کے مطابق منتخب کرتا ہے اور وہ ان سے مختلف صورتوں میں فائدہ اٹھا سکتا ہے اور میلاناتِ منفی کی مخالفت کر کے ان کی سرکوبی بھی کر سکتا ہے۔

یہ حقیقت اسی صورت میں واضح ہوتی ہے کہ ہم اس بات پر توجہ دیں، کہ انسان کا وجود دو مختلف اور متضاد اقدار (جو فلسفیانہ تضادات ہیں نہ کہ منطقی) سے خمیر ہوا ہے۔ یعنی انسان میں مختلف قسم کی خوفناک قوتیں شعلہ ور ہیں۔ یہی وہ قوتیں اور رجحانات ہیں جو (انسان کی آزادی کے سائے میں) اُسے تکمیل وارتقاء کی چوٹی تک پہنچاتی ہیں یا پھر درندوں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہیں۔

انسان کی آزادی کی حفاظت کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ ہم انسان کی طبیعی موجودات کے برخلاف جو پہلے سے بنی ہوئی منظم و مشخص ماہیت کی حامل ہوتی ہیں، ایک ایسا وجود سمجھنے لگیں، جس کی اپنی کوئی ماہیت نہ ہو، اور نہ خیال کر لیں کہ انسان کی ماہیت وہی ہے جسے وہ عمل وسعی سے بناتا ہے۔ اس سلسلہ میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ہم اس کی تمام اقدارِ وجودی کو ازلی نہ سمجھیں، بلکہ ان کے ایک حصہ کو جسے ہم ماہیتِ خصوصی کہتے ہیں اس کے عمل کا ماحصل تصور کریں۔

۲: ماہیتِ خصوصی

انسان کی ماہیتِ عمومی کا کوئی خاص صورت اختیار کرنا، اس کی شخصی کوشش اور ارادہ کی مدد سے ہوتا ہے۔ اس امر کا تعلق اس بات سے ہے کہ انسان ان طبیعی کیفیات سے کس طرح فائدہ اٹھاتا ہے، اور انھیں کس طرح استعمال کرتا ہے۔ ماہیت کی یہ قسم انسان کے عمل وسعی کا ہی نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ کسی طرح پہلے سے بنی ہوئی یا پہلے سے مقدر شدہ نہیں ہوتی۔ اس ماہیت کی بلندی و پستی یا خوش بختی اس حصہ کے ساتھ مربوط ہوتی ہے۔

ہم اس حقیقت کی ایک مثال کے ذریعہ وضاحت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت جو درحقیقت انسان کی ماہیتِ عمومی کا ایک حصہ ہے انسان کی حریت و آزادی ہے۔ اس کے بارے میں یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ انسان نے اس آزادی کو اپنے عمل وسعی کے ذریعہ حاصل کیا ہے بلکہ یوں کہنا ہوگا کہ انسان فطرت کے قانون کے مطابق پیدائشی طور آزاد ہے۔ انسان دیگر جانداروں کی مانند نہیں ہے جو کوئی

اختیار نہیں رکھتے اور فطرتاً محکوم و بے اختیار ہوتے ہیں۔

یہاں اس کی عمومی ماہیت کا ایک حصہ حریت و آزادی کے تصور سے تشکیل پاتا ہے۔ اس قسم کی محدودیت نہ صرف یہ کہ اس سے آزادی کو سلب نہیں کرتی بلکہ وہ اس کو دوسرے جانداروں سے ممتاز وجود کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ تاکہ وہ اپنے دائرۂ اختیار میں شامل تمام افعال کو اپنے اختیار سے بروئے کار لائے۔

اس عنایت کے علی الرغم اس کے پاس تکوینی محرکات و ہدایت کا ایک سلسلہ بھی ہوتا ہے، جنھوں نے اس کے وجود کو پہلے سے ہی ایک خاص طریق پر بنایا اور محدود کیا ہوا ہوتا ہے۔ مثلاً:

(خوراک، پوشاک اور مسکن کے حصول کے میلانات، دشمن سے دفاع کا جذبہ، جنسی امور کی کوشش، جمال و ہنر کے میلانات، جاہ طلبی، حیثیتِ مقام، احترام خواہی، حق طلبی، حقیقت خواہی، علم و آگہی کا شوق، فطری خیر خواہی، تلاشِ عدل اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی طرف رجحان) یہ سب رجحانات دو دھاری تلوار یا دورُخ والے سکہ کی مانند ہوتے ہیں جو سعادت آفرین ہونے کے ساتھ بدبختی کا باعث بھی ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے تحرکات اور رجحانات پر اعتقاد انسان کو نہ تو ازل سے پختہ وار وجود کا مالک بناتے ہیں اور نہ ہی اسے خواہشات کا اسیر بناتے ہیں۔ کیونکہ انسان کے تمام میلانات ایک با اختیار اور طاقتور نفس کے ماتحت ہوتے ہیں۔ یہ طاقتور نفس ہی ہے جو ان سے جس طرح چاہتا ہے کام لیتا ہے اور ان کو قابو میں قابو رکھتا ہے۔

''ژان پال سارتر'' (فرانسیسی مفکر) اپنی ان تمام کوششوں کے باوجود جو اس نے حدود کے سلسلہ میں کی ہیں، کسی ایسی حدودِ انسانیت کا جو عالمِ وجود میں متعین ہیں انکار نہیں کر سکتا۔ مثلاً

عالم میں انسان کا وجود؟

دنیا میں انسان کی کارکردگی؟

معاشرے میں انسان کی زندگی؟

اور انجامِ کار انسان کی فنا

یہ انسان کی ان صفات کا ایک سلسلہ ہے جو اس کے وجود کی حدود کو محدود اور مشخص کرتی ہیں۔

اگر بنیاد اسی بات پر ہو کہ انسان کا وجود ان حالات کی وجہ سے محدود و مشخص ہوتا ہے تو پھر انسان کو مادی و طبیعی قوانین کا محکوم ماننا ہوگا، یعنی ہرگز اپنے آپ کو ان قوانین کی حدود سے نہیں نکال سکے گا۔ ہم ان قوانین کو خلقت و آفرینش کے قوانین کا نام دیتے ہیں۔ یہ قانون وجودِ انسانی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں انسان ان قوانین کی حدود کے خلاف ہرگز مبارزہ نہیں کر سکتا۔ نہ یہ ممکن ہے کہ انسان کارزارِ حیات میں ان قوانین سے الگ ہو کر زندہ رہ سکے۔

اب موقعہ آ گیا ہے کہ ہم مکتبِ جبریہ کی وضاحت کریں۔ مکتب جبر کی درج ذیل دو صورتیں ہیں۔

۱: جبر سے متعلق موحدین کا نظریہ۔

۲: جبر بہ نظریۂ مادیین۔

عام طور پر مکتب جبر کے داعی ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق ظاہر نہیں کرتے۔ اور دونوں صورتوں سے متعلق دلائل کو آپس میں خلط ملط کر دیتے ہیں، حالانکہ اس بارے میں موحدین کے استدلال کا طریقہ مادیین کے استدلال سے بالکل الگ ہے۔ ان کے اختلاط سے بچنے کے لیے ہم دونوں صورتوں کو الگ الگ پیش کرتے ہیں۔

۱: موحدین کا نظریۂ جبر

لفظ 'آزادی' ان قوموں کے لیے جو سالہا سال سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں اور اب وہ ان زنجیروں کو توڑنے کی سعی میں مصروف ہیں۔ مقدس ترین اور دلکش ترین لفظ ہے، جو ان کے کانوں تک کبھی پہنچا ہو۔ ان اقوام کے نزدیک اس آزادی کا مفہوم جس کے بارے میں وسیع وطویل بحث ہوسکتی ہے۔ صرف سیاسی آزادی اور ''مدنی آزادی ہے جس میں وہ اپنی اجتماعی زندگی کو مکمل طور پر اس طرح اپنے اختیار میں لے لیں کہ دوسرے لوگ ان کی اجتماعی حیات کو چلانے کی راہ متعین کرنے کے ذمہ دار نہ ہوں۔

اس قسم کی آزادی خدا کی بہت بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، جسے ظالم اور طاقتور اقوام اپنی قوت وانا اور تنگ نظری کی بناء پر دوسرے انسانوں سے چھین لیتے ہیں۔ شاعرِ شیریں سخن 'خاقانی' نے کیا خوب کہا ہے۔

نعمتی　بہتر　از　آزادی　نیست

بر　چنیں　مائدہ　کفراں　چہ　کنم

آزادی سے بہتر اور کوئی نعمت نہیں ہے۔ مَیں ایسے دسترخوان پر ناشکری کیوں کروں۔

اس قسم کی آزادی کے حصول اور اس کی حفاظت کے لیے بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے، قربانی وجانبازی کے بغیر اُسے حاصل کرنا یا اس کی حفاظت کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ایران کا مشہور شاعر 'فرخی' کہتا ہے:

رسم　و　رہِ　آزادی　یا　پیشہ　نباید　کرد

یا　آنکہ　ز　جانبازی،　اندیشہ　نباید　کرد

یا تو آزادی کی سعی کو ہی اختیار نہ کرنا چاہیے۔ یا پھر جانبازی اور قربانی سے خوف نہ کرنا چاہیے۔

اگر محروم اور مصیبت زدہ قوموں کے لیے آزادی سے مُراد صرف ''مدنی وسیاسی'' آزادی ہی ہے، تو علماء اخلاق اور استادانِ تہذیبِ نفس اسی موضوعِ آزادی سے نفس کی غلامی سے آزادی، ہوا وہوس سے رہائی اور لامحدود خواہشات سے انسانی شخصیت کی حفاظت مُراد لیتے ہیں۔

علماء کی یہ دانش مند جماعت انسان کے وجود میں اس کی اندرونی خواہشات کو اعتدال پر رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر یہ دانشور اس انسان سے جو قوائے الٰہی اور نفسیاتی توانائیوں کا آمیزہ ہے ایسا وجود پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جسے وہ انسانِ کامل کہہ سکیں۔ کیونکہ درحقیقت انسانِ کامل وہ انسان ہوتا ہے جو نفس کی غلامی سے اپنے آپ کو آزاد کر کے خدا کا بندہ بن جائے اور اس کے حیات بخش اور کمال آفریں فرامین پر عمل کرے۔

علماءِ اخلاقیات کے مطابق شہوت کا غلبہ، حصولِ خواہشات کو مطمعِ نظر بنانا اصولِ آزادی کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت ہے کہ ایسا آدمی ہوا و ہوس کا اسیر ہوتا ہے، اور خود اپنے لیے اختیار و آزادی نہیں رکھتا۔ اس سلسلہ میں عنصری[1] کہتا ہے۔

برخرد خویش، برستم نتواں کرد
خویشتن و خویش را دژم نتواں کرد
قانع بنشیں و ہرچہ داری پسند
تا زادی و بندگی بہم نتواں کرد
دانش و آزادگی و دین و مروت
ایں ہمہ را بندہ درم نتواں کرد

ترجمہ: اپنی عقل پر ظلم نہ کر۔ اپنے آپ اور اپنوں کو مصیبت میں نہ ڈال۔ قناعت سے بیٹھ اور جو کچھ رکھتا ہے اسے پسند کر۔ کہ آزادی اور غلامی اکٹھا نہیں ہوسکتیں۔ عقل و آزادی و دین و مروت۔ یہ سب دولت کے غلام نہیں ہوسکتے۔

لیکن ایک فلسفی کے سامنے، جس کا کام جہان و انسان کی پہچان کرنا ہے۔ آزادی کی ایک اور قسم ہے جسے ''فطری و باطنی آزادی'' کہنا چاہیے۔ اگر اس کے وجود و ہستی کے لیے ایک حد اور اندازہ مدنظر رکھنا مقصود ہو تو پھر اس کو اس صفت کے ساتھ موصوف کرنا چاہیے کہ وہ ایک مختار، صاحبِ ارادہ، حُر اور آزاد وجود کا مالک ہے۔

اگر دنیا میں تقدیر و فطرت کوئی چیز ہیں اور جبر الٰہی انسان کے بارے میں صادق آتا ہے تو پھر اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ انسان کو ہر طرح آزاد ہونا چاہیے۔ اور اسے مکمل آگاہی اور آزادی کے ساتھ اپنے امور کو انجام دینا چاہیے۔

اگر مشیت الٰہی انسان کے بارے میں کوئی تعلق رکھتی ہے تو یہ تعلق اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ انسان اپنے کاموں کو آزادی اور خود مختاری کے ساتھ انجام دے۔

---

[1] عنصری متولد تقریباً ۳۰۵ و متوفی ۴۳۱ھ

باطنی آزادی سے مراد یہ ہے کہ انسان ذاتی اور طبعی طور پر کسی چیز کا انتخاب کرنے یا ترک کرنے اور چھوڑنے میں مکمل طور پر آزاد ہے اور اس کا ہاتھ ہر کام کے اختیار کرنے یا ترک کرنے کے لیے مکمل طور پر کھلا ہوا ہے۔

اختیار و آزادی انسان کی خلقت کے ساتھ اس طرح سے خمیر ہوئی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اس کیفیت سے جس قدر دور رکھنا چاہے گا، اتنا ہی غیر شعوری طور پر اس کے لیے استحکام اور استواری کا باعث ہوگا۔

دوسرے لفظوں میں انسان کی آزادی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایک نعمت ہے جو اسے عطا کی گئی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ انسان نے خود سے اسے حاصل کیا ہے۔

انسان کو اپنی اس باطنی کیفیت کو ثابت کرنے کے لیے وجدان اور ادراکِ باطنی کے سوا اور کسی دلیل و گواہ کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ہر شخص کسی عمل کے انجام دینے میں میل و رغبت کے باوجود اپنے آپ کو اس کے ترک کر دینے یا اختیار کرنے کے لیے مکمل طور پر قادر و توانا جانتا ہے۔

حصولِ آزادی کے لیے آزادی کا انکار

وہ گروہ جو اپنے وجدان ہی سے نبرد آزما ہے، اختیار و آزادی کا، جو انسان کی قدر و منزلت کا سبب اور حیوان و انسان کے درمیان حدِ فاصل ہے، انکار کرتا ہے ان کا خیال ہے کہ انسان زندگی کے ماحول میں بعض پراسرار عوامل کے زیر اثر مجبور ہے جو اسے کسی مخصوص سمت میں چلاتے ہیں اور وہ اپنے اختیار و آزادی سے اس طرف قدم نہیں اٹھاتا۔ یہ لوگ اجتماعی، سیاسی اور اخلاقی مفادات کے ایک سلسلہ کی بناء پر اس قسم کے خیال کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اور اس تخیل کے زیرِ سایہ یہ چاہتے ہیں کہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے عمل و فعل میں اس کی زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کریں۔ جس میں نہ تو کوئی صاحب خرد ان کی مذمت کرے اور نہ ہی معاشرہ کے اربابِ اختیار ان کا پیچھا کریں۔ یہ اس لیے ہے کہ یہ لوگ اپنے خیال میں اپنے افعال کی انجام دہی میں اس کے بغیر اختیار و آزادی نہیں رکھتے۔

اگر کوئی جماعت اپنے قبیح اعمال کی ''وقتی جنوں'' یا غلبۂ احساسات کے ساتھ توجیہہ کرتی ہے، تو یہ لوگ دراصل اپنے تخیلاتی اور فلسفیانہ قیافہ کی مدد سے جرم کی جڑ کو کاٹ دینا چاہتے ہیں، تاکہ ان کے اعمال میں جرم و گناہ کا کوئی مفہوم ہی باقی نہ رہے۔

انسان میں کیفیت آزادی کے انکار سے اس بات سے قطعِ نظر کہ یہ ایک وجدانی حالت کا انکار ہے جس کا کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا، نتائج کا ایک سلسلہ لازم آتا ہے جن کا ایک مکتبی انسان متحمل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً:

مفاسدِ جبر

۱: انسان میں اصل آزادی کا انکار تمام انسانی اقدار کے سقوط کا سبب بن جائے گا۔ اس کے نتیجہ میں نیکوکار و بدکار، ظالم و مظلوم، خدمت گذار اور مجرم وغیرہ کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔ کیونکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی اپنے عمل کے انجام دینے میں مختار و

آزاد نہیں سمجھا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا، کہ محسوس اور غیر محسوس پر اسرار عوامل کے ایک سلسلہ کے زیر اثر لوگ اچھے اور برے کی انجام دہی میں مجبور سمجھے جائیں گے۔

۲: آزادیٔ عمل سے انکار ارتکابِ جرائم سے متعلق قوانین کی بنیادوں ہی کو ختم کر ڈالے گا۔ کیونکہ انسان کے مجبور ہونے کی اصل کو قبول کر لینے سے جرم کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا مجرم وغیر مجرم کی تقسیم بے معنی ہو جائے گی۔

۳: اختیار کا انکار نہ صرف اخلاقی اقدار کو تباہ و برباد کر دیتا ہے اور حقوق کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے، بلکہ اس سے انسان کے شرف و بزرگی پر ایسی زد پڑتی ہے جسے کوئی بھی انسان فطری طور پر قبول نہیں کر سکتا۔ دراصل انسان اور حیوان میں یہی واضح فرق ہے کہ موخر الذکر اپنے افعال میں اختیار و آزادی سے قطعی محروم ہے۔ اور اس کی فطرت اس کی خواہشات کے ماتحت ہوتی ہے۔ اگر انسان بھی اسی فطرت کا مالک ہوتا اور عواملِ ظاہری یا کشش ہائے باطنی کے ہاتھوں وہ مغلوب و مجبور ہو، تو اس صورت میں انسان اور چار پاؤں والے درندے میں کیا فرق رہ جائے گا۔

۴: کیا انسان کی فطری آزادی کے منکر ہر قسم کے ظلم و ستم اور تعدی و تجاوز کو قبول کر لینے کے لیے تیار ہیں اور اس سلسلہ میں اس بات کے لیے تیار ہیں کہ اپنا منہ بند رکھیں اور کچھ نہ کہیں، نہ شکایت کریں اور نہ ہی اس سلبِ آزادی کی مذمت کریں۔

۵: گنہگار انسان ایک مدت بعد اپنے عمل پر پشیمان ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بُرا بھلا کہنے لگتا ہے اور خود اپنی مذمت کرتا ہے۔ بسا اوقات ارتکاب گناہ یا غلط کام کے احساس سے اس کی ایسی حالت ہوتی ہے جو گناہ کی برائی کے احساس کی پیداوار ہوتی ہے۔ اگر واقعتاً افعال میں حریت و آزادی کا وجود نہیں تو پھر ندامت و پشیمانی کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

آزادیٔ انسان بنظرِ قرآن

قرآن فطرت کے فیصلہ اور عقل کی تائید میں، تصریحاً وتلویحاً آزادی انسان کو شریعت کی بنیاد قرار دیتا ہے اور علتِ عمل میں خود انسان ہی کو ذمہ دار قرار دیتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾ (نجم: ۳۹)

''انسان کے لیے اس کی سعی و کوشش کے نتیجہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔''

دوسری جگہ فرماتا ہے:

کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ ﴿۳۸﴾ (مدثر: ۳۸)

''ہر انسان اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے۔''

کون سا پیغام اس سے زیادہ واضح ہوگا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِهٖ وَمَنۡ اَسَآءَ فَعَلَيۡهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ﴿۴۶﴾

(حم سجدہ: ۴۶)

''جو شخص کوئی نیک کام انجام دیتا ہے تو وہ اپنے فائدہ کے لیے انجام دیتا ہے۔اسی طرح جو شخص کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کا نقصان بھی خود اسی کو ہوتا ہے اور تیرا خدا تو اپنے بندوں پر ہرگز ظلم نہیں کرتا۔''

اصولی طور پر پیغمبروں کا بھیجا جانا، قوانین کی تشریح، تربیتی کوششیں اور علوم انسانی کے ان دانش کدوں کی تاسیس اور تربیت کے لائحہ عمل، سب کے سب انسان کی آزادی کی اصل پر استوار ہیں۔اگر یہ اصل ہی متزلزل ہو جائے تو پھر ان تمام اقدار میں کسی کے بھی صحیح معنی باقی نہیں رہیں گے، اور تربیتی علوم کے دانشوروں کی تمام کوششوں کو بے ثمر اور بے نتیجہ ماننا پڑے گا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہر انسان کی ذمہ داری خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے تو پھر وراثت، جغرافیائی عوامل، فرہنگ وتمدن، محیط وماحول اور مقدر جیسے مسائل کے اثرات کو کیا کہیں گے؟ اور انسان ان مجبور کر دینے والے عوامل کے مقابلہ میں اپنے ارادہ واختیار کا محافظ ونگہبان کیسے ہوگا؟

جبر کے حق میں موحدین کے دلائل

دلائلِ عقلی اور مسلماتِ مسائلِ حقوقی وتربیتی واخلاقی اور آیاتِ قرآنی کے انسان کی حریت وآزادی پر گواہی دینے کے باوجود بعض موحدین (خدا پرستوں) 'جبر' کی راہ اختیار کرتے ہیں۔انھوں نے اس کے لیے کچھ دلائل قائم کیے ہیں، جن میں ہم پہلے زیادہ اہم کو پیش کرتے ہیں۔پھر اس کے بعد مادیین کے فلسفۂ جبر کو جو دوسرے طریقہ سے اپنے مدعا پر استدلال کرتے ہیں پیش کریں گے۔

لہٰذا اب بعض موحدین کے عقاید جبر کے دلائل ملاحظہ ہوں:

بعض موحد علماء کے عقیدۂ جبر کی طرف جھکاؤ کے اسباب درج ذیل دو امور پر منحصر ہیں:

۱: ''توحید در خالقیت'' کے عقیدہ کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ایک سے زیادہ موثر کے معتقد نہ ہوں، اور تمام موثرین کے اثر کو براہِ راست خدا کا اثر وفعل سمجھیں۔

۲: مسئلہ تقدیر وبخت (مقدرات) جن پر آسمانی شرائع کا اتفاق ہے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم ہر فرد کی زندگی کی راہ کو پہلے سے مقرر شدہ قرار دیں۔

یہی دونوں امور موحدین میں سے بعض کے عقیدۂ جبر کی طرف جھکاؤ کے بنیادی اسباب ہیں۔اس سلسلہ میں بعض دیگر علل واسباب بھی ہیں جو اہمیت کے اعتبار سے دوسرے درجہ پر ہیں۔

اب ہم ان دونوں علتوں کے بارے میں الگ الگ تحقیق پیش کریں گے، اور واضح کریں گے کہ ان میں سے کوئی بھی عقیدۂ جبر کی

حمایت نہیں کرتا بلکہ یہ دونوں دراصل انسانوں کے اختیار کی تائید اور آزادی کو ثابت کرتے ہیں۔

الف: خدا کے سوا کوئی خالق نہیں

وہ کہتے ہیں کہ عقل واضح دلائل کی روشنی میں گواہی دیتی ہے کہ صفحۂ ہستی میں ایک سے زیادہ خالقوں کا وجود ممکن نہیں، اور تمام اشیاء اور ان سب چیزوں کا خالق، جسے انسان شئ کا نام دیتا ہے، صرف اور صرف خود خدائے واحد ہی ہے۔ اگر ہم اس کے علاوہ کچھ اور کہیں گے تو موحدین کی صف سے خارج ہو جائیں گے۔

قرآن بھی وحدانیتِ خالق پر، اور یہ کہ خدا کے علاوہ اور کوئی خالق نہیں ہے اور تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔ وضاحت کے ساتھ گواہی دیتا ہے، جہاں فرماتا ہے:

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿١٦﴾ (رعد:۱۶)

''کہہ دیجیے کہ خدا ہی ہر چیز کا خالق ہے وہ یکتا و غالب ہے۔''[1]

اگر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا مسئلہ مستقل طور پر بنیادی مسئلہ ہے اور تمام اشیاء کا پیدا کرنے والا وہی ہے، تو پھر انسان کا فعل اور اس کا عمل بھی اشیاء ہی میں سے ایک شئ ہے۔ لہٰذا انسان کے افعال کا خالق بھی خود خدا ہی ہوا اور انسان نمائش کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یعنی فاعلِ حقیقی تو خدا ہی ہے اگر بظاہر فاعل انسان ہی ہو۔

جواب: ''توحید در خالقیت'' توحید افعال کی ایک شاخ ہے، جس کی فلسفی دلائل اور قرآن کی صریح آیات مکمل طور پر تائید کرتی ہے۔ لیکن جبریہ نے اس سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے، کیونکہ ''توحید در خالقیت کے معنی یہ نہیں کہ ہم تمام اشیاء کی علت واسباب کا انکار کر دیں اور موجوداتِ عالم میں ان کی تاثیر کو نظر انداز کر دیں، نیز یہ کہنے لگیں کہ جہانِ آفرینش کی اصلی وغیر اصلی بس ایک ہی علت وسبب ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔ تمام موجودات براہِ راست اسی سے صادر ہوتے ہیں اور کسی قسم کا کوئی سبب اور نتیجہ درمیان میں وجود نہیں رکھتا۔

اس قسم کا نتیجہ اخذ کرنا ''توحید در خالقیت'' کے بارے میں صحیح فلسفیانہ دلائل سے لاعلمی اور قرآن کی دیگر آیات سے بے خبری کی دلیل ہے۔

فلسفیانہ دلائل ''وحدتِ حقیقتِ وجود'' کی بنیاد پر تمام مراتبِ وجود میں ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم دیگر موجودات کے اسباب کا انکار کر دیں، اور یہ کہنے لگیں کہ سورج کی چمک، چاند کی دمک اور آگ کی تپش خود ان کے خواص نہیں ہیں، بلکہ خدا ہی ہے جو ان کے وجود میں آنے کے بعد اس قسم کے آثارِ واضح ان میں پیدا کر دیتا ہے۔

علیٰ ہٰذا القیاس ''وحدتِ حقیقتِ وجود'' کا مسئلہ ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ ہم عللِ طبیعی کی سببیت اور ایک وجودِ موجود میں ان کی دخالت

[1] سورۂ انعام ۱۰۱، ۱۰۲، زمر: ۶۲: اور غافر (مومن): ۴۳ میں بھی یہی مضمون ذکر ہوا ہے۔

کا انکار کردیں۔ بلکہ یہ مسئلہ ہمیں اس بات پر مائل کرتا ہے کہ ہم ان کی دخالت اور سببیت کے پورے طور پر معترف ہوں۔

فلسفیانہ دلائل ہمیں بتاتے ہیں کہ وجود ہر مرتبہ اور مقام میں اپنی تاثیر واثر کے ساتھ لازم وملزوم ہوتا ہے، اور ہر وہ فاعل جس کا وجود و ہستی میں کچھ حصہ ہے اپنے مخصوص اثر کو ظاہر کرکے رہتا ہے۔[1]

اسی طرح موجودات عالم میں اسباب طبیعی کی تاثیر کے بارے میں مختلف آیات میں تصریح کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ (بقرہ:۲۲)

''ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ تمھیں رزق دینے کے لیے پھل پیدا کیے۔''

فلسفہ کی اس بنیاد اور قرآن کی تصریح کی طرف توجہ کرتے ہوئے ''توحید در خالقیت'' سے اس قسم کا نتیجہ نکالنا بالکل غلط اور بے کار ہے۔

بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ عالمِ خلقت میں ایک فاعلِ مستقل اور خالقِ واحد کے علاوہ اور کسی کا وجود نہیں ہے۔ دیگر بنانے والوں کی خالقیت اور آفریدگاری اسی خالقِ اعلیٰ کی قدرت وتوانائی کے سایہ اور بے پایاں فیض کے تحت صورت پذیر ہوتی ہے۔

''توحید در خالقیت'' کا مطلب علل طبیعی کے طریقۂ کار کی شناخت نیز خداوندِ عالم سے خلقت کے جملہ نظاموں اور اسباب و مسببات کی وابستگی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر یہ بھی لازم ہے کہ وجود وتاثیر کے لحاظ سے ان علل واسباب کا عمل اسی کی قدرت و ارادہ سے وابستہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں جس طرح موجوداتِ جہاں اپنی ذات اور اصلِ ہستی میں استقلال نہیں رکھتیں، اور سب کی سب خدا ہی کے حکم سے قائم ہیں۔ اسی طرح مقامِ اسباب وتاثیر میں بھی بذاتِ خود مستقل نہیں ہیں، بلکہ صرف خدا کی عطا کردہ قوت وتوانائی سے ہی اپنے فرائض اور افعال کو انجام دیتی ہیں۔

توحید در خالقیت کی اس تشریح سے نہ صرف یہ کہ جبر لازم نہیں آتا، بلکہ اس سے انسان کے اختیار وآزادی کا ثبوت ملتا ہے، کیونکہ اس تشریح میں ''انسان'' کے افعال کے فاعل اور ان کے موثر ہونے کی صراحت ملتی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ انسان جو کام کرتا ہے وہ خدا کی دی ہوئی قدرت وتوانائی سے انجام پاتا ہے۔

---

[1] مراتب وجود اور ان کی حقیقت کی وحدت کے بارے میں بنیادی شبہات کی طرف توجہ کرنے سے یہ مطلب بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اصول وحدتِ حقیقتِ وجود کو محفوظ رکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا ایک ہی مقام ہے اور وہ وہی مقام اعلیٰ ہے جو باعثِ وجودِ اثرات ہے جبکہ اس کے دیگر مراتب میں کسی قسم کی فاعلیت اور تاثیر نہیں ہوتی۔ اس دلیل سے معارف کے باب میں بہت سے مسائل کے نتائج حاصل ہوجاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک موحد کو یہ جاننا ضروری ہے کہ خدا کا نہ تو کوئی ذات میں شریک ہے اور نہ ہی کوئی اس کی فاعلیت و خالقیت میں شریک ہے بلکہ سارے کے سارے نظامِ کائنات کا صرف ایک ہی مستقل فاعل اور اس میں بس ایک ہی ملتِ قائم بنفس وجود رکھتی ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے تمام فاعل اپنی ذات و وجود اور اپنی تاثیر و فاعلیت کے اعتبار سے اسی کے حکم سے قائم ہیں۔ لہٰذا ایک موحد کے عقیدہ کو بیان کرنے کے لیے لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا جملہ اس کا شعار ہے۔

اس لحاظ سے توحید در خالقیت کی تفسیر صفحۂ ہستی سے وابستہ علل واسباب کی نفی کے معنی میں نہیں ہے۔ پس خدا کی معرفت تمام طبیعی موجودات کے اسبابِ مستقل یہاں تک کہ انسان کے افعال کے عنوان سے کرانا، بہت ہی بے جا اور بے معنی تفسیر ہوگی اور اس کے انتہائی غلط نتائج برآمد ہوں گے۔

ب: تقدیرِ الٰہی ومقدرات

دوسرا عامل جو بعض موحدین کے جبر کی طرف جھکاؤ کا سبب بنا ہے مسئلہ تقدیر اور مقدرات کی غلط تفسیر ہے، جس پر آسمانی شریعتوں کا اتفاق ہے۔ اگرچہ اول الذکر عامل نے علماء کے صرف ایک گروہ کو ہی عقیدہ جبر کی طرف مائل کیا ہے۔ تاہم دوسرے عامل نے بہت زیادہ وسعت اختیار کر لی ہے، کیونکہ مذکورہ گروہ کے علاوہ بعض شعراء اور بہت سے شکست خوردہ اور فسادات میں ملوث لوگوں نے اسی عامل کا سہارا لیا ہے۔ یہ لوگ کوششیں کرتے ہیں کہ سیاسی اور اجتماعی شکستوں یا اپنی آلودگیوں کی اسی طریقہ سے توجیہہ کریں۔ یہاں تک کہ صائب تبریزی کہتا ہے:

رضا بہ دادہ بدہ وز جبیں گرہ بکشائی
کہ برمن و تو ، در ، اختیار نکشا دند

ترجمہ: عطا کرنے والے سے خوش ہوجا اور پیشانی کی گرہ کو کھول دے کیونکہ مجھ پر اور تجھ پر اختیار کا دروازہ نہیں کھولا گیا۔

اور دوسرا شاعر کہتا ہے:

گلیمِ بخت کے را کہ بافتند سیاہ
بہ آب زمزم و کوثر، سفید نتواں کرد

ترجمہ: جس کے بخت کی گُدڑی سیاہ بنی گئی ہے۔ زمزم وکوثر کے پانی سے اسے سفید نہیں کیا جاسکتا۔

تیسرا شاعر یہ کہتا ہے:

کوکبِ بخت مرا ہیچ منجم نشاخت
یا رب! از مادرِ گیتی بہ چہ نحوی زادم

ترجمہ: میرے بخت کے ستارے کو کوئی منجم نہ پہچان سکا۔ خدا! میں زمین سے کس طرح پیدا ہوا ہوں۔

''قضا'' و''قدر'' کے بارے میں بحث، ان دونوں امور میں فرق اور تقدیر کے مختلف معانی کی وضاحت، جو آیات و روایات اور بزرگ اسلامی علماء کے بیانات سے معلوم ہوئے ہیں، اس مختصر سی بحث میں ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ اس مقام پر جس چیز کا بیان کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ 'علم سابق' یا 'خدا کے تخلف ناپذیر ارادے'' کے معنی میں مقدر کی کیفیت جبر یا سلبِ اختیار کا سبب نہیں، مقدر کے معانی کے بارے میں بحث ہم کسی دوسرے مقام پر پیش کریں گے۔ اس وقت مندرجہ بالا دونوں جہات کا بیان ملاحظہ فرمائیں۔

الف: خدائی علم سابق اور انسانی اختیار

کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل سے ہی خلقتِ کائنات سے پہلے، فضائے بیکراں میں ستاروں کی گردش، ایٹم کے اندر الیکٹرونوں کی پر اسرار حرکت۔ باغوں اور جنگلوں میں پتوں کے گرنے، سمندروں میں پانی کی لہروں اور سمندروں کی گہرائیوں میں مچھلیوں کی حرکات سے آگاہ تھا۔ اسی طرح وہ اپنے بندوں کی نیک کرداری یا بدرفتاری سے بھی ان کی خلقت سے پہلے ہی واقف تھا، اسے علم تھا کہ ہر شخص اپنی زندگی میں کیسے کیسے کام کرے گا، ایک صورت تو یہ ہے۔

دوسری طرف علمِ خدا سو فیصد مبنی بر واقعیت اور تخلف ناپذیر ہے اور سوئی کے ناکے کے برابر بھی کوئی بات اس کی واقعیت اور حقیقت کے خلاف نہیں ہوتی۔ لہٰذا حوادثِ عالم کو بعینہٖ اسی طرح جیسے کہ وہ ازل سے علم خدا میں ہیں واقع ہونا چاہیے یعنی کائنات کے نقشہ عینی کو اللہ کے نقشۂ علمی کے مطابق جامۂ ہستی پہننا چاہیے اور سوئی کے سرے کے برابر بھی اس سے تخلف نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرا پہلو یہ ہے۔

ان دونوں صورتوں سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان اپنے تمام افعال میں مجبور و بے اختیار ہے۔ کیونکہ خدا کو ازل سے یہ علم تھا کہ ہر فرد کون کون سے کام انجام دے گا...... چونکہ خدا کا علم مبنی بر واقعیت اور تخلف ناپذیر ہے، فطرتاً اس سے تخلف نہ ہونا چاہیے اور تمام افعال کو لازماً اس کے مطابق انجام پانا چاہیے۔ پس ثابت ہوا کہ جس کام کو لازماً انجام پانا ہے وہ اختیاری نہیں ہوسکتا۔

دوسرے لفظوں میں ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کا علم ہونے والے واقعہ کے مطابق ہے، اور عملاً واقعات کو اس کے علم کے مطابق ویسے ہی ہونا چاہیے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ انسان کو علم خدا کے مطابق کام ضرور انجام دینا ہوگا۔ یعنی انسان کو اس سے تخلف کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لہٰذا ان حالات میں انسان کو اس کے اپنے کاموں میں اختیار و آزاد نہیں سمجھا جا سکتا۔

جواب: تقدیر، خدا کے علم سابق کے معنی میں جبریوں کا سب سے بڑا حربہ ہے، جس کا وہ سہارا لیتے ہیں اور کہتے ہیں:

می خوردن من حق ز ازل می دانست
گر می نخورم علم خدا جہل بود!

میرے شراب پینے کا علم خدا کو ازل سے تھا۔ اگر میں شراب نہ پیوں تو خدا کا علم جہالت میں بدل جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے علم سابقہ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے، سو فیصد باطل اور بے بنیاد تصور ہے، اس بات میں کہ خدا کو ازل سے ہر چیز کا علم تھا اور خدا کا علم مبنی بر واقعیت وتخلف ناپذیر ہے۔ بحث وگفتگو کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ خدا کے علم کا وقوع پذیر واقعات سے کس طرح کا تعلق ہے پھر جب ہم علم خدا کی وجہِ تعلق سے آگاہ ہو جائیں گے تو پھر ہرگز جبریہ کی حمایت نہ کرینگے۔

علمِ خدا کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ہر علت اپنی خصوصیت کے ساتھ کام کرے یا ہر حادثہ وواقعہ اپنی خاص علت اور مخصوص سبب کے باعث رونما ہو۔ مثلاً فاعلِ ناآگاہ تو مجبور ہو کر کام کرے، جبکہ فاعلِ مختار اپنے پورے اختیار وآزادی کے ساتھ اپنے کام انجام دے۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ ہم پہلے ہی سے اس علت کی واقعیت سے آگاہ ہو جائیں اور اس کے بعد فاعل کے مجبور ومختار ہونے کے بارے میں فیصلہ کریں۔ پس ہم کہتے ہیں کہ علل واسباب دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ا: علت ہائے طبیعی ناآگاہ یعنی سورج، چاند اور آگ وغیرہ

۲: علل طبیعی آگاہ وآزاد یعنی انسان

پہلی قسم میں علمِ خدا کا تعلق اس بات سے ہے کہ اس قسم کے علل واسباب آگاہی وآزادی کے بغیر اپنے مخصوص آثار کے ذمہ دار قرار پائیں۔ مثلاً سورج بغیر آگاہی کے روشنی دے اور چاند بغیر آگاہی کے چمکتا رہے۔ دوسری صورت میں علمِ خدا اس بات سے متعلق ہے کہ انسان کمالِ آگاہی کے ساتھ اور مکمل اختیار وآزادی کے ساتھ اپنے تمام کاموں کو انجام دے۔ اس قسم کے علل واسباب سے، علمِ خدا کے تخلف ناپذیر ہونے کے مطابق، حتمی طور پر بہت سے اچھے اور برے کام انجام پاتے ہیں۔ لیکن آگاہی کی قید اور آزادی کی خصوصیت کے ساتھ اللہ کا علمِ سابق، نہ صرف یہ کہ مجبوریٔ افعال کا سبب نہیں ہے بلکہ اختیار کی تاکید کرتا ہے۔ اس لیے علمِ خدا کے تخلف ناپذیر ہونے کے لحاظ سے اس قسم کے علل واسباب کی موجودگی میں افعال کو خود ان کی اپنی اس قسم کی دونوں مخصوص خصوصیات کے ساتھ انجام پانا چاہیے اور علم وآگہی اور اختیار کی قید کے ساتھ کسی بھی کام کو انجام دینا چاہیے۔ اگر اس طریقہ کے علاوہ کسی اور صورت میں کوئی کام کیا جائے گا تو اس صورت میں علمِ خداوند تعالیٰ کی مخالفت ہوگی۔

اسی بناء پر ہم نے کہا تھا کہ ایسے علم کے متعلق اعتقاد رکھنا نہ صرف یہ کہ جبر ولزوم کے اعتقاد کا سبب نہیں ہے، بلکہ اختیار وآزادی کے اعتقاد کا موجب ہے۔

ب: ارادۂ ازلی وآزادیٔ انسان

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دنیا میں کوئی چیز، خدا کے ارادہ اور اس کی مشیتِ نافذہ کے بغیر انجام نہیں پاتی۔ انسان کے افعال بھی جو اس عالم کے واقعات میں شامل ہیں، طبعاً ارادۂ خدا کے دائرہ سے باہر نہیں ہیں، نہ ہی اس کی مشیت کے بغیر جامۂ عمل پہنتے ہیں۔ جو چیز خدا کے علم میں آچکی ہے اس کے انجام پائے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، لہٰذا اس صورت میں انسان کے افعال کو کس طرح فعلِ اختیاری سمجھا جا سکتا ہے۔

جواب: حق تعالیٰ کا قطعی ارادہ، جس کی حدود سے کوئی مخلوق باہر نہیں ہے نہ صرف سادہ لوح لوگوں کے لیے اشتباہ کا سبب بنا ہے بلکہ

مصری مولف فرید وجدی جیسے عالم بھی اس کی گرہ کھولنے میں بے بس نظر آتا ہے چنانچہ وہ خدا سے یہ دعا کرتا ہے کہ خدا سے اس گرہ کے توفیق عطا فرمائے۔[1]

اگر دائرۃ المعارف کا مولف علمِ کلام اور فلسفہ کی ان کتابوں کی طرف جنھیں محققین نے تحریر کیا ہے، رجوع کرتا تو وہ اس کا واضح جواب پالیتا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے ارادہ کی کیفیت کو بھی علمِ خدا کی کیفیت کی روشنی میں دیکھنا چاہیے اور پھر اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ کسی معلول کے اپنی علت کے مطابق صادق ہونے میں خدا کے ارادہ کا تعلق متعلقہ علل کے وجود کی کیفیت کے ساتھ مطابقت میں مضمر ہے۔ اگر علل واسباب فاقدِ شعور وادراک ہوں یا فرض کیجیے کہ ان کے افعال کا طریقہٗ کار فطرت کی بنیاد پر ہو، تو اس صورت میں خدا کا ارادہ اس بات سے متعلق ہوتا ہے کہ اس قسم کے اسباب اختیار وآزادی کے بغیر افعال کی انجام دہی کریں۔ جیسا کہ سورج چاند، یا چیونٹی اور شہد کی اپنے اپنے کام کو اپنے اپنے طریقہ سے انجام دیتے ہیں۔

لیکن اگر اشیاء کے اسباب آگاہی اور آزادی کے حامل ہوں تو اس صورت میں خدا کا ارادہ اس کیفیت سے متعلق ہوگا کہ یہ اسباب کمال آگاہی وآزادی کے ساتھ ظہور پذیر ہوں اور متعلقہ افعال کو انجام دیں۔ چونکہ انسان ایک آگاہ وآزاد فاعل ہے اور ادراک وشعور نیز انتخاب واختیار اس کے وجود میں شامل ہیں۔ لہٰذا خدا کے ارادۂ ازلی کا اس بات سے یہ تعلق ہے کہ اس قسم کے اسباب اپنی خصوصیات (اختیار) کے مطابق عمل کریں اور تمام افعال واعمال کو بجالائیں۔ یہاں خدا کا ارادہ اسی صورت میں تخلف ناپذیر ہوگا کہ اس قسم کے علل واسباب آزادی کے ساتھ عمل کریں۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ انسان اس صورت کے علاوہ کسی اور صورت میں اپنے افعال کو انجام دیتا ہے تو اس صورت میں ارادۂ ازلی کے خلاف بات ہوگی اور جو کچھ اس نے چاہا ہے وہ انجام نہیں پائے گا۔

دوسرے لفظوں میں جس طرح انسان کا اصل وجود اس کا اصل کام اور کوشش خدا کے ارادے اور اس کی مشیت سے متعلق ہیں، اسی طرح اس کے کام کا طریقہ وصفت اور اس کی سعی وکوشش کی خصوصیت بھی خدا کی مشیت کے مطابق ہوگیف۔ اب چونکہ انتخاب واختیار، آگاہ وآزاد انسان کی خصوصیات میں شامل ہیں، تو اس صورت میں خدا کا سابقہ ارادہ، نہ صرف یہ کہ انسان کے اختیار کو دگرگوں کرنے والا نہیں ہوگا، بلکہ خدا چاہتا ہے وہی معمولی سا بھی تخلف ہوئے بغیر انجام پاتا ہے، انسان کے کاموں کو قطعی طور پر اس خصوصیت کے ساتھ انجام پانا چاہیے۔ اس کے برعکس اگر ہم اس کے علاوہ کچھ اور تصور کرلیں تو اس صورت میں لازم آئے گا کہ ہم نے ارادۂ خدا کو تخلف ناپذیر فرض کرلیا ہے۔

اس بحث سے واضح ہوگیا کہ تقدیر چاہے علم ازلی کے معنی میں ہو یا ''خدا کے تخلف ناپذیر اور ومشیت کے معنی میں، وہ انسان کے لیے جبر اور سلبِ اختیار کا سبب نہیں ہے۔

---

[1] دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۷ ص ۸۴۴

خدا پرست قائلینِ جبر سے دو سوال

۱: کیا اس خدا کے لیے جو اپنے آپ کو عدل و انصاف کے ساتھ متصف کرتا ہے اور اس کی کتاب بھی اس کی عدالت و انصاف کی گواہی دیتی ہے۔[1] یہ بات صحیح ہوگی کہ اپنے بندوں کو ان افعال کے لیے جن میں انھیں معمولی سا بھی اختیار نہ ہو، عذاب کرے، یا انھیں اپنی جزا کا سزاوار قرار دے۔

۲: پیغمبروں کا بھیجا جانا تمام اوامر ونواہی اور قوانینِ الٰہی کے انضباط ورعایت کی دعوت، انسان میں اختیار و آزادی کے وجود کی بنیاد پر استوار و قائم ہے تا کہ انسانیت کا قافلہ عقل وخرد کی مدد سے سعادت وکمال کی چوٹی تک پہنچ جائے۔

اگر ہم انسان کو فاقدِ اختیار و آزادی فرض کرلیں اور یہ کہیں کہ تمام افراد مشین کی طرح زندگی کے میدان میں اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، تو اس صورت میں خدائی معلمین (پیغمبروں) کا بھیجا جانا اور تشریعِ شرائع کا سلسلہ لغو اور بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ ساری جدوجہد اور کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوں گی، تقویٰ اور پاکدامنی کی توقع، اور ایسے انسان کے اقدار کی تربیت اور پرورش جو ہرگز اپنے کام کے لیے جوابدہ نہیں ہے، بلکہ طوطے کی طرح وہی کچھ کہتا ہے جو استادِ ازل نے اسے پڑھا دیا ہے، بہت ہی بے جا بات ہوگی۔

شائستگی و آزادی، خودسازی و اختیار لازم وملزوم ہیں۔ آزادی کا انکار تمام شائستگی اور خودسازی کے امکان کے انکار کے مترادف ہے۔

جبر کا قائل انسان چاہے جس طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، عقل وحس اور وجدان کا منکر ہوتا ہے۔ جس طرح مولوی رومی اس کے بارے میں کہتا ہے:

در خرد جبر از ''قدر'' رسوا تراست
ز آنکہ جبری حس خود را منکر است
منکر حس نیست آں مرد ''قدر''
فعلِ حق، حسی نباشد اے پسر
پس تسفسط آمد دعوائے جبر
لاجرم بدتر بود زیں رو، ز ''گبر''
جملہ عالم مقر بر اختیار !!
امر و نہی ایں بیاور و آں میار

[1] ۱۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ (آل عمران: ۱۸) ۲۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (یونس: ۴۴)

او ہمی گوید کہ امر و نہی، لاست
اختیاری نیست، ویں جملہ خطاست
ز آنکہ محسوس استے مارا اختیار
خوب می آید براو تکلیف کار
درک وجدانی بہ جای حسِ بود
ہر دو دریک جدول اے عم می رود
ایں کہ فردا ایں کنم یا آں کنم
ایں دلیل اختیار است اے صنم

ترجمہ:

عقل کے نزدیک جبر، قدر سے زیادہ رسوا ہے۔ کیونکہ جبری تو اپنی حس کا بھی منکر ہے۔ قدر کا قائل آدمی حسِ کا منکر نہیں ہوتا۔ اور اللہ کا فعلِ حسی نہیں ہوتا۔ جبر کا دعویٰ قیاس باطل کی پیداوار ہے۔ اس لیے اس کا داعی یہودیوں اور مجوسیوں سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ سارے عالم کو اختیار کا اعتراف ہے۔ امر و نہی کے معنی ہیں کہ یہ کر اور وہ نہ کر۔ وہ یہ کہتا ہے کہ امر و نہی لغو ہیں۔ کیونکہ کوئی اختیار نہیں ہے، لیکن بات بالکل غلط ہے۔ کیونکہ ہمارا مختار ہونا ظاہر ہے۔ اسی لیے انسان کو ذمہ داری سونپنا درست ہے۔ وجدانی ادراک حس کی جگہ لیتا ہے۔ اے چچا یہ دونوں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ یہ بات کہ کل میں یہ کروں گا یا وہ کروں گا۔ اے دوست! یہ اختیار ہی کی تو دلیل ہے۔[1]

اب وقت آ گیا ہے کہ ''مادیین کے عقیدۂ جبر'' کو پیش کریں۔ جبر کے یہ دونوں نظریے نتیجہ کے اعتبار سے تو ایک ہی ہیں لیکن استدلال اور اقامۂ دلیل کے لحاظ سے مختلف ہیں۔

مادیین کا عقیدۂ جبر

موحدین اور مادیین دونوں کے مکتبِ فکر میں اپنے اعمال کے دائرۂ کار میں انسان کی آزادی کے انکار سے متعلق بہت سے طرفدار موجود ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ موحدین میں سے کچھ لوگ اس بات کے قائل ہوں یا مادیین میں سے بعض لوگ اس بات کے قائل ہوں یا مادیین

---

[1] مثنوی دفتر پنجم ص ۴۹۸ طبع میر خوانی

میں سے بعض لوگ اس نظریہ کے طرف دار ہوں بلکہ دونوں مکاتب میں گونا گوں علل واسباب کی بناء پر اس نظریے کے بہت سے طرفدار موجود ہیں، ہم یہاں مادیین کے اس نظریئے کی طرف رجحان کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مادیین کے نزدیک عقیدۂ جبر کے نفوذ کے صرف دو ہی اسباب ہیں۔ ہماری اس بحث میں مادیین سے مراد اعتقادی یا اخلاقی مادیین دونوں مراد ہیں۔ان دونوں قسم کے مادیین کے درمیان واضح فرق موجود ہے۔اعتقادی مادیین سے مراد وہ جماعت ہے، جو عالمِ بالا مثلاً خدا، دارِ آخرت اور روزِ محشر کی جزا وسزا کا عقیدہ نہیں رکھتے۔لہٰذا وہ طبعاً اپنے عمل میں الحاد وکفر کے مرتکب ہوتے ہیں اور نظامِ زندگی سے فرار اختیار کرتے ہیں۔اس قسم کا آدمی ایمان کے فقدان کی بناء پر اپنی بے مہار خواہشات کو سیر کرنے کے لیے کسی حد یا قید وبند کی پابندی نہیں کرتا۔

اخلاقی مادیین سے مراد وہ جماعت ہے جو مذہب اور دین سے تعلق کا اظہار کرتے ہیں۔مثلاً ان کے ازدواج کے مراسم ان کے مذہب کے دستور کے مطابق انجام پاتے ہیں۔اپنی اولاد کا نام رکھنے میں مذہبی ناموں کو اختیار کرتے ہیں لیکن اخلاقی لحاظ اور عمل کے اعتبار سے اعتقادی مادیین سے جو عمل کے اعتبار سے خدا اور قیامت کے منکر ہیں کوئی فرق نہیں رکھتے اور انھیں کی طرح فساد کی گندگی میں ڈوبے رہتے ہیں۔

اب ہم اس جماعت کے عقیدۂ جبر کے رجحان کے اسباب بیان کرتے ہیں:

۱: پہلا سبب

فلسفیانہ سبب ہے۔اس کی بنیاد قانونِ علت واسباب پر ہے۔یعنی ہر مادی وجود کے لیے ایک علت ہوتی ہے۔انسان کا عمل بھی وجودِ مادی ہے۔جو انسان کی زندگی کے دائرۂ کار میں انجام پاتا ہے اور اس کی اصلی علت انسان کا ارادہ اور خواہش ہوتے ہیں۔پھر انسان کی خواہش، مرئی وغیر مرئی عوامل کے ایک سلسلہ کی پیداوار ہوتی ہے، جو اس کے ارادہ کو اپنے حلقہ میں لیے ہوئے ہوتی ہے۔

وہ عوامل یہ ہیں:

یہ ایسی خواہشات واحساسات، وراثت وتربیت، اجتماعی زندگی، آب وہوا، مٹی اور کیمیائی عناصر اور دوسرے ظاہری وباطنی عوامل ہیں جو انسان کے ضمیر میں ارادہ وخواہش کو پیدا کرتے ہیں اور انسان خواہ نخواہ عمل وفعل کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ان امور کے تحت انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بالکل اپنے اختیار ومرضی سے کام کر رہا ہے۔حالانکہ اُسے اس بات کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس کے اختیار سے باہر بعض عوامل کے ایک سلسلہ نے خواہش وکشش کو اس کے دماغ میں پیدا کیا ہوا ہے۔

۲: دوسرا سبب

دوسرا سبب نفسیاتی سبب ہے، کیونکہ اعتقاد اور آزادی سے مقامِ مسئولیت اور فرائض ادا کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔لہٰذا وہ جماعت جو رفتار واخلاق کے لحاظ سے مادی ہو یا نہ ہو، ہر قسم کی مسئولیت اور انضباط سے پہلو تہی کرنے کے لیے، خواہشات کے حصول کی خاطر زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کرنے کے لیے عقیدۂ جبر کو قانون شکنی اور اپنی غلط کاریوں کے خلاف ڈھال بنالیتی ہے۔اس طریقہ سے وہ یہ چاہتے ہیں کہ

وجدان کے دباؤ میں کمی کریں اور جہاں تک ممکن ہو ملامت وسرزنش اور سزا وعقاب کے بوجھ سے سبکدوش ہوجائیں۔

یہ دونوں اسباب، جن میں سے ایک فلسفیانہ ہے اور دوسرا نفسیاتی۔ ایک جماعت کے عقیدۂ جبر کی طرف مائل ہوجانے کا سبب بن گئے ہیں۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ موخرالذکر سبب کے لیے بحث وتحقیق کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کا عمل اس کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ جس بات کے لیے بحث وتحقیق کی ضرورت ہے وہ انسان کے ارادہ وخواہش کی آزادی کا مسئلہ ہے۔ جس کے بارے میں ماہرینِ تنقید مابعد الطبیعات (METAPHYSICS) پختہ اور راسخ عقیدہ رکھتے ہیں۔

آزادیٔ ارادہ

عقیدۂ جبر کی پیدائش کے علل واسباب اور مادیین میں خواہ وہ اعتقادی مادیین ہوں یا اخلاقی، اس کے پھیلنے کی وجہ سے ہم آشنا ہوچکے ہیں۔ اب ''انسان کے ارادہ اور خواہش'' کے بارے میں ان کے دلائل کا تجزیہ کرتے ہیں۔ لیکن پہلے مناسب ہوگا کہ ہم نفیٔ اختیار کے بعض مفاسد کی طرف اشارہ کریں۔ یہ وہ مفاسد ہیں جنھیں خود مادیین بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ چہ جائیکہ کوئی عاقل وخردمند اس قسم کے نتائج کو قبول کرے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کہنا پڑے گا کہ قائلین جبر بھی عملی طور پر مکتبِ اختیار وآزادی کے پیرو کار نہیں، اور ان کی انفرادی واجتماعی زندگی میں عقیدۂ جبر کا ہرگز نام ونشان نہیں پایا جاتا۔ اب ہم مفاسدِ جبر کو بیان کرتے ہیں۔ اگرچہ اس موضوع پر پہلے بھی ہم کسی قدر گفتگو کرچکے ہیں:

۱: سب سے پہلی ضرب جو مکتبِ جبر انسان کی کرامت وفضیلت پر وارد کرتا ہے یہ ہے کہ انسان اور حیوان کے درمیان جو عمیق فاصلہ موجود ہے وہ ختم ہوجاتا ہے، اور یہ نظریہ انسان کو رفتار وکردار کے لحاظ سے باقی جانداروں کی صف میں کھڑا کردیتا ہے۔

یعنی اگر انسان کی حرکات اس کے اختیار سے خارج عوامل یعنی خواہشات کے ایک سلسلہ کے زیرِ اثر واقع ہوتے ہیں تو انسان کے اعمال بھی اس کے ایسے ارادہ کی پیداوار ہوں گے جو خود اس کے اختیار سے خارج عوامل کا نتیجہ ہے۔ پس انجامِ کار دونوں (انسان وحیوان) اپنے اعمال میں مجبور ہیں، اور انسان کے اختیار وآزادی کی کچھ حقیقت نہیں۔ اگر حیوان کا ارادہ اس کے اختیار سے خارج خواہشات کی پیداوار ہے اور وہ ہرگز اپنی خواہشات کو ترک کرنے پر قادر نہیں تو اسی طرح انسان کے کام بھی، جو اس کے ارادہ کی پیداوار ہیں خود غیر اختیاری اسباب کے ایک سلسلہ کی پیداوار ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان وحیوان دونوں ہی فاعلِ غیر مختار ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان مختار نما فاعلِ جبری ہے اور اس کا ظاہری اختیار وآزادی اس کے مجبور ہونے پر ملمع کی حیثیت رکھتا ہے۔

کیا مادیین کی جماعت کا وہ فرد جو عقیدۂ جبر کا دم بھرتا ہے اس نتیجہ کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے اور انسان کی قدر ومنزلت کو ایک جانور کی حد تک گرادینے پر آمادہ ہے۔

۲: ساری دنیا میں مربی اور اساتذۂ اخلاق کا عمل انفرادی واجتماعی اصلاح کے لیے قابل قدر اور لائقِ تعریف ہے۔ یہاں تک کہ کمیونسٹوں کے مراکز میں بھی تربیتی علوم ودانش کی علمی صورت میں پیروی کی جاتی ہے۔ اگر واقعی انسان اپنے افعال میں خود مختار نہیں

ہے اور افرادِ معاشرہ کی باگ ڈور افراد معاشرہ کے سپرد نہیں ہوئی بلکہ یہ سب کے سب مادی عوامل کے ایک سلسلہ کے زیرِ اثر منعکس ہوتے ہیں جنھوں نے ان کے ارادہ اور خواہش کو گھیر رکھا ہے۔ اور یہ عامل خواہ نخواہ افراد معاشرہ کو اس راستے پر چلاتے ہیں جس پر وہ چلنا نہ چاہتے ہوں، تو اس صورت میں افراد اور معاشرہ کے اخلاق کے سلسلہ میں کوشش کرنا اور انھیں اخلاقی اقدار اور اصلاحی پروگراموں کی طرف دعوت دینے کا کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں اصلاح کی توقع کرنا جس کی باگ ڈور فاقدِ شعور مادی اسباب کے ہاتھ میں ہو وہ اسباب اسے خواہ نخواہ کسی مخصوص سمت کی طرف ہی دھکیلتے ہوں۔ بہت ہی بے جا اور لغوسی توقع ہے۔ تربیت کی توقع، تبدیلئ طریق عمل اور اقدار کی طرف رجحان تو اسی فرد کے بارے میں صحیح تصور ہوگا، جو بنیادی طور پر آزاد و خود مختار و جو راہ و چاہ کے انتخاب کرنے میں خود مختار و آزاد ہو۔

ہم نے ابھی تک کوئی ایسا فرد مادیین میں نہیں دیکھا جو تربیتی لائحہ عمل اور اصلاحی کوششوں کو انسان کے طرزِ عمل میں عقیدۂ جبر کی بناء پر ٹھوکر مار دے اور انھیں غیر مفید جانے۔

نعرے سے عقیدے تک

مارکسزم ایک طرف تو کسانوں اور مزدوروں کو استعمار اور سامراج کے مقابلہ میں کھڑا ہونے اور انقلاب لانے کی دعوت دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اپنی صفوں کو منظم کر کے غلام بنانے والوں کے منہ پر زبردست طمانچہ رسید کریں۔ وہ انسان کی حسِ اختیار و آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معاشرے کی تقدیر کو اپنے ہاتھ میں سمجھتا ہے اور اسی بناء پر اپنے مسلک میں نظم و ضبط کی دعوت دیتا ہے۔ یہ ایک پہلو ہے۔

دوسری طرف مارکسزم انسان کے ارادہ اور خواہش کو معاشرے کے اقتصادی اور مادی روابط کے حالات و شرائط کا ایسا آئینہ سمجھتا ہے جو خواہ نخواہ انسان کو اس راستے کے اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے جس کے لیے زندگی کا ماحول تقاضا کرتا ہے وہ اس کے لیے ایک راستہ کے سوا جو اقتصادی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے اور کوئی راستہ قرار نہیں دیتا۔

یہ بات مسلم ہے کہ انقلاب برپا کرنے، جاگیرداری FEUDALISM اور مغرب کے سرمایہ داری نظاموں اور بے رحم حالات کو بدلنے کی دعوت دینا، شرائطِ زندگی اور روابطِ مادی کے مقابلہ میں اس کی مقہوریت و محکومیت کے ساتھ سازگار نہیں ہے کیونکہ اگر انسان کا عقیدہ اور اس کی خواہش مادی حالات کی پیداوار ہو، وہ عقیدہ کے انتخاب اور ارادہ میں استقلال و اصالت نہ رکھتا ہو، تو انقلاب و نہضت کی دعوت، اور کسان و مزدور سے کام نکالنے اور کارسازی کی توقع، نظام حاکم کی سرنگونی کے بعد سنداں پر مکہ مارنے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

اور اگر واقعی انسان کا ارادہ اور خواہش کسی نظام کو بدلنے میں کچھ تاثیر رکھتا ہے تو پھر اس کے استقلال و آزادی کا انکار بے معنی ہے۔ لہٰذا انسان کے ارادہ و خواہش کو نظامِ اقتصادی کا آئینہ دار نہیں سمجھنا چاہیے، جو ارادہ کرنے اور ایک خاص راستہ اختیار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رکھتا۔

☆☆☆

مارکسزم کا فلسفہ اس قسم کے تناقض میں ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور اس سلسلہ میں اپنی دو توجیہات اس طرح پیش کرتا ہے۔

پہلی توجیہہ

''کسانوں اور مزدوروں کی قوت کو جمع کر کے قومی انقلاب لانے کا مقصد یہ ہے کہ کمیونزم COMMUNISM کا نیا نظام (سرمایہ داری کے) نظامِ کہنہ کی نسبت زیادہ تیزی کے ساتھ دنیا میں آگے بڑھے۔''

اس قسم کی توجیہہ مسائل کا حل نہیں ہوتی۔ کیونکہ کسی بھی نئے نظام کا پرانے نظام کی جگہ لینا ایک قطعی و حتمی عمل ہے پھر کسی نظام نو کی پیدائش سے قطع تعلق طبیعی طور پر بے موقع عمل ہوتا ہے۔ اصولِ منطق کے مطابق مادی دنیا میں ہر شخص خود اپنے کام کو بہتر طور پر انجام دیتا ہے اور وہ نشو و نما کے لیے کسی مددگار یا خادم کا محتاج نہیں ہوتا کہ وہ اس کے ظہور کو آگے لائے۔

ایسے واقعات کی تولید جبری ہوتی ہے جس کو ہم اصولِ مروجہ یا غیر مروجہ کے تضاد میں کہہ سکتے ہیں۔ یہ واقعات انسان کی خواہش کے بغیر خود بخود طبیعی مواقع پر دنیا میں رونما ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ تاریخی واقعات اجتناب ناپذیر موجودات کی صورت میں جنم لیتے ہیں اور یکے بعد دیگرے وجود میں آتے رہتے ہیں۔ اس صورت میں کسی واقعہ کی تعجیل کے لیے دخل دینا یا اس کی سست روی پر اعتراض بیجا مداخلت قرار پائے گا اور ان میں سے کوئی سی بات بھی منطقِ طبیعی کے لیے سازگار نہیں ہے۔

مارکسزم کے نظریہ کے مطابق پرانے آلاتِ کار کی ترقی، مثلاً سوت کاتنے کے چرخے کو سوت بنانے والی مشین میں ترقی دینا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اسی طرح پرانے اقتصادی نظام کا جدید مشینوں کی ایجاد سے تضاد ایک مسلمہ امر ہے، اس تضاد سے طبقاتی چیلنج کے نام سے ایک اور تضاد پیدا ہوتا ہے تاکہ پرانے اقتصادی نظام کو ختم کر کے نیا مناسب نظام پیدا ہو۔ یہ سب تبدیلیاں ''مشین کی طرح رونما ہوتی ہیں۔ ان حالات میں جدید نظام کے روبکار لانے میں تعجیل کی خاطر دخل اندازی، عملِ طبیعی میں ناپختہ کاری یا بے موقع دخل دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا اس مقام پر یہ کہنا پڑے گا کہ جبرِ تاریخ پر اعتقاد رکھنے سے دو عظیم مفاسد سامنے آتے ہیں:

۱: انسان اپنی زندگی میں ہر قسم کی جواب دہی اور ذمہ داری سے فارغ ہے۔

۲: جبر، تاریخ میں طاقتور لوگوں کی ہر قسم کی بدکاری کا جواز مہیا کرتا ہے۔

دوسری توجیہہ

آزادیٔ ادراکِ ضرورت، قوانینِ فطرت کی شناخت اور معینہ ہدف و مقاصد کی سمت میں ان اقدار سے فائدہ اٹھانے کا عزم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں، نہ ہی قوانینِ فطرت و اقدارِ طبیعی کے مقابلہ میں ڈٹ جانا آزادی کہلاتا ہے۔

لیکن جاننا پڑے گا کہ اس وضاحت سے کیا مراد ہے؟

کیا اس سے مراد یہ ہے کہ ضرورت کا ادراک قوانینِ طبیعی کی پہچان اور مقاصد کی سمت میں ان اقدار سے فائدہ اٹھانے کا عزم، انسان کے ذہن میں فطری طور پر اس کے اقتصادی حالات کا اسی قسم کا لازمی عکس ہوتا ہے، جس طرح چیزوں کی صورت صیقل شدہ اجسام میں منعکس ہونے لگتی ہے یعنی بالکل اس طرح جیسے مادی زندگی کے حالات سے متعلق ادراکات وشناسائی اور عزائم انسان کے ذہن میں منعکس ہوتے ہیں۔

اس قسم کی آزادی کا مطلب شرائطِ طبیعی اور مادی خواہشات کے مقابلہ میں انسان کو پابند کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ آزادی کسی نہ کسی صورت میں کم وبیش تمام جانداروں میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر جاندار بھوک وپیاس گرمی وسردی کے احساس اور کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھ کر اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ان سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کرتا ہے۔ یہ آزادی ایسی آزادی ہوگی۔ گویا کسی کو سزائے موت کے بارے میں طریقۂ قتل کے انتخاب کا اختیار دے دیا جائے جبکہ اسے جان دینے اور قتل ہوجانے کے سوا اور کوئی راستہ انتخاب کرنے کی اجازت نہ ہو۔

آزادی واقعی معنی میں اسی صورت میں صادق آتی ہے کہ شناختوں، ضرورتوں اور ان سے فائدہ اٹھانے کے امکانات کو معلوم کرنے کے بعد ہم اس بات کو تسلیم کریں کہ ہر کام کو انجام دینے یا ترک کرنے کا اختیار خود انسان کے پاس ہے اور ہم اسے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے میں آزاد چھوڑ دیں۔ یہ نہ ہو کہ ہم انسان کی خواہش کو مادی زندگی کے حالات اور اقتصادی ماحول کا ناخواستہ عکس سمجھنے لگیں۔

ایسے مادی انسان سے اختیار وآزادی کی توقع رکھنا جس کے نزدیک انسان کے تمام افکار وعقائد، ارادہ وخواہشات اقتصادی تبدیلیوں کے تابع ہوں یا طبقاتی نظام اور معاشرے کی اقدارِ نسل ورنگ کا نتیجہ ہوں یا وہ اقتصادیات کو بنیاد اور باقی چیزوں کو اس کے عوارض جانتا ہو بہت ہی غیر معقول اور بے جا بات ہوگی۔ معاشرہ ایسے انسان کی نظر میں ایک ایسی بڑی مشین ہوگی جو ایک معینہ طریقہ سے چل رہی ہو اور اسے آگے چلنے یا پیچھے ہٹنے کی اجازت نہ ہو۔

آزادیٔ اِرادہ اور قانونِ اسباب

اب ہم اس مقام پر آگئے ہیں کہ آزادیٔ ارادہ کا تجزیہ کریں۔ جو استقلال اور حریت وآزادی کے اصول کے مطابق انسان کا واحد سہارا ہے۔ ہمعصر مادیین خصوصاً مارکسسٹ عقیدۂ جبر کو ثابت کرنے کے لیے قانونِ علیت ومعلول کو پیش کرتے ہیں اور علت ومعلول کے تحت انسان کی مجبوری کا فلسفہ ہمیشہ ان کے وردِ زبان رہتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ موجودات کے بارے میں جن میں سے ایک انسان کا ارادہ بھی ہے۔ علت ومعلول کے نظریہ پر انحصار ارادہ کی آزادی کو بنیادی طور پر متزلزل کر دیتا ہے۔ علت ومعلول کے نظریہ پر انحصار ارادہ کی آزادی کو بنیادی طور پر متزلزل کر دیتا ہے اور اصولِ جبر اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ کیونکہ ہر معلول ایک امرِ ضروری کی صورت میں اپنی علت سے صادر ہوتا ہے۔ انسان کا ارادہ بھی اسی کیفیت میں شامل ہے۔ لہٰذا طبیعی طور ارادۂ انسانی کے اسباب وعلل انسان کی زندگی کے ماحول میں وہ چاہے یا نہ چاہے اس کے ارادہ کے وجود کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ بس اس ضرورت کی موجودگی میں ارادہ کی آزادی کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کا ارادہ اس کے دیگر نفسیاتی حالات واقدار کی مانند ہے اور اس علت کا معلول ہے جو انسان کے وجود

کا باعث ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراف ارادۂ انسانی کی آزادی کا سبب نہیں بنتا۔ نہ ہی انسان کو عزم کرنے پر مجبور کرتا ہے کیونکہ:

''ضروریات کا ادراک، قوانین طبیعی کا شعور اور ان اقدار سے اہداف و مقاصدِ معینہ کے حصول کی خاطر فائدہ اٹھانے کے امکانات، انسان کے طبیعی و باطنی میلانات اور اس کے ارادہ میں شوق پیدا کرنے والے مددگار، دیگر عوامل، سب کے سب ایک تصور اور مخصوص رجحان پیدا کرنے کے سوا اور کچھ اثر نہیں رکھتے۔ پھر انسان ہی ہے جو ان تصورات کی جو ارادہ کے ظہور کی علتِ ناقص ہیں تکمیل کرتا ہے اور کمال حریت و آزادی کے ساتھ عزم کرتا ہے۔ انسان کی آزادیٔ ارادہ اس کی ذاتی وفطری آزادی کا پرتو ہوتا ہے جو اس کے اندر سے پھوٹتی ہے اور اس کی روح میں شامل ہے۔ یہی ذاتی آزادی ہے، جو انسان کے تمام ارادوں اور خواہشوں بلکہ اس کی اصلی رفتار و کردار کو حریت و آزادی بخشتی ہے۔''

دوسرے لفظوں میں انسان کے عزم و ارادہ کی آزادی کے اسباب کو میلانات اور رہبر عوامل کے ایک سلسلہ کی پیدائش کے بعد انسان کی روح اور اس کی فطرت اور خمیر میں تلاش کرنا چاہیے۔ کیونکہ:

''انسان ذاتی طور پر ایک مختار و آزاد ہستی ہے۔ لہٰذا ارادہ کرنے میں کسی قسم کے خارجی اور داخلی عوامل کا دباؤ اس پر اثر انداز نہیں ہوتا، پس وہ ہر قسم کے عاملِ جبر سے مستغنی ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ارادہ کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے ارادہ اور اختیار میں مکمل طور پر آزاد ہے اور ارادہ کرنے میں کسی طرح بھی وہ مجبور نہیں ہے۔''

اس بات پر کہ انسان کے ضمیر میں ارادہ کا پیدا ہونا قانونِ اسباب کا حصہ ہے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن ان اسباب کو تحقیق کے ساتھ معین کرنا چاہیے کہ کیا انسان کے ضمیر میں ارادہ پیدا کرنے والی چیز ماحول کے حالات اور باطنی وفطری کششیں ہی ہیں یا اس قسم کے عوامل ایک تصور پیدا کرتے اور راہِ تخیل کو کھولتے ہیں اور اصل میں خود انسان ہی ارادہ کا موجد ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تصوراتِ ماقبل ارادہ و خواہش کے پیدا ہونے کے لیے کافی نہیں ہیں بلکہ ارادہ کے لیے ایک فاعل یعنی انسان کا وجود لازم و ضروری ہے جو ارادہ کا موجد ہو۔ اس فاعل (انسان) کی خصوصیات کی شناخت ہمارے فیصلہ پر مکمل طور پر موثر ہیں۔

انسان ایک فاعل آگاہ ہے جو اپنا فعل پوری آگاہی اور علم کے ساتھ انجام دیتا ہے۔ وہ دوسرے فاعلوں کی طرح جو اپنے کام سے واقف نہ ہوں ادراک وشعور کا فاقد نہیں جیسا کہ آگ کے جلانے کا عمل۔

ایسے فاعل نہ صرف یہ کہ فاعل آگاہ نہیں ہوتے بلکہ ان کے ارادہ کرنے میں کسی قسم کے کوئی باطنی یا خارجی عوامل اس پر دباؤ نہیں ڈالتے۔ بلکہ یہ فاعل ہر قسم کے عواملِ جبر سے بے نیاز اپنا کام سرانجام دیتے ہیں اور وہ اس فاعلِ آگاہ کی طرح نہیں ہوتے جو کسی مقرر شدہ جبر کے تحت زندگی کے ماحول کو چھوڑ دیتا ہے۔

اس لحاظ سے ارادہ نفسِ انسانی کی پیداوار ہے جس کے وجود ہستی کے ساتھ آزادی و اختیار کو خمیر کیا گیا ہے۔ انسان اپنے ضمیر میں جبر کے معمولی سے معمولی عامل کے احساس کے بغیر بعض حالات جن میں سے ایک ارادہ بھی ہے، پیدا کرتا ہے ایسا ہرگز نہیں کہ کوئی اور عامل اسے اس کام پر آمادہ کرتا ہو۔

نتیجہ یہ ہے کہ:

''علت و معلول کے قانون کا اعتقاد، نیز یہ کہ انسان کا ارادہ دوسرے موجودات کی طرح حاملِ علت و ایجاد ہے، کا ایک مطلب ہے۔ جبکہ انسان کے ضمیر میں جبر کے تحت داخلی یا خارجی دباؤ کے باعث ارادہ پیدا ہونا دوسرا مطلب ہے۔''

پہلے مطلب سے دوسرے مطلب کا نتیجہ نکالنا بالکل غیر منطقی ہے اور ان دونوں کے درمیان معمولی سا بھی ارتباط نہیں پایا جاتا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ مادیین زیادہ تر ''جبرِ علت و معلول'' کے قانون کا سہارا لیتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس ضرورت کو ثابت کرنے اور ارادہ کی پیدائش کے لازم ہونے کے بارے میں مثلث شخصیت کا سہارا لیتے ہوئے انسان کے ارادہ کو ان تین عوامل کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس مثلث کی تاثیر کی بنیاد کو واضح کریں۔

مثلث شخصیت کی تاثیر

انسان جسم و روح کا مرکب ہے۔ اگر بدن کی خصوصیات کو جاننے کے لیے علوم وضع کیے گئے ہیں تو اس کی روح کی خصوصیات معلوم کرنے کے لیے بھی کچھ علوم وجود میں آئے ہیں۔ اسی لیے ہر صاحبِ فکر نے اپنے علم و دانش کے زاویہ کے مطابق ان علوم میں فکر کیا ہے اور ان سے متعارف ہونے کی کوشش کی ہے۔

فلاسفروں نے جن کا تعلق انسان کے فکر و تخیل سے ہے۔ انسان کا بطورِ حیوان متفکر (ناطق) تعارف کرایا ہے۔ اسی طرح ماہرینِ اخلاق نے جن کا مقصد انسان کے احساس اور اغراضِ طبیعی کی رہبری ہے فطرتِ باطنی اور اس کے ذاتی رجحانات کے مطالعے کے تحت تحقیق کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دونوں فریقوں نے انسان کی نصف شخصیت کی طرف توجہ دی ہے جب کہ اس کی شخصیت کے دوسرے نصف حصہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ نہ تو صرف تفکر ہی سے درحقیقت انسان کا مکمل تعارف ممکن ہے اور نہ ہی اس کا احساس اور اغراضِ ناگزیر کو جاننے سے تعارف مکمل ہوتا ہے اس کے برعکس انسان ان دونوں عناصر کا مرکب ہے۔ یعنی وہ تفکر و تخیل کے ساتھ ساتھ باطنی اور فطری کششوں کا حامل بھی ہے۔

انسان کی خصوصیات میں حریت و آزادی نیز یہ کہ وہ اختیار کے سائے میں ایک سرنوشت ساز ہستی ہے۔ اس کی دیگر خصوصیات سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ انسان میں حریت و آزادی کا وجود اس کو دیگر جانداروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اگرچہ دوسرے جانداروں کی تقدیر ان سے زیادہ طاقت والی مخلوق کے ہاتھوں میں دے دی گئی ہے اور وہ ہرگز اپنی اغراض کی حدود سے باہر نہیں نکل سکتے۔ لیکن انسان کی تقدیر خود اس کے اپنے ہاتھوں کے سپرد کی گئی۔ لہٰذا وہ اپنی ذاتی آزادی کی مدد سے زندگی کے خطوط کی تصویر کشی کر سکتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق اپنے باطنی محرکات کے خلاف یا موافق قدم اٹھا سکتا ہے۔

جس چیز نے بعض اہلِ علم کے لیے انسان کے اختیار و آزادی کے سلسلہ میں شکوک و شبہات پیدا کیے ہیں۔ وہ اس کے اختیار سے

خارج عوامل کے اثرات ہیں جن کے بارے میں یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ یہ عوامل غیر شعوری طور پر انسان کی زندگی کو اپنے زیر اثر لے کر اسے ان خطوط پر چلانے پر مجبور کر دیئے ہیں، جن کی تصویر کشی ان عوامل کے ذریعہ ہوتی ہے۔

یہ لازمی عوامل ایک ایسی مثلث ہیں جن کے اضلاع 'وراثت'، 'ماحول' اور تمدن نامی عوامل سے مل کر بنتے ہیں، اور انسان کے محرکات ان تین عناصر کے مقتضیات کا نچوڑ ہیں۔ ان عوامل کے اثرات کو انسان کی نفسیات و حالات کی کسی نوع میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان تینوں عناصر کی تاثیر میں کسی طرح شک وشبہ تو نہیں کیا جا سکتا، البتہ جو بات اشد ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ان عوامل کے اثرات کی بنیاد سے واقفیت حاصل کی جائے۔

عاملِ وراثت

وراثت شخصیت سازی کے عمل میں مسلمہ عوامل سے ہے اور دوسرے دو عوامل یعنی 'تمدن اور ماحول' کے ساتھ جزو مشترک ہے۔ اس عامل کی موجودگی میں اولاد نہ مال اور ماں باپ کے ظاہری صفات ورثہ میں حاصل کرتی ہے بلکہ ان کی باطنی صفات کی وراثت بھی پاتی ہے۔ یہ موروثی صفات اولاد کی شخصیت سازی میں موثر کردار ادا کرتی ہے۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تربیت جو بذاتِ خود شخصیت سازی میں ایک اہم عامل کی حیثیت رکھتی ہے اور وراثت اس کے بالکل برعکس عامل ہے کس طرح موثر ہو سکتی ہے؟

جواب: شخصیت سازی میں وراثت کی تاثیر کا بطورِ ایک عامل انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن مجید میں اس مطلب کے لیے بہت سی تصریحات اور اشارے ملتے ہیں جن میں سے بعض کا ہم ذکر کرتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ (اعراف: ۵۸)

''پاک و پاکیزہ زمین میں نباتات خدا کے اذن و ارادہ سے اُگتی ہے۔ لیکن ناپاک (اور شورہ زار) زمین سے بہت تھوڑی سی چیز اُگتی ہے۔''

حضرت نوحؑ بارگاہِ خداوندی میں اپنی مناجات میں اس طرح عرض کرتے ہیں۔

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾ (نوح: ۲۶:۲۷)

''پروردگار! روئے زمین پر کسی کافر کو باقی نہ رہنے دے۔ اگر تو نے انھیں آزاد چھوڑ دیا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ

کریں گے اور گناہگار اور کفار کے سوا کوئی بچہ پیدا نہیں کریں گے۔"

مسئلۂ وراثت کے اثرات کو احادیثِ اسلامی میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

"بیوقوف اور احمق عورتوں سے شادی نہ کرو کیونکہ ان کی مصاحبت باعثِ بدبختی ہوگی اور ازدواج کا نتیجہ بچوں کی تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔"[1]

امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:

حُسْنُ الْاَخْلَاقِ بُرْهَانُ كَرَمِ الْاَعْرَاقِ

اچھے اخلاق اچھی بنیادوں کی دلیل ہیں۔[2]

امیرالمومنینؑ مصر کے گورنر کو اپنے فرمان میں تحریر فرماتے ہیں:

ثم الصق بذوی الاحساب واهل البیوتات الصالحة والسوابق الحسنة ثم اهل النجدة والشجاعة والسخاء والسماحة فانهم جماع من الکرم و شعب من العرف۔"[3]

"ملک کو چلانے کے لیے ایسے افراد کا انتخاب کرو جو شریف، اصیل اور نیک نام گھرانوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ جن کا ماضی بے داغ ہو، دلاور، شجاع، مہربان اور بخشش وسخاوت کرنے والے ہوں، کیونکہ ایسے لوگ اچھی صفات کے مالک اور نیکی کے درخت کے پتے اور شاخیں ہوتے ہیں۔"

کارکنوں کے انتخاب کے سلسلہ میں اس طرح حکم دیتے ہیں:

وتوخ منهم اهل التجربة والحیاء من اهل البیوتات الصالحة والقدم فی الاسلام المتقدمة فانهم اکرم اخلاقا و اصح اعراضا و اقل فی

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۴ ص ۶۵

[2] غدر الحکم ص ۳۷۹

[3] نہج البلاغۃ حصۂ خطوط شمارہ ۵۳

المطامع اشرافا وابلغ فی عواقب الامور نظرا۔ [1]

''تجربہ کار اور پاک دامن خاندانوں کا انتخاب کرو جنھوں نے حریمِ مقدس اسلام میں بہت جلدی قدم رکھا ہو، کیونکہ وہ لوگ پسندیدہ اخلاق وروش کے مالک اور بے لوث اور وسیع نظر والے ہوتے ہیں۔''

اس لحاظ سے اسلام کے نقطۂ نظر میں شخصیت سازی کے لیے ''وراثت'' کے اثرات کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ماہرینِ حیاتیات BIOLOGISTS کے نزدیک بھی یہ مفہوم درست ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ شخصیت سازی میں وراثت کے اثرات کا مقام کیا ہے؟ کیا تمام صفات موروثی نا قابلِ تغییر ہیں یا یہ سب کی سب صفات تبدیل ہوسکتی ہیں، یا ان میں سے بعض تغیر کے قابل ہیں اور بعض نہیں۔

ہم ذیل میں اس کیفیت کی تشریح پیش کرتے ہیں:

مقامِ وراثت بطورِ عامل

اگرچہ وراثت جسم و بدن کے مربوط مسائل میں بعض اوقات ایک تقدیر ساز عامل کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے اور ایک بچہ موروثی کمزوری یا ساری کو اپنے جسم سے دور نہیں کرسکتا، تاہم اخلاقی اور اجتماعی مسائل کے بارے میں ایک سازگار ماحول ہی بچہ کی پسندیدگی کی حس کو بیدار کرتا ہے اور اس سے اختیار و آزادی کو ہرگز سلب نہیں کرتا۔

ہر شخص اپنی موروثی اقدار وروحیات سے مبارزہ کرسکتا ہے اور ان کے اثر کو بھی زائل کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی قوم اپنی سستی و زبوں حالی کو 'وراثت' کے ساتھ بطورِ عامل منسوب نہیں کرسکتی جبکہ ہر قوم حریت و آزادی کے سائے میں ایک شریف اور فعال ملت کی صورت اختیار کرسکتی ہے۔

تجربہ اور آزمائش اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ کتنے ہی موروثی آثار ایسے ہیں جو ترقی یافتہ تمدن، مناسب ماحول اور ہمدرد مربیوں کے زیرِ سایہ کلی طور پر ختم ہو چکے ہوں اور انسان ان تمام اقدارِ موروثی پر غالب آچکا ہے لہٰذا اگر ان عوامل کی تاثیر مستقل اور نا قابلِ تغیر ہوتی تو پھر کسی طرح ممکن نہ تھا کہ انسان کی سعی وکوشش یا دوسرے عوامل کی مدد سے یہ آثار موروثی ختم ہوجاتے۔

لیکن علم الحیات کے ماہرین کے نظریہ کے مطابق جو خود مسئلۂ وراثت کے داعی اور اس کو پیش کرنے والے ہیں، وراثت کی قوت اس حد تک کارفرما نہیں ہوتی کہ یہ کہہ دیا جائے کہ وراثت اپنا کام کرچکی ہے بلکہ یہ جاننا چاہیے کہ ظاہری صفات اگر قابلِ تغیر نہ بھی ہوں لیکن موروثی اقدار ایسی نہیں ہوتیں کہ ان کو بدلنا ممکن ہی نہ ہو۔

اس سے قطع نظر کہ ابھی تک وراثت کی حدود مکمل طور پر مشخص نہیں ہوئیں، ہم سب حسی طور پر روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ تندخو اور رذیل ماں باپ سے خوش خو اور بزرگ منش اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح با استعداد اور طاقت ور ماں باپ سے ناتواں اور کمزور بچے پیدا

---

[1] گذشتہ مدرک

ہوتے ہیں ۔لہٰذا ہمیں سوچنا چاہیے کہ عملِ وراثت کی موجودگی میں اثراتِ تربیت کو کلی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اسی بناء پر یہ ہرگز نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی سنا گیا ہے کہ کوئی شخص اس وجہ سے اپنے بیٹے کی تربیت کی طرف متوجہ نہ ہو کہ اس کا بچہ ہر حالت میں اس کے اپنے اخلاق واقدار کا وارث ہے اور قانونِ وراثت کے مقابلہ میں کوئی کام اس کے خلاف نہیں کیا جا سکتا۔

وراثت بطور ایک عاملِ فعال کچھ بھی ہوتا ہم وہ انسان کی حریت وآزادی عواملِ تربیت اور سزا وجزا کی موجودگی میں ان کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ درست ہے کہ عمل وراثت انسانی شخصیت کے ایک ضلع کو تشکیل دیتی ہے اور اس کے دوسرے اضلاع کو تمدن اور ماحول بناتے ہیں، لیکن اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ سب سے بالاتر انسان کی اپنی آزادی واختیار ہیں۔

موروثی صفات کی دو اقسام

ا: وہ صفات ومشخصات جو مستقل اور ناقابلِ تغییر صورت میں انسان کی طرف منتقل ہوتی ہیں۔ ماحول اور تربیتی عوامل ان صفات کو آسانی سے تبدیل نہیں کر سکتے۔ ان صفات کی مثال جلد کا رنگ، قد کی بلندی وکوتاہی اور چند ایک دیگر موروثی بیماریاں ہیں جیسا کہ جنون اور احمق پن۔

۲: وہ صفات ومشخصات جو ایک خاص استعداد کی صورت میں، کسی موافق ماحول میں انسان کے وجود میں جلوہ گر ہوتے ہیں، مثلاً سل (تپِ دق) جیسی بیماریاں جن میں اگرچہ جوان بیماریوں میں مبتلا والدین سے پیدا ہوتا ہے تو اس کو وراثتاً اس بیماری میں مبتلا ہونے کا خطرہ موجود رہتا ہے لیکن ایسے بچہ کو پیدا ہوتے ہی اگر اس کے بیمار ماں باپ سے جدا کر کے صحیح وسالم ماحول میں منتقل کر دیا جائے تو وہ بچہ اپنی صحت وسلامتی کو دوبارہ حاصل کر سکے گا۔

بہت سے اخلاق اور اقدارِ وراثت کے بارے میں یہی اصول کارفرما ہے۔

ہر بچہ موروثی استعدادوں کے ایک سلسلہ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اگر اسے اچھا ماحول میسر آجائے تو پھر وہ خوب پھلتا پھولتا، ترقی کرتا اور عقل وادراک کا حامل ہوتا ہے۔اسی طرح اگر اسے ناسازگار ماحول مل جائے تو وہ اپنی طرف سے کسی طرح ماحول پر کوئی اثر نہیں ڈالتا بلکہ ممکن ہے کہ بالآخر وہ معاشرہ میں گم ہی ہو جائے، یہ اسی طرح ہے جیسے نوعیتِ کار، آب وہوا اور غذا کے باعث جسم کی جلد کے رنگ اور انسان کی جسمانی وضع وکیفیت میں بعض تغیرات کا واقع ہونا ممکن ہے۔ بالکل اسی طرح ماحول سے متعلق اخلاق وعادات اور مربی کی لیاقت یا نااہلی انسان کی مختلف روحانی اور نفسیاتی استعدادوں کو بگاڑ سکتے ہیں اور سنوار بھی سکتے ہیں۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض منفی فکر رکھنے والے لوگ اور ناامیدی کے شکار شعراء ونثر نگاروں نے بھی جو اس طرزِ فکر سے متاثر ہوئے ہیں، اپنے فکری مطالب کو اعلیٰ قسم کی نثر اور عمدہ ودلفریب اشعار کے سانچے میں ڈھال کر لوگوں کے حوالے کیا ہے۔

ایک فارسی زبان کے شاعر نے اس زمین میں کچھ اشعار کہے ہیں، جن کا مطلع یہ ہے:

درختی که زشت است دی را سرشت
اگر برنشانی به باغِ بهشت!

جس درخت کی فطرت ہی بری ہے اگر تو اسے باغِ بہشت میں بھی لگا دے۔ (تو کوئی فرق نہیں پڑے گا)۔

اس شاعر نے اس زمین میں کافی اشعار کہے ہیں۔ درخت کے لیے آبِ کوثر سے بھی مدد لی ہے اور آخر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ پھر بھی وہ درخت برا ہی پھل دے گا۔

ہمارے خیال میں اس قسم کے اشعار ایک زہر کی مانند ہے۔ جس پر شرینی چڑھائی ہوئی ہو۔ کیونکہ ناامیدی پیدا کرنے والے افکار فعالیت کی قوت ہی معاشرے سے ختم کر دیتے ہیں، ایک بہانہ ہاتھ آ جاتا ہے کہ تقدیر ناقابلِ تغییر ہے۔ لہٰذا جوابدہی کا احساس ہی ذمہ دار افراد کے قلوب میں ختم ہو جاتا ہے اور معاشرہ ہی اس احساس سے خالی ہو جاتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ گندم سے گندم اور جو سے جو ہی پیدا ہوگا سیب کا پودا لگانے سے سیب ہی کا درخت بنے گا اور اس پر سیب ہی لگیں گے۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ گندم یا جو یا سیب ہمیشہ ایک جیسے نہیں ہوتے بلکہ ضروری دیکھ بھال، مناسب زمین کے انتخاب، کھاد با موقع مناسب مقدار میں پانی دینے اور خودرو نقصان وہ جڑی بوٹیوں کو صاف کرنے سے، بہتر اور زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مشہور ماہرِ علم الحیاتیات الکسیس کارل کی کتاب غیر معروف انسان کے بعض مندرجات کی طرف اشارہ کریں۔

وہ لکھتا ہے:

''ہم جانتے ہیں نقصِ عقل، دیوانگی، مراق، گونگا پن وغیرہ موروثی عیوب و نقائص ہیں۔ اسی طرح بعض بیماریاں مثلاً سِل، سرطان، بلڈ پریشر وغیرہ بھی کسی نہ کسی صورت میں ماں باپ سے اولاد کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ماحول کی اقدار اور زندگی کی کیفیات ان عوارض کے پیدا ہونے میں رکاوٹ بن جائیں یا ان کے ظہور کو سہل اور آسان بنا دیں۔''

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھا ہے:

''افراد کی شخصیت بنانے میں نفسیاتی اور ماحولیاتی عوامل بہت گہرا اثر رکھتے ہیں۔ یہ امور ہماری فکری اور معنوی بنیادوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر ان تغیرات کے ذریعہ جو خون کی گردش اور باطنی غدو کے عمل سے پیدا ہوتے ہیں۔ تمام اعضائے بدن کی ساخت و افعال کو متاثر کرتے ہیں۔ موروثی حالات کچھ بھی ہوں، تربیت کے زیرِ اثر انسان ایسی راہ پر چل پڑتا ہے جو اسے کبھی پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر پہنچا دیتی ہے اور کبھی ٹیلوں کے دامن میں یا پھر گندے پانی اور کیچڑ میں کھینچ لے جاتی ہے۔''

اس بیان کے مطابق تربیت اور ماحولِ زندگی غدود و ہارمونز کی خصوصیات اور انسان کے خون کی گردش پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے:

''جسم کی نشو ونما اور پرورش عوامل خارجی کے زیرِ اثر مختلف راہیں اختیار کر لیتی ہے پھر جسم اپنے ذاتی خصائص کو یا تو کام میں لاتا ہے یا انھیں معطل چھوڑ دیتا ہے۔لہٰذا ظاہر ہوا کہ موروثی حالات پر تربیت و پرورش کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔''

یقینا پیغمبر اس لیے نہیں آئے تھے کہ لوگوں کی جلدوں اور آنکھوں کے رنگ کو بدل دیں۔اور مجنون اور مادر زاد گونگے افراد جیسے عوارض کا علاج کریں۔ بلکہ انبیاء اس لیے آئے تھے کہ معاشرے کی ایمان باللہ کی بنیاد پر تربیت کریں، افراد معاشرہ کو تعلیم دیں، انھیں مذہبی سوجھ بوجھ عطا کریں، ان کی استعدادوں کو زندہ کریں، افراد کی عقول کو بیدار کریں، لوگوں کی طرح طرح کی خواہشات کو اعتدال پر لائیں اور ان میں ضبط پیدا کریں۔

تاریخ اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ پیغمبر تمدنِ بشر کے مقدس بنیاد گذار اور واقعی و حقیقی بانی تھے۔انھوں نے انسانی معاشروں کو عظیم تحریکوں کی مدد سے تکامل وارتقاء کے راستہ پر تیار کیا ہے۔اسلام کا تکمیلِ انسانیت کی طرف انقلاب خود پیغمبروں کے زبردست افعال کا ایسا زندہ و باکمال نمونہ ہے جس نے انسان کی تاریخ کے صفحات کو زینت بخشی ہے۔

اگرچہ تربیت کے زیرِ اثر انسان کی بعض موروثی صفات کو بدلا نہیں جا سکتا تاہم ماحول و تربیت کے ذریعہ لوگوں کے طرزِ تفکر، سلیقہ، عادات اور اخلاق میں تبدیلی پیدا کرنا ممکن بھی ہے اور قابلِ عمل بھی۔

طبیعی ماحول کے اثرات

ماحول کی تاثیر اور جغرافیائی عوامل کے نقوش قابلِ انکار نہیں ہیں۔ یقینا خشک ماحول گرم اور جلانے والے ریگستانی علاقوں میں پرورش پانے والے ساحلی علاقوں اور سرسبز و شاداب خطوں میں رہنے والے انسانوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں، وہ نہ صرف شکل وصورت اور قوتِ عقلی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، بلکہ میلانات و باطنی کششوں کے لحاظ سے بھی ایک جیسے نہیں ہوتے، تاہم مابعد الطبیعاتی اور طبیعی عوامل ہرگز ایسی ناگزیر قوت نہیں رکھتے کہ وہ کسی نہ کسی طرح انسان کے ہاتھ سے عنانِ زندگی کو چھین لیں اور انسان کو ایک تنکے کی طرح بنادیں جو کسی خطرناک سیلاب میں بہتا چلا جائے۔ان عوامل کی زیادہ سے زیادہ تاثیر یہ ہے کہ انسان کے انتخاب کے طریقہ کے لیے سازگار ماحول پیدا کریں لیکن اس کے باوجود ہر انسان اپنی قوت ارادی کی مدد سے اخلاق واجتماع سے متعلق مسائل میں ان عوامل کی تاثیر کو کم کر سکتا ہے۔

تمدنی اثرات

مثلث کے تیسرے ضلع یعنی تمدن، یا زیادہ واضح الفاظ میں اجتماعی، اقتصادی، اور تمدنی روابط کے اثرات سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کسی خاص قسم کے میلانات ومحرکات پیدا کرتا ہے، لیکن خود انسان اپنے اختیارِ کامل کے ذریعہ اپنے آپ کو ان عوامل کے تقاضوں کے مطابق ڈھالتا ہے، یا اس کے علی الرغم رنج وتکلیف کو اپنے لیے اختیار کر کے ان میلانات کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

اس طرح انسان بعض اوقات معاشرے کو ان عوامل کی قید سے رہائی دلا دیتا ہے۔ ہم قرآن میں بینشِ تاریخی کی بحث میں اس موضوع پر خاطر خواہ بحث کریں گے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کوئی عقلمند شخص ان عوامل کے انسانی جسم وروح پر مرتبہ اثرات سے انکار نہیں کرتا۔ دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ ان عوامل کے اثرات کس حد تک واقع ہوتے ہیں۔ یہ عوامل انسان کے انتخاب کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتے ہیں یا اختیار کی باگ ڈور ہی اس کے ہاتھ سے چھین لیتے ہیں۔ بیدار انسان کا وجدان وتجربہ نیز آزمائش اور تاریخِ اقوام پہلے نظریہ ہی کو ثابت کرتے ہیں۔

بعض اقوام کے درمیان جو ایک جیسے حالات میں زندگی بسر کرتی ہین۔ اختلاف کا وجود ان عوامل کے غیر قطعی اثرات اور ناسازگار ماحول پیدا کرنے کی علامت ہے صرف سازگار ماحول پیدا کرتے ہیں، جبکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی قوم ان عوامل کے مقتضیٰ کے خلاف قیام کرے اور اپنی تقدیر کو ہاتھ میں لے کر خود اپنے اجتماعی عوامل کو نقصان پہنچانے لگے۔

مندرجہ بالا بحث شخصیتِ انسان کی مثلث کے تینوں اضلاع کے اثرات کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔

اسلام اور آزادیِ ارادہ

قرآن مجید جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے وراثت ماحول اور تمدن کے اثرات کی تصدیق کرتا ہے۔

لیکن انسان کے ارادہ اور اس کی آزادی کو وراثت کے اثرات کے مقابلہ میں غالب وطاقتور قرار دیتے ہوئے ایک عام قانون کے طور پر فرماتا ہے:

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿٣٨﴾ (مدثر: ۳۸)

ہر انسان اس کام کے بدلے میں پابند ہے جو اس نے آزادی وحریت کے ساتھ انجام دیا ہے۔

بعض گمراہ لوگ اپنی ضلالت وگمراہی کا سبب اپنے مختصر ماحول کے اثرات کو قرار دیتے تھے اور انبیاء کے مقابلہ میں کہتے تھے:

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿٢٣﴾ (زخرف: ۲۳)

''اسی طرح ہم نے کسی مقام پر آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس نے مسرف لوگوں سے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے تو اپنے آباؤ اجداد کو اسی طریقہ پر پایا ہے، لہٰذا ہم تو انھیں کے طریقِ کار کی پیروی کریں گے۔''

قرآن اس طرزِ فکر پر تنقید کرتے ہوئے ان کے ارادے کی آزادی کو واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۭ (زخرف: ۲۴)

کہہ دیجیے! اگر میں اس طریقِ کار سے، جس پر تم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا، بہتر ہدایت کرنے والا دین لایا ہوں تو پھر بھی تم انھیں کی پیروی کرو گے؟"

آیت کا موضوع بتاتا ہے کہ صاحبِ فکر انسان اپنے ماحول میں مجبورِ محض نہیں بلکہ اپنے فکر کی روشنی میں اپنے آپ کو ماحول کی قیود سے آزاد کر کے اپنی عقل و فہم کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔

قرآن اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کو کافی سمجھتے ہوئے فرماتا ہے:

"سمہ"، ہم نے فطرت و آفرینش، عقل و خرد اور پیغمبروں کو بھیج کر بنی نوع انسان کی راہِ راست کی طرف ہدایت کی ہے۔ اب یہ خود انسان ہی ہے جو کفر کو ہدایت پر ترجیح دیتا ہے۔

جیسا کہ فرماتا ہے:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ (دھر:۳)

"ہم نے اسے سیدھی راہ کی ہدایت کر دی ہے۔ اب چاہے وہ شکر گزار بن جائے یا کفران کرے۔"

آخر میں قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ ہر فرد کے کام کا نتیجہ خود اسی طرف لوٹتا ہے۔

جیسا کہ فرماتا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۭ (حم سجدہ: ۴۶)

"جو شخص نیک کام کرے گا تو وہ اسی کے فائدہ کے لیے ہوگا اور جو شخص برے کام انجام دے گا تو وہ خود اسی کے نقصان میں ہوگا۔"

اس بحث سے ہمیں "نظریۂ وجودیت"، موحدین کے عقیدۂ جبر اور مادیین کے نظریۂ جبر کی کمزوری معلوم ہوگئی۔

اب ہم چوتھے مکتب یعنی تفویض و اختیارِ انسان پر تبصرہ کرتے ہیں۔ اس بحث سے چاروں کے چاروں مکاتب پر جن میں سے کوئی بھی فلسفہ اور قرآن کی میزان کے مطابق نہیں ہے، تنقید ہو جائے گی۔

☆☆☆

سپردگیِ فرائض اور انسانی اِختیار

موحدین میں سے ایک جماعت کا عقیدۂ جبر، نیز یہ کہ انسان اپنے افعال میں معمولی سا بھی دخل نہیں رکھتا۔ خدا ہی ہے جو انسان کی ظاہری کوششوں کے پس پردہ افعال کو انجام دیتا ہے، اور انسان ایک فاعلِ ظاہری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ایک مفرط جماعت کے وجود میں

آنے کا سبب بن گیا، جو عقل کے نقطۂ نظر سے جماعتِ جبریہ کے برعکس واقع ہوئی ہے۔

پہلی جماعت ''توحید در خالقیت'' کی حفاظت میں اس قدر آگے بڑھ گئی کہ ہر قسم کے عوامل طبیعی سے متعلق تبعی اور ٹھوس اثرات سے انکار کر دیا، اور عالم میں ایک موثر سے زیادہ، خواہ وہ مستقل ہو یا کمزور، کی قائل نہ رہی، تو دوسری طرف ان کی مقابل جماعت ''عدلِ الٰہی'' کی حفاظت میں، انسان کی آزادی کے مسئلہ میں اس حد تک آ گئی کہ انھوں نے انسان کے فعل، بلکہ تمام عوامل کے اثرات کی تائید میں خدا کی طرف نسبت سے کلی طور پر انکار کر دیا اور انسان کو خلق و آفرینش اور ایجاد و تاثیر تک میں مستقل و خود مختار سمجھ لیا۔

اس مفرط جماعت کا خیال ہے کہ خدائے دانا و توانا نے ازل ہی میں عالم کو ایک خاص نظام کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مادہ وطبیعت کے اندر علت و معلول کی بنیاد ڈالی اور اسباب و مسببات کی راہوں کو معین کر دیا۔ اس کے بعد کائنات کی پیدائش اور تمام موجودات کے بارے میں جو اس میں پائی جاتی ہیں، خدا کا کام ختم ہو گیا۔ پھر کائنات نے مخصوص نقوش کے مطابق اپنا کام شروع کر دیا اور اس نظام کی شکست وریخت تک یہ نظام خود بخود اسی طرح جاری رہے گا۔

لہٰذا اسباب طبیعی، جن میں خود انسان بھی شامل ہے صرف اپنے وجود کی حد تک خدا کے محتاج ہیں جبکہ اپنے افعال اور ان کے اثرات کے بارے میں خدا سے بے نیاز ہوتے ہوئے فاعلِ مختار کی حیثیت سے انسان مکمل طور پر مستقل اور با اختیار ہے۔

علماءِ علمِ کلام کا یہ گروہ کائنات و انسان کو ان کے حدوث و وجود کے مقام تک علت (خدا) کا محتاج جانتا ہے، جبکہ بقاء و دوامِ ہستی اور ایجاد و تاثیر میں انسان کے اللہ سے بے نیاز ہونے کا قائل ہے۔

دانائے بزرگ و فلسفی ''ابنِ سینا'' اشارات میں اس جماعت کا عقیدہ نقل کرتے ہوئے کہتا ہے:

''اس جماعت نے کائنات کے بارے میں خدا کی حیثیت کو عمارت کے معمار کی حیثیت کی طرح سمجھا ہے۔ عمارت اپنے وجود کے لیے کسی فاعل سے بے نیاز نہیں ہو سکتی، لیکن اپنی بقاء کے لیے عمارت کو اس فاعل کی کوئی احتیاج نہیں رہتی۔ کیونکہ عمارت میں موجود قوائے طبیعی اس کی بقاء کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت کائنات و انسان کی اصل پیدائش و بقاء کی ہے۔''

اس کے بعد ''ابن سینا'' اس جماعت سے نقل کرتا ہے کہ اسے یہ بات کہنے میں کوئی تردد نہیں کہ:

''اگر خدا کے وجود کا نہ ہونا فرض کر لیا جائے تب بھی کارِ جہاں اسی طرح جاری و ساری رہ سکتا ہے۔ کیونکہ کائنات اپنے اصل وجود کے لیے خدا کی محتاج تھی اور یہ احتیاج وجودِ ہستی کے بعد ختم ہو گئی، اور اب بقاء اور فعالیت میں اُسے خدا کی کوئی احتیاج باقی نہیں۔ [1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر تفریطی کے پیچھے ایک مفرط ہوتا ہے۔ اگر پہلی جماعت نے تمام عوامل کو نظر انداز کر کے انسان کے تمام افعال کو خدا کا اثر مستقیم سمجھ لیا ہے، تو دوسری جماعت نے ان کے بالکل برعکس تصور قائم کیا ہے۔ مؤخر الذکر جماعت نے علل و اسباب کے بارے میں اس قدر مبالغہ اور بے ہودہ گوئی سے کام لیا ہے کہ انھی اسباب و علل کو فاعلیت و تاثیر میں مستقل اور بنیادی تسلیم کر لیا ہے۔

---

[1] شرح اشارات ج ۳ ص ۶۸۔ کشف المراد بحث امکان مسئلہ ۲۹، ۴۳ کی طرف رجوع فرمائیے۔

ہم اپنے آپ کو اس بحث میں اس سے بلند تر سمجھتے ہیں کہ ان کی فضول اور بیہودہ دلیلوں کی پروا کریں اور ان کا جواب دینے بیٹھ جائیں۔ جو لوگ کائنات کے بارے میں خدا کی حیثیت کو عمارت کے معمار کی طرح سمجھتے ہیں، وہ اپنی جہاں بینی میں اس قدر کور اور نابینا ہو چکے ہیں کہ نہ انھوں نے خدا ہی کو پہچانا ہے اور نہ ہی کائنات کو۔ یہ لوگ معلولِ حقیقی کے بارے میں علتِ واقعی کی اہمیت سے کامل طور پر غافل اور ناآشنا ہیں۔

یہاں صرف اس بات کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس جماعت نے اصولِ اسلام کی ایک اصل یعنی ''عدلِ الٰہی'' کی حفاظت کرتے کرتے اس سے بڑی اصل یعنی توحید باری تعالیٰ سے انکار کر دیا ہے۔ یہ لوگ اس مثال کے مصداق ہیں، کہ بارش کے نیچے سے اٹھ کر انھوں نے پرنالے کے نیچے پناہ لی ہے۔

اب ہم اس نظریہ کے بعض ایسے نتائج کی طرف، جنھیں کوئی موحد قبول نہیں کر سکتا، اشارہ کرتے ہیں۔

۱: خدا کا شریک بنانا

اس سے بڑھ کر غلطی اور کیا ہوگی کہ کوئی مکتبِ فکر اسبابِ طبیعی اور انسان کی اصالت میں اس حد تک آگے بڑھ جائے کہ انھیں خدا کی نظیر و شبیہہ خیال کرنے لگے اور یہ دعویٰ کرے کہ وہ ہستی و وجود کی بقاء و دوام کے سلسلہ میں ہر قسم کے اسباب سے بے نیاز ہیں۔ افعال کی انجام دہی اور ان کے اثرات میں مکمل طور پر مستقل اور خود مختار ہیں۔ اس قسم کا طرزِ فکر، خدا کے لیے شریک قرار دینے اور اس کے لیے ''مرحلۂ بقا'' و فعالیت و کارکردگی میں ''شبیہہ و نظیر'' قرار دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نظامِ امکانی خدا سے وجود و ہستی پانے کے بعد ''واجب الوجود'' بن گیا ہے اور خدا ہی کی طرح کسی بھی سہارے کے بغیر مبدءِ افعال و اعمال ہو گیا ہے۔

توحید اور ''واجب الوجود'' کا یکتا و یگانہ ہونا ایک ایسی اصل ہے جس پر تمام شرائع آسمانی متفق ہیں اور تمام پیغمبر اسی اصل کو محکم بنانے کے لیے بھیجے گئے ہیں کلمہ لا الٰہ الا اللہ ایک ایسی اصل ہے جس میں کوئی فرد موحد کسی طرح کا شک و شبہ نہیں رکھتا اب اگر ہم ایک اصل یعنی ''عدلِ الٰہی'' کی حفاظت کی خاطر انسان اور کائنات کو ہستی و وجود حاصل کرنے کے بعد خدا کی مانند و نظیر تصور کر لیں تو اس صورت میں ہم ایک اہم چیز کی حفاظت کے لیے ایک اور اہم چیز کو ہاتھ سے دے بیٹھیں گے اور موحدین کے زمرہ سے خارج ہو جائیں گے۔

یہ طرزِ فکر (عدلِ الٰہی کی حفاظت توحید کی نفی کی قیمت پر) (''ژان پال سارتر'' کی طرزِ فکر کی مانند ہے جو انسان کی آزادی کی حفاظت میں وجودِ خدا ہی کا منکر ہو گیا ہے وہ کہتا ہے:

''چونکہ میں آزادی کا معتقد ہوں لہٰذا خدا کا معتقد نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر میں خدا پر ایمان رکھوں گا تو قضاء وقدر کو قبول کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ پھر اگر میں قضاء وقدر کو قبول کر لوں تو پھر مجھے آزادی سے آنکھ بند کرنا پڑے گی۔ لیکن چونکہ مجھے آزادی سے محبت ہے لہٰذا میں خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔''

ہم اس مغربی مفکر کو دو مطالب کی طرف متوجہ کرتے ہیں:

اولاً: حقائق و واقعات ہمارے لگاؤ اور خواہش کے تابع نہیں ہوتے کہ ہم اپنے آزادی کے تصور کی حفاظت کرتے ہوئے عظیم ترین واقعیت کی نفی کر دیں اور خدا کے وجود ہی کے منکر ہو جائیں۔ اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے ایک نفسیاتی مریض اپنی صحتِ نفس کے حصول کی بناء پر اپنی بیماری ہی کا انکار کر دے۔

دوم: قضاء و قدر صحیح معنی میں نہ صرف اختیار کی نفی نہیں کرتے بلکہ ان کو ثابت کرتے ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے، خدا کا ارادہ کے معنی یہ ہیں کہ ہر فاعل مختار اپنا کام انتہائی اختیار و آزادی کے ساتھ انجام دے۔ اس سلسلہ میں خدا کا سابقہ علم و ارادہ انسان کی آزادی کو مستحکم کرتا ہے اس کی نفی نہیں کرتا۔

مغربی مفکرین نے یہ خیال کر لیا ہے کہ زندگی کے ماحول اور تقدیر ساز عوامل کے درمیان ''قضاء و قدر'' نام کا پر اسرار عامل موجود ہے جو زندگی کی منصوبہ بندی کرتا اور سعادت و شقاوت کا بنانے والا ہے، حالانکہ تقدیر ساز تو خود انسان ہی ہے۔ خوش بختی اور بدبختی کا عامل بھی وہ خود ہی ہے، اور ہر فرد کی تقدیر و سرنوشت اس کے اپنے ارادہ و اختیار میں ہے۔ تقدیرِ الٰہی اور اللہ تعالیٰ کا طریقِ کار اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہر فرد اختیار و آزادی کے ساتھ اپنی زندگی کی منصوبہ بندی اور انجام کا تعین کرنے والا ہو۔ اس صورت میں اس قسم کی تقدیر جو سب کے لیے قدرِ مشترک ہے انسان کی حریت و آزادی کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے۔ ''قضاء و قدر'' عمومی اقدار کے سوا، جو فرد اور معاشرے کے لیے یکساں ہیں اور کوئی چیز نہیں اور اس قسم کا طریقِ کار، خواہ ہم تقدیر کے قائل ہوں یا نہ ہوں قابلِ انکار نہیں ہے۔

۲: وجودِ خدا اور اس کی حدودِ قدرت

اگر انسان اپنے افعال میں خود مختار ہو اور خدا کی قدرت و ارادہ اس کے افعال میں کوئی اثر نہ رکھتے ہوں تو یہ افعال یقیناً ارادۂ خدا سے باہر ہوں گے۔ اس صورت میں خدا کی قدرت و توانائی اس کا ارادہ و مشیت طبیعی اسباب تک محدود ہو جائیں گے۔ اس صورت میں خدا کی قدرت کی عمومیت و وسعت کا انکار ہوگا، نہ صرف اس کی قدرت و ارادہ کی شعاع محدود ہو جائے گی بلکہ اس کی ذات کا تصور بھی محدود ہو جائے گا۔

خدا کی ذات، اس کی قدرت و طاقت اور اس کے ارادہ و مشیت کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ اگر تمام اسبابِ طبیعی اپنے عمل و تاثیر میں خدا سے مستغنی و بے نیاز ہو جائیں اور خدا کا انسان کے وجود اور اس کے افعال و اعمال وجودِ خدا کے دائرۂ اختیار سے بالکل خارج ہوں گے جس کا نتیجہ خدا کی ذات کی حدود اور اس کی قدرت و طاقت کو محدود کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

اسی بناء پر آٹھویں امام اس جماعت کے عقاید پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اَلْقَدَرِيَّةُ اَرَادُوْااَنْ يَّصِفُوا اللّٰهَ عَزَّوَ جَلَّ بِعَدْلِهٖ فَاَ خْرَجُوْهُ قُدْرَتِهٖ وَسُلْطَانِهٖ

''قائلینِ تفویض نے چاہا کہ خدا کی عدل و انصاف کے ساتھ توصیف کریں لیکن انجامِ کار اس کو اس کی قدرت و

سلطنت ہی سے خارج کر بیٹھے۔"[1]

۳: تربیت کے برے اثرات

سپردگئ فرائض اور اختیارِ انسانی کی سوچ انسان میں بغاوت و سرکشی کی روح پیدا کرتی ہے اور انسان کی شخصیت رفتار اور کردار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ انسان جو خود کو خدائے لا یزال کی قدرت وقوت کا محتاج و نیاز مند جانتا ہے اور اپنی ہر چیز کو اسی کی عطا سمجھتا ہے، وہ ہمیشہ خدا کی رضا کے حصول اور اس کے احکام پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے جبکہ خدا سے بے نیازی کا احساس اسے خدا کے احکامات سے بے اعتنائی کرنے اور الٰہی نظام کو ٹھکرانے پر آمادہ کرتا ہے۔ اب وہ اپنے میلانات اور ہوا و ہوس کو مطمئن کرنے کے سوا اور کچھ نہیں سوچتا۔

قرآن انسان کی تربیت کے لیے اس کے فقر و نیاز پر تکیہ کرتا ہے اور فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾ (فاطر: ۱۵)

"اے لوگو! تم سب کے سب خدا کے محتاج ہو اور خدا بے نیاز اور لائق تعریف ہے۔"

اس کے بعد فرماتا ہے:

"بے نیازی کا احساس بغاوت و سرکشی کا سبب ہے۔"

ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ﴿۶﴾ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ﴿۷﴾ (علق: ۶،۷)

"جب انسان غنا اور بے نیازی کا احساس کرتا ہے تو وہ بغاوت و سرکشی کرنے لگتا ہے۔"

اگر کوئی مکتبِ فکر انسان کو سپردگئ فرائض و خود مختاری کی دعوت دیتا ہو اور یہ سمجھاتا ہو کہ پیدائش کے بعد افعال کی انجام دہی کے لیے اس کو تمام حالات و کوششوں میں خدا کی کوئی ضرورت، نیاز اور احتیاج نہیں ہے۔ تو یہ فکر انسان میں بغاوت و سرکشی کی روح پیدا کرتی ہے اور اس میں سے روحِ تسلیم کو ختم کر دیتی ہے۔

قرآن اس سوچ پر تنقید کرتے ہوئے، بہت سی آیات میں جہانِ آفرینش کی تدبیر کو خدا کے اپنے اختیار میں جانتے ہوئے اپنی ذات کے بارے میں کسی بھی مدبر کا اعتراف نہیں کرتا۔

چنانچہ فرماتا ہے:

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ

---

[1] بحار ج ۵ ص ۵۴

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴿۳﴾ [1] (یونس: ۳)

''وہی جہانِ آفرینش کی تدبیر کرتا ہے۔ کوئی اسباب اس کے حکم کے بغیر موثر نہیں ہوتے، یہی ہے اللہ تمھارا پروردگار، پس تم اسی کی پرستش کرو، تم نصیحت حاصل کیوں نہیں کرتے؟''

اب جبکہ عقیدۂ جبر اور تفویض کے دونوں مکاتب کی، ان کی تمام شاخوں کے ساتھ، بے پائیگی واضح ہوگئی تو یہ دیکھنا چاہیے کہ مکتبِ حق، اور جبر و تفویض کے درمیان تیسری راہ کون سی ہے، اور براہینِ عقلی اور آیاتِ قرآنی اس کی کس طرح تائید کرتے ہیں۔

راہِ سوم، نہ جبر نہ تفویض

نظریاتِ جبر و تفویض میں ہر ایک پر جداگانہ تحقیق پیش کر دی گئی ہے، اور دونوں کی کمزوری واضح ہوگئی۔

پہلے نظریہ میں عدلِ الٰہی پر اعتقاد کو ہدفِ بحث بنایا گیا، جس میں ٹھوکر کھائی گئی اس طرح 'حقوق' کی بنیاد اور اخلاقی اقدار، جن کا دارومدار اختیار و آزادی پر ہے کا انکار ہوگیا۔ اسی طرح دوسرے نظریہ میں توحیدِ افعالی پر زد پڑی اور یہ نظریہ رکھنے والے شرک اور دوگانگی کی خوفناک کھائی میں جا گرے۔

لہٰذا اب کسی اور راستے کی تلاش کرنا چاہیے جس سے دونوں صورتوں میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

یہ راہ وہی تیسری راہ یعنی نہ جبر اور نہ تفویض، جسے اسلامی احادیث میں امر بین الامرین سے تعبیر کیا گیا ہے۔

شیعوں کے آئمہ اور حکماء و متکلمین ہمیشہ اسی طریق پر گامزن رہے ہیں۔ انھوں نے علم کلام کے مسائل کی تاریخ میں عظیم معلومات پیش کی ہیں۔ اس نظریہ کی اہمیت موجودہ زمانہ کے بہت سے مفکرین پر واضح ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ اہلِ تسنن کے بعض علماء نے بھی اس نظریہ کو قبول کیا ہے۔

اس نظریہ کے مطابق انسان نباتات وحیوانات کے برعکس، جو طبیعی قوتوں اور حیوانی خواہشات کے اسیر ہوتے ہیں، طبیعی قوتوں، باطنی خواہشات اور شرائطِ زندگی کے بس میں مجبور نہیں ہوتا، بلکہ سب اقدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور معقول حد تک ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہے۔ پس اس نظریہ کا حامل انسان نہ تو خود اپنے افکار میں بالکل آزاد ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے افعال خدا کے علم و مشیت اور قدرت کے دائرے سے باہر آتے ہیں، لہٰذا وجود وہستی کی بقائ، عمل وسعی اور مختلف قوتوں سے فائدہ اٹھانے میں انسان ایک لمحہ کے لیے بھی ذاتِ باری تعالیٰ سے جس سے اس کا وجود قائم ووابستہ ہے بے نیاز نہیں ہو پاتا۔ ہم اس نظریہ کی تشریح کے لیے چند نکات پیش کرتے ہیں۔

---

[1] اعراف ۵۴، رعد ۲، سجدہ ۴ اور حدید ۴ کی طرف بھی رجوع فرمائیں۔

۱: معلول کا علت سے دائمی احتیاج

معلول کا علت سے احتیاج ''حدوث'' اور ''تحقق پذیری'' کی تحت وقتی اور محدود نہیں ہوتی بلکہ یہ احتیاج استمراری اور دائمی ہوتی ہے۔ تحقق پذیری کی کیفیت اس میں خصوصیت نہیں رکھتی۔ ''علیت ومعلولیت'' کے مسئلہ میں فلسفہ کے بنیادی اصولوں کی طرف توجہ کرنے سے اس نظریہ پر دلیل بہت واضح ہوجاتی ہے۔

نظامِ جہاں، جس میں انسان بھی شامل ہے ایک امکانی نظام ہے جو بذاتِ خود ہر چیز کا فاقد ہے۔ یہ کیفیت انسان کی ذاتی ہونے کی بناء پر ہمیشہ کائنات کے ساتھ پیوستہ رہتی ہے اور کبھی اس سے جدا نہیں ہوتی۔

یہ تصور کہ ''جہان وانسان'' بنیادی طور پر بقائے ہستی کی خاطر کسی سبب کی احتیاج رکھتے ہیں اور دوامِ ہستی وبقائے وجود کے لیے انھیں اس سبب کی ضرورت نہیں ایک خیالِ خام ہے۔ یہ تصور خدائے جہاں اور خود جہان کی صحیح شناخت نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بھی ہم اس موضوع پر گفتگو کر چکے ہیں، لہٰذا اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

علت ومعلول کی نسبت کو علت ومعلول حقیقی، یعنی واجب الوجود اور ممکن الوجود ذیل میں پیش کی گئی یا اسی جیسی کسی اور مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ تاریک ماحول بجلی کا بٹن دبانے سے روشن ہوجاتا ہے۔ بلب کی روشنی تاروں میں بجلی کی روانی کے باعث ہوتی ہے جو ان تاروں میں بجلی پیدا کرنے والے کارخانہ سے آتی ہے۔ لیمپ بجلی کی روانی سے ایک وقتی احتیاج نہیں رکھتا بلکہ اس کی احتیاج استمراری اور دائمی ہوتی ہے اور اگر ایک لحہ کے لیے بھی یہ رابطہ منقطع ہوجائے تو سارے ماحول پر تاریکی چھاجاتی ہے۔

جہان وانسان اور تمام طبیعی موجودات بھی خدا کی اسی طرح محتاج ہیں، کیونکہ خدا وجود وہستی کا موجد، عالم کا خالق اور اس کی تمام قوتوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

۲: نظامِ امکاں یا نظامِ علت ومعلول

جہان وانسان جب ایک امکانی نظام کے ماتحت ہیں اور ہر لحاظ سے خلاق ازل سے وابستہ ہیں، جس کی ذات کسی معمولی سے استقلال کی بھی محتاج نہیں، اس کے باوجود اس نظام میں وجود کے کئی مراتب ودرجات موجود ہیں، جن میں سے بعض علت ہیں اور بعض معلول۔ اس طرح سارے کا سارا نظام علت العلل سے وابستگی کے باوجود بذاتِ خود ایک سبب اور مسبب کا نظام ہے۔ لہٰذا ہرگز ایسا نہیں کہ ہر موجود کا فعل براہِ راست خدا کا فعل سمجھا جائے اور خدا خود تمام علل واسباب کا فاعل ہو۔

عام طبیعی کے بارے میں علت ومعلول کے نظام پر اعتقاد رکھنا اور ہر مادی وجود کے بارے میں اس بات پر اصرار کہ وہ خود اپنا ایک اثر رکھتا ہے، ''توحید در خالقیت'' کی نفی یا ''شرک در خالقیت'' کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ یہ اعتقاد اس قسم کی ''توحید'' کی تکمیل کرتا ہے کیونکہ یہ نظام تمام علل ومعالیل کے ساتھ، جو اس میں مخفی ہیں خالق یعنی مبدء کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی کے نافذ ارادہ ومشیت سے ابھرتا ہے، اور ارادۂ

خالق اس بات سے متعلق ہے کہ ہر مادی وجود اپنی علتِ خاص کے ساتھ موجود ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے اس سلسلہ میں ایک جملہ فرمایا ہے جو بہت ہی خوبصورت اور قیمتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''خدا کے ارادہ کا تعلق اس حقیقت سے ہے کہ ہر کام اپنے سبب اور علت کے ذریعہ انجام پائے۔ خداوند تعالیٰ افعال کا ان کے اسباب کے طریقہ کے علاوہ ارادہ نہیں رکھتا۔ اسی لیے اس نے ہر چیز کا ایک سبب قرار دیا ہے۔[1]

۳: انسان، ایک بااختیار ہستی

خالقِ انسان نے انسان کو ایک صاحب ارادہ و صاحبِ اختیار ہستی کی حیثیت سے خلق کیا ہے جو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے تشخیص وتمیز کی قوت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کمالِ عقل و بصیرت، علم و آگہی اور ایک خاص انداز سے موازنہ و مقابلہ کرنے کے بعد دو سمتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرتا ہے۔

اس جگہ ہمارے سامنے ایک ایسی ہستی ہے جو ایک بالاتر وجود کے ساتھ تعلق و وابستگی کے ساتھ ساتھ خود عالم و آگاہ، قادر وتوانا، موازنہ و مقابلہ کرنے والا اور صاحب ارادہ و اختیار ہے۔ ان مراحل سے گزرنے کے لیے نہ تو کوئی خارجی یا داخلی قوت اس پر دباؤ ڈالتی ہے اور نہ ہی دونوں سمتوں میں سے کسی ایک طرف کا انتخاب کرنے پر اسے مجبور کرتی ہے۔

ان تینوں مراحل کی طرف توجہ کرنے سے ''امر بین الامرین'' کی حقیقت ظاہر و واضح ہو جاتی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ مقدمۂ اول کے مطابق انسان کی خدا سے احتیاج استمراری اور دائمی ہے۔ لہٰذا اس سے ''توحید در خالقیت'' یعنی خدائے واحد کا عقیدہ ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر ممکن الوجود فاعل کی ہستی، اس کے افعال و اثرات، خدا کی قدرت کا پرتو ہیں، اور ممکن الوجود اپنے وجود، بقاء، دوامِ ہستی، اثرات اور افعال کے انجام دینے میں ہستی بخشنے والی اصل (واجب الوجود) اور اس کی لامحدود قدرت کا محتاج ہے۔

مقدمہ دوم، جو نظامِ امکانی کا بطور نظامِ اسباب و نتائج تعارف کراتا ہے ہر سبب کے دخل کو، جو ظاہر ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، کسی شے کے وجود میں آنے کے لیے قطعی و لازمی قرار دیتا ہے۔ اسی طرح ہر فعل کو اس کے فاعل سے منسوب کرنے کو صحیح جانتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ بات صحیح نہیں کہ تمام افعال اور ان کے اثرات کو براہِ راست فعلِ خدا تسلیم کریں اور تمام موجودات کے لیے اصلی و تبعی لحاظ سے خدا کے نام ہی کو سبب تصور کر لیں، بلکہ اس حقیقت کے باوجود صرف خدا ہی خالقِ اصلی و مستقل ہے و ہی تمام قدرت و قوت کا سرچشمہ ہے۔ اسباب و عوامل کی خلقت بھی اسی کی وسعتِ خلقت میں شامل ہیں، ہرگز اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر ظاہر وجودِ طبیعی اپنے خواص کے اعتبار سے اثرات رکھتا ہے۔ سورج اور آگ کے اثرات کے تردید یا ان میں شک ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ یہ اثرات اس قسم کے ہیں کہ اگر سورج اور آگ کو درمیان سے نکال ہی دیا جائے تو کسی چیز کا اثر باقی نہ رہے گا۔

---

[1] اَبَى اللّٰهُ اَنْ يُّجْرِىَ الْاَشْيَآءَ اِلَّا بِاَسْبَابٍ فَجَعَلَ لِكُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا کافی چاپ اخوندی ج ا ص ۱۸۳ء

اگر مقدمۂ دوم ہر فعل کی اس کے فاعل کے ساتھ نسبت کو صحیح قرار دیتا ہے تو پھر مقدمہ سوم انسان کو دوسرے فاعلوں ہی سے الگ کر دیتا ہے۔ اگر دوسرے فاعلوں کا تعلق صرف انتساب ہی تک محدود ہے تو جہاں ہم کہتے ہیں کہ سورج چمکتا ہے، آگ جلاتی ہے تو پھر علم و آگہی کے نہ ہونے یا آزادی و انتخاب اور اختیار کے فقدان کی وجہ سے انھیں ان کاموں کے لیے جوابدہ نہیں ٹھہرا سکتے، نہ ہی ان کے افعال کے لیے کسی قدر و منزلت کے قائل ہو سکتے ہیں۔ لیکن انسان کے سلسلہ میں انتساب بھی ہے اور جواب دہی کا پہلو بھی۔ انسان کا اس کی عقل و بصیرت، محاسبہ و اندازہ گیری اور انتخاب و اختیار کے ساتھ اپنے کاموں میں دخل دینا قابلِ انکار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان انتساب کے علاوہ خود اپنے افعال کے لیے جوابدہ بھی ہے۔ اس کی ہر کوشش، اخلاقی اقدار اور مسائل حقہ کے دائرے میں آتی ہے۔ عقاید کو اس طریق پر استوار کرنے سے عدلِ الٰہی کا عقیدہ ہر قسم کے شکوک سے محفوظ رہتا ہے۔

فلسفیانہ تجزیہ کے اعتبار سے اس فعل کی دو نسبتیں ہیں، ایک تو خلاق عالم و انسان کے درمیان ہے، اور دوسری کا تعلق صرف خدا کے بندے سے ہے، جو انتخاب ذاتی اور اختیارِ فطری جیسی خداداد قوتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کام کو انجام دیتا ہے۔

ایک نسبت خدا ہی کی طرف ہے کیونکہ وہی کائنات و انسان اور تمام خلق کرنے والی قوتوں کا خالق ہے۔ اور انسان کی خلقت خداوندِ تعالیٰ کے استمراری اور دائمی سائے میں ہے جو خدا کی طرف سے اُسے پہنچتا ہے۔ اگر یہ سایۂ خداوندی ایک لحہ کے لیے منقطع ہو جائے تو وجودِ موجودات ظلمت کدۂ عدم میں تبدیل ہو کر رہ جائے۔

ایک نسبت خدا بندے کی طرف رکھتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ نسبت ہے جس کی مدد سے انسان اپنے اختیار و ارادہ سے اپنی خداداد قوتوں کو اپنے متعلقہ افعال میں استعمال کرتا ہے اور اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنا تا ہے۔

افعال کی نسبت تو دونوں طرف ہے، لیکن اپنے افعال کے لیے جوابدہ انسان خود ہے۔ کیونکہ وہی ہے جو خدا کی مشترک قوتوں کو پوری آگاہی کے ساتھ ایک خاص راستہ میں استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان جوانی کی طاقت اور بازووں کی قوت سے یا تو اپنی اور معاشرے کی بہبود کے لیے کام کرتا ہے یا اسے افسوسناک و اندوہناک افعال میں استعمال کرتا ہے۔ اس فلسفیانہ حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے علماء کی طرف سے کچھ مثالیں پیش کی گئی ہیں جن میں سے بعض کو ہم یہاں بیان کرتے ہیں:

۱: منڈی میں جہاں مقام و اجناس کا ایک ہی شخص مالک ہے، کوئی شخص متفقہ شرائط اور اختیارات کے ساتھ اشیاء فروخت کرنے کے کام میں مشغول ہو جاتا ہے، اس کا تمام کام خود اس کی ملکیت ہونے کے باوجود منڈی کے مالک کے ساتھ بھی تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ تو منڈی کے مالک ہی کا ہے اور وہ جب چاہے اس دوسرے شخص کو کام کرنے سے روک دے۔ اس لحاظ سے اس کام کی نسبت دونوں کی طرف دی جا سکتی ہے۔

۲: ایک آدمی کا ہاتھ مفلوج ہے، لیکن بجلی کی قوت کی وجہ سے اس کے ہاتھ میں حرکت اور فعالیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ بجلی کی بیٹری کا بٹن اس طرح ہمارے ہاتھ میں ہے کہ جب چاہیں بجلی کی رَو کو منقطع کر دیں اور اس کا ہاتھ اسی طرح سے مفلوج ہو جائے۔ لیکن ہم بجلی کی

رَو کو منقطع نہیں کرتے اور اسے جاری رہنے دیتے ہیں تا کہ مفلوج شخص اس قوت سے جو کام چاہے کرے۔ اس صورت میں ہمارا فعل اور مفلوج کا کام دونوں طرف نسبت رکھتا ہے اور دونوں کے ساتھ قائم ہے۔ لیکن افعال کے لیے جوابدہ وہی مفلوج شخص ہوگا نہ کہ وہ جس کے اختیار میں بیٹری کا بٹن ہے۔

یہ مثالیں اگر چہ ایک فلسفی اور کلامی نظریہ کو واقعی طریقہ سے واضح تو نہیں کر سکتیں، لیکن ایک حد تک ممکن ہے کہ ایک عقلی سوچ کو تجسم بخشنے کے اسلوب سے مسئلہ کو ذہنوں کے قریب کر سکیں۔

اس سلسلہ میں خاندانِ عصمت سے کچھ روایات منقول ہیں جو بین الامرین کی حقیقت کو واضح کرتی ہیں۔ ہم ان میں سے بعض جو سوال و جواب کی صورت میں وارد ہوئی ہیں، یہاں نقل کرتے ہیں:

راوی: کیا خدا نے اپنے بندوں کو گناہ کے سلسلہ میں مجبور پیدا کیا ہے؟

امام: نہیں!

راوی: کیا افعال کو خود بندوں ہی کے سپرد کر دیا ہے؟

امام: نہیں!

راوی: پھر اصل صورتِ حال کیا ہے؟

امام: تیرے پروردگار کی طرف سے ان دونوں صورتوں کے درمیان ایک عنایت کا وجود ہے۔[۱]

ایک رسالہ، جسے امام جعفر صادقؑ نے جبر و تفویض کی رو کے بارے میں تحریر فرمایا، ارشاد ہوتا ہے:

''تقدیر کے سلسلہ میں لوگوں کے دو گروہ ہیں۔

''ایک گروہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا نے افعال کو خود انھیں کے اختیار میں دے دیا ہے۔ انھوں نے ایسا سوچ کر خدا کی قدرت و سلطنت کو محدود کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ ہرگز نجات نہ پائیں گے۔ جبکہ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ خدا خود اپنے بندوں سے گناہ کراتا ہے، اور انھیں ان کی قوت سے زیادہ کا مکلف بنایا ہے لوگ اپنے اس فیصلے سے خدا پر ظلم کرتے ہیں، لہٰذا یہ بھی نجات نہیں پائیں گے۔ ایک گروہ ایسا ہے جس کا ایمان ہے کہ خدا نے بندوں کو ان کی قوت کے مطابق مکلف کیا ہے اور ان کی طاقت سے زیادہ انھیں تکلیف نہیں دی۔ یہ لوگ اگر کوئی نیک کام کرتے ہیں تو خدا کا شکر بجالاتے ہیں اور اگر کوئی برا کام کرتے ہیں تو طلبِ مغفرت کرتے ہیں، یہی لوگ حقیقی و واقعی مسلمان ہیں۔''[۲]

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

---

[۱] عَنۡ اَبِی عبد اللہِ سَاَلَ رَجُلٌ اَجۡبَرَ اللہُ الۡعِبَادَ عَلَی الۡمَعَاصِیۡ؟ فَقَالَ لا قتال فَفَرَّضَ اِلَیۡهِمُ الۡاَمۡرَ؟ قَالَ لَا قَالَ فَمَاذَا قَالَ لُطۡفٌ مِّنۡ رَّبِكَ بَیۡنَ ذٰلِكَ۔ (کافی ج ۱ ص ۲۲۱)

[۲] بحار ج ۵ ص ۷

''نہ تو جبر ہی ہے نہ قدر (تفویض) ہے، بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک مقام ہے کہ حق اسی میں ہے۔اس مقام کو سوائے عالم کے، یا اس شخص کے جو عالم سے کسبِ علم کرتا ہے، اور کوئی نہیں جانتا۔''[1]

دو سوالوں کا جواب

''جبر'' اور ''انسان کی آزادی'' کے بارے میں پانچ مکاتب کا بیان کرنے سے حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے اور ''امر بین الامرین'' کی حقیقت ایک خاص شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

اس مقام پر تکمیلِ مطلب کے لیے دو سوال اور ان کا جواب ضروری ہیں۔

۱: خدائی ہدایت و گمراہی کا تصور

اگر انسان دوراہے پر مکمل طور پر آزاد ہے اور خوش بختی اور بدبختی کی لگام اس کے اپنے ہاتھ میں ہے تو پھر متعدد آیات میں ہدایت و گمراہی کے مسئلہ کی، جو ایک اہم ترین مسئلہ ہے، خصوصیت کے ساتھ خدا کی طرف اس طرح نسبت کیوں دی گئی ہے کہ اس سے جبر کی بو آتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

۱: فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ④ (ابراھیم:۴)

''یہی خدا جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور وہی سب پر غالب حکمت والا ہے۔''

۲: وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ (نحل:۹۳)

''مگر وہ جس کو چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، ہدایت کرتا ہے۔''

۳: فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖ (فاطر:۸)

''یقینی (بات) یہ ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے، اور جس کی چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔''

ان آیات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ ہدایت و ضلالت میں خدا کا ارادہ جاری ہوتا ہے اور ہر کام کا اختیار اسی کو ہے۔ انسان

[1] کافی ج ا ص ۲۲۲۔ لَاجَبْرَ وَلَاقَدَرَ وَلٰكِنْ مَّنْزَلَةٌ بَيْنَهُمَا ،فِيْهَا الْحَقُّ الَّتِيْ بَيْنَهُمَا لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا الْعَالِمُ اَوْ مَنْ عَلَّمَهَا اِيَّاهُ الْعَالِمَ

اس بارے میں کوئی اختیار و آزادی نہیں رکھتا۔ اس قدر صراحت کی موجودگی اللہ تعالی کے حضور جوابدہی کے لزوم کے مقابلہ میں انسان کی آزادی کی کیا توجیہہ ہوسکتی ہے؟ قرآن کے فرمودات کے مطابق ہدایت وضلالت کی بحث ایک وسیع وطویل بحث ہے۔ اس مسئلہ پر مکمل بحث کے لیے ضروری ہے کہ مسئلہ سے متعلق تمام آیات کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے، اس کے بعد ان سب آیات کے مطالعہ سے اس مسئلہ میں قرآن کا مفہوم ومطلب معلوم ہوگا۔ ہم بحث کے طویل ہوجانے کے پیشِ نظر اس کو نظرانداز کرتے ہیں، اور صرف ایسی آیات کی وضاحت کرتے ہیں جو کہتی ہیں، کہ ''ہم جسے چاہتے ہین ہدایت کرتے ہیں۔'' ہم کہتے ہیں کہ اس قسم کی آیات سے عقیدۂ جبر کے حق میں استدلال ان آیات کے ہدف ومقصد سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ اس کا سبب ہدایت من جانب اللہ کی دو اقسام کو خلط ملط کر دیتا ہے، جن میں سے ایک قسم تو عام اور سب انسانوں کے لیے ہے جبکہ دوسری ہدایتِ خصوصی ہے۔ ہدایت کی ان دونوں قسموں کی وضاحت سے آیات کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے اور عقیدۂ جبر کا معتقد ہوکر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

ہدایتِ عمومی اور خصوصی

خداوندِ فیاض، ہدایت بھی جس کے فیوض میں سے ایک ہے، دو قسم کی راہنمائی صادر فرماتا ہے۔ ہدایتِ الٰہی کی ایک قسم عمومی اور وسیع ہدایت ہے۔ جو تمام افرادِ انسانی پر سایہ فگن ہوتی ہے۔ دوسری قسم خصوصی ہدایت کی ہے، یہ انھی افراد کے کام آتی ہے جو ہدایتِ عمومی سے فیضیاب ہوئے بغیر ہدایت کی اس قسم میں شامل نہیں ہوسکتے۔

ہدایت عمومی کی آگے دو قسمیں ہیں:

الف: ہدایتِ عمومی تکوینی

اس قسم سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے تمام موجودات کو پیدا کیا اور ہر ایک کو اس کی پیدائش کے فرائض سے آشنا کیا جیسا کہ فرماتا ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ﴿۵۰﴾ (طٰہٰ: ۵۰)

''میرا پروردگار وہی ہے جس نے تمام موجودات کو پیدا کیا اور ان کی رہنمائی فرمائی۔''

اس ہدایت میں کسی قسم کی استثناء یا تبعیض نہیں ہے۔ لہٰذا انسان کی فطری اور پیدائشی محرکات کا تو کیا ذکر تمام جانداروں کے فطری افعال اور تمام حیوانات تک کے منظم اعمال، سب کے سب ہدایتِ الٰہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

ب: ہدایتِ عمومی تشریعی

ہدایتِ تکوینی وہ ہدایت ہے جو انسان کے باطن سے روبکار آتی ہے۔ اس کے برعکس تشریعی ہدایت سے مراد وہ ہدایت ہے جو باہر کی

طرف سے انسان کی جانب متوجہ ہوتی ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر خطرناک مراحل کو عبور کراتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے۔ ہدایت کی اس قسم میں بھی کسی طرح تفاوت وتبعیض کا کوئی شائبہ نہیں۔ اس قسم کی ہدایت کے وسائل حسبِ ذیل ہیں:

۱: عقل وخرد

۲: اللہ کے رسول اور پیغمبر

۳: اولیاء الٰہی

۴: آسمانی کتابیں

۵: امام اور رہنما

۶: علماء و دانشور

اس کے علاوہ عمومی ہدایت کے دوسرے وسائل جو سب کے سب اختیار میں ہوتے ہیں، اور سب لوگ ان وسائل سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں معمولی سا بھی امتیاز یا فرق نہیں ہے۔ اس جماعت کی مکمل ہدایت کے لیے خدا نے پیغمبر اور قرآن کا ہادی و رہنما کے طور پر تعارف کرایا ہے اور واضح طور پر پیغمبر سے فرماتا ہے:

وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝۵۲ (شوریٰ: ۵۲)

''بیشک تم راہِ راست کی ہدایت کرتے ہو۔''

قرآن میں دوبارہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (اسراء: ۹)

''یہ قرآن راہِ راست کی طرف رہبری کرتا ہے۔''

عدلِ الٰہی کے پیشِ نظر جو بات لازم وضروری ہے وہ یہی ہدایتِ عمومی ہے، تمام افرادِ انسانی کے لیے انجام پاتی ہے۔ اب یہ خود انسان کا اپنا فرض ہے، کہ آزادی سے استفادہ کرتے ہوئے، ان عمومی ہدایات سے فائدہ اٹھائے۔ شیطان اور شیطان صفت لوگوں کو شکست دے۔ ہدایت کی اس قسم میں کوئی قید وشرط نہیں اور مشیتِ الٰہی اس بات کی متقاضی ہوئی ہے کہ اس قسم کے وسائل ہدایت سب لوگوں کے اختیار میں رہیں۔

ہدایتِ خصوصی

یہ ہدایت، جسے خدا کے مخصوص بندوں کی ایک جماعت پر خدا کی خاص عنایت سمجھنا چاہیے، انھیں لوگوں کے لیے ہوتی ہے جنھوں نے ہدایتِ عمومی سے فائدہ اٹھایا ہو اور ان کی روح اس عمومی ہدایت کے وسائل کے فروغ کی روشنی سے منور ہوگئی ہو۔ یہ جماعت عمومی ہدایتوں سے

بھر پور فائدہ اٹھانے کی وجہ سے، خدا کی خاص عنایات سے زیادہ سے زیادہ بہرہ مند ہوتی ہے، اور اللہ کی طرف سے غیبی امداد و توفیقاتِ الٰہی (ہدایتِ خصوصی) میں شامل ہو جاتی ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ہدایت کی یہ قسم اس جماعت کے لیے ہے جو ہدایتِ عمومی کے وسائل سے بہرہ مند ہو چکی ہو۔ یہ ایسی بات ہے جسے قرآن نے مختلف آیات میں کسی نہ کسی طرح بیان کیا ہے اور بعض موارد میں اس طرح فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡۤ اِلَيۡهِ مَنۡ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ (رعد: ۲۷)

''خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جو شخص اس کی طرف توجہ کرتا ہے اسے ہدایت کرتا ہے۔''

دوسری آیت میں فرماتا ہے:

اَللّٰهُ يَجۡتَبِىۡۤ اِلَيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡۤ اِلَيۡهِ مَنۡ يُّنِيۡبُ ﴿۱۳﴾ (شوریٰ: ۱۳)

''خدا جسے چاہتا ہے اپنے لیے منتخب کر لیتا ہے اور اس شخص کو ہدایت فرماتا ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔''

پہلی آیت میں ''اناب'' اور دوسری آیت میں ''ینیب'' سے، جو خدا کی طرف مکرر اور بار بار توجہ کے معنی میں ہے، یہ مراد ہے کہ یہ ہدایت ان لوگوں کے لیے ہے جو عقل اور اللہ کی طرف سے مقرر کردہ دیگر رہنماؤں کی بات کو دھیان سے سنتے ہیں اور اپنے آپ کو خدا کی خاص راہِ ہدایت پر ڈال کر زیادہ سے زیادہ ہدایت اور توفیق کے خواستگار ہوتے ہیں۔

اگر ہدایت کی دوسری قسم کے حاملین کو ہدایت کی پہلی قسم سے بہرہ ور سمجھا جائے تو اسی طرح خدا کے گمراہ کرنے کا سبب انسان کا اس ہدایت سے روگردانی کرنا تصور ہوگا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّا زَاغُوۡۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۵﴾ (صف: ۵)

''پس جب وہ ٹیڑھے ہوئے تو خدا نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا ہی رہنے دیا اور خدا بدکار لوگوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا۔''

اور دوسری آیت میں فرماتا ہے:

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيۡنَ ۙ وَيَفۡعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾ (ابراهیم: ۲۷)

اور سرکشوں کو خدا گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

یضل من یشاء و یھدی من یشاء جیسی آیات سے جبر کا نتیجہ نکالنا ضلالت و ہدایت کے یکساں تصور پر مبنی ہے، یعنی یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت و گمراہ کرنے کی ایک ہی کیفیت ہے، اور یہ کیفیت بھی اسی جماعت کے لیے جن کی خدا ہدایت چاہتا ہے، حالانکہ اس سلسلہ میں ہدایت کی دو قسمیں ہیں، جن میں ایک عمومی اور وسیع ہے اور دوسری خصوصی۔ اب عدلِ الٰہی کے لیے جو چیز لازم

ہے، وہ پہلی قسم کی ہدایت ہے، جبکہ دوسری قسم کی ہدایت اس بات سے مشروط ہے کہ اس کے لیے ہدایتِ اول سے پہلے ہی فیضیاب ہو۔ اور اس طرح رحمتِ حق کے راستہ پر گامزن ہو۔

یہ ٹھیک ہے کہ خدا نے اس قسم کی ہدایت کو اپنی مشیت کے ماتحت رکھا ہے لیکن خدا کی مشیت بغیر سبب اور بلا وجہ نہیں ہوتی اور اس کا سبب بندہ میں لیاقت و شائستگی کی موجودگی ہے، جسے مندرجہ بالا آیات میں 'اناب' اور 'ینیب' کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اس قسم کے اسباب کا حصول سب کے لیے آسان ہے۔ اس موضوع کو، (کہ ہدایت کی دوسری قسم ان لوگوں کے لیے ہے جو ہدایت کی پہلی قسم سے فائدہ اٹھا چکے ہوں) زیادہ واضح کرنے کے لیے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں:

فرض کریں کچھ لوگ ایک چوراہے پر کھڑے کسی جگہ کا پتہ پوچھ رہے ہیں۔ ایک شخص ان کی ایک راستہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ اس کی بات کو قبول کر لیتے ہیں اور اس راستہ پر چل پڑتے ہیں۔ یہی لوگ جب دوسرے اور تیسرے چوراہے پر پہنچتے ہیں تو ان کی پھر راہنمائی کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اسی جگہ کھڑے رہے یا کسی دوسرے راستہ پر چل پڑے اور اصل راستے سے بھٹک گئے وہ لحظہ بہ لحظہ اصلی راستے اور مقصد سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔ پھر ان کے لیے بعد والی راہنمائی کی صورت بھی باقی نہیں رہے گی۔

خدا نے بھی پہلے سب کو ذیل کی آیات کے مطابق ہدایت فرمائی ہے:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ (دھر: ۳)

''ہم نے اس کو راستہ دکھا دیا۔''

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ (بلد: ۱۰)

اور اس کو (اچھی بری) دونوں راہیں بھی دکھا دیں۔

اس کے بعد اس کی مشیت یہ قرار پائی ہے کہ راہ پانے والوں اور راستہ طے کرنے والوں کو دوبارہ خاص عنایت اور مخصوص ہدایت کے ذریعہ انسانیت کی معراج تک پہنچا دے اور خود قرآن کی تعبیر کے مطابق:

ذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد: ۱۷)

''جنھوں نے ہدایت کو قبول کر لیا، خدا انھیں اور زیادہ ہدایت کرتا ہے۔''

اسی اصل کی بناء پر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ایک مقام پر ہدایت کو خدا کی راہ میں جہاد و کوشش کے اسباب و نتائج قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ (عنکبوت: ۶۹)

”جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انھیں اپنی راہ کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔“

دوسری طرف خدا کی مشیت اس بات میں ہے کہ بدکاروں اور ایسے لوگوں کو جو غلط راستوں پر چل پڑے ہیں، ہدایت کے بلند مراتب سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت کھو بیٹھے ہیں، ان کے حال پر چھوڑ دے اور انھیں ہدایت نہ کرے۔ یہی ان میں سے بہت سوں کی گمراہی کا سبب بن جائے گا (کیونکہ جتنا وہ غلط راستہ پر چلتے جائیں گے اتنا ہی سیدھے راستے سے دور ہوتے چلے جائیں گے)۔ یہ ٹھیک ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔لیکن وہ کن لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہے؟ قرآن مجید اس سوال کا جواب دیتا ہے:

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٦﴾ (بقرہ: ۲۶)

”بدکاروں کے سوا اور کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔“

دوسری جگہ فرماتا ہے:

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ (صف: ۵)

”جب وہ خود ہی منحرف ہو گئے تو خدا نے بھی ان کے دلوں کو منحرف ہی رہنے دیا۔“

خداوندِ عالم سب کو راہِ راست کی ہدایت کرسکتا تھا اور کرسکتا ہے۔ اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ سب کو راہِ ہدایت پر چلنے پر مجبور کر دے جیسا کہ فرماتا ہے:

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا (سجدہ: ۱۳)

”اگر ہم چاہتے تو تمام لوگوں کو ہدایت کر دیتے۔“

لیکن اس صورت میں انسان انسان نہ رہتا، بلکہ گوشت و پوست کی ایک مشین ہوتا جو بٹن دباتے ہی اس کی مرضی ہو یا نہ ہو ایک معین راستہ پر چل پڑتا۔ اپنی خواہشات کے انجام دینے میں مخالفت کی قوت اس کے پاس نہ ہوتی۔ وہ اپنی زندگی کا تناسب قائم رکھنے پر مجبور ہوتا، جیسے شہد کی مکھی چھتہ بناتی ہے یا ریشم کا کیڑا اپنے گرد جال بنتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔لیکن اب انسان انسان ہے۔ وہ خدا کی مشیت سے آزاد ہے۔ خدا نے اسے انتخاب کی قوت وقدرت دی ہے تا کہ اپنے تکامل وارتقاء کی راہ اپنے پاؤں سے طے کرے اور یہ راہ (غیر متناہی حد تک) اس کے لیے کھلی ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن کا بیان، ایک استاد کے لہجہ میں ہے جو اپنے شاگردوں سے کہتا ہے:

”ہم نے تمھیں ضروری سبق پڑھا دیئے ہیں۔ تم میں جو کوئی اچھی طرح سبق پڑھے گا، اسے ہم اچھا نتیجہ دیں گے۔ ہم جسے چاہیں گے قبول کریں گے اور جسے چاہیں گے رد کریں گے۔ کوئی شخص ہم پر اعتراض نہیں کرسکتا، نہ ہی ہمارے نظریہ کو پلٹا سکتا ہے۔“ ہم دیکھتے ہیں کہ شاگرد کو قبول یا رد کرنے کو اپنی خواہش پر منحصر جانتا ہے۔لیکن ایسا کرنا شاگرد کی صلاحیت اور لیاقت وشائستگی کو نظر میں رکھتے ہوئے ہوتا ہے۔

۲: ذاتی آزادی اور سعادت وشقاوت

اگر انسان واقعی آزاد وخود مختار پیدا کیا گیا ہے اور اس کی خواہش وارادہ کے بارے میں اس پر کوئی دباؤ اور زبردستی نہیں ہے، تو پھر سعادت وشقاوت سے جو بعض روایات وآیات کے مطابق طبعاً انسان کو مخصوص راستہ کی طرف کھینچ لے جاتی ہیں کیا مراد ہے؟

ان کے مفہوم کی تشریح کے لیے متن کا نقل کرنا ضروری ہے جو اس طرح ہے۔

قرآن قیامت کے دن لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم فرماتا ہے:

يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ۝۱۰۵ (هود: ۱۰۵)

''ایک دن آئے گا جب کوئی شخص اللہ کی اجازت کے بغیر بات نہیں کر سکے گا، ان میں سے کچھ تو نیک بخت ہوں گے اور کچھ بد بخت ہوں گے۔''

اس کے بعد قرآن دونوں جماعتوں کی کیفیت اور ان کی جزا وسزا اور ثواب وعقاب کو بیان کرتا ہے۔

یہ آیات ایسے نیک انجام کو بیان کر رہی ہیں۔ جسے لوگ انتہائی حریت وآزادی کے ساتھ حاصل کر لیتے ہیں۔ یعنی اپنے اچھے یا برے اعمال کے باعث قیامت کے دن خوش بختی یا بد بختی کو اپنے لیے فراہم کرتے ہیں، اور اس قسم کی سعادت وشقاوت میں کسی طرح جبر کو دخل نہیں۔

دوسری آیت میں، قیامت کے دن گنہگار لوگ اپنے برے انجام کے علل واسباب کو اپنی دنیاوی زندگی میں اپنی شقاوت وبد بختی کے غلبہ کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں:

اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۝۱۰۵ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ۝۱۰۶ (مومنون: ۱۰۵، ۱۰۶)

''کیا میری آیات تمھارے سامنے پڑھ پڑھ کر سنائی نہیں جاتی تھیں لیکن تم انھیں جھٹلایا کرتے تھے۔ وہ کہیں گے۔ اے ہمارے رب! ہماری شقاوت وبد بختی ہم پر غالب آ گئی تھی، اور ہم گمراہ قوم تھے۔''

اب دیکھنا چاہیے کہ یہ دنیاوی شقاوت جس نے ان پر غلبہ کیا تھا، دراصل کیا چیز ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جہنمی لوگ اپنے برے انجام کو اپنی دنیاوی شقاوت کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''شقوتنا'' لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا وہ اس شقاوت کو اپنے اعمال کی پیداوار سمجھتے ہیں یا اسے اپنا ذاتی وصف جانتے ہیں جو ان کی خلقت سے ان کے ہمراہ تھا۔ آیت کا متن کہتا ہے کہ دوزخی اس شقاوت کو ایک اکتسابی حالت قرار دیتے ہیں۔ جسے وہ اپنی دنیاوی زندگی میں اپنے اعمال کے ذریعہ بناتے ہیں۔ آیت کا متن یہ ہے:

رَبَّنَآ اَخۡرِجۡنَا مِنۡهَا فَاِنۡ عُدۡنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوۡنَ﴿۱۰۷﴾ (مومنون: ۱۰۷)

''خداوندا! ہمیں دوزخ سے باہر نکال دے (ہمیں دوبارہ دنیا کی طرف پلٹا دے) اگر ہم پھر وہی پہلے اعمال کریں تو پھر ہم یقینی طور پر ظالم اور مستحقِ عذاب ہوں گے۔''

خداوندِ عالم کی بارگاہ میں یہ درخواست کہ خدا انھیں دوبارہ دنیا کی طرف لوٹا دے اور اگر وہ اس دفعہ پہلے ہی جیسے افعال کے مرتکب ہوں تو وہ اپنا قصوروار و ظالم ہونا تسلیم کرلیں گے اس بات کا ثبوت ہے کہ سعادت و شقاوت کے حصول میں وہ بالکل خودمختار ہیں اور اپنی زندگی کے لائحہ عمل کو اپنی مرضی کے مطابق مرتب کرسکتے ہیں۔ اگر ان کا برا انجام ایسی شقاوت کا نتیجہ ہوتا جس کا انھیں اختیار نہیں تھا تو پھر دنیا کی طرف لوٹنے کی درخواست کرنا اور پہلے والے لائحہ عمل کو بدلنے کا ضمنی وعدہ کرنا بے معنی ہوجاتا۔

کیونکہ فرض یہ ہے کہ ان کی خلقت دونوں مرحلوں میں یکساں ہوگی۔ اس سلسلہ میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ اسی لیے امام جعفر صادقؑ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''بِاَعۡمَالِهِمۡ شَقُوۡا''[1] یعنی وہ اپنے برے اعمال کی وجہ سے بدبخت ہوئے ہیں:

اَلشَّقِیُّ مَنۡ شَقِیَ فِیۡ بَطۡنِ اُمِّهٖ [2]

''بدبخت انسان شکمِ مادر میں بھی بدبخت ہے۔''

اَلنَّاسُ مَعَادِنٌ کَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالۡفِضَّةِ

''لوگوں کے وجود کا پہاڑ سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح ہے۔''

پہلی حدیث اگر مستند ہے تو ہوسکتا ہے کہ ماں ایسی صفات کو بیان کرتی ہو جو والدین سے ورثہ میں ملی ہوں، کیونکہ موروثی صفات انسان کی جسمانی صفات کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہیں۔ بلکہ فضائلِ اخلاق اور نفسانی رذائل کو بھی انسان والدین سے ورثہ میں حاصل کرتا ہے۔ جو بچہ جسمانی اور اخلاقی عوارض والدین سے لے کر پیدا ہوتا ہے، رحمِ مادر میں ہی اس کی شقاوت و بدبختی کی فطری طور پر بنیاد پڑ جاتی ہے۔ اس کے برعکس جس بچے کا نطفہ جسمانی و روحانی لحاظ سے صحیح و سالم ماں باپ سے رحمِ مادر میں قرار پاتا ہے، اسی لمحہ سے اس کی خوش بختی کے مقدمات کی بنیاد پڑ جاتی اور وہ ایک لحاظ سے سعید و خوش بخت ہوجاتا ہے، چونکہ موروثی اخلاق اور روحانی و نفسانی خصوصیات، فطرت کی صورت میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا طبعاً ان سے جبر لازم نہیں آتا۔

دوسری حدیث کمالات کے لحاظ سے خلقت کے اختلاف کو بیان کررہی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ تمام افراد مختلف استعدادوں اور گونا

---

[1] توحید صادق ۳۵۹

[2] توحید صادق ص ۳۵۹، روح البیان ج ص ۱۰۴

گوں اقدار کے ساتھ سونے اور چاندی کی خصوصیات کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص سے کوئی ایسی چیز مطلوب ہے، جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ آخر میں ہم وہ حدیث جو ساتویں امام سے اس سلسلہ میں منقول ہوئی ہے پیش کرتے ہیں۔

محمد بن ابن عمیر نے حضرت موسیٰ کاظمؑ سے سوال کیا: آنحضرتؐ کی شقی شکمِ مادر میں شقی اور سعید شکم مادر ہی میں سعید ہوتا ہے۔ اَلشَّقِیُّ مَنْ شَقِیَ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ وَالسَّعِیْدُ مَنْ سَعِدَ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ کے جملہ سے کیا مراد ہے؟

امام نے فرمایا: ''اس سے مراد یہ ہے کہ خدا پہلے دن سے جانتا ہے کہ کون لوگ سعادت آفرین اعمال بجالائیں گے اور کون شقاوت آمیز کام انجام دیں گے۔'' اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ میں نے حضرت سے سوال کیا کہ آنحضرتؐ کی دوسری حدیث کے کیا معنی ہیں۔ جس میں آپ نے فرمایا ہے:

''اعملوا فکل میسر لما خلق لہ۔''

''عمل کرو، ہر شخص جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس پر قادر و توانا ہے۔''

امام نے اس کی تفسیر میں اس طرح فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں نہ کہ اس کی مخالفت کریں۔ لہٰذا تمام انسان اس مقصد کے پورا کرنے کی (اطاعت و بغیر عصیاں) قدرت و طاقت رکھتے ہیں۔ وائے ہے اس شخص کی حالت پر جو دل کے اندھے پن کو اس کی بینائی تصور کرے۔''[1]

☆☆☆

اختتامِ ترجمہ

بتاریخ ۲، جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ

مطابق ۱۲ر دسمبر ۱۹۸۷ء

بروز جمعرات بوقت سوا گیارہ بجے دن

بر مکان محمد حسن سیٹھ برادرز

بہادر یار جنگ روڈ، کراچی

احقر: سید صفدر حسین نجفی

---

[1] توحیدِ صدوق ص ۳۵۷